معالم القرآن

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

○

ادارہ تعلیمات قرآن

سیالکوٹ ۔ پاکستان

نام ــــــــــ معالم القرآن

موضوع ــــــــــ تفسیر و تشریح

تالیف ــــــــــ حضرت مولانا محمد علی صاحب الصدیقی الکاندھلوی

عناوین ــــــــــ ۷۶۹

آیات ــــــــــ ۱۱۱

طابع ــــــــــ محمد شریف قاسمی

تزئین و آرائش ــــــــــ سید انور حسین نفیس رقم

کتابت ــــــــــ محمود احمد صوفی، گوجرانوالہ

ناشر ــــــــــ ناظم ادارہ تعلیمات قرآن

صفحات ــــــــــ ۶۰۵

تاریخ اشاعت ــــــــــ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ مطابق جولائی ۱۹۷۹ء

قیمت : ۴۸ روپے

ــــــ ملنے کا پتہ ــــــ

دارالعلوم الشہابیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ
(پاکستان)

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی ساتویں جلد کو جس میں انسانیت کے فکری مسائل کی اصلاح کی گئی ہے عالی جناب داؤد مساعد الصالح مالک مساعد الصالح العقاریہ دولت کویت کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی دینی حمیّت اور محبت قرآن میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے اور جو اپنے دل میں قرآنی تعلیمات کو پروان چڑھانے کا خاص جذبہ رکھتے ہیں اور جن کی ہمدردانہ عنایت کی انجمن دارالعلوم الشہابیہ رہینِ منّت ہے۔ اللہ سبحانہ سے دعا ہے کہ جود و عطا کا یہ فیض تا قیامت جاری رہے اور اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرتا رہے۔

عبدالرحمان قاری ایم اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دارالعلوم الشہابیہ، سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے معالم القرآن جلد ہفتم کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا، اور مجھ گنہ گار کو یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ ساتویں پارے کی تشریح کر کے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی کو دھونے کے لیے رحمت کے چند قطرے مہیا کروں۔ جلد ششم اکتوبر [illegible]ء میں طبع ہوئی تھی۔ اب چھ ماہ کے بعد یہ جلد ہفتم مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس جلد میں جو عرق ریزی کی گئی ہے اس کا بڑا اصلہ یہی ہے کہ قلم جادۂ حق سے نہ ہٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے دوری نہ ہوئی ہو۔

الحمد للہ اس جلد پر سارا کام دار العلوم ہی میں ہوا ہے اور مئی [illegible]ء سے شروع ہو کر دسمبر [illegible]ء کو یہ جلد مکمل ہوئی۔

اس جلد میں جن گراں قدر علمی گہواروں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

التفہیمات الالٰہیہ	حکیم الامت شاہ ولی اللہ
فیوض الحرمین	” ”
اقتضاء الصراط المستقیم	شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ
فتاویٰ عالمگیری	مرتبہ علمائے ہند
البحر الرائق	الشیخ ابن نجیم
ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	علامہ الشیخ ابو الحسن علی میاں
منہاج السنۃ	شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ
تشکیل جدید الٰہیات	فلاسفر علامہ شیخ محمد اقبال
عقیدۃ الاسلام	السید انور شاہ کشمیری
الرد علی المنطقیین	شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ

شرح المواقف	میر سید شریف
الفوز الکبیر	حکیم الامت شاہ ولی اللہ رح
ترجمان السنہ	مولانا بدر عالم
صراط مستقیم	ملفوظات الشیخ سید احمد رح
شریعت و طریقت	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح
تاریخ تصوف قبل الاسلام	مولانا عبدالماجد دریابادی

یہ ان تفسیر و حدیث کی کتابوں کے علاوہ ہیں جن سے استفادہ شرح قرآن میں اس کی آیات کی تفسیر میں اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھ سیاہ کار کو قرآن کی شرح کرنے کی توفیق بخشی۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور میری محنت کا سب سے بڑا اندوختہ ہے اور خدائے قدوس اگر قبول فرمائے تو میری نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یاد رکھیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور اس ارشاد گرامی کے بیان کرنے والے حضرت عمرؓ ہیں۔

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً و یضع بہ آخرین

اللہ سبحانہ اس کتاب کے ذریعے کتنے ہی لوگوں کو اونچا کرے گا اور کتنے لوگوں کو پست کرے گا۔

یعنی جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور عمل کرتے ہیں اللہ سبحانہ ان کو دنیا و آخرت میں رفعت و عزت عطا فرماتے ہیں اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے اللہ ان کو ذلیل کرتے ہیں۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہی ہے کہ اگر امت کا علم و عمل میں قرآن سے رابطہ ہوگا تو آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی آسائش اور عزت و اقتدار ملے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے قرآن سے علم و عمل میں رابطہ کی راہ اپنائی ان کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا اور جن کی آخرت سنور رہی تھی، ان کی دنیا بھی باغ و بہار بنی رہی۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ماننے والوں کے بارے میں اللہ کا یہ فیصلہ اور ضابطہ بدل جاتے۔ آج بھی وہ قانون ہے جو کل تھا۔ یہی قانون مکہ کے تاریک ماحول میں تھا اور یہی مدینے کے پرخطر دور میں رہا۔ انہیں بھی مخاطب کر کے کہا گیا جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے اور انہیں بھی جو ایمان لا چکے تھے۔ اللہ کے رسول نے انہیں یقین دلایا تھا۔

اگر تم میرا لایا ہوا پیغام قبول کر لوگے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوشحالی کا

باعث ہوگا اور آخرت میں بھی۔

اس امت سے یہ وعدہ کس طرح پورا ہوا اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ قرآن سے علم و عمل کا رابطہ استوار کرنے سے آخرت کی فلاح کے ساتھ دُنیا کس طرح ہاتھ آتی ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہ اصولی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دولت، عزت، اقتدار جن کو دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے قرآن کی نگاہ میں بجائے خود معیوب نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کا فضل ہیں اور پھر یہ کہ انسان اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے اپنے مالک کے احکام کے مطابق چلائے۔ یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو یہ خلش اس حد تک بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ دُنیا کی عزت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو، کیونکہ جو چیزیں اللہ کی نعمت اور اس کا فضل ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتی ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

باسمہٖ سبحانہٗ

الحمد للہ ثم الحمد للہ معالم العرفان کی ساتویں جلد آج ناظرین کے سامنے ہے۔ یہ ان اعتقادی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح ہے جو کہ زندگی میں اللہ سبحانہٗ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا سے انسانیت کو عموماً اور اہل مکہ کو خصوصاً بتائی اور سکھائی گئیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ عقائد کی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں حالانکہ عقائد کی حیثیت بالکل ایک درخت کی جڑ کی ہے۔ جڑ کے بغیر درخت کا تصور آپ ذہن میں تو قائم کر سکتے ہیں لیکن وجود کی دنیا میں ایسے درخت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ درخت کو تمثیل کے لیے میں نے بطورِ تفنن ذکر نہیں کیا بلکہ افکار و نظریات کے لیے بھی تمثیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی ہے ارشاد ہے کہ:

ایمان کی ستر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے اور شرم بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

یعنی ایمان درخت کی اس خشک جڑ کا نام نہیں ہے جس میں عمل صالح کی ایک شاخ بھی نہ ہو بلکہ اس تر و تازہ درخت کی جڑ کو ایمان کہتے ہیں جس میں اعمال صالحہ کی بے شمار شاخیں پھوٹتی رہیں۔ اس پر رنگا رنگ کی عبادات کے پھول کھلیں اور ایسے ایسے سود مند اعمال کی بہار آئے کہ راستہ سے کانٹا ہٹا دینا ان میں ایک ادنیٰ ترین عمل شمار ہو، اسی بات کو قرآن عزیز نے اپنے بلیغ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

ایک اچھی بات کی مثال ایسی ہے جیسے اچھا درخت جڑ اس کی جمی ہوئی ہو اور ٹہنیاں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل

دیتا رہتا ہو۔

اس آیت میں کلمہ طیبہ یعنی عنوان ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن اس درخت سے نہیں جس پر پھل پھول پتہ کوئی نہ ہو بلکہ اس درخت سے تشبیہ دی ہے جو سدا بہار ہو اور اس پر کبھی خزاں نہ آتی وہ دوسرے درختوں کی طرح سال بھر میں ایک ہی بار پھل نہ دے بلکہ موسم کی قید سے آزاد ہو کر پھلوں اور پھولوں سے ہمیشہ لدا رہے۔

اس سے آپ کو تطہیر فکر اور ایمان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ اس پارے میں سورہ انعام ہے اور اس میں توحید آخرت اور رسالت کے دلائل واضح کر دیے ہیں۔ انسانیت کو ایمان کی دعوت دی ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ کی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس سے تکذیب کرنے والی قوموں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ اہل عرب چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے اور ان کا یہ دعویٰ تھا کہ جس مذہب پر وہ ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیم سے وراثت میں ملا ہے اس وجہ سے اس سورت میں اس حجت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی ہے۔

اسلامی قانون اپنی جامعیت میں بے مثال ہے۔ یہ افکار و نظریات، قوانین اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ یہ انسان کے اعتقادی فکر سے لے کر اس کے ذاتی اخلاق اور اس کے اجتماعی معاملات کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ دنیوی قانون کی طرح صرف انتظامی ضابطہ نہیں ہے۔ یہ کامل ہے اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہیں ہے، جامع ہے ہر حالت کے بارے میں اس کا ایک حکم ہے انسانی زندگی کا کوئی پہلو اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ افراد، جماعتوں اور حکومتوں کے سارے احوال و ظروف اس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ یہ شخصی اور انفرادی احوال سے بھی بحث کرتا ہے یہ اجتماعی انتظامات سے بھی تعلق رکھتا ہے اور بین الاقوامی احوال سے بھی علاقہ رکھتا ہے۔ یہ قانون ہنگامی اور وقتی نہیں ہے۔ بہرحال اسلامی قانون میں ایمانیات کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اور یہ ایمانیات ہی اسلامی نظام حیات کے تمام قوانین اور تمام اخلاق کے لیے جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح کسی درخت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک جڑ ہو جس پر درخت کا تنا اس کی شاخوں، پھولوں اور پھل کا بوجھ ہو اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جڑ اتنی گہری اور مضبوط ہو جو تنے، شاخوں اور پھلوں کا بوجھ سنبھال سکے ورنہ وہ درخت ہوا کے ایک تیز جھونکے کی بھی تاب نہ لا سکے گا۔ ایک دانا اور دوراندیش باغبان کبھی اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا کہ

جس جسامت کا تنا اور وزن کی شاخیں ہوں اسی کے تناسب سے درخت کی جڑ کا لحاظ رکھنا چاہیے۔
ایمان کی علم برداری ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایانی اور جس کی ذمہ داریوں کی گرانباری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی، دوست دشمن، موافق اور مخالف سب اس امر واقعی کا اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اظہار اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو علانیہ فریب خوردہ بلکہ مجنون کہا کرتے ہیں اور جو لگانے ہیں وہ اس کا اعلان اس کی کامیابی کو ناممکن بتا کر فرماتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں امام الحسن البصری سے نقل کیا ہے کہ

ایمان صرف ظاہرداری اور ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں گھر کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔

مطلب یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیات قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ ابتداءً ایمان اگرچہ تصدیق قلبی کا نام ہے مگر یہ تصدیق اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے نشوونما پاکر ایک نور کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہی نور فی الواقع ایمان ہے۔ امام بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ پہلے ایمان ایک سفید نقطہ کی صورت میں قلب میں نمودار ہوتا ہے اور جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے یہاں تک کہ جب ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو سارا دل منور ہو جاتا ہے یہی حال نفاق کا ہے کہ پہلے سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بالآخر تمام قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم ایک مومن کا قلب نکال کر دیکھو تو بالکل سفید پاؤ گے اور ایک منافق کا دل دیکھو تو بالکل سیاہ دیکھو گے۔ (اتحاف النبلاء المتقین)

یہ نورِ تصدیق جس قدر رسوخ پیدا کرتا جاتا ہے اتنا ہی خواہشاتِ نفسانیہ، جہالت اور نادانی اور گرد و پیش کی تاریکیوں کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں۔ اسی قدر یہ نور پھیلتا جاتا ہے تا آنکہ یہ نور انسان کے تمام جوارح کا احاطہ کر لیتا ہے اور یہ مومن خود ایمان مجسم بن جاتا ہے جسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔
اس نور کی وسعتوں کے مقدار میں اوامر الٰہیہ کے امتثال اور نواہی ربانیہ سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق رذیلہ زائل ہو جاتے ہیں اور اخلاق حمیدہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ایمان کی اسی وسعت کا اس سورت انعام میں ان لفظوں میں چہرہ پیش کیا ہے۔

فمن یرد اللہ ان یہدیہ یشرح صدرہ للاسلام

ارشاد نبوت ہے کہ جب نور یقین قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں ایک فراخی اور کشادگی

نمودار ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس کی علامت کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کی تین علامتیں ہیں۔ اول آخرت کی طرف میلان دوم دُنیا سے نفرت اور دوری سوم موت سے پیشتر اس کی تیاری۔

یہی واقعی اور حقیقی ایمان ہے۔ یہی دعوت انبیاءؑ کا مرکزی نقطہ ہے اور اسی پر نجات اور فلاح ابدی کا مدار ہے۔ یہ ایمان صرف ذہنی و عقلی نہیں بلکہ دب کر محسوسات کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے اس کا نور شاہراہ عام پر ہوتا ہے سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ قلب اس کی حلاوت اور شیرینی اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسے زبان مٹھائی کی۔ یہ ایمان فطرت انسانی کا ایک تقاضا بن جاتا ہے جس طرح دوسرے جبلی اور فطری اخلاق لازوال ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ ایمان بھی زوال کے ہر خطرہ سے بڑی حد تک محفوظ ہوتا ہے۔

اس سورت میں ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، کی دعوت دی گئی ہے اور نبوت کی زبانی دی گئی ہے۔

ایمان باللہ اسلامی نظام حیات کا سب سے پہلا بنیادی پتھر ہے اور اسی لیے سب سے زیادہ اہم بھی ہے اس قدر اہم کہ اس کے بغیر اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایمان باللہ کہنے میں تو صرف ایک بات ہے مگر اس پر سے ظاہر کا پردہ اٹھا دیجیے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھیے تو اس کی تہ میں حقائق و معانی کی پوری دنیا آباد نظر آئے گی جس کو اللہ کی ذات اور اس کی تمام صفات کی صحیح معرفت حاصل ہو گی۔ اس کو نہ پھر یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن آنے والا ہے، نہ وہ اس تذکیر کا محتاج ہے کہ اپنے رب اور حقیقی معبود کی یاد سانس کی طرح زندگی کا ایک لازمی وظیفہ ہے اور نہ وہ اس تلقین کا منتظر ہو گا کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے احکام کی اطاعت میں کسی مرعوبیت کا شکار نہ ہونا چاہیے بلکہ وہ ایمان باللہ کی روشنی میں یمین و یسار کی ساری صداقتیں پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت نے اُمت کو دعوت حق دینے کا آغاز اعبدوا اللّٰہ مالکم من الٰہ غیرہ سے کیا ہے۔ لہٰذا ہر اس شخص کے لیے جو قرآن و سنت کی بتائی اسلامی زندگی بسر کرنے کی سچی نیت رکھتا ہے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان باللہ کی رُوح بیدار کرے اور یہ معلوم کرے کہ ایمان باللہ کا مطلب اور تقاضا کیا ہے۔ قرآن سے رہنمائی حاصل کرے اور یہ ہرگز نہ بھولے کہ عقائد و کلام کی کتابوں میں جس ایمان سے بحث کی گئی ہے وہ صرف ایک اسلامی حکومت کے شہری کا سیاسی ایمان ہے یہ ہمیں اسلامی حکومت اور مسلم سوسائٹی سے اپنے سیاسی حقوق تو دلا سکتا ہے

مگر اللہ کی راہ میں حائل ہونے والے مصائب کے طوفان سے ہماری کشتی کو پار نہیں لگا سکتا۔ یہ توفیق تو اللہ نے اس ایمان کے لیے مخصوص رکھی ہے جو قرآن اور نبوت کی نگاہ میں ایمان ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ نے ایمان حقیقی اور ایمان سیاسی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے:

نبوت نے ایمان کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ ایمان جو احکام دنیوی کا مدار ہے اور دوسرے وہ ایمان جس پر آخرت کی نجات کا مدار ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ایمان کے لوازم اور تقاضے معلوم کریں اور اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیں اور اپنی سیرت و کردار کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ اور اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ اس روح کو اپنے اندر اتارنے کی فکر کریں اور اس کو از سر نو بیدار کرنے کی سعی میں ڈوب جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا اہتمام کریں۔ بصیرت۔ لوازم صفات کا علم، ذکر دائمی، محبت الٰہی، ایمانی زندگی کی حدود میں بصیرت اور یقین و معرفت کے حاصل کرنے کے بالعموم تین طریقے ہیں:

ایک طریقہ وہ ہے جو قرآن و سنت نے بتایا ہے
دوسرا وہ ہے جو ارباب تصوّر نے بتایا ہے
تیسرا وہ ہے جو فلسفہ و کلام نے ایجاد کیا ہے۔

تیسرے طریقے یعنی کلام اور متکلمین کی مساعی اور ان کے دعاوی کا جہاں تک تعلق ہے۔ عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ ناقابل پذیرائی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس فلسفہ یونان و عجم نے ایمان کے حصول میں نہ کبھی کوئی مدد کی ہے اور نہ آئندہ دے سکتا ہے۔ اس کی حیثیت ایمان کے لیے صرف دفاعی سرمایہ کی ہے۔ صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے جو یہ لکھا ہے کہ" امام ابوحنیفہ نے یہ علم حاصل کیا ہے اور اس کے ذریعے معتزلہ اور تمام اہل بدعت سے مناظرہ کیا ہے"، تو اس سے وہ اپنے مخاطبوں کو بھی سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس علم کی حیثیت اسلام کے دفاعی ذخیرے کی ہے۔ اور خود امام بزدوی ہی نے امام ابوحنیفہ کا بھی نظریہ نقل کیا ہے۔ علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں بھی امام صاحب کے اس موقف کی وضاحت کی ہے۔ جو بات روز اول امام اعظم نے علم الکلام کے بارے میں فرمائی تھی کہ اس کی حیثیت دفاعی سرمایہ کی ہے۔ یہی بات اس علم کے بڑے بڑے شہسواروں نے آخر میں کہی ہے۔ چنانچہ امام الحرمین ابو محمد جوینی نصیحۃ المسلمین میں فرماتے ہیں:

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے

کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں، کچھ کے لیے سودمند مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی بیانات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچن کے روغنی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ سے گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی جیسے کلامی محقق نے اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں اقرار کیا ہے۔

علم کلام کا مقصد صرف بدعتیوں سے اہل السنۃ کے عقائد کی نگرانی ہے [1]

دراصل یہ بھی ہماری دینی تاریخ کا ایک بڑا ہی المناک باب ہے کہ ایمان باللہ کے لیے قرآن کو چھوڑ کر دلائل مہیا کرنے کے لیے یونانی فلسفہ کے اس بیابان کی جادہ پیمائی شروع کر دی جہاں شک وریب اور تذبذب اور وساوس کے سوا کچھ نہ تھا۔

دوسرا طریقہ یعنی اربابِ تصور کی راہ تو اس کی خامی یہ ہے کہ اس میں معرفت اور تعلق باللہ کے مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی روش غلط اختیار کی ہے۔ ابتدائی زینوں کو تقریباً یوں ہی چھوڑ کر آخری زینے پر قدم رکھ دیا جاتا ہے یعنی سارا زور جذبات کی انگیخت اور کیفیات باطن کی تحصیل پر صرف کر دیا جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے ضرورت اس امر کی بھی ہوتی ہے کہ عقل کو تسلیم اور یقین کو استحکام سے بہرہ ور کیا جاتے۔ پھر قوانین شرع سیکھے جائیں اور اپنی عملی ذمہ داریوں کو سمجھا جاتے۔ بعد ازاں ان قوانین میں کام کرنے والی حکمتوں سے شناسائی بھی حاصل کی جاتے۔ اس غلطی کا سرچشمہ ان بزرگوں کا یہ غلط تصور ہے خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کہ مذہب کا تعلق صرف دل سے ہے نہ کہ عقل و دماغ سے۔ حالانکہ باطنی طور پر دین و مذہب کے باب میں دل و دماغ کی یہ تفریق ایسی ہی غلط اور غیر قرآنی ہے جیسی کہ عالم ظاہر میں دین و سیاست کی تفریق۔

دراصل اسلام نے دین کا جو وسیع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے۔ اس کا دماغوں میں ٹھیک ٹھیک بیٹھنا اور مرتسم رہنا عملاً کچھ آسان نہیں۔ اگرچہ بالاجمال اس کا اقرار کرنے اور اس کی مدح و ثنا کرتے رہنے کی حد تک تو کسی کی زبان سست نہیں پڑتی۔ اور ہر شخص خواہ وہ صوفی ہو یا عالم یا سیاست داں، زبانی تعریف و توصیف میں سب پیش پیش ہیں لیکن عملی زندگی میں کہیں دین سیاست سے جدا

---

[1] المنقذ من الضلال

ہے اور کہیں عقل و دماغ کا رشتہ دین سے کاٹ دیا جاتا ہے اور قلب و روح ہی میں ساری وسعتِ دین سمیٹ لی جاتی ہے۔ فکر و عمل کا یہ انتشار اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے۔

دین کے اس تصور کی بنیاد عشقِ الٰہی پر رکھی گئی ہے۔ عشق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں۔

عشق سے مراد وہ بے قراری اور شوریدگی ہے جو اپنا مطلوب اور مقصود حاصل نہ ہونے کے باعث انسان کے اندر پیدا ہو جایا کرتی ہے اور پیدا ہو کر تمام باطنی قوتوں میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ مقصود تک رسائی ہو جائے اور محبوب کا وصال ہو جائے اوّل اوّل تو اس کا مقام انسان کا قلب ہوتا ہے جو تمام کیفیاتِ نفسانیہ کا مرکز ہے۔ پھر وہ وہاں سے پھیل کر تمام باطنی قوتوں پر چھا جاتا ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ انسان اپنے محبوب کی یافت میں از خود رفتہ اور بے خبر ہو جائے۔

مولانا اسماعیل کے اس بیان سے عشق اور اس کے مزاج کی یہ خصوصیات متعین ہوتی ہیں۔ اوّلاً عشق کی بارگاہ میں عقل و دانش کی کسی طرح رسائی نہیں ہو سکتی کیونکہ شورش و اضطراب اور تعقل میں کھلا ہوا تضاد ہے۔

ثانیاً یہ کہ عشق انسان کو اجتماعیت سے دُور بھاگنے والا اور سخت قسم کا انفرادیت پسند بنا دیتا ہے اور پھر انفرادیت سے بھی پاک کر کے تصورِ حبیب میں گم کر دیتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ عشق کے تسلط کے بعد انسان میں توازن اور اعتدال پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یہ اس لیے کہ عشق کا معمول ایک زبردست انجذابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

رابعاً یہ کہ عشق میں مبتلا انسان آداب و رسوم اور قوانین و ضوابط کا پابند نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے دل و دماغ پر محبوب کا دلآویز تصور چھایا رہتا ہے۔

اس تصور کے لازماً تقاضے یہ ہوں گے، اوّلاً یہ کہ بندہ کا مقصود بندگی از اوّل تا آخر اللہ تعالیٰ کا دیدار و وصل قرار پائے۔ عشق کی فطرت اور تصورِ عشق رکھنے والے مذاہب دونوں اس پر متفق ہیں۔ یہاں بھی مولانا شہیدؒ نے تاریکی میں روشنی کا مینار پیش کیا۔ صراطِ مستقیم میں لکھتے ہیں،

اس حبِ عشقی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بشریت کا حجاب چاک ہو جائے یا دیدار روح الٰہی اپنی اصل سے جا ملے اور بس۔ وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتی کہ انسان صاحب جلال خدا کے جمال کے مشاہدے میں فنا ہوا ہے۔

غرض جس دین کا تصور عشق الٰہی ہو اس کے نزدیک وصال الٰہی کا مقصود ہونا ایک بدیہی بات ہو گی۔ چنانچہ وہ مذاہب جو نہ کسی رنگ میں یہ تصور رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک انسان کی غایت مقصود یہی بتاتا نظر آتا ہے اور بعض مذاہب تو اس معاملہ میں بالکل انتہا پسند ہو گئے ہیں یعنی وہ بندے کی غایت مقصود اللہ تعالیٰ کے وصل و دیدار کو نہیں بلکہ اس کی ہستی میں جا کر ضم ہو جانے کو ٹھہراتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب میں مکتی (نجات) کا تصور بھی قرآنی تصور نجات سے مختلف ہے۔ قرآن کا تصور نجات تو یہ ہے کہ انسان عذاب جہنم سے بچے جب ان مذاہب میں نجات کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جسم کی قید سے چھٹکارا پا جائے اور چھٹکارا پاکر اس کی روح کا قطرہ روح خداوندی کے سمندر میں جا ملے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی دراصل اسی تصور کی پیداوار ہے کیونکہ عشق کی فطرت ہی یہ ہے کہ انسان محبوب کے وجود کے سوا ہر وجود حتیٰ کہ اپنے وجود سے بھی بیگانہ اور بے خبر ہو جائے۔

ثانیاً اس تصور کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اس دنیا کو مال کا جال سمجھ کر اس سے دور بھاگے۔ اجتماعیت کا تصور تک اس پر بار ہو۔ زندگی کے مسائل پر ایک غلط نگاہ ڈالنا بھی اس کے لیے گوارا نہ ہو۔ فلاطینوس صاف لفظوں میں کہتا ہے۔

جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کو ترک کر دیتی ہے [1]

اور یہ کہ

حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل کی جا سکتی ہے ان میں تبدیلی سے نہیں۔ آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔

غرض عشق کا یہ فطری تقاضا ایک مانی ہوئی حقیقت ہے اور جس طرح وہ کل ایک حقیقت تھا آج بھی ایک حقیقت رہی ہے حضرت مولانا اسماعیل شہید عشق الٰہی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

اس کے آثار اور تقاضوں میں سے ایک تفرد ہے یعنی یہ کہ انسان محبوب کے

[1] تاریخ تصوف قبل الاسلام

سوا باقی سارے علائق منقطع کر دیتا ہے۔ زندگی کے رنگارنگ مشاغل اور بے شمار تعلقات کا سامنا کرتے ہوئے اس کا دل بڑی تنگی محسوس کرتا ہے اور طرح طرح کے معاملات کے نظم و انصرام سے مثلاً خانگی مسائل کے انتظام، معاشرتی اور اجتماعی امور کی انجام دہی جماعت کی امامت، عیدین اور جمعہ کی اقامت، حقدار اعزہ کے حقوق کی بجا آوری وغیرہ امور سے اسے سخت انقباض ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نکاح سے جو تمام علائق کی بنیاد ہے اسے حد درجہ نفرت ہوتی ہے [1]

ثالثاً اس تصور کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان وحی و نبوت کی ضرورت سے بالکل بے گانہ ہو جاتا ہے یا کم از کم اس کی صحیح قدر و قیمت اور اصل حیثیت کو فراموش کر دیتا ہے اور اس کا وہ لحاظ نہیں کرتا جو کرنا چاہیے۔ مولانا اسماعیل شہید حبِ عشقی کے آثار بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اس کا بالذات تقاضا نہ تو یہ ہے کہ کسی قانون سے ہم آہنگی ملحوظ رکھی جائے، خواہ قانون شرح ہو خواہ قانون ادب، نہ یہ ہے کہ کسی کی رضا جوئی کی جائے چاہے اپنے محبوب کی رضا کا سوال ہو یا کسی اور کی اور نہ یہ ہے کہ کسی کی پیروی کا لازمی اہتمام کیا جائے خواہ اپنے محبوب کی پیروی ہو یا کسی دوسرے کی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فطری طور پر ان امور کی مقتضی نہیں، اس کا فطری تقاضا تو یہ ہے کہ انسان خدائے ذوالجلال کے جمال کے مشاہدے میں غرق رہے، چاہے جس طرح بھی یہ بات حاصل ہو اس کے لیے کسی خاص طریقے کی پابندی اس کا فطری تقاضا بالکل نہیں ہے۔ مثلاً اگر صاحب عشق کا خیال ہو کہ مزامیر کے ذریعے یا شغل برزخ اختیار کر کے یا اپنے اوقات کو اذکار و طاعات سے خالی رکھ کر یا اسی طرح کے کسی دوسرے ممنوع شرعی کے ارتکاب سے اس کی مقصد براری ہو سکتی ہے تو یقیناً اس کے دل کی گہرائیوں میں اس کام کی طرف ایک زبردست کشش پیدا ہو جائے گی۔ (صراط مستقیم)

مزید فرماتے ہیں:

اس کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان ظاہری علوم اور طاعات سے بے نیاز ہو رہے۔ (صراط مستقیم)

---

[1] صراط مستقیم

تیسرا طریقہ وہ ہے جو حصولِ مقصد کا تنہا اور فطری طریقہ ہے۔ یہ وہ ہے جو قرآن حکیم اور اسوہ رسول نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ قرآن نے جب بھی امورِ غیب لوگوں کے سامنے رکھے، اللہ کی ذات و صفات پر ایمان کی دعوت دی۔ قیامت اور محاسبہ اعمال پر یقین رکھنے کا مطالبہ کیا، اس پر فطرت کے واضح حقائق سے استدلال کیا۔ انسان کی اپنی ذات میں چھپی ہوئی حقیقتوں سے شہادت دلوائی۔ اس پورے کارخانہ عالم کے نظام سے اس کی توثیق کرائی۔ پھر ان سے کہا کہ آنکھیں کھول کر دیکھو، یہ سارے انفسی آفاقی حقائق کیا کہہ رہے ہیں۔ کانوں کی گرانیاں دور کر کے سنو یمین و یسار تم سے کیا کہہ رہے ہیں اور جب بہتوں نے پھر بھی ایمان لانے سے انکار کیا تو اس نے یہ کہہ کر ان پر اظہارِ غضب کیا لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم آذان لا یسمعون بھا صرف اس لیے کہ وہ اپنی عقل اور فکری قوتوں سے کام نہیں لیتے ان کے بالمقابل قرآن نے ان لوگوں کو جن کا طرزِ عمل ان سے مختلف تھا یہ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

والذین اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا

غرض جہاں تک ایمان باللہ کے ایقانی پہلو کا تعلق ہے اسے حاصل کرنے یا بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قرآن کے اس حصے پر جس میں توحید اور دوسری صفات پر دلائل پیش کیے گئے ہیں خصوصیت سے نگاہ ڈالی جائے اس کے طرزِ استشہاد پر دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ غور کیا جائے اور پیہم و لگاتار کیا جائے۔ قرآن، ہمیں اطمینان دلاتا ہے کہ اس غور و فکر کے نتیجہ میں ذہن کے اندر وہ روشنی پیدا ہو کر رہے گی۔ اور برابر بڑھتی جائے گی۔ یہی فطری ترتیب ہے اور یہی صحیح تدبیر۔

قرآن جسے ایمان کہتا ہے وہ جب تک تصدیق قلبی کے ساتھ التزام طاعت اور انقیاد قلبی نہ ہو حاصل نہیں ہوتا، ہرقل اور اس جیسے اہلِ کتاب نے تصدیق ضرور کی اور اقرار بھی کیا مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دینِ محمدی میں قدم رکھا۔

انقیاد باطن، التزام طاعت عہد و فاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتی ہے ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسا صفت نفس بن جائے کہ پھر قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے، اسی کا نام عملِ قلب ہے۔

منشا یہ ہے کہ ایمان نہ تو اربابِ کلام کی صرف تصدیق ہے اور نہ اربابِ تصوف کا صرف تصور ہے بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا جزء ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد و فاداری

نہیں لہٰذا وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے آمادہ تو ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں ہے تو وہ بھی مومن نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور قانون الٰہی پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لیے امانت اور اعتماد کے معنے اس میں ہمیشہ ملحوظ رہنے چاہئیں۔ متکلمین کے نزدیک لفظ تصدیق کا چونکہ یہ خصوصیت نہیں ہے اس لیے ہر خبر میں خواہ وہاں مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو تصدیق کا لفظ یکساں استعمال ہوتا ہے ایمان کے معنے بھی اگرچہ تصدیق کے ہیں لیکن اس کا استعمال صرف ان خبروں تک محدود ہے جو چشم دید نہ ہوں کیونکہ یہاں تصدیق صرف مخبر کی امانت و دیانت اس کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا تعلق مغیبات سے ہے۔ مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایمان بالغیب ہی ہدایت حاصل کرنے کی بنیادی شرط ہے۔ نبوت کا مطالبہ ایمان بالغیب ہی کی حدود میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ کی بلند و برتر صفات اس کی لامحدود قدرت اور اس کے محیر العقول افعال کی دل سے تصدیق کریں اور رسولوں کی لائی ہوئی تمام باتوں کو دل کی سچائی سے مانیں اور ان خبروں پر جن کا نہ کبھی انسان نے تجربہ کیا نہ حواس ظاہرہ نے ان کی تصدیق کی نہ عقل نے ان کو قبول کیا یقین کریں اور صرف رسولوں کی خبروں اور ان کی بیان کی ہوئی باتوں پر ان کی سچائی کے اعتماد پر اور اس اعتماد پر کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے وہ بہت بڑا خالق ہے بے مثل اشیا کا بنانے والا اور اپنے ارادوں میں آزاد و خود مختار ہے۔ مولانا ابوالحسن نے صحیح فرمایا ہے کہ

افسوس کہ ہمارے اسلامی ادب اور ہماری مذہبی تعلیم اور دعوت دین کے انداز نے یقین اور جوش کے ساتھ ایمان بالغیب کی طرف دعوت دینے میں بہت بڑی کوتاہی کی ہے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ادبی اور فکری غذا مہیا کرنے میں تساہل سے کام لیا ہے اور بعض ہمارے معاصر انشاپرداز دین کو جدید عقلی انداز میں ڈھالنے کی طرف متوجہ ہیں۔ اور دین کی ایسی تشریح کر رہے ہیں جو جدید علم اور جدید عقل سے میل کھاتی ہو لیکن اس نے ایک حد تک غیر ارادی طور پر ایمان بالغیب کی روح کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان اسی کے عادی ہوتے جا رہے ہیں وہ ان ہی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں جو مانوس ہوں، مقررہ اصولوں کے مطابق ہوں اور

طبیعیاتی زندگی میں بار بار سامنے آرہی ہوں، لیکن جو واقعات ان اصولوں سے الگ یا ان کے خلاف واقع ہوں اور جن کی تصدیق میں گہرے یقین وایمان کی اور مخبر کی سچائی پر اعتماد کی ضرورت ہو ان کو بہت تذبذب کے بعد اور بڑی مشکل سے قبول کرتے ہیں، نہ ان کی طرف لپکتے ہیں اور نہ ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک عقلی اور علمی ضابطہ حیات ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ معقول اور منقول میں کوئی تضاد نہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ عقل انسانی کا درجہ اور معیار ایک ہے بلاشبہ انسانی عقل کے درجات میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ ہمارے زمانے کے بڑے شہروں اور حکومتوں کے مراکز میں پائی جانے والی مصنوعات اور تمدن کی سہولتیں ایک دیہاتی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں، اسی طرح ایک عام انسان کی عقل عصر حاضر میں انسانوں کی ایجادات و اختراعات مثلاً ایٹمی طاقت کی تسخیر اور مصنوعی چاند وغیرہ کو نہیں قبول کر سکتی پھر جتنی بھی بلند پرواز اور عقل رسا کا تصور کیا جاتے بہر حال اس کے بھی حدود ہوں گے اور اس کا دائرہ انہی حدود تک محدود رہے گا اور اسی کے مطابق اس کی ذمہ داریاں بھی ہوں گی اور وہ انہی ذمہ داریوں کا مکلف ہو گا۔ اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے اس پابزنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدے سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کی رضا کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے یہ نہ ہو تو ہمارے کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے۔

پارہ ہفتم ایک نظر میں

شرک

توحید

صفات

رسالت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

دعوت و تذکیر

قرآن

صحابہ کرام کا چہرہ

دستوری قواعد

حیات بعد الموت

اخلاقی قوانین

اجتماعی قوانین

قوانینِ عدلیہ

سیاسی قوانین

معاشرتی قوانین

شعائر

اصطلاحات قرآنیہ

اعتداء :- یہ لفظ عدو سے بنا ہے۔ اس کے معنے حد سے گزر جانے کے ہیں۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو لانگ جانا اعتداء کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص حدود الٰہیہ سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہیہ میں مداخلت کرتا ہے۔ اس میں حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھہرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔ حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کی حدود میں داخل ہونا بھی اعتداء ہے۔

ازلام :- زلم کی جمع ہے۔ عرب کے مال و دولت کا تمام سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لیے جوا بھی ان ہی کے ذریعے کھیلا جاتا تھا۔ جوئے کی خاطر اونٹوں کو ذبح کرتے۔ ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کرتے۔ ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے۔ ان کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر تھے۔ ان میں ہر تیر کے مختلف حصے مقرر تھے اور جب جوا کھیلتے تو ان تیروں کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے۔ وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا جن کے نام پر وہ تیر نکل آتے جن جن کے حصے مقرر ہوتے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکام ہوتی تھی۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہوتے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کرتے۔ چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی امر اتفاقی پر رکھا جائے مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص

کا نام نکل آیا ہے لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیبوں سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمہ کے بہت سے حل صحیح ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول وجہ کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحب معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

الٰہ:۔ اس سورت میں خاص طور پر توحید فی الالوہیت کا اثبات اور شرک فی الالوہیت کی تردید ہے اس لیے الٰہ کے معنے خاص طور پر قرآنی اصطلاح میں سمجھ لینے چاہئیں۔ یہ لفظ عربی زبان میں فعال کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے جیسے اَمَّ سے امام بنا ہے وہ شخص جس کی اقتدار کی جائے ایسے ہی اَلَہٗ سے الٰہ بنا ہے۔ الٰہ عربی میں ایک سے زیادہ معانی میں بولا جاتا ہے مثلاً حیران اور سرگشتہ ہونے کے معنے میں اَلِہَ بولا جاتا ہے۔ کسی سے تعلق پیدا کرکے یا کسی کی پناہ میں جاکر سکون حاصل ہونے پر الھت الی فلان بولتے ہیں۔ آدمی کسی مصیبت سے خوفزدہ ہو اور کوئی اسے پناہ دے اس وقت بولتے ہیں آلہ الرجل آدمی کسی کی طرف شدت شوق سے متوجہ ہو تو اسے بولتے ہیں الہ الرجل الی فلان اونٹنی کا بچہ جب اس سے بچھڑ جانے کے بعد ماں سے ملے اور ماں سے چمٹ جائے تو بولتے ہیں الہ الفصیل۔ ان سب استعمالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہ وہ ذات ہے جو انسانوں کی حاجتیں پوری کرسکتی ہو، بیقراریوں کو سکون بخش سکتی ہو۔ اسی بنا پر الٰہ کا ترجمہ معبود اور حاکم کیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند کے تراجم میں اس کی موقعہ کے لحاظ سے رعایت کی گئی ہے۔ مثلاً شاہ صاحب سورۂ انعام کی آیت قل انما ھو الٰہ واحد کا ترجمہ فرماتے ہیں تو کہہ وہی ہے معبود ایک، اور سورہ نمل میں متعدد بار آتے ہوئے فقرے ءالٰہ مع اللہ کا ترجمہ فرماتے ہیں کیا کوئی ہے حاکم اللہ کے ساتھ اور کبھی حاکمیت کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ بندگی اختیار کرتے ہیں اللہ لا الٰہ الا ھو کا ترجمہ فرماتے ہیں اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور معبودیت کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی پوجنا بولتے ہیں لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کرتے ہیں، کسی کو پوجنا نہیں ہے اس کے سوا بڑا مہربان رحم والا۔ اللہ کی شان معبودیت اور شان حاکمیت کے لیے موقعہ اور محل کے اعتبار سے ترجمہ میں شاہ صاحب نے لطیف فرق پیدا کیا ہے نہ تو ان لوگوں کی طرح جن کے ذہنوں میں توحید کا مکمل نہ تصور بسا ہوا ہے الٰہ کا ترجمہ خدا کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی طرح جن کے

ذہنوں میں صرف خدا کی محبوبیت ہے ہر جگہ معبود ترجمہ کرتے ہیں اور ان لوگوں کی طرح جو حکومت کے شوق میں مغلوب ہیں ہر جگہ حاکم کا ترجمہ کرتے ہیں۔ باتیں ساری اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن کسی ایک کا اس طرح ہو جانا کہ دوسرا رُخ مغلوب ہو جائے یہ شان رسوخ فی العلم کے خلاف ہے۔ اللہ کی ذات معبود بھی ہے حاکم بھی ہے۔ معبود ہونے کی حیثیت میں اس کو یاد کیا جاتا ہے اس سے محبت کی جاتی ہے اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اس کی طاعت کی جاتی ہے اس کے دربار میں دست بستہ حاضری دی جاتی ہے۔ اللہ کی الٰہیت کی ایسی تفہیم جس سے اس کی وسعتیں سمٹ جائیں کوئی تحقیق نہیں ہے۔

اَنصاب:۔ نصب، تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں اور جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحوں کو بھی حرام قرار دے دیا۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت مجرد بارادہ تقرب وخوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس سے بحث نہیں کہ ان پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا۔ اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان میں حرمت ہوتی تو سورہ مائدہ میں ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی حکم میں وہ قربانیاں اور نذریں بھی داخل ہیں جو مزاروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار کی خوشنودی مدنظر ہوتی ہے ذبح کے وقت خواہ اللہ کا نام لیا جائے۔

بصائر:۔ یہ بصیرۃ کی جمع ہے۔ کھلی دلیلیں، ظاہر نصیحتیں۔ واضح رہے کہ بصیرۃ صرف دل کی بینائی کے لیے ہوتا ہے۔ آنکھ سے دیکھنے اور نظر کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ بصیرۃ کے مختلف معانی آتے ہیں۔ عقل، سمجھ، عبرت، دلیل اور حجت۔ قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنے میں بھی استعمال ہوا ہے اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنے میں بھی یہاں اس سے مراد قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن جس راہ کی طرف بلاتا ہے وہ علم و یقین کی اور دلیل و حجت کی راہ ہے۔ اتباع علم و یقین کا کرنا چاہیے۔

بحیرہ: ۔ اس اونٹنی کو کہتے تھے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ ایسی اونٹنی کے کان چیر کر اس کو آزاد چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کا دودھ پیتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ یہ کفر کی رسمیں تھیں کہ مواشی میں کوئی بچہ

نیاز رکھتے بت کی تو اس کا کان پھاڑ دیتے نشان کو، اور اس کو بحیرہ کہتے، چونکہ بحر کے مادے میں وسعت اور کثرت کے معنے ہیں اس لیے اونٹ کے اچھی طرح کان پھاڑنے کے لیے عرب والے بولتے تھے بحرن البعیر، اس اعتبار سے یہاں فعیلہ بمعنے مفعول ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ بحیرہ کا دودھ بتوں کے نام پر محفوظ کر دیا جاتا تھا اس لیے کوئی شخص اس کے تھن نہیں دوہ سکتا تھا۔ مصنف عبدالرزاق میں قتادہ سے روایت ہے کہ بحیرہ اونٹنی ہوتی تھی۔ جب ناقہ پانچویں مرتبہ بچہ دیتی۔ اگر بچہ نر ہوتا تو صرف مرد ہی کھاتے عورتیں نہ کھاتیں اور اگر مادہ ہوتا تو اس کے کان پھاڑ کر چھوڑ دیتے پھر نہ اس کی اون کاٹتے نہ دودھ دوہتے نہ اس پر سوار ہوتے اور جو بچہ مردہ پیدا ہوتا تو پھر مرد اور عورتیں سب مل کر کھاتے۔ بحیرہ کی تعیین میں اہلِ لغت کے اس سے زیادہ خیالات ہیں۔

تائید:۔ حضرت مسیح کے ذکر میں قرآن نے بار بار ایدناہ بروح القدس کا جملہ بولا ہے۔ دراصل یہ فقرہ یہود کے رد میں آیا ہے۔ یہود حضرت مسیح کے کھلے کھلے معجزات کو معاذ اللہ شیطانی تصرف کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ قرآن نے یہود کے اسی الزام کی تردید کے لیے حضرت عیسٰی کے بارے میں بار بار فرمایا ہے کہ ایدناہ بروح القدس یعنی حضرت عیسٰی سے جو معجزے ظاہر ہو رہے ہیں یہ روح القدس کی تائید کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی شیطانی تصرف کا جیسا کہ یہود کا خیال ہے، ورنہ جہاں تک روح القدس کی تائید کا تعلق ہے وہ ہر پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے۔ حضرت عیسٰی کے باب میں اس کا خاص طور پر اعلان اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہود ان پر الزام لگاتے تھے۔

روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے اور اس سے مراد حضرت جبریل ہیں۔ ابن ابی حاتم نے باسنادِ ثقات حضرت عبداللہ بن مسعود سے اور طبری نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ روح القدس جبریل ہیں۔ ابوعبیدہ اور بہت سے علماء کا اس پر یقین ہے۔ امام بخاری نے بھی سورہ نحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

حُرُم:۔ حرام کی جمع ہے۔ احرام باندھنے والے۔ چونکہ حالتِ احرام میں انسان کو بہت سی باتوں سے رکنا پڑتا ہے اس لیے اس کو حرام کہتے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں جس چیز سے منع کر دیا جائے وہ حرام ہے خواہ بہ تسخیر الٰہی ممنوع ہو یا بہ منع قہری یا عقل کی رو سے یا شرع کی طرف

سے یا اس شخص کی وجہ سے جس کا حکم مانا جاتا ہے۔ تسخیر الٰہی کے سبب سے حرام ہونے کی مثال وحرمنا علیہ المراضع اور ہم نے دائیوں کا دودھ اس پر حرام کر دیا ہے کہ اللہ نے اپنی تسخیر سے دائیوں کا دودھ پینے سے روک دیا اور منع قہری سے حرمت کی مثال ان اللہ حرمھما علی الکافرین، یعنی بزور قوت کافروں کو اس سے محروم کر دیا۔ باقی وجوہ حرمت کی مثالیں ظاہر ہیں۔ حرمت کے مہینوں کو اشھر الحرم کہتے ہیں کیونکہ ان وقتوں میں اللہ تعالیٰ نے بعض ان چیزوں کو حرام کر دیا ہے جو دوسرے اوقات میں حلال تھیں۔ اسی طرح بیت الحرام اور مشعر حرام ہے۔

حام:- اس سانڈ یا اونٹ کو کہتے ہیں جس کی پشت سے کئی پشتیں پیدا ہو گئیں۔ ایسے سانڈ کو بھی آزاد چھوڑ دیتے۔ حامی جنوانے والا اونٹ، شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں کہ جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پورے پیدا ہوتے لائق سواری کے اور بوجھ کے اس باپ کو لادنا موقوف کر دیتے اور چارے پانی پر سے نہ ہانکتے۔

رب:- عربی، عبرانی، سریانی تینوں زبانوں میں اس کے معنے پالنے کے ہیں۔ لیکن عربی میں پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیے۔ امام راغب نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے ھو انشاء الشیئ حالا فحالا الی حد التمام یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دینا کہ اپنے حد کمال کو پہنچ جائے۔ اس معنے کے اعتبار سے امام حلیمی نے جو رب کی تعریف کی ہے وہ ان کے ہی الفاظ میں پڑھنے کے لائق ہے۔ امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں ان سے ناقل ہیں رب وہ ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے ایجاد کیا ہے کمال کی اس حد تک پہنچائے کہ جو حد اس نے اس چیز کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ انسان کو دیکھئے وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا ہے پھر اس کو بستہ خون بناتا ہے پھر بستہ خون کو بوٹی، پھر بوٹی سے ہڈیاں بناتا ہے۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا ہے۔ پھر بدن میں جان ڈالتا ہے اور اس کو ایک نئی صورت میں جب کہ وہ ناتواں بچہ ہوتا ہے بنا دیتا ہے اور لگاتار اس کی نشوونما کرتا رہتا ہے تاآنکہ اسے پورا کر دیتا ہے۔ وہ جوان ہوتا ہے۔ پھر اس پر کہولت آتی ہے بعد ازیں وہ بوڑھا ہوتا ہے۔ اور ہر مخلوق کے لیے اس کا انداز ربوبیت بھی ہے لہٰذا رب وہ ہے جو اس کا نگران ہو اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا ہو جو حد اس نے اس کے لیے

مقرر کی ہے۔ ابن خالویہ نے تصریح کی ہے کہ رب کے معنے آقا اور مالک کے ہیں۔ امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں امام خطابی سے ناقل ہیں کہ بہت سے مفسرین سے الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر میں مروی ہے کہ رب کے معنے آقا اور سردار کے ہیں۔ اور کچھ کی رائے میں رب بمعنے مالک ہے۔ امام راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ رب مطلقاً اور بلا قید سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لیے نہیں بولا جاتا اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

الساعۃ :- قرآن عزیز میں الساعۃ کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس سے قیامت مراد ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا بھی حصہ ہو ساعت ہے اور قیامت بھی اس سے مراد لی جاتی ہے ارشاد ہے اقتربت الساعۃ اور یسئلونك عن الساعۃ اور عندہ علم الساعۃ یا تو حق تعالیٰ کے جلد حساب لینے کی وجہ سے اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی ہے اور یا اس وجہ سے کہ جس پر یہ کہہ کر متنبہ فرمایا ہے کان لم یلبثوا الا ساعۃ من النہار، اور بعض کا خیال یہ ہے کہ وہ ساعات جو قیامت کے معنے دیتی ہیں تین ہیں۔ ایک الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لیے اٹھنا اسی کی طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے لا تقوم الساعۃ حتیٰ یظہر الفحش والتفحش وحتی یعبد الدرہم والدینار قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپیہ اور اشرفی کی پوجا ہونے لگے۔ دوسری الساعۃ الوسطیٰ، یہ ایک قرن کے لوگوں کا مر جانا ہے چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن انیس کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ہذا الغلام لم یمت حتیٰ تقوم الساعۃ، اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ اس وقت تک نہ مرے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو، بیان کیا جاتا ہے کہ یہ صحابہ میں سب سے آخر میں ہونے والے صحابی ہیں، تیسرے الساعۃ الصغریٰ یہ انسان کی موت ہے، لہٰذا ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے۔

شہادۃ :- گواہی قطعی خبر، ظاہر کھلا، اصل میں یہ شہد یشہد کا مصدر ہے لیکن اسم ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے، شہادات جمع ہے، امام راغب فرماتے ہیں، شہود اور شہادت کے معنے اس حضور کے ہیں جو مشاہدے کے ساتھ ہو خواہ مشاہدہ بصر سے ہو یا بصیرت کے ذریعے اور کبھی صرف حضور کو بھی کہتے ہیں جیسے عالم الغیب والشہادۃ، لیکن شہود

کا استعمال حضور مجرد کے ساتھ اولیٰ ہے اور شہادت کا اس حضور کے لیے جو مشاہدے کے ساتھ ہو نیز شہادت وہ بیان ہے جو اس علم کی بنا پر سرزد ہو جو مشاہدے، بصیرت یا مشاہدہ بصر کے ذریعے حاصل ہوا ہو۔

شہید:۔ گواہ، شاہد، نگہبان، احوال لکھنے والا، اقرار کرنے والا۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شہید شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی۔ علامہ ابو السعادات مبارک ابن الاثیر جزری النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں رقمطراز ہیں۔ حق تعالیٰ کے اسماء میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں فعیل فاعل کے معنے مبالغہ کے اوزان میں سے ہے۔ جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور امور باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور امور ظاہرہ کی طرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنے کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔

طیبات:۔ طیبہ کی جمع ہے، ستھری چیزیں، نفیس اشیاء، پاک چیزیں، پاکیزہ چیزیں، عمدہ چیزیں، طاب یطیب سے صفت مشبہ، امام راغب فرماتے ہیں اصل میں طیب وہ چیز ہے کہ جس سے حواس لذت اٹھائیں اور جی مزہ پائے۔ طعام طیب وہ کھانا ہے جو جائز طور پر جائز مقدار میں جائز مقام سے حاصل کیا گیا ہو، جو کھانا ایسا ہوگا وہ اب بھی اور آئندہ بھی طیب ہوگا۔ اسی معنے میں ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم کھاؤ صاف اور ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تم کو۔ اور لا تحرموا طیبات ما احل اللہ، ان صاف اور ستھری چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ نے حلال کی ہیں۔ اور انسانوں میں طیب وہ ہے جو جہالت، فسق اور بداعمالیوں کی نجاست سے پاک ہو اور علم و ایمان اور محاسن اعمال سے آراستہ ہو، الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین، سے یہی لوگ مراد ہیں۔

عبادۃ:۔ بندگی اور پرستش یہ عبد یعبد کا مصدر ہے جس کے معنے پوجنے اور بندگی کرنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ عبودیت اظہار فروتنی کا نام ہے اور عبادت اس سے بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں اور اس کا استحقاق بھی سوائے اس ذات عالی کے کہ جس کے افضال و انعام بے حد و نہایت ہیں اور کسی کو نہیں، اسی لیے ارشاد ہے ان لا تعبدوا الا ایاہ، اور عبادت کی دو قسمیں ہیں عبادت بالتسخیر اور عبادت بالاختیار جو ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے جس کا حکم اعبدوا ربکم میں دیا گیا ہے۔ اہل لغت اور

علمائے شریعت نے عبادت کے معنے اس طرح بیان کیے ہیں۔ لسان العرب میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ لغت میں عبادت کے معنے اس طاعت کے ہیں جس میں عاجزی اور فروتنی پائی جاتی ہو۔ مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس میں عبادت کے معنے طاعت کے بتائے ہیں لیکن ابن الاثیر نے نہایہ میں یہ اضافہ کیا ہے کہ لغت میں عبادت نام اس طاعت کا ہے جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن الاثیر کی یہ تعریف بہت جامع ہے۔ راغب اصفہانی اور فیروزآبادی نے اس کے صرف ایک جزء کو بیان کیا ہے۔ قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے عبادت کی شرعی تعریف ان لفظوں میں نقل کی ہے۔ شریعت میں عبادت وہ ہے جو انتہائی محبت فروتنی اور خوف پر مشتمل ہو۔ اور علامہ علاءالدین نے تفسیر لباب التاویل میں بعض علماء سے اس طرح نقل کیا ہے کہ عبادت اس فعل کا نام ہے جس کے ذریعہ تعظیم الٰہی کے لیے فرض کی ادائیگی عمل میں آتی ہے۔ اور مخدوم علی مہائمی اپنی مشہور تفسیر تبصیر الرحمان و تیسیر المنان بعض مایشیر الی اعجاز القرآن میں رقمطراز ہیں عبادت اپنے اختیار سے دوسرے کی انتہائی تعظیم کی غرض سے اس کے لیے فروتنی کا نام ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اپنے مشہور رسالہ العبودیہ میں لکھتے ہیں عبادت جس کا حکم دیا گیا ہے اس میں فروتنی اور محبت دونوں داخل ہیں۔ اس طرح اللہ کی عبادت مکمل عاجزی اور کمال محبت کا نام ہے۔ اور اس پر تفریع کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ بغض رکھتے ہوئے اس کا تابع رہتا ہے تو وہ اس کا عابد نہیں ہے ایسے ہی اگر کوئی کسی سے محبت کرتا ہے لیکن اس کی بڑائی تسلیم نہیں کرتا تو وہ بھی اس کا عابد نہیں ہے۔ الغرض عبادت نہ منفرد طاعت کا نام ہے اور نہ منفرد محبت کا بلکہ طاعت و محبت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اللہ سے بندوں کے تعلقات دوگونہ ہیں حاکم و محکوم کے اور محب و محبوب کے۔ حاکم ہونے کی حیثیت میں اللہ کے لیے خضوع و تذلل، طاعت اور انقیاد ہوتا ہے اور معبود ہونے کی حیثیت میں اس کا ذکر، انابت محبت اور اخلاص ہوتا ہے اللہ سبحانہٗ کے ان ہی دوگونہ تعلقات کو ظاہر کرنے کے لیے عبادت کے معنے پرستش اور بندگی کیے جاتے ہیں۔ پرستش ہوتی ہے معبود کی اور بندگی کی جاتی ہے حاکم کی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی میں ان دو کی عکاسی ہے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی تاج العروس میں لکھتے ہیں کہ بعض ائمہ اشتقاق کا بیان ہے کہ عبودیت کی اصل عاجزی اور فروتنی ہے اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ عبودیت کے معنے ہیں رب جو کرے اس پر راضی رہے

اور عبادت کے معنے ہیں وہ کام کرنا جس سے رب راضی ہے اور زیادہ محنت و مشقت کا کام ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ عبادت تو عالم آخرت میں ساقط ہو جائے گی مگر عبودیت بدستور باقی رہے گی کیونکہ عبودیت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جہان میں اللہ کے سوا کسی کو متصرف نہ سمجھے۔ اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد علامہ زبیدی لکھتے ہیں، ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ یہ صوفیانہ نقطہ نظر ہے۔ لفظ کی لغوی ساخت کو اس تشریح میں کچھ دخل نہیں ہے۔ امام محی السنہ معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عباس سے ناقل ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی عبادت کا ذکر ہے اس سے توحید عبادت مراد ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اس موقعہ پر بڑی اونچی بات فرما گئے ہیں جب ان سے پوچھا گیا کہ یا ایہا الناس اعبدوا۔ میں جس عبادت کا حکم دیا گیا ہے اس کا مدعا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ عبادت ایک جامع لفظ ہے۔ اس کے اندر وہ تمام باطنی اور ظاہری اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث ہیں مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، دیانت، اطاعت والدین، وفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، اور مملوکوں کے ساتھ اچھا سلوک، دعا ذکر الٰہی تلاوت قرآن، اور اسی قسم کے تمام اعمال صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں اسی اللہ اور اس کے رسول کی طاعت رحمت خداوندی کی امید اور عذاب الٰہی کا خوف خشیت، انابت، اخلاص، صبر و شکر، توکل تسلیم و رضا وغیرہ، ساری اچھی صفات عبادت کے اندر شامل ہیں (العبودیت ص ۲) آگے چل کر فرماتے ہیں۔ ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت کسی مخلوق کے شرف مجد اور اس کی سعادت کی معراج کمال ہے وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ عبادت میں داخل ہے۔ سارے انبیاء اللہ کا دین سکھاتے آئے ہیں اور ہر نبی نے اپنے مخاطبوں کو اعبدوا اللہ کی ہدایت کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دین اور عبادت ایک ہی مدعا کی دو تعبیریں ہیں۔

کفارہ:- کفر سے بنا ہے لغت میں کفر کے معنے ڈھانپ دینے کے ہیں۔ شریعت نے گناہ کی سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے جو بدلہ تجویز کر دیا ہے اس کو کفارہ گناہ کہا جاتا ہے جیسے اس بارے میں قسم کا کفارہ بیان ہوا ہے۔ اسلام میں عبادات اور جنایات میں کئی قسم کے کفارے ہیں،

مثلاً رمضان میں روزے کا کفارہ، یمین کا کفار، ظہار کا کفارہ، قتل خطأ کا کفارہ، -

مفاتح الغیب :- لفظ مفاتح جمع ہے، اس کے واحد دو ہو سکتے ہیں - ایک مَفتح میم کے زبر سے دوسرے مِفتح میم کے زیر سے - مفتح میم کے زبر کے معنے خزانہ کے اور زیر والے مفتح کے معنے چابی کے ہیں - آیت میں دونوں مراد ہو سکتے ہیں خزانے بھی اور چابیاں بھی - اگر چابیاں مراد ہوں تو مطلب یہ ہے تو یہ استعارہ ہے کیونکہ چابیوں کے ذریعے خزانوں تک رسائی ہوتی ہے جو ان چابیوں سے واقف ہو اور کھولنے کا طریق ان سے جانتا ہو وہ خزانوں تک پہنچ سکتا ہے - اللہ سبحانہ چونکہ ماکان و مایکون کی تمام معلومات کا عالم ہے اس لیے اس کے علمی احاطہ کے لیے یہ بلیغ استعارہ ہے اور اگر خزانے مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پاس غیب کے خزانے ہیں حکماء نے اس آیت کی تشریح میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ علت کا علم معلول کے علم کی علت ہوتا ہے مگر معلول کا علم علت کے علم کی علت نہیں ہوتا - اس بنیاد پر ان کا کہنا ہے کہ موجود دو قسم کا ہے ایک واجب بالذات دوسرے ممکن بالذات، واجب بالذات صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے اور اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ ممکن ہے اور ممکن کا وجود واجب کی تاثیر سے ہے لہٰذا اللہ کے سوا تمام موجودات اللہ کی تکوین سے موجود ہیں - یہ ایجاد بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہو اور واسطہ ایک ہو یا متعدد ہوں، اللہ کے علم ذاتی کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کا تعلق اثر اول سے ہو اور اثر اول کے علم کے لیے لازمی ہے کہ اس کا تعلق اثر ثانی سے ہو کیونکہ اثر اول اثر ثانی کی علت ہے اور ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ علت کے علم کے لیے معلول کا علم ضروری ہے - اس سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف علم خداوندی ہو سکتا ہے اور کسی ممکن کا علم علم غیب نہیں ہو سکتا چونکہ غیب کا علم صرف علم خداوندی ہے اس لیے یہ حصر بالکل واقعی ہے، عندہٗ مفاتح الغیب، صحیح بخاری میں اسی سورت کی تفسیر میں حضرت سالم بن عبداللہ نے اپنے والد محترم کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ مفاتح الغیب خمس، امام بخاری نے سورہ لقمان کی تفسیر میں بھی یہی الفاظ روایت کیے ہیں لیکن سورہ مائدہ اور رعد کی تفسیر میں مفاتیح کی جگہ مفاتح کی تعبیر آئی ہے -

دون اللّٰہ :- ورے سوائے غیر جو کسی چیز سے نیچے ہو دون کہلاتا ہے بعض کی رائے ہے کہ یہ دنو کا مقلوب ہے جس کے معنے نزدیک کے ہیں - السیوطی لکھتے ہیں کہ دون ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے غیر کے معنے میں بھی آتا ہے - زمخشری لکھتے ہیں کہ من دونہ

کے معنی کسی چیز کے ورے کے ہیں اور حالت کا فرق بتانے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے الغرض دون کے معنے ورے نیچے، سامنے اور علاوہ کے آتے ہیں۔ ورے کے معنے میں یہ لفظ قرآن میں، حدیث میں اور اشعار عرب میں آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بھاگ کر مدین پہنچے تو وہاں ایک کنویں پر تشریف لائے اور وہاں وجد من دونہم امراتین تذودان یہاں دون کے معنے غیر کے نہیں ورنہ معنے یہ ہوں گے کہ وہاں لوگ نہ تھے یہ دو بیبیاں ہی تھیں اور یہ مقصود الٰہی کے خلاف ہے بلکہ من دون کے معنے ورے کے ہیں۔ الزمخشری نے من دونہم کی تشریح فی مکان اسفل من مکانہم سے کی ہے یعنی دونوں عورتیں، مردوں کی نسبت نیچی جگہ پر تھیں۔ اسی طرح سورہ مریم میں ہے فاتخذت من دونہم حجابا، اس کے معنے یہی ہیں، پھر اس نے گھر والوں سے ورے پردہ بنایا۔ نیز سورہ کہف میں ذوالقرنین کے واقعہ میں ہے لم نجعل لہم من دونہا سترا ہم نے ان سے ورے کوئی آڑ نہیں رکھی تھی اور ایسے ہی ذوالقرنین کے ذکر میں ہے وجد من دونہما قوما اس نے دو پہاڑوں سے ورے ایک قوم پائی۔ ان تمام آیتوں میں لفظ من دون کے معنے ورے اور سامنے کے ہیں۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

عجبت لمسراها وانی تخلصت
الی وباب السجن دونی مغلق

مجھے حیرت ہوئی محبوب کے رات کو چلنے پر اور اس پر کہ اس کی مجھ تک رسائی کیونکر ہوئی حالانکہ میرے ورے یا آگے جیل کا پھاٹک بند تھا۔

ایک اور حماسی شاعر یہی کہتا ہے

ملکت بہا کفی فانہرت فتقها
یری قائم من دونہا ما وراءها

میں نے نیزہ مضبوط ہاتھ میں تھام کر اس کے زخم کو ایسا کشادہ کر دیا تھا کہ اس زخم سے ورے کھڑے ہونے والے کو پار کی چیزیں نظر آسکتی ہیں۔

مصر کی مجمع اللغۃ العربیہ نے لغت کی نئی کتاب شائع کی ہے اس کا نام المعجم الوسیط ہے اس میں دون کے معانی تفصیل سے بتائے ہیں لکھا ہے دون ظرف منصوب ہے یہ کبھی نیچے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے دون قدمک بساط، کبھی اوپر کے معنے میں ہوتا ہے جیسے السماء

دونک کبھی پیچھے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے جلس الوزیر دون الامیر اور کبھی آگے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے سار الہ امکہ دون الجماعۃ کبھی غیر کے معنے میں ہوتا ہے جیسے ویغفر مادون ذالک کبھی پہلے اور ورے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے دون قتل الاسد اھوال کبھی پکڑ لو کے معنے میں ہوتا ہے جیسے دون الکتاب اگر مشرکین عرب کی اس ذہنیت کو سامنے رکھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق، مالک، رازق، مدبر اور ہر چیز کا اختیار رکھنے والا مان کر پھر بزرگوں، نبیوں کی تصاویر کو یہ کہہ کر پوجتے ہیں کہ ھولاء شفعاءنا عند اللہ تو دون اللہ کے معنے نیچے ورے سامنے کے ہی بنتے ہیں۔ وہ اللہ سے ورے ان کو پکارتے تھے اور ان کے ناموں کی نذر ونیاز دیتے تھے تاکہ وہ راضی ہو کر خدا تعالیٰ سے ان کے کام کرا دیں اور یہی ان کا شرک تھا۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ
أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا
نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٨٢﴾
وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ
تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا
آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ
مَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصَّالِحِينَ ﴿٨٤﴾ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٥﴾
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٨٦﴾ ع ۹

---

[۱۶۹] تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ اور
اہل ایمان سے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے

کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب
ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے[۱۸۰]۔ اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو
رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کی معرفت کی
وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ
اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے تو ہمیں اس کی گواہی دینے
والوں میں لکھ[۱۸۱]۔ اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ایمان
کیوں نہ لائیں جبکہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکو کاروں
کے زمرے میں شامل کرے گا[۱۸۲] تو اللہ ان کے اس قول کے صلہ میں
ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے
نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے اور جنہوں نے
کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں[۱۸۳]۔

اسلام دشمنی میں یہود و مشرکین برابر ہیں

یہاں قرآن نے دورِ نبوت میں اسلام سے تعلق کی حد تک یہود، مشرکین اور عیسائیوں کا تقابلی

مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ اسلام کو اپنانے اور قبول کرنے کی حیثیت میں ہے یا اسلام کی مخالفت کرنے میں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ تقابل اسلام کو قبول کرنے کی حد میں ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام کے استقبال کرنے میں جس وسعت صدر کا عیسائیت نے مظاہرہ کیا ہے وہ نہ یہودیوں نے کیا اور نہ مشرکین مکہ نے۔ نبوت کی حد تک اگر مشرکین اور یہود کی جانب سے حضور کو ماننے کی سازشیں ہوتی ہیں تو عیسائیوں کی جانب سے سب سے پہلے حبشہ میں استقبال پایا گیا ہے حتیٰ کہ شارحین قرآن کی اکثریت نے اس آیت کے پس منظر میں واقعات ہی وہ تحریر کیے ہیں جن میں عیسائیوں کے استقبال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت اسلام کے لیے سربراہان ممالک کو خطوط روانہ کیے ہیں۔ ان میں جن سربراہوں کی جانب سے حوصلہ افزا جواب آئے وہ بیشتر عیسائی ہیں۔ اس پر عام شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ یہ آیات نجاشی اور اس کے روانہ کردہ وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن الفاظ میں عموم ہے اس لیے اس کا حکم ان تمام عیسائیوں کے لیے عام ہے جو اہل حبشہ کی طرح حق پرست اور انصاف پسند ہوں۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ یہ عام عیسائیوں کا نہیں بلکہ دور نبوت کے ان عیسائیوں کا خصوصیت سے ذکر ہو رہا ہے جن کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آغاز اسلام میں سابقہ پڑا لتجدن کا تکرار اور خطاب اس کا قرینہ ہے۔ عام اہل ایمان سے عیسائیوں کے رویہ کا یہاں ذکر نہیں ہے اور یہ قرآن کا بہت بڑا انصاف ہے کہ عیسائیوں میں جس دور میں اور جہاں بھی اچھی بات ظاہر ہوئی قرآن نے وسعت صدر کے ساتھ اس کا علی الاعلان اقرار کیا ہے۔ افسوس کہ بعد کو عیسائیوں کا یہ طرز عمل نہیں رہا ہے۔

۱۶۹۔ تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ یعنی اسلام سے عداوت اور دشمنی تو سب غیر مسلموں کو ہے لیکن اس عموم میں مرتبہ خصوص مشرکین و یہود کو حاصل ہے کہ وہ شدید ترین دشمن اسلام ہیں۔ اس فقرے میں مکہ کے جور وستم اور مدینہ میں یہودیوں کی مخالفانہ سازشوں کو ہم پلہ قرار دیا ہے۔ دعوت اسلام کے ساتھ ہی قریش کی آتش عداوت ایک دم بھڑک اٹھی اور ہر سمت جور وستم کا آغاز ہو گیا۔ حالانکہ اسلام کی دعوت میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس پر بگڑنا یا جوش میں آجانا کسی مدعی شرافت کے لیے کسی بھی اعتبار سے زیبا ہوتا مثلاً خدا ایک ہے وہی پوجا کے لائق ہے۔ سورج، چاند، ستارے، شجر، حجر، بت وغیرہ کسی کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ دین میں دیانت، وعدے کا ایفا، محتاجوں، مسافروں اور غریبوں کی خبر گیری، آپس میں مل جل کر رہنا، برائیوں سے بچنا، اچھائیوں کی پیروی کرنا ہی

خاص باتیں تھیں لیکن قریش اسے برداشت نہ کر سکے۔

مدینہ میں یہودیوں نے شرارتوں، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ قائم کر لیا تھا مثلاً

۱۔ اوس و خزرج میں تفرقہ ڈال کر خانہ جنگی کی وہی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جو چند سال پیشتر تک دونوں گروہوں کی بربادی کا باعث بن چکی تھی اور وہ یہودیوں کے دست نگر بن کر رہ گئے تھے۔

۲۔ اسلام کے خلاف عداوت سے جنون نے انہیں انتہائی پستی میں گرا دیا تھا یہاں تک کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود مشرکین کے مسلک کو پیروان اسلام کے طور طریقے سے بہتر اور قابل ترجیح بتاتے تھے۔ گویا ان کا تصور حق وصداقت ہی بدل گیا تھا اور اہل کتاب ہونے کا دعویٰ بھی برائے نام رہ گیا تھا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے خلاف منصوبہ بندیوں میں بھی انہیں کوئی تامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت گھر سے نکلتے تو مسلمانوں کو یہودیوں کے ہاتھوں آپ کی جان کا خطرہ رہتا۔

بہر حال نبوت کی ذات کی حد تک دونوں یعنی قریش اور یہود کی دشمنی میں ہم آہنگی تھی۔ شارحین قرآن نے دونوں کی عداوت کی اور پھر عداوت میں ہم آہنگی کی وجہ یہی بتائی ہے۔ مثلاً المہائمی رقمطراز ہیں کہ یہود کی عداوت اہل ایمان سے اس لیے تھی کہ مسلمان حضرت عیسیٰ اور حضور انور کی نبوت کو مانتے تھے اور مشرکین کو عداوت اس لیے تھی کہ مسلمان توحید و نبوت کو مانتے ہیں۔ علت دونوں میں الگ الگ تھی مگر عداوت میں برابری تھی۔ دوسرے شارحین کہتے ہیں کہ ان کی عداوت کی بنیادی وجہ ان کا انکار اور کفر میں حد سے زیادہ ہونا اور اپنے مفادات و خواہشات میں زیادہ دلچسپی، تحقیق سے دوری، تقلید پر جمود اور نبوت انبیاء کے خلاف باغیانہ میلانات تھے۔ ماضی میں وہ انبیاء کے قاتل رہے ہیں اور حال میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قتل کی سازشوں میں سرگرم تھے۔ حضور انور کو زہر دیا، آپ پر جادو کیا، مشرکین کو حملہ کی ترغیب دی۔ ارشاد میں مشرکین سے پہلے یہود کے ذکر کرنے میں کہ یہود اپنی عداوت میں مشرکین سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ اس میں قرآن نے ان پر طنز کی ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انہیں تو فطرۃً مشرکین کے مقابلہ میں ان لوگوں سے زیادہ ہمدردی ہونی چاہیے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف رکھتے ہیں مگر بہر حال انہی کی طرح خدا اور سلسلہ نبوت کو مانتے ہیں لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہل کتاب ہیں کہ توحید کے مقابلے میں مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں بلکہ اسلام کی عداوت میں مشرکین سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ اقرار نبوت اور انکار نبوت کے

مقابلے میں ان کی ساری ہمدردیاں منکرین نبوت کے ساتھ ہیں۔

بہ نسبت یہودیوں کے عیسائی زیادہ محبت کرتے ہیں

۱۷۔ اور اہل ایمان سے دوستی میں قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر علماء اور مشائخ ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے۔ یہ دُنیا کے سارے عیسائیوں کے بارے میں قرآن کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو زمانہ نبوت میں موجود تھے اور آیت میں لتجدن اس کا قرینہ دلیل ہے۔ یعنی نزول قرآن کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کی یہ حالت تھی آگے چل کر مسیحی ریاستوں اور حکومتوں میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو یہودیوں کی تھی آیت میں بتایا یہ گیا ہے کہ نصاریٰ اہل ایمان سے زیادہ قریب ہیں۔ یہاں نصاریٰ سے عام عیسائی مراد نہیں ہیں جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو تثلیث و کفارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اسلام دشمن دُنیا کے سرخیل ہیں بلکہ اس سے مراد صرف حبشہ کے وہ مسیحی ہیں جنہوں نے اہل ایمان کا حضور انور کے زمانہ اقدس میں استقبال کیا تھا۔ اگر دنیا کے سارے عیسائی مراد ہوتے تو پھر مخاطب سیاق و سباق کے لحاظ سے صرف حضور نہ ہوتے بلکہ مسلمان ہوتے اور تعبیر بجائے لتجدن کے لتجدن جمع کے صیغے سے ہوتی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نبوت کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں جن لوگوں سے اپنے زمانے میں سابقہ پڑا ہے قرآن یہاں ان ہی کا تقابلی مطالعہ پیش کر رہا ہے۔ نبوت کے مخاطبوں میں یہودی، مشرکین اور عیسائی تھے۔ مشرکین مکہ اور یہود دُور دُور تک پھیلے ہوتے تھے۔ یہود کی مدینہ سے شروع ہو کر شام تک آبادیاں تھیں جبکہ عیسائی نجران، یمن اور حبش میں تھے۔ حبش کیا ہے۔

حبش کی اصلیت

عربی میں لفظ حبش کے معنے اختلاط و امتزاج کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کے نزدیک یہ ایک ممزوج النسل اور مختلط النسب قوم تھی۔ اسی قسم کا ایک قبیلہ مکہ کی پہاڑیوں میں آباد تھا۔ عرب اس کو بھی احابیش کہتے تھے۔ اسلام نے ابھی چھ سال کی عمر نہ پائی تھی کہ ستر مسلمانوں نے تمام دُنیا کو چھوڑ کر صرف ملک حبش کا رُخ کیا۔ حبش کا صوبہ زیلع جس کو آج کل سمالی لینڈ اور اریٹریا کہتے ہیں، وہ ہمیشہ تاریخ اسلام میں عرب قوت کا مرکز رہا ہے اور اب بھی حبش اور تمام افریقی سواحل صرف عربوں سے متاثر ہیں۔ شہر کے شہر ان سے آباد ہیں۔ زبان تک عربی کی نقل ہے۔ لباس و

طعام وتمدن کی ہر نگی ترادنی چیزیں ہیں۔ حبش کے ساحل پر ایک شہر زیلع ہے وہاں ایک کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں سنجاشی مدعی ہے کہ اس نے سبا کے ملک تک عرب میں جنگ کی۔ چوتھی صدی کے اوائل میں جب حبش میں مذہبی انقلاب پیدا ہوا تو مذہب عیسوی کے نئے پیرووں کے دل وفور جوش سے لبریز تھے۔ شاہ اذینہ جو حبش کا پہلا بادشاہ عیسائی تھا۔ اور نیز اس کے جانشین اپنے کتبات میں اپنے نام کے ساتھ یہ القاب لکھتے ہیں۔ شاہ اکسوم وحمیر و ریدان وحبشات و سبا و زیلع۔ ان مخلوط سبائی عربوں کا پایہ تخت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ تجرے میں ۱۴ درجہ ۷ دقیقہ ۳۲ ثانیہ بطرف شمال اور ۳۸ درجہ ۳۱ دقیقہ ۱۵ ثانیہ بطرف مشرق واقع تھا اور جہاں اب تک اس کے کھنڈر باقی ہیں۔ اہل حبش اس کو نہایت مقدس شہر سمجھتے ہیں۔ شاہان حبش کی تاجپوشی انقلاب حکومت کے بعد بھی اب تک یہیں ہوتی ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں جب کہ سبائے حمیر نے ریدان میں اپنی مستقل حکومت قائم کی۔ سبائے حبش نے اکسوم میں ایک خاندان شاہی کی بنا ڈالی جو اس وقت سے چھٹی صدی تک قائم رہا، اس کے عروج و کمال کا زمانہ چوتھی اور پانچویں صدی ہے۔ عربوں میں شاہان حبش کا لقب سنجاشی ہے۔ یہ نجاشی عیسائی ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کے کون سے فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس موضوع پر ڈاکٹر جواد علی مصنف تاریخ عرب قبل الاسلام اور سید سلیمان ندوی مصنف ارض القرآن دونوں خاموش ہیں۔ ابوحیان اندلسی نے حضرت قتادہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب میں سے وہ لوگ تھے جو حضرت عیسٰی کی شریعت پر عمل پیرا تھے ایسے ہی محدث ابن جریر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسٰی کی شریعت سے وابستہ تھے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ سنجاشی آریوسی عیسائیوں سے تعلق رکھتا تھا جو حضرت عیسٰی کی وحدت فطرت کے قائل تھے۔ تثلیث کے ماننے والوں کی طرح کہ حضرت عیسٰی میں دو فطرتیں ہیں ایک عبدیت کی اور دوسری الوہیت کی۔ آریوس اسکندریہ کا پادری تھا۔ چوتھی صدی مسیح کے اوائل میں حضرت مسیح کی وحدت فطرت کا عقیدہ پیش کیا یعنی حضرت مسیح کی الوہی فطرت کے انکار کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ اہل حبش مدت تک آریوس کے عقیدے پر قائم رہے۔ بہرحال کچھ ہو قرآن نے ان کا چہرہ یہ بتایا ہے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں اور یہ لوگ تکبر نہیں کرتے، ظاہر ہے کہ یہ بات ان کی مدح میں بولی گئی ہے۔ بلا شبہ وہ نصاریٰ جن میں یہ اوصاف ہوں کہ

الف : اپنے آپ کو مسیحی نہیں بلکہ نصاریٰ کہتے ہیں۔

ب : ان میں فکر کی اصلاح کے لیے علماء علمی کارنامے دین کی حدود میں انجام دے رہے ہوں۔
ج : ان میں اخلاق و قلب کی اصلاح کے لیے مشائخ اور اہلِ تقویٰ محنت کر رہے ہوں اور یہ ذاتی مفادات اور منفعتوں سے بالا ہوں۔
د : ان میں پوری انسانیت کے لیے نیاز مندی اور تواضع ہو اور متکبر نہ ہوں۔ آج بھی ایسے لوگ یہودیوں اور مشرکین کے مقابلے میں اہلِ ایمان کے زیادہ قریب ہیں۔ اور آئیے یہ کسوٹی لے کر پوری عیسائی دُنیا کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو نصاریٰ سے نہیں مسیحیوں سے سابقہ پڑے گا۔ علماء و زہاد سے نہیں خالص مادہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ آپ کو ملیں گے۔ نیاز مند اور متواضع نہیں بلکہ آپ کو متکبر اور مغروروں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں،

ان آیات میں اسی جماعت کا حال بیان فرمایا ہے۔ قیامت تک کے لیے کوئی خبر نہیں دی گئی ہے کہ ہمیشہ عیسائیوں اور یہود و مشرکین وغیرہ کے تعلقات کی نوعیت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہی رہے گی۔ آج جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں ان میں کتنے قیس و رہبان اور متواضع و منکسر المزاج ہیں اور کتنے ہیں جن کی آنکھوں سے کلامِ الٰہی سن کر آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ جب اقربھم مودۃ کی علت ہی جو ذالک بان منھم قسیسین و رھبانا سے بیان کی گئی ہے موجود نہیں ہے تو معلول قربِ مودت کیوں موجود ہوگا۔ بہر حال جو اوصاف عہدِ نبوی کے عیسائیوں اور یہود و مشرکین کے بیان ہوئے۔ وہ جب کبھی اور جہاں کہیں جس مقدار میں موجود ہوں اسی نسبت سے اسلام و مسلمین کی محبت و عداوت کو خیال کر لیا جاتے۔

نصاریٰ نے قرآن کا خیر مقدم کیا

۱۷۱- اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسُول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کی معرفت کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ جن کا پہلے چہرہ بیان ہوا ہے ان ہی کا یہاں بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے جس والہانہ انداز میں قرآن اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا یہ اس کا بیان ہے۔ اس بیان میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ حضرت عیسٰی نے انجیل میں جس تسلی دینے والے اور جس نجات دہندہ کی بشارت دی تھی اور اس کی جو علامتیں بتائی تھیں وہ ان میں سے ایک ایک چیز کو محفوظ کیے ہوئے اس آنے والے کی راہ تک رہے تھے، فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے

کہ جب انہوں نے قرآن پاک کی آیات سنیں اور ان کے اندر اس حق کی کرنیں جلوہ گر دیکھیں تو جوشِ مسرت سے ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ پکار اٹھے ربنا آمنا، اے ہمارے رب ہم اس کتاب پر اور اس کے لانے والے پر ایمان لے آئے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں کے زمرے میں لکھ لے۔ جو بات انہوں نے یہاں کہی ہے یہی بات حواریین نے حضرت مسیح کی دعوت ایمان پر لبیک کہتے ہوئے فرمائی تھی ربنا آمنا بما انزلت وا تبعنا الرسول فاكتبنا مع الشاهدين گویا انہوں نے قرآن سن کر یہ اقرار کیا کہ ہم قرآن پر ایمان لا کر تیرے رسول کا اتباع کریں گے اور اللہ سے درخواست کی کہ ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں درج فرمالیجئے۔ دراصل اس میں دعا کے انداز میں ان کی جانب سے ادائے فرض شہادت کی تمنا اور آرزو ہے۔ کیونکہ یہی شہادت وہ ذمہ داری ہے جو اللہ کی جانب سے نبی پر اور نبی کی امت پر ڈالی گئی ہے۔ شہادت یا گواہی عرف عام میں اس کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعہ کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہے دوسروں کو ٹھیک ٹھاک بتادے۔ اس لیے اللہ کے دین کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر نبی کے دین کو جیسا کچھ وہ ہے پوری طرح واضح کردے۔ اب رہا یہاں شہادت کا مفہوم تو اگرچہ بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت ہے ایک تو یہی ہے کہ ہمیں ان لوگوں میں شمار کرلے جنہوں نے قرآن کے اور نبوت کے حق ہونے کی شہادت دی ہے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہمارا شمار امت محمدؐ میں فرمالے۔ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے منصبِ شہادت عطا فرمایا ہے۔ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے پیغمبر نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔

نصاریٰ یہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس لیے کہ ان کو اپنی کتابوں کے ذریعے یہ معلوم ہے کہ آخری نبی جس کے ذریعے اللہ سبحانہٗ دین میں کمال پیدا فرمائے گا۔ اس کی پیروی کرنے والے پوری انسانیت کے سامنے فرضِ شہادت انجام دیں گے۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ اس آیت میں شاہدین سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو قرآن نے شہداء علی الناس کا منصب دیا ہے۔

سامانِ ایمان موجود ہے

۲۷۱- اور آخر ہم اللہ اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ہے ایمان کیوں نہ لائیں جب کہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایمان لانے کا سامان موجود ہے تو ایمان نہ لانے کی وجہ کیا ہے۔ یعنی جب ہم خود یہ توقع رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ

ہمیں صالحین کے گروہ میں داخل کرے گا تو پھر اللہ اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے ایمان لائے بغیر ہمیں یہ توقع کرنے کا کیا حق ہے۔

ایمان و کفر کی جزا و سزا

۱۷۳۔ تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغات عطا فرماتے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے، اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ خاص سے عام کی طرف آنا اور جزئیات سے کلیات پیدا کرنا قرآن کا ایک عام اسلوب ہے۔ اوپر ایک خاص گروہ کے انعامات کا ذکر تھا۔ اب قانون عام بیان کر دیا کہ ہمارے قانون میں ایسی جزائے خیر تو ہر نیکوکار کو ملتی ہی رہتی ہے اور اخلاص طلب رائیگاں نہیں جاتا۔ متکلمین نے فاثابھم بما قالوا سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ زبان کا اقرار شرط ایمان ہے۔ عرفائنے یہاں یہ بات خوب سمجھی ہے کہ ان آیات میں تین باتیں موجود ہیں، زیادتیوں پر رونا، دین اور عطا کے لیے دعا اور پھر جو کچھ مل جائے اس پر رضا۔ اگر کوئی شخص ان تینوں کی عدم موجودگی میں معرفت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ شیخ الاسلام نے تمام آیات پر ایک جامع نظر ڈالی ہے لیجئے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے۔ ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ یہود کا مشرکین سے دوستی کرنا محض اسلام اور مسلمانوں کی عداوت و بغض کی وجہ سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن اقوام سے زیادہ سابقہ پڑتا تھا ان میں یہ دونوں قومیں یہود اور مشرکین علی الترتیب اسلام و مسلمین کی شدید ترین دشمن تھیں۔ مشرکین مکہ کی ایذا رسانیاں تو اظہر من الشمس ہیں لیکن ملعون یہود نے کوئی کمینہ سے کمینہ حرکت اٹھا کر نہیں رکھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے خبری میں پتھر کی چٹان گرا کر شہید کرنا چاہا۔ کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی، سحر اور ٹوٹکے کرائے غرض غضب پر غضب اور لعنت پر لعنت حاصل کرتے رہے۔ اس کے بالمقابل نصاریٰ باوجودیکہ وہ بھی کفر میں مبتلا تھے۔ اسلام سے جلتے تھے۔ مسلمانوں کا عروج ان کو ایک منظر نہ بھاتا تھا تاہم ان میں قبول حق کی استعداد ان دونوں گروہوں سے زیادہ تھی۔ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرنے کی طرف نسبتہً جلد مائل ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک عیسائیوں میں علم دین کا چرچا دوسری قوموں سے زیادہ تھا۔ اپنے طریقہ کے موافق ترک دنیا اور زاہدانہ زندگی اختیار کرنے والے ان میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ نرم دلی اور تواضع ان کی خاص صفت تھی۔ جس قوم میں یہ خصال کثرت سے پائی جائیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا

چاہیے کہ اس میں قبول حق اور سلامت روی کا مادہ دوسری اقوام سے زیادہ ہو کیونکہ قبول حق سے عموماً تین چیزیں مانع ہوتی ہیں۔ جہل، حُبِّ دُنیا یا حسد و تکبّر، نصاریٰ میں قسیسین کا وجود جہل کو رہبان کی کثرت حُبِّ دُنیا کو نرم دلی اور تواضع کی صفت کبر و نخوت وغیرہ کو کم کرتی تھی۔ چنانچہ قیصرِ روم، مقوقس مصر اور نجاشی ملک حبشہ نے جو کچھ برتاؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ رسالت کے ساتھ کیا وہ اس کا شاہد ہے۔ اس وقت نصاریٰ میں قبول حق اور مودت مسلمین کی صلاحیت نسبتہً دوسری قوموں سے زائد تھی۔ مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر جب ایک جماعت صحابہ کرام نے حبشہ کو ہجرت کی اور مشرکین نے وہاں بھی ملک حبشہ کے دربار تک اپنا پروپیگنڈا نہ چھوڑا تو بادشاہ نے ایک روز مسلمانوں کو بلا کر کچھ سوالات کیے اور حضرت مسیح کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ دریافت کیا، حضرت جعفر نے سورہ مریم کی آیات پڑھیں اور اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کر دیا۔ بادشاہ بے حد متاثر ہوا اور اقرار کیا کہ جو کچھ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے وہ بلا کم و کاست صحیح ہے۔ اس نے کتب سابقہ کی بشارات کے موافق حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزمان تسلیم کیا۔ قصہ طویل ہے انجام کار ہجرت کے کئی سال بعد ایک وفد جو ستر نو مسلم عیسائیوں پر مشتمل تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ لوگ جب مدینہ پہنچے اور قرآن کریم کے سماع سے لذت اندوز ہوئے تو کلام اللہ سُن کر وقف گریہ و بکا ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو اور زبان پر ربنا آمنا کے کلمات جاری تھے۔ شیخ الاسلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

خدا کی راہ میں پہلی ہجرت

جب قریش کے ظلم و تعدی کا بادل پیہم برس کر بھی نہ کھلا تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت فرمائی کہ حبشہ ہجرت کر جائیں جو قریش کی قدیم تجارت گاہ تھی۔

حبش کے ساتھ قریش کے تجارتی تعلقات پشتوں سے چلے آرہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم نے قیصرِ روم سے تجارت کا پروانہ حاصل کیا تھا تو قیصر نے اپنے ہم مذہب حکمران شاہِ حبش کے نام بھی ایک سفارشی خط لکھ دیا تھا کہ اہلِ مکہ کے تجارتی قافلے اپنے ملک میں آنے دے۔ سیرۃ النبی میں ہے کہ ہاشم نے شاہِ حبش سے قریش کے تجارتی مال پر ٹیکس نہ لینے کا فرمان حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت سے قریش بڑی تعداد میں حبش جاتے آتے تھے۔

حبش کے بادشاہ کو عرب نجاشی کہتے تھے جو حبشی زبان کے لفظ نجوس یا نیگوش کی تعریب ہے

اور اس کے معنے بادشاہ کے ہیں۔ وقت کے نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ ڈاکٹر جواد علی تاریخ العرب قبل الاسلام میں رقمطراز ہیں کہ نجاشی کا اصل نام الااصبحہ کالب ہے۔ یہی عربی میں آکر اصحمہ بن گیا ہے۔ الا ذو یا آل کے معنے میں ہے۔ اصحبہ اس کے اجداد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کالب جو آل اصحبہ میں ہے۔ اس کے عدل وانصاف کی شہرت تھی۔

ہجرت سے ایک بدیہی فائدہ تو یہ تھا کہ مظلومین کے لیے امن مہیا ہو جاتا دوسرا اور اہم فائدہ یہ بھی تھا کہ دعوتِ حق کے پیرو جہاں جاتے وہاں اسلام کی روشنی خود بخود پھیلنے کا سروسامان ہو جاتا وہ زبان سے بھی اسلام کی دعوت دیتے، اپنے حسنِ عمل اور فضائلِ اخلاق کی بدولت بذاتِ خود بھی ایک موثر عملی دعوتِ اسلام تھے۔

شروع میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن میں حضرت عثمان مع اہلیہ حضرت رقیہ بنت آنحضرت، حضرت زبیر بن العوام، حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوسلمہ مخزومی مع اہلیہ حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمان بن مظعون، بعد میں وقتاً فوقتاً متفرق قافلے جاتے رہے، یہاں تک حبشہ میں کل مہاجرین کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی۔ ستر اسی مرد اور اٹھارہ عورتیں بعد کے قافلوں میں جو اہم شخصیتیں گئیں ان میں سے ایک حضرت جعفر بن ابی طالب تھے جو آگے چل کر نجاشی کے دربار میں مہاجرینِ حبشہ کے ترجمان بنے۔

قریش کی بے پناہ عداوت

اس زمانے میں اہلِ مکہ کے لیے بندرگاہ شعیبہ تھی، جہاں سے جہاز حبش جاتے تھے۔ یہ مقام جدہ سے تھوڑے سے فاصلے پر جنوب میں ہے۔ خود جدہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں بندرگاہ بنا اور شعیبہ کی رونق ادھر منتقل ہو گئی۔ مہاجرین کا پہلا قافلہ ۵ نبوی یعنی ۶۱۴ء میں روانہ ہوا تھا۔ یہ حضرات دو تجارتی جہازوں پر سوار ہو کر گئے تھے۔ قریش کو ہجرت کا علم ہوا تو مہاجرین کے تعاقب میں بندرگاہ تک گئے لیکن قافلہ پیشتر جا چکا تھا۔ بعد میں مہاجرین کے قافلے چھپ چھپا کر جاتے رہے۔ قریش کی عداوت کا یہ عالم تھا کہ مظلومین کا تعاقب نہ چھوڑا۔ ایک وفد بطورِ سفارت شاہِ حبش کے پاس پہنچا، جس میں عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص جو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے بعد فاتح مصر بنے شامل تھے۔ وفد نے نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے تحائف بھی ساتھ لیے تھے مقصد یہ تھا کہ درباریوں کو ہمنوا بنا کر مظلوم مسلمانوں کو حبش سے نکلوا کر اپنے ساتھ لے آئیں تاکہ

پہلے کی طرح ظلم و جور کا شوق پورا کرتے رہیں۔

قریش کے وفد نے حبش پہنچتے ہی درباریوں اور پادریوں سے ملاقات کی۔ تحائف دے کر انہیں ہموار کرلیا۔ سب سے یہی کہا کہ ہمارے ہاں کے چند لوگ آبائی دین چھوڑ چکے ہیں اور یہاں آگئے ہیں۔ انہوں نے مسیحیت یا یہودیت بھی قبول نہیں کی۔ لہٰذا انہیں ملک سے نکلوا دینے پر زور دینا چاہیے۔ پھر اہل وفد خود دربار میں پہنچے اور نجاشی سے بھی اسی انداز میں گفتگو کی کہا کہ یہ جو لوگ آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ ہمارا دین چھوڑ بیٹھے ہیں آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوتے۔ انہوں نے نیا دین نکالا ہے۔ اشراف قوم نے جن میں ان لوگوں کے باپ دادا، چچا اور دوسرے اہل قبیلہ شامل ہیں ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ انہیں واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے بھی حسب قرارداد وفد کے مطالبے کی تائید کی۔

نجاشی نے مطالبہ سن کر کہا کہ جب تک ان لوگوں سے بات چیت نہ کر لی جاتے اور ان کا مسلک معلوم نہ ہو جاتے ان کے خلاف کوئی حکم دے دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان مہاجرین کے نمائندے دربار میں بلائے گئے، وہ آئے تو دستورِ عام کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہ کیا۔

حضرت جعفر کی تقریر

نجاشی نے مسلمانوں سے ان کے مذہب کی کیفیت پوچھی، ان کی طرف سے حضرت جعفرؓ نے ایک جامع اور پُرتاثیر تقریر فرمائی، جس میں اسلام کے اہم اجزاء بھی آگئے تھے اور اسلام سے قبل عربوں کی حالت کا نقشہ بھی کھینچ دیا تھا۔ یہی پوری دنیا کا نقشہ تھا۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا۔

اے بادشاہ! ہم لوگ جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کو پوجتے تھے، بے حیائی کے کام کرتے تھے۔ اقرباء کے حقوق سے قطع نظر کیے بیٹھے تھے۔ ہمسایوں سے ہمارا برتاؤ اچھا نہ تھا۔ ہم میں سے طاقتور کمزوروں کو کھا گئے تھے۔ یہ حالت تھی جب اللہ نے ہم میں سے ایک رسول بھیجا، جس کے حسب ونسب، صدق و دیانت، تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی، سمجھایا کہ اکیلے خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ پتھروں اور بتوں کی عبادت چھوڑ دو جنہیں ہم اور ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔ سچ بولو، امانتیں ادا کرتے رہو۔ اقرباء کے حقوق کا خیال رکھو۔ ہمسایوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ حرام باتوں اور خونریزی سے

دُور رہو۔ اس نے ہمیں تاکید کی کہ بے حیائی سے بچو، جھوٹ نہ بولو، یتیموں کا مال نہ کھاؤ، پاک دامن عورتوں پر بدنامی کے داغ نہ لگاؤ۔ وعدے پورے کرو، گناہوں سے دُور رہو، حکم دیا کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، روزے رکھو، اس نے جس چیز کو حرام بتایا ہم نے حرام جانا جس چیز کو حلال بتایا ہم نے حلال جانا، ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی۔ بُرے کاموں سے باز آ گئے۔ اس پر ہماری قوم ہماری جانی دشمن ہو گئی۔ مجبور کر رہی ہے کہ ہم وحدہٗ لا شریک کی عبادت چھوڑ دیں۔ لکڑی اور پتھر کی مورتیں پوجیں۔ ہم نے قوم کے ہاتھوں بہت ظلم سہے، مجبور ہو کر پناہ لینے کے لیے تیرے ملک میں آئے ہیں۔

نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے وہ کہیں سے پڑھو۔ حضرت جعفر نے سُورہ مریم کی چند آیتیں سنائیں جنہیں سنتے ہی نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے کہا خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

قریش کے وفد کو جواب دے دیا کہ تم چلے جاؤ میں ان لوگوں کو ہرگز واپس نہ کروں گا۔ دوسرے روز عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا کہ اے بادشاہ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عیسٰی کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ کیا ہے۔ چنانچہ مسلمان دوبارہ دربار میں بلائے گئے۔ خود انہیں بھی اندیشہ تھا کہ نجاشی عیسائی ہے ممکن ہے وہ حضرت عیسٰی کے بارے میں مسلمانوں کے خیالات سن کر ناراض ہو جاتے، حضرت جعفر نے فرمایا کچھ بھی ہو ہمیں سچ کہنا چاہیے، ہم وہی کہیں گے جو ہمارے خدا اور ہمارے رسُول نے فرمایا۔ دربار میں حضرت عیسٰی کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت جعفر نے فرمایا کہ

وہ اللہ کے بندے، اس کے رسُول، اس کی رُوح اور اس کا کلمہ تھے۔

نجاشی نے یہ سُنتے ہی زمین سے تنکا اٹھایا اور کہا جو کچھ تم نے بتایا خدا کی قسم عیسٰی اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٨٧﴾ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمان! اللہ نے جو چیزیں تم پر حلال کر دی ہیں انہیں اپنے لیے حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے[۱۷۴]۔ اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے پاکیزہ اور حلال کھاؤ اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس پر تم ایمان لاتے ہو[۱۷۵]۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

چونکہ پچھلی آیات میں عیسائی راہبوں کی نرم دلی اور فروتنی کی تعریف کی گئی تھی اس سے ممکن ہے کہ کوئی سمجھ لے کہ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش ہے اس لیے ضروری تھا کہ کھول کر بتا دیا جائے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اور انداز بیان کچھ ایسا بلیغ اختیار فرمایا ہے کہ ایک ہی بات میں متقشف کے تقشف اور مادہ پرست کے تعیش دونوں کی تردید ہو گئی۔ اور بتا دیا کہ اسلام کے

نام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو نظام لے کر آتے وہ رہبانیت کا ہرگز متحمل نہیں ہے کیونکہ اسلام میں اللہ کا تصور صرف ایک مطلوب حقیقی کا تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ انسانوں کا حقیقی فرماں روا اور حقیقی قانون ساز بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ترک دنیا، نفس کشی اور گیان دھیان کے ذریعے خدا تک پہنچ جانے کا نظریہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ انسان کا صرف مطلوب اور مقصود ہو اور اس کے سوا اور کچھ نہ ہو لیکن جب حقیقت یوں نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کا فرمانروا اور قانون ساز بھی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے لیے اس کے کچھ احکام اور قوانین بھی ہوں گے جن کی اسے طاعت کرنی چاہیے اس لیے انسان کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں آتے اور ان احکام کی اطاعت میں فرمانبردار رعیت ہونے کا ثبوت دے۔

رہبانیت دراصل دین کے اس تصور پر قائم ہوتی ہے کہ دنیا انسان کے لیے فی الواقع قید خانہ ہے اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اندر جو مادی خواہشیں پائی جاتی ہیں وہ اس پنجرے کی تتلیاں ہیں۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانے کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے اور اس پنجرے سے اپنی روح کو آزاد کرا لے، یعنی وہ دنیا چھوڑ دے، بستیوں سے دور نکل جائے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھ جائے۔ اپنی خواہشوں کو دبا کر کچل ڈالے اور فنا کر کے رکھ دے، صرف اسی شکل میں اس کی روح کے اوپر سے وہ پردہ ہٹ سکتا ہے جو اسے خدا کے جلووں کو دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کر لینے سے روکے ہوئے ہے اس انسان کا فرض ہے کہ وہ ریاضتیں کر کے مایا کے اس جال سے باہر نکل آئے۔ قرآن نے عیسائیوں پر جنہوں نے رہبانیت کو دین اور خدا پرستی کا کمال سمجھ کر اپنا رکھا تھا تنقید کرتے ہوتے فرمایا و رهبانیة ابتدعوها ما کتبناها علیهم انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی ہم ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا اور یہاں اس آیت میں بھی اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۷۴۔ اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ نے جو چیزیں تم پر حلال کر دی ہیں انہیں اپنے لیے حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئیں ایک یہ کہ جو چیزیں اچھی اللہ نے حلال کر دی ہیں ان کو حرام نہ کرو۔ دوسری یہ کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ ان دونوں باتوں میں رہبانیت کی تردید کی ہے۔ اچھی چیزوں کو حرام کرنے کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ اپنے آپ حلال و حرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرانا قانون الٰہی سے ہٹ کر اپنے نفس کی پیروی ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ

عیسائیوں کے راہبوں کی رہبانیت اور ترکِ لذات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ رہبانیت اختیار کرنے والوں میں ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذتوں سے محروم کرنا، دنیا کے سامان زیست سے تعلق توڑنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

اور حد سے تجاوز کرنا وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھہرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی عدوان ہے اور حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کی حدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے اللہ کو یہ تینوں باتیں ناپسند ہیں۔

ارشاد میں لا تحرموا اور لا تعتدوا دونوں ممانعتیں الگ الگ ہیں ضروری ہے کہ ان کی معنویت بھی الگ الگ ہو۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی جائز کردہ چیزوں میں سے طیبات کو حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے اسی طرح اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنالینا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ اعتدا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری چیزیں ہمارے لیے پیدا کی ہیں۔ ہمیں ان کے کھانے اور برتنے کی اجازت ہے۔ گنتی کی چند چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کی حدود کی ہے اور حدود کو پھلانگنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ان حدود سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہی کی حدود الٰہی میں مداخلت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں کو پسند نہیں کرتا ہے اعتدا یا حدود سے نکل جانا یہی ہے کہ اللہ کی قیدوں اور احتیاطوں کو ناکافی سمجھ کر ان پر اپنی رائے سے اضافہ کرے یا اس کے برعکس انہیں زیادہ سمجھ کر ان میں سے کچھ چیزوں کو گھٹا دے۔ محققین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دونوں کی تردید ہو رہی ہے۔ ان مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں کی بھی جن میں یہ میلان پایا جاتا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور ان دنیاداروں کی بھی جو قانونی پابندیوں سے بے پرواہ ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔

غلو و جفا اور افراط و تفریط کے درمیان اعتدال

۱۷۵ ۔ اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے پاکیزہ اور حلال کھاؤ اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس پر تم ایمان لاتے ہو۔ آغاز سورت میں ایفائے عہود کی تاکید کے بعد حلال و حرام کا بیان شروع ہوا تھا۔ اس ضمن میں خاص خاص مناسبات سے جن کا ذکر موقع بموقع ہم کر چکے

ہیں۔ دوسرے مفید مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا الشیئ بالشیئ یذکر بات میں سے بات نکلتی رہی ہے تمام استطرادی مضامین کو تمام کر کے اس پارے کے پہلے رکوع سے پھر اصل موضوع بحث کی طرف عود کیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس رکوع سے متصل پہلے رکوع میں جو مضمون گزرا اس سے بھی اس رکوع کا مضمون پوری طرح مربوط ہے کیونکہ پچھلے رکوع میں جو یہود و نصاریٰ کی فضائح بیان کی گئیں سمجھنے والوں کے نزدیک ان کا خلاصہ دو چیزیں تھیں یعنی یہود کا لذات و شہوات دنیا اور حرام خوری میں انہماک جو تفریط فی الدین کا سبب ہوا اور نصاریٰ کا دین میں غلو اور افراط جو آخر کار رہبانیت وغیرہ پر منتہی ہوا۔ بلاشبہ رہبانیت جسے دینداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہیے، نیت اور منشائے اصلی کے اعتبار سے فی الجملہ محمود ہو سکتی تھی، اسی لیے ذالک منھم قسیسین و رھبانا کو من وجہ معرض مدح میں پیش کیا گیا لیکن چونکہ اس طرح کا تجرد و ترک دنیا اس مقصد عظیم اور قانون قدرت کے راستہ میں حائل تھا جو فاطر السماوات والارض نے عالم کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا ہے۔ اس لیے وہ عالمگیر دین جو ابدی طور پر تمام بنی نوع انسان کی فلاح دارین اور اصلاح معاش و معاد کا متکفل ہو کر آیا ہے ضروری تھا کہ اس طرح مبتدعانہ طریق عبادت پر سختی سے نکتہ چینی کرے۔ کوئی آسمانی کتاب ایسی جامع معتدل فطری تعلیم انسانی ترقیات کے ہر شعبہ کے متعلق پیش نہیں کر سکتی جو قرآن حکیم نے ان دو آیتوں میں پیش کی ہے۔ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف طور سے روک دیا کہ وہ کسی لذیذ حلال و طیب چیز کو اپنے اوپر عقیدۃً یا عملاً حرام ٹھہرالیں نہ صرف یہی بلکہ ان کو خدا کی پیدا کی ہوئی حلال و طیب نعمتوں سے متمتع ہونے کی ترغیب دی ہے مگر سلبی اور ایجابی دو شرطوں کے ساتھ۔ ۱۔ اعتداء نہ کریں۔ ۲۔ تقویٰ اختیار کریں۔ اعتداء کے دو مطلب ہو سکتے ہیں حلال چیزوں کے ساتھ حرام کا سا معاملہ کریں۔ اور نصاریٰ کی طرح رہبانیت میں مبتلا ہو جائیں۔ یا لذائذ و طیبات سے تمتع کرنے میں حد اعتدال سے گزر جائیں۔ حتیٰ کہ لذات و شہوات میں مبتلا ہو کر یہود کی طرح دنیوی زندگی ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیں۔ الغرض غلو و جفا اور افراط و تفریط کے درمیان متوسط و معتدل راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ نہ تو لذائذ دنیوی میں غرق ہونے کی اجازت ہے اور نہ ازراہ رہبانیت مباحات وطیبات کو چھوڑنے کی۔ "ازراہ رہبانیت" کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ بعض اوقات بدنی یا نفسی علاج کی غرض سے کسی مباح سے عارضی طور پر پرہیز کرنا ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ نیز مسلمان تقویٰ کے مامور ہیں جس کے معنے ہیں خدا سے ڈر کر ممنوعات سے اجتناب کرنا۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض مباحات کا استعمال بعض اوقات کسی حرام یا ممنوع کے ارتکاب کی طرف مفضی ہو جاتا ہے۔ ایسے مباحات کو عہد و قسم یا

تقرب کے طور پر نہیں بلکہ بطریق احتیاط اگر کوئی شخص کسی وقت باوجود اعتقاد اباحت ترک کر دے تو یہ رہبانیت نہیں بلکہ ورع و تقویٰ میں شامل ہے۔ حدیث میں ہے،

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتیٰ یدع ما لا باس به حذرا مما به باس۔ (ترمذی)

بندہ متقین میں سے نہیں ہو سکتا تاآنکہ ان چیزوں کو بر بنائے احتیاط نہ چھوڑ دے جن میں کوئی مضائقہ نہیں ان کی وجہ سے جن میں حرج ہے۔

الحاصل ترک اعتداء اور اختیار تقویٰ کی قید کو ملحوظ رکھ کر ہر قسم کی طیبات سے مومن استفادہ کر سکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقیات کے دروازے کھلے ہوتے ہیں [1]

رہبانیت دین کا غلط تصور ہے

دراصل اس سورت کے آغاز سے یہاں تک قرآن نے اسلام کے مقابلے میں دین کے دو مختلف تصور پیش کیے، ایک تو وہی ہے جسے رہبانیت کہا جاتا ہے۔ یعنی اس دُنیا کو مایا کا جال سمجھ کر اس سے دُور بھاگے، اجتماعیت کا تصور تک اس پر بار ہو۔ زندگی کے مسائل پر ایک نگاہ غلط ڈالنا بھی اس کے لیے گوارا نہ ہو۔ بستیوں سے اسے وحشت ہو لو وحشت کدوں سے اسے انس ہو۔ مادی رشتوں کو مادی ضرورتوں کو مادی خواہشوں کو سر تا سر شیطان کے پھندے یقین کرے، ایک ایک دنیوی نعمت کو اپنے لیے حرام قرار دے لے، اپنے جسم کے اعضا کو گھلا گھلا کر بے کار اور بے حس بنا لینے کے درپے ہو جائے۔ غذا اگر استعمال کرے تو انتہائی مجبوری کے وقت میں۔ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اگر داخل ہونے دے تو اس وقت جب حبس دم کے ذریعے اسے آخری حد تک روکے رکھنے کی کوشش کر چکا ہو، غرض ہر وہ شے جو مادیات اور جسمانیات سے تعلق رکھتی ہے اس کے نزدیک یکسر ترک کر دینے اور جلا کر رکھ دینے کے لائق ہو۔ یہ اس لیے کہ عاشق خدا کو اپنے معشوق حقیقی کے جاں بخش روح پرور اور وجد انگیز تصور سے ایک لمحہ کی مہجوری بھی گوارا نہیں ہوتی۔ لذت و سرور کا جو کیف اسے شاہد مطلق کی ایک تجلی دیکھ لینے کی آرزو تے پیہم اور سعی مسلسل میں حاصل ہو رہا ہے۔ دُنیا جہان کی کوئی شے بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف تو تصور معشوق کی یہ داستان کیفیت دوسری طرف دنیوی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علائق کا یہ رُوح فرسا اثر و عمل کہ وہ نگاہ تصور کے سامنے حجاب بن بن کر حائل ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح جمالِ حق کے مشاہدے کی محویت میں دخل انداز ہوتے ہیں اور وصالِ معشوق کی کوششوں کو درہم برہم کر دیا کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ عاشق ان علائق کو برداشت کرے۔ اس دُنیا کو قید خانہ تصور نہ کرے اور اس جسم کو اپنے لیے قفس باور نہ کرے۔ ان ضرورتوں کو بیڑیاں تصور نہ کرے ان رشتوں کو بدبختی کے پھندے نہ گمان کرے۔ اس دنیوی زندگی کو اپنے لیے عذاب خیال نہ کرے فلاطینوس صاف کہتا ہے۔

جب رُوح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے وہ ہر چیز کو چھوڑ دیتی ہے۔

اور یہ کہ

حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے ان میں تبدیلی سے نہیں، آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کریں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔

عرفانی حکما تو اسی انداز فکر کے منطقی تقاضوں کی انتہا تک جا پہنچے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ

انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دُنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے۔

اور یہ کہ

یہ کائنات خدائے مطلق کی تخلیق کا نتیجہ نہیں بلکہ شیطان کی اہلیت کا کارنامہ ہے۔ انسانی ارواح جب اس مادی کائنات میں وارد ہوتی ہیں تو شیطنت کے بُرے اثرات سے ملوث ہو جاتی ہیں۔ ان کی نجات ان کے اپنے اعمال و افعال کے ذریعے ممکن نہیں۔ عالم بالا سے ایک نجات دہندہ ہی ان کو اس قید سے چھڑا سکتا ہے۔

فلاطینوس کے شاگرد فرا فوریس کا بیان ہے کہ "اسے اپنے جسم سے ہمیشہ نفرت رہی" عیسائیوں کے ایک فرقے جو ویلیسین کہلاتا تھا یہ عقیدہ تھا کہ نجات کے لیے اختہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک اور فرقہ جو اس کو لینی کہلاتا تھا اور جو غالباً ۱۷۷۱ء میں روس میں قائم ہوا تھا اپنے اراکین کے خصیے نکلوا دیتا تھا یہ لوگ اپنے کو خدائی جماعت کہتے تھے۔

تاریخ ادیان میں اس طرز فکر اور طرز عمل کی اتنی زیادہ مثالیں ہیں کہ کوئی صاحب نظر ان سے

ناواقف نہیں ہو سکتا۔ یہ سنیاس یہ لوگ یہ برہمچریہ اسی رہبانیت کی عملی تشکیلیں ہیں کوئی کامل کوئی ناقص کوئی کلی کوئی جزئی، کوئی خالص کوئی مخلوط۔

غرض رہبانیت کا یہ فطری تقاضا ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس طرح وہ کل تک ایک حقیقت تھا آج بھی حقیقت ہی ہے۔ مولانا اسماعیل شہید عشق الٰہی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

> اس محبت یعنی حب عشقی کے آثار و مقتضیات میں سے ایک تفرد ہے۔ یعنی یہ کہ انسان محبوب کے سوا باقی سارے علائق منقطع کر دیتا ہے۔ زندگی کے رنگارنگ مشاغل اور بے شمار تعلقات کا سامنا کرتے ہوئے اس کا دل بڑی تنگی محسوس کرتا ہے اور طرح طرح کے نظم و انصرام سے مثلاً خانگی مسائل کے انتظام معاشرتی اور اجتماعی امور کی انجام دہی جماعت کی امامت، عیدین اور جمعہ کی اقامت، حقدار اعزہ کے حقوق کی ادائی وغیرہ سے اسے سخت انقباض ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نکاح سے جو تمام علائق کی بنیاد ہے اسے حد درجہ نفرت اور وحشت ہوتی ہے۔ (صراط مستقیم)

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ رہبانیت اور ترک دنیا کا اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز انسان کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔ قرآن کی ہدایت تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی کا فریضہ اس دنیا سے الگ ہو کر نہیں اس میں رہ کر ہی انجام دے۔ عقل و فہم کی اور اعضاء و جوارح کی جن قوتوں اور صلاحیتوں سے اسے آراستہ کر کے پیدا کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اس ادائے فرض کے سلسلے میں کارآمد اور مطلوب ہے۔ یہی حال ان فطری مطالبات اور جذبات کا بھی ہے جو اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ یہ سرتاسر مادی ہونے کے باوجود اس کی منصبی ذمہ داریوں کی ٹھیک ٹھیک انجام دہی کے لیے مطلوبہ آلات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان فطری قوتوں کا صحیح استعمال اور ان جبلی مطالبوں کی مناسب تکمیل عین تقاضائے دین ہے اور ان میں سے کسی قوت یا کسی خواہش کو کچل ڈالنا اور فنا کر کے رکھ دینا ایک نادانی کی بات اور منشاء الٰہی کی کھلی بغاوت ہے۔

دراصل رہبانیت دین کا جو تصور پیش کرتی ہے اس کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی گئی ہے جبکہ قرآن کے تصور دین کی بنیاد سرتاسر محبت و طاعت پر ہے۔ دونوں میں جو فرق ہے عام لوگ اس سے بہت کچھ نابلد ہیں اور محبت الٰہی کی عقلی اور طبعی یا ایمانی اور نفسانی تقسیم کو نظر انداز کر کے محبت الٰہی اور عشق الٰہی کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ یہ فکر و نظر کی ایک ایسی زبردست لغزش ہے جس کے بعد دین کے صحیح قرآنی تصور پر کوئی شخص باقی نہیں رہ سکتا، اور عشق الٰہی پر مبنی تصور دین

اس کے راستہ میں رکاوٹ بن کر رہتا ہے اور وہ اپنی جگہ پورے اخلاص سے یہی سمجھتا رہتا ہے کہ میں سچا پیرو قرآن ہوں مگر اس کے ذہن میں فی الواقع دین کا وہ خالص تصور نہ ہوگا جو قرآن نے دیا ہے بلکہ ایک ایسا تصور ہوگا جو دونوں تصورات کا آمیزہ ہوگا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ قرآنی تصورِ دین سے مکمل اور طمانیت بخش واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک عشقِ الٰہی پر مبنی تصورِ دین یعنی رہبانیت سے ضروری حد تک واقفیت نہ ہو جائے کیونکہ قرآنی تصور پر اگر منفی پہلو سے پوری طرح سے روشنی پڑ سکتی ہے تو اسی واقفیت سے پڑ سکتی ہے۔ اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کون سی غیر قرآنی باتیں ہیں جو قرآن کی پیروی کے مخلصانہ دعوے کے باوجود بھی دین سمجھ کر اختیار کر لی جا سکتی ہیں۔

رہبانیت کے متعلق یہ ضروری واقفیت حاصل کر لینے کے لیے ہمیں تین بنیادی سوالوں کا جواب معلوم کرنا ہوگا۔

۱۔ اس کا سرچشمہ کیا ہے؟
۲۔ اس کا فطری مزاج کیا ہے؟
۳۔ اس کے بنیادی تقاضے کیا ہیں؟

رہبانیت کا سرچشمہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب قرآن نے صاف اور کھلے الفاظ میں یہ دیا ہے کہ

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ

مطلب یہ ہے کہ رہبانیت اسلامی اور قرآنی تصور نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا سرچشمہ قرآن نہیں ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی تعلق کتابِ الٰہی سے نہیں ہے وہ اپنے پاس اللہ تعالیٰ کی کسی بھی وحی اور ہدایت کی سند نہیں رکھتا وہ صحیفۂ آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ کی انجیل تک کسی بھی کتابِ الٰہی کی تعلیم نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ کا دین اصولوں کی حد تک ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ نوعِ انسانی کو نیابتِ الٰہی کا ذمہ دار نزولِ قرآن ہی کے وقت نہیں بلکہ روزِ اول ہی میں بنایا جا چکا تھا۔ انسان کی غایتِ آفرینش وحیِ الٰہی نے جو قرآن میں بتائی ہے وہی ہمیشہ بتائی گئی ہے اللہ سبحانہٗ نے اپنی ذات سے اولادِ آدم کے منصبی تعلق کی جو نوعیت زبانِ نبوتِ محمدیہ سے واضح کی ہے آدم، نوح، ابراہیم، یعقوب، موسیٰ، اور عیسیٰ ہر پیغمبر نے وہی بیان کی ہے۔ اللہ کے دین کے

جو اصول جو عقائد جو بنیادی احکام اور جو ضروری تقاضے قرآن میں مذکور ہیں کسی بھی پہلی شریعت میں ان سے مختلف نہیں تھے۔ یہی عقل اور منطق کا تقاضا بھی ہے اور یہی صاف اور صریح قرآن کا اعلان بھی ہے۔ اس منفی جواب کے بعد زیر بحث سوال کے مثبت جواب کی طرف آئیے اور یہ معلوم کیجئے کہ پھر رہبانیت کا تصور کہاں سے لیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس کا ماخذ اللہ کی وحی نہیں اس سوال کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر رہبانیت خود انسان کے اپنے ذہن کی تخلیق اور اس کے اپنے ہی افکار و جذبات کی پیداوار ہے کیونکہ انسان جو کچھ مانتا اور جانتا ہے وہ یا تو معلم حقیقی کی وحی و ہدایت کا عطیہ ہے یا پھر اس کے اپنے ہی دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ تیسرا ماخذ اس کے کسی تصور یا عقیدے کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر رہبانیت کا تصور وحی الٰہی کا بتایا ہوا نہیں ہے تو پھر لازماً وہ اس انسان کا اپنا ہی ساختہ و پرداختہ ہے۔ قرآن نے صاف طور پر بتایا ہے کہ یہ انسان کی اپنی اختراع ہے۔

رہبانیت کا فطری مزاج

دوسرا سوال کہ رہبانیت کا فطری مزاج کیا ہے؟ اس کے جواب میں یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ جس کا سنگ بنیاد عشق ہو اس کا مزاج بھی عقل و بصیرت کا مزاج نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہوگا جو عشق کا مزاج ہے حتیٰ کہ اس کی تشکیل میں عقل و بصیرت کے کسی مؤثر اشتراک کی بھی گنجائش نہیں ہو سکتی، اس لیے عشق الٰہی پر مبنی رہبانیت کا فطری مزاج معلوم کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ پہلے خود عشق کا مزاج معلوم کر لیا جائے تاکہ وہ آئینہ ہاتھ آ جائے جس کے اندر اس کے ایک ایک خط و خال کے ساتھ پوری طرح دیکھ لیا جا سکے۔

عشق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں:

> عشق سے مراد وہ شوریدگی اور بے قراری ہے جو اپنا مطلوب مقصود حاصل نہ ہونے کے باعث انسان کے اندر پیدا ہو جایا کرتی ہے اور پیدا ہو کر تمام باطنی قوتوں میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ مقصود تک رسائی ہو جائے اور محبوب کا وصال میسر ہو جائے۔ اوّل اوّل تو اس عشق کا مقام انسان کا قلب ہوتا ہے جو تمام کیفیات نفسانیہ کا مرکز ہے، پھر وہ وہاں سے پھیل کر تمام باطنی قوتوں پر چھا جاتا ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ انسان اپنے محبوب کی یافت میں محو اور اپنے سے بے خبر ہو جائے۔
>
> (صراط مستقیم)

شاہ صاحب کے اس بیان سے عشق اور اس کے مزاج کی حسب ذیل خصوصیات متعین ہوتی ہیں۔
اولاً، عشق کی بارگاہ میں عقل و دانش کو کسی طرح رسائی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ باطنی شورش و اضطراب اور تعقل میں کھلا تضاد ہے اس لیے کہ جس کسی کے اندرون میں ہر چہار طرف بے قراری ہی بے قراری چھائی ہوئی ہو گی وہ عقل کو اپنے قریب ہرگز نہ آنے دے گا اور اگر آنے دے گا بھی تو صرف اس شکل میں کہ وہ اپنے وظیفہ حیات سے دستبردار ہو چکی ہو گی اور کسی بات پر بھی کیوں اور کیا نکالنے کی گستاخی نہ کرے گی۔ غرض عشق اسے اپنا فرمانبردار اور غلام بنا کر تو اپنے قریب رہنے دے سکتا ہے لیکن نگران اور پاسبان بن کر نہیں رہنے دے سکتا اور نہ اسے یہ حق دے سکتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ حدود پیش کر کے اس سے ان کی پابندی کا مطالبہ کرے۔ اور کہے کہ راہرو عشق کو ان کا پابند ہو کر سفر کرنا چاہیے۔ تیسری صدی عیسوی کے مشہور نو فلاطونی مفکر اور صوفی فلاطینوس کی جس کے افکار نے عیسائی تصوف پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے یہ بات کسی طرح غلط نہیں ہے کہ

عشق کی شراب سے انسانی عقل خراب ہو جاتی ہے۔

ثانیاً، عشق انسان میں اجتماعیت گریز رجحانات کی پرورش کرتا ہے اور اسے سخت قسم کا انفرادیت پسند بنا دیتا ہے اور پھر انفرادیت سے بھی پاک کر کے تصور حبیب میں گم کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے محبوب و مقصود کے سوا ہر شے کے وجود سے بلکہ خود اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو رہتا ہے۔
ثالثاً، عشق کے تسلط کے بعد انسان کے اندر سے توازن اور اعتدال پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے یہ اس لیے کہ عشق کا محمول ایک زبردست انجذابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ محبوب کی یاد اسے اس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے کہ اگر وہ گرد و پیش کی صداؤں پر کان دھرنا چاہے تو دھر نہیں سکتا۔ اس کی باگیں ایسے جوش جنون کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں جو ساری حد بندیوں کو آگ لگا دینے والا ہوتا ہے۔ آخر عشق تو جب نام ہی شورش قلب اور اضطراب باطن کا ہے۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

تو اس کے ساتھ توازن پسندی کہاں باقی رہ سکتی ہے؟
رابعاً، یہ کہ عشق میں مبتلا انسان آداب و رسوم اور ضوابط کا پابند نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کے تو دل و دماغ اور افکار و احساسات سبھی پر اپنے محبوب کا دل آویز تصور چھایا رہتا ہے اور وہ اسی ایک تصور کی کیفیتوں میں غرق رہتا ہے۔ قدرتی طور پر ایسے شخص کو باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں

رہ سکتا۔ اور جب اسے باہر کی دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہ سکتا تو سوسائٹی کے آداب و رسوم اور ضوابطہ و قوانین کو وہ کیا جانے کہ یہ کیا بلا ہیں؟

یہ ہے عشق کا مزاج، اب جس تصورِ دین کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہو اس کا مزاج مزاجِ عشق کے اس آئینے میں خود جھانک کر دیکھ لیجئے کہ کیا ہے؟

رہبانیت کے عملی تقاضے

رہبانیت کے سرچشمے اور اس کا مزاج بتلانے کے بعد اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ رہبانیت کے عملی تقاضے بتا سکیں۔ اس کے تقاضے کیا ہو سکتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تقاضے رہبانیت کے مزاج سے معلوم ہو سکتے ہیں یا پھر ان تجربات اور مشاہدات سے معلوم ہو سکتے ہیں جو رہبانیت کے عملی نتائج کے سلسلے میں تاریخِ ادیان نے فراہم کیے ہیں اور یا پھر رہبانیت کا لٹریچر یہ معلومات فراہم کر سکتا ہے ان تینوں بنیادوں سے کام لیتے ہوتے رہبانیت کے جن نمایاں تقاضوں تک نگاہ پہنچ سکتی ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

اوّلاً یہ کہ بندے کا مقصود بندگی از اوّل تا آخر اللہ تعالیٰ کا وصل اور دیدار ہے۔ عشق کی فطرت اور تصورِ عشق رکھنے والے مذاہب دونوں اس پر متفق ہیں۔ چنانچہ آپ سن چکے ہیں کہ عشق کی غایت وصل حبیب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں:

> اس حبِ عشقی کا بالذات لازمی تقاضا یہ ہے کہ بشریت کا حجاب چاک ہو جائے اور رُوح اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی سے جا ملے اور بس .... وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتی کہ انسان صاحبِ جلال خدا کے جمال کے مشاہدے میں فنا ہو رہے۔

اسی طرح مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے کے بعد کہ سلوک ولایت والوں پر حبِ عشقی غالب ہوتی ہے واضح کرتے ہیں کہ

> سلوک ولایت کی انتہا مقام رضا یا فنا الفنا ہے۔ (شریعت و طریقت)

غرض جس دین کا بنیادی تصور عشقِ الٰہی ہو اس کے نزدیک وصالِ الٰہی کا مقصود ہونا ایک بدیہی بات ہو گی۔ چنانچہ وہ مذاہب جو کسی نہ کسی رنگ میں یہ تصور رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسان کی غایت مقصود یہی بتاتا نظر آتا ہے اور بعض مذاہب تو اس معاملہ میں بالکل انتہا کو پہنچ گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب میں تصورِ نجات بھی قرآنی تصورِ نجات سے بالکل مختلف ہے۔

قرآنی تصورِ نجات تو یہ ہے کہ انسان عذابِ جہنم سے چھٹکارا پاجاتے جب کہ ان مذاہب میں نجات کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جسم کی قید سے چھٹکارا پاکر اس کی رُوح کا قطرہ رُوحِ خداوندی کے سمندر میں جاملے۔

ثانیاً، رہبانیت کا دوسرا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس دُنیا سے دور بھاگے۔ اجتماعیت کا تصور بھی اس پر بار ہو۔ اس تقاضے کے نمایاں اور عملی مطالبے تین ہیں۔

۱۔ عزلت	۲۔ تجرد	۳۔ ترک لذات

ان تینوں کے بارے میں واقعات کی شہادت ذرا تفصیل کی محتاج ہے۔

ثالثاً، رہبانیت کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان وحی و نبوت کی ضرورت سے بیگانہ ہو جاتے یا کم از کم یہ کہ اس کی صحیح قدر و اہمیت اور اصل حیثیت فراموش کر بیٹھے۔ یہ صورتِ حال جس بنا پر پیش آتی ہے وہ منطقی بھی ہے اور نفسیاتی بھی کیونکہ جس تصورِ دین کا سرچشمہ وحی الٰہی نہ ہو بلکہ انسان کا خود اپنا ہی ذہن و وجدان اس کا خالق ہو وہ وحی و رسالت کی ضرورت اور وہ بھی قرار واقعی ضرورت کا احساس قدرتی طور پر کر ہی نہیں سکتا۔ جو نظریہ اپنی اصل تشکیل ہی میں وحی کی ضرورت سے بے نیاز ہو وہ اپنی عملی تشکیل میں اس کا ضرورت مند کیوں ہوگا۔ فلاطینوس اس حقیقت کی ایک مکمل مثال ہے۔ اس کی زندگی اگرچہ عیسائی راہبوں کے مشابہ تھی لیکن وہ عیسائیت قبول نہ کر سکا، وجہ صرف یہ تھی کہ عیسائیت نجات کے لیے حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتی تھی جبکہ فلاطینوس کے نزدیک نجات کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہ تھی بلکہ خدا اور انسان کے درمیان بلا کسی واسطہ کے ربط پیدا کیا جاسکتا تھا۔

اسی طرح اس تصورِ دین عشقِ الٰہی کے ایک مشہور پنجابی علم بردار بابا کبیر داس فرماتے ہیں۔

ہم اسی ایک اللہ سے لو لگاتے ہیں جو بے نشان ہے نہ وہاں مندر کی ضرورت ہے نہ مسجد کی۔ وہاں وہ آپ ہی آپ موجود ہے اس کی پوجا کے لیے کسی خاص ریت رواج کی بھی ضرورت نہیں سچے گرو نے ہمیں دکھایا ہے کہ آدمی کا جسم ہی مسجد ہے اور یہی مندر ہے۔ اسی کے اندر بیٹھ کر ہم اللہ کی سیوا بندگی کر سکتے ہیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کے اندر ایشور کے وجود کا بھوجن بھرا ہوا ہے۔ اس میں ہم اچھی طرح نہا سکتے ہیں اور وضو کر کے وہیں پر اللہ کے سامنے نماز پڑھ سکتے ہیں ہمارا یہ جسم ہی مسجد ہے۔ ہمارے پانچوں حواس جماعت ہیں، ہمارا من ہی ملّا اور امام

ـــــــــــــــ

لہ تاریخ تصوف قبل از اسلام

ہے۔ اس امام کو سامنے رکھ کر ہمیں اس بے نشان خدا کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے اور اسی کو سلام کرنا چاہیے۔ (بحوالہ گیتا اور قرآن)

اگر آپ خدا پرستی کے اس طرز فکر کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو آپ محسوس کریں گے کہ عشق الٰہی کو بنائے دین قرار دینے کے بعد مرضیات الٰہی کی اور ان کے طریق حصول کی نوعیت یہی ہونی چاہیے۔ چنانچہ حضرت مولانا اسماعیل شہید حب عشقی کے آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس عشق کا بالذات تقاضا نہ تو یہ ہے کہ کسی قانون سے ہم آہنگی ہو خواہ قانون شرع ہو یا قانون اخلاق، نہ یہ ہے کہ کسی کی رضا جوئی کی جائے، چاہے اپنے محبوب کی رضا کا سوال ہو یا کسی اور کی اور نہ یہ ہے کہ کسی کی پیروی کا لازمی اہتمام کیا جائے خواہ اپنے محبوب کی پیروی ہو یا کسی دوسرے کی . . . . کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حب بالذات اس کی مقتضی نہیں اس کا فطری تقاضا تو یہ ہے کہ انسان خدائے ذوالجلال کے مشاہدے میں غرق ہو رہے چاہے جس طرح بھی یہ بات حاصل ہو اس کے لیے کسی خاص طریقے کی پابندی اس کا فطری تقاضا بالکل نہیں ہے مثلاً اگر صاحب عشق کا خیال ہو کہ مزامیر کے سننے سے یا عشق مجازی کے ذریعے یا شغل برزخ اختیار کر کے یا اپنے اوقات کو اذکار و طاعات سے خالی رکھ کر یا اسی طرح کے کسی دوسرے ممنوع شرعی کے ارتکاب سے اس کی مقصد برآری ہو سکتی ہے تو یقیناً اس کے دل کی گہرائیوں میں اس کام کی طرف ایک کشش پیدا ہو جائے گی۔ (صراط مستقیم)

مزید فرماتے ہیں:

اس حب عشقی کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان ظاہری علوم و طاعات سے بے نیاز ہو جائے۔ (ص: ۱۱)

یہ ہے رہبانیت کا حقیقی اور واقعی چہرہ، قرآن نے لا تحرموا طیبات ما احل اللّٰہ لکم کہہ کر اسی پر ضرب کاری لگائی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانو! زندگی کی جائز لذتیں اور راحتیں جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں ان کو حرام نہ کرو اور عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں بدھ مذہب کے بھکشوں، اور اشراقی متصوفین کی طرح رہبانیت اور قطع لذات کا طریقہ اختیار نہ کرو اور نہ خود حلال و حرام کے مختار بنو حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا ہے منشا یہ ہے کہ اسلام میں راہبانہ میلانات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو کچھ بھی تمہارے سامنے

ہے سب کچھ تمہارا ہے اور اسی لیے ہے کہ جس حد تک اپنی اکتسابی قوتوں کو بیدار کر کے تم ان سے استفادہ کرنا چاہو کر سکتے ہو کلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً اسلام کے اس رجائی صلائے عام اور حوصلہ پرور ندائے دوام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رہبانیت کے اس افسردہ قنوطی پیغام کو کوئی ادنیٰ اور معمولی مناسبت اسلام کے پیغام سے نہیں ہے رہبانیت میں غریب انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تیرے سامنے ہے اس میں کچھ بھی تیرا نہیں ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کا ارتقائی کمال اس سے گریز میں ہے حتیٰ کہ اسی رہبانیت نے کتنوں کے بدن سے کپڑے اتروا دیے، ان کے منہ سے لقمے چھینے گئے، ان پر پانی بند کیا گیا بلکہ کبھی کبھی اسی رہبانیت کے جنون نے اس حد تک ترقی کی کہ عام آدمی جو ہوا کے بغیر عام فطری حالات میں چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا ہے اسی کو حبس دم وغیرہ کے نام سے ہوا میں سانس لینے سے محروم کر دیا گیا۔ قرآن نے صاف صاف لفظوں میں مالا بد منہ ضروریات سے گزر کر آسائش و راحت، رفاہیت و زینت وغیرہ کے ساز و سامان تک کے متعلق صرف جواز کے فتوی پر قناعت نہیں کی بلکہ زینۃ اللہ اور الطیبات من الرزق کے استعمال سے گریز کرنے والوں پر یہ عتابی استفہام کیا ہے

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق

فقہائے محققین نے لکھا ہے کہ جو غذائیں اللہ نے حلال و طیب قرار دی ہیں انہیں چھوڑ دینے میں کوئی دینی فضیلت نہیں ہے جیسا کہ رہبانیت پسند لوگوں نے ترک لذائذ کو تقویٰ کا معیار سمجھ رکھا ہے الجصاص رقمطراز ہیں لا فضیلۃ فی الامتناع من اکلھا۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشتوں میں علاوہ بکری، بھیڑ، اونٹ کے مرغ کا گوشت بھی تناول فرمایا ہے۔ فواکہ اور شیرینی اور حلوے کی دوسری لذیذ قسمیں بھی آپ سے نوش فرمانا ثابت ہے۔ آیت میں کلوا کے امر و اجازت کا دائرہ صرف کھانے کی چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، سواری مکان، غرض برتنے کی ساری چیزیں اس کے اطلاق میں داخل ہیں۔ قرطبی رقمطراز ہیں کہ کھانا اس آیت میں فائدہ اٹھانے اور استعمال کرنے کے معنے میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پیو بس اتنا خیال رکھو کہ اسراف اور فخر نہ ہو۔ الجصاص ہی نے لکھا ہے کہ صحابہ میں سے حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت حسن، حضرت عبداللہ ابی اوفی، حضرت عمران بن حصین، حضرت انس بن مالک، حضرت ابوہریرہ اور مشہور تابعی قاضی شریح سے لباس میں پشمینہ کا استعمال ثابت ہے۔

نبوت رہبانیت کے خلاف ہے

رہبانیت پسند لوگوں کو دیکھ کر کچھ لوگوں میں بھی ایسا بننے کا داعیہ پیدا ہوا چنانچہ ایک بار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ کر عبادت کریں گے۔ گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے تمہارے نفس کے بھی تم پر حقوق ہیں، روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی، مجھے دیکھو میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں، روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی، بس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے پھر فرمایا کہ یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو اور خوشبو اور نیند کو اور دنیا کی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ میں نے تو تمہیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری و خلوت نشینی۔ ضبط نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے۔ رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد میں حاصل ہوتے ہیں اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو تم سے پہلے لوگ جو ہلاک ہوئے وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انہی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔

یہ داعیہ پیدا اس لیے ہوتا ہے کہ تصورِ عشق میں بے پناہ نفسیاتی کشش اور وسیع مقبولیت ہے چونکہ رہبانیت کا تعلق عقل سے نہیں بلکہ جذبات سے ہے اس لیے عام انسان بڑی آسانی سے اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ دین کا یہ تصور نامعلوم مدت سے دین و خدا پرستی پر اپنا گہرا نقش ثبت کرتا چلا آرہا ہے اور آج اس کے شعوری پیروؤں کی تعداد بھی حدِ شمار سے باہر ہے۔ رہا اس سے غیر شعوری طور پر اثر قبول کر لینے کا معاملہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی حدیں کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

بہر حال اللہ کی معرفت، اور وصول الی اللہ کی دو راہیں ہیں۔ ایک قرآن و سنت کی بتائی ہوئی اور دوسری رہبانیت کے ذریعے لوگوں کی بنائی ہوئی۔ خود ہمارے بزرگوں نے کھلے سینہ کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحی الٰہی اور تعلیمات نبوت نے تلقین فرمائی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو الہام اور معارف اولیاء نے متعین کیا ہے۔ (التفہیمات الالٰہیہ ص ۲۸ جلد دوم)

فیوض الحرمین میں مزید توضیح فرماتے ہیں:

خدا رسیدگی کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو وہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے مخلوق تک پہنچا ہے، دوسرا وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ہے۔ اس جہت سے کہ وہ اسی کے وجود میں لانے سے وجود میں آیا ہے اور اسی کے فیضان تخلیق کا ایک راست ظہور ہے۔ اصلاً اس طریقہ میں کوئی بھی درمیانی واسطہ نہیں۔ (فیوض الحرمین)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ طریق نبوت کے متوازی بندگی اور خدا رسیدگی کا ایک اور راستہ طریق ولایت بھی تسلیم کیا جا چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس دوسرے طریقے کی بنیاد وحی الٰہی اور تعلیمات قرآنی پر نہیں بلکہ حضرات اولیاء کرام کے کشف والہام پر ہے جبکہ طریق نبوت کی بنیاد سر تا سر وحی اور قرآنی تعلیمات پر ہے۔ دونوں راستوں کی نوعیتوں میں اس فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں کے جیسے آداب و شرائط مختلف ہوں ایسے ہی ان کے نتائج و ثمرات بھی مختلف ہوں۔ ان کی عابدانہ اور نیازمندانہ قدریں اور ان کے معیار بھی مختلف ہوں اور آخری بات یہ کہ ان کے بنائے ہوئے ذہنی سانچے اور خدا پرستی کے عملی نمونے بھی مختلف ہوں چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں:

سلوک دو قسم پر ہے سلوک نبوت اور سلوک ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں ..... اولیاء میں سے کسی پر کسی وقت فیض نبوت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی فیض ولایت کا۔

(مبادی تصوف بحوالہ شریعت اور طریقت)

اس کے بعد موصوف نے دونوں طریقوں کے آثار و خواص کی کچھ تفصیل دی ہے جس کے بعض اجزاء ترتیب کے تغیر کے ساتھ یہ ہیں:

طریق ولایت والوں سے شرائع میں کبھی تسامح بھی ہو جاتا ہے اور وہ معذور رہیں ان کو اپنے مکاشفات اور تحقیقات پر اعتماد اور اس پر عمل کرتے ہیں اگر خلاف شرع

نہ ہو۔ شیخ کو سارے جہاں سے افضل سمجھتے اور اس پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان پر سکر یعنی عالم بے خودی غالب ہوتا ہے۔ سلوک مقام کی انتہا مقام رضا یا فناء الفنا ہے۔ جب کہ طریق نبوت والے شریعت پر بڑی پختگی سے عمل کرتے ہیں، ان پر ادب غالب ہوتا ہے جیسا کہ اس پر اپنی طرف سے بذریعہ کشف وغیرہ کچھ نہیں بڑھاتے اگرچہ وہ زیادت خلاف شرع نہ ہو۔ شیخ کی افضلیت کا یقین نہیں کرتے، محبت کرتے ہیں ان پر صحو عالم ہوش غالب ہوتا ہے سلوک نبوت کی انتہا مقام عبودیت ہے۔

حضرت اقدس کے الفاظ اگرچہ بہت محتاط ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اندر یہ تو موجود ہی ہے کہ "طریق ولایت والوں سے شرائع میں کبھی تسامح ہو جاتا ہے"۔ پھر اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت اقدس کے اس تبصرے اور اظہار حال کا تعلق سارے اہل ولایت سے نہیں ہے بلکہ ان میں کے صرف محتاط لوگوں اور شریعت کا پاس و لحاظ رکھنے والے بزرگوں ہی سے ہے ورنہ جہاں تک غیر محتاط اور غالی قسم کے لوگوں کا تعلق ہے۔ وہ حضرت اقدس کی تحقیق کے مطابق بھی شرائع میں صرف تسامح ہی کے نہیں بلکہ ان کی کھلی ہوئی ناقدری کے مرتکب ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:

غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں ظاہری احکام ہیں۔ تصوف علم باطن ہے ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن و حدیث کی ضرورت نہیں ہے۔

(شریعت و طریقت)

حافظ ابن تیمیہ اس سے بھی زیادہ دہشت انگیز صورت واقعہ کی اطلاع دیتے ہیں۔

کتنے ہی نام نہاد صوفیوں اور درویشوں کو تم پاؤ گے کہ وہ شریعت اور علم دین کو بالکل ہیچ سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے خیال میں وہ شخص جو ان چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوتے ہو اللہ تعالیٰ سے یکسر بے تعلق ہوتا ہے اور اس کے دامن میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہی نہیں ہے جو اسے اللہ کی بارگاہ میں فائدہ پہنچا سکے۔

(اقتضاء الصراط المستقیم)

غرض یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ طریق ولایت اختیار کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا پرستی اور خدا رسیدگی کے معاملے میں قرآن و سنت ہی کی پیروی کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ چاہے ان کا نام غالی نام نہاد یا گمراہ صوفی رکھیں۔ پھر جہاں تک محتاط اور پاس شریعت

رکھنے والے اہل ولایت کا تعلق ہے۔ ان کا معاملہ بھی صرف اسی بات تک پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا کہ انہوں نے طریق ولایت کو اختیار فرمالیا جو قدرتی طور پر اپنے لوازم و مقتضیات اور آثار و خواص میں اس سے بہت کم مختلف ہے بلکہ کتنوں ہی کی نگاہ میں یہی طریقہ افضلیت رکھتا ہے اور اسے طریق نبوت پر برتری حاصل ہے۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :

اس میں گفتگو ہے کہ نبوت افضل ہے یا ولایت مگر اس پر اتفاق ہے کہ ولی سے نبی افضل ہے کیونکہ وہ نبوت اور ولایت کے جامع ہیں جو حضرات نبوت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ نبی کی افضلیت سے استدلال کرتے ہیں اور جو ولایت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ولایت میں توجہ الی الحق ہے اور نبوت میں توجہ الی المخلوق، چونکہ خدا کی طرف توجہ مخلوق کی طرف توجہ کرنے سے افضل ہے پس ولایت افضل ہے۔

(مبادی تصوف بحوالہ شریعت و طریقت)

یہ ولایت اور طریق ولایت کی افضلیت ہی کا نظریہ تھا جس کے تحت ایک بزرگ نے فرمایا ہے

اصحاب کہف کو قرآن نے فتیۃ "مردان خدا" اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ اللہ پر براہِ راست اور کسی واسطہ کے بغیر ایمان لاتے تھے۔ (رسالہ قشیریہ)

بہرحال قرآن نے اس آیت میں رہبانیت کے نظریہ پر یہ کہہ کر ضرب کاری لگائی ہے لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم یہ عیسائیوں کا نظریہ تھا۔

اللہ رحمتوں کی بارش نازل کرے مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور مولانا اشرف علی کی قبروں پر جنہوں نے دونوں راستوں کو الگ الگ کر دیا اور تصوف سے ان تمام چیزوں کو نکال دیا جو خلاف سنت تھیں اور جن کو باقی رکھا ہے ان کی حیثیت غذا کی نہیں بلکہ دوا کی ہے۔ ان بزرگوں نے اس موضوع پر جو مجددانہ کارنامہ انجام دیا ہے یہاں اسے پیش کرنا ایک طویل فرصت چاہتا ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب نے اچھوتے انداز میں ان بزرگوں کے علمی سرمایہ کو مسلک علماء دیوبند میں اس طرح پیش فرمایا ہے :

حضرات صوفیاء اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز کی محبت و عقیدت ـــــ ان کے مسلک پر بلاشبہ ایک شرعی حقیقت ہے مگر اس میں غلو و مبالغہ، رسم بندی اور زمان و مکان کی قید و بند اور از خود حدود سازی محض رواجی چیز ہے ممکن ہے ایسی

چیزیں کسی صاحب حال اور مخلص سے ابتداءً اتفاقیہ عمل میں آئی ہوں مگر بعد والے بے بصیرت عقیدت مندوں اور بے شعور عشاق نے انہیں ایک مستقل اصول اور قانون کے انداز سے بے پڑھے لکھے عوام میں بنام شریعت و اسلام پھیلا دیا جس سے انہوں نے بعد میں ایک جزوِ شریعت بلکہ اصل شریعت کی صورت اختیار کرلی بہر حال اس قسم کی رواجی صورتیں بے بصیرت اہل محبت کے اندر سے نکلی ہوئی ہیں۔ باشعور اور مبصر عشاق کے جذبات سے جو خدا و رسول کی پیروی سے پیدا شدہ ہوں نکل ہوئی نہیں ہیں اس لیے جو مسلک بھی شعوری انداز کا ہوگا وہ اس فرق کو ہر مقام پر محسوس کرے گا۔ حاصل یہ ہے کہ ان کے مسلک میں تعظیم اولیاء اللہ جزوِ دین ہے۔ رسم بندی جزو دین نہیں ہے، احترام آثار دین میں سے ہے عبادت آثار دین میں سے نہیں ہے۔ رسوم پیغمبر اصل دین ہیں، ان کے متوازی من گھڑت رسوم دین نہیں ہیں۔

آگے فرماتے ہیں:

بہر حال اتباعِ سنت علمارِ دیوبند کے مسلک میں اصل ہے جسے وہ ہر حالت میں قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، خلاف سنت امور جن کی کتاب و سنت میں کوئی اصل نہ ہو یا عارفان شریعت کے تعامل اور ذوق کے دائرے میں اس کا کوئی ماخذ نہ ملتا ہو یا ایسی رواجی عادات جنہیں دین کے نام پر رسوم دین باور کرایا جاتا ہو درآں حالیکہ دین یا دینی ذوق میں ان کی کوئی بنیاد نہ ہو، ان کے نزدیک قابلِ رد و انکار ہیں اس لیے اس قسم کی بدعات و اختراعات سے الگ رہ کر اتباعِ سنت اور ادبِ طریق ہی علمارِ دیوبند کا مسلک ہے۔

اور فرماتے ہیں:

بعض لوگ سننِ نبوت پر عمل کا نام لے کر معمولاتِ اولیاء کو تحقیر سے رد کردیتے ہیں اور بعض لوگ اولیاء کے سلوک راستوں کو سامنے رکھ کر سننِ نبوت کو نذرِ بے التفاتی کر دیتے ہیں لیکن علمارِ دیوبند اپنے مسلک میں ان دونوں سے الگ درمیانہ نقطہ اعتدال رکھتے ہیں، ان کے یہاں اصل اصول اتباع سنت ہے لیکن معمولات مشائخ بھی جس حد تک غلبہ حال یا سکر کے دائرے میں نہ ہوں بے اعتنائی اور بے توجہی کے مستحق نہیں ہوسکتے بلکہ وہ سننِ انبیاء کی عملی مشق کے ثمرات و نتائج ہوتے ہیں یا

ان کے لیے مبادی واسباب جن سے سنن انبیاء پر چلنے کی توفیق ہوتی ہے اس لیے ان سے بے التفاتی محرومی ہے البتہ وہ شریعت نہیں ہوتے کہ شرائع کی طرح ان کی تبلیغ ذریعہ کو اسٹیج کا موضوع بنالیا جائے جس سے سنت نبوی جو اصل مقصد ہے غیر اہم ہو کر رہ جائے
(مسلک علمائے دیوبند)

دوسرا دین کا غلط تصور وہ ہے جو یہودی پیش کر رہے ہیں یعنی یہ کہ انسان کو دُنیا سے منہ موڑ لینے اور اپنے نفس کو مار ڈالنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے دُنیا کو برتتے ہوتے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوتے خدا کی عبادت کرنی چاہیے رہے دنیوی معاملات اور مسائل تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے متعینہ ہدایتیں دیتا ہے جن کی پوری پوری پابندی کرنی چاہیے ۔ باقی زندگی میں وہ آزاد ہے کیونکہ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا کام نہیں ہے اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان کا ایک نجی معاملہ ہے جو دُنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرتا ہے نہ اسے کوئی تعرض کرنا چاہیے، ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے خدا اور مذہب کو اس سے بحث نہیں ہے ۔ اسی غلط تصور کی تردید کے لیے لا تعتدوا ان اللّٰہ لا یحب المعتدین کی بلیغ تعبیر اختیار فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ یہ نظریہ اسلام پر راست نہیں آتا ہے وہ اس طرح کا دین نہیں ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کا بس ایک نجی معاملہ ہو اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہوتیں ۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا ، نماز روزے کا حکم دیتا ۔ چند اخلاقیات کی تلقین کرتا ، کچھ معاشرتی ہدایتیں دے دیتا پھر خاموش ہو رہتا مگر نبوت کے علم و عمل کا ایک ایک گوشہ گواہ ہے کہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے ۔ اسلام کی مسند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں ہی میں بچھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں ، کاروباری اداروں ، معاشی میدانوں ، تمدن کے دائروں ، سیاست و حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایتیں دیتا ، کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا نظر آتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو وہ دین سے باہر کہتا ہو مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو کوڑے مارو ۔ اس کا یہ حکم صریح طور پر ایسا ہے جس کا تعلق پولیس ، عدالت اور حکومت سے ہے اس لیے وہ بداہتہً اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے لیکن اس حکم کی حیثیت وہ اللّٰہ کے دین کی بتاتا ہے لا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللّٰہ
اس سے معلوم ہوا کہ کوڑے لگانے کا حکم بھی دین ہی کا ایک حصہ ہے ۔ یہ ایک مثال اس حقیقت کو

کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول کا ہر ارشاد اسلامی نظام کا حصہ اور دین کا جزو ہے۔

قرآن یہودیوں کے اسی غلط طرزِ عمل کو عدوان کہتا ہے اور اسی کو یہاں اہلِ ایمان کو ممانعت کی گئی ہے۔ اس طرح اس آیت میں عیسائیوں کے افراط اور یہودیوں کی تفریط دونوں سے بچنے کا اہلِ ایمان کو حکم ہوا۔ افراط و تفریط نہ ہو تو اسی کا نام اعتدال ہے۔ اب بھی ہماری زندگی کا المیہ یہی دو ہیں افراط و تفریط، ہمارے دیندار افراط کی بیماری کا اور ہمارا دنیادار طبقہ تفریط کی بیماری کا شکار ہے اور ہمارے عوام ان دو ہی میں بٹے ہوتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ تفریط کی حد تک اگر ایک طرف دنیا دار مسلمان تمدن، معیشت اور سیاست کے میدانوں میں اپنی اغراض اور جاہ طلبیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اسلام بازاروں، منڈیوں، عدالتوں، قانون ساز اداروں اور حکومت کے ایوانوں میں رہ کر ان کے اعمال و افکار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے اور پھر اپنی اس نامبارک روش پر پردہ ڈالنے کے لیے پوری شدت سے یہ پُرفریب نعرے بھی لگاتے رہتے ہیں کہ مذہب ہر شخص کی ایک مقدس مگر ذاتی متاع ہے اسے دنیوی معاملات میں دخیل بنانا اور گھسیٹتے پھرنا اس کی عظمت کی توہین کرنا ہے۔ تو دوسری طرف مخلص حاملان دین کو بھی اس صورت حال پر کوئی بے چینی محسوس نہیں ہوتی، حالانکہ ان کے سینوں میں خدا سے تعلق بھی ہے اور اسلام کا درد بھی ہے اور دین کے معاملے میں ان کے احساسات بھی بڑے ہی نازک ہیں۔ یہ دو ہی باتوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے اولاً اس بات کا مفادِ آخرت پر مفادِ دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے اور اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع اور مصالح کو آجل کے مقابلہ میں عاجل کو اپنانے کی بیماری پیدا ہو گئی ہے یہی قرآن کی زبان میں اعتداء ہے، کیونکہ اس سے امت ایک با اصول بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے مقام سے گر کر ایک بے اصول ناقابلِ اعتبار ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی دنی سطح پر آجاتی ہے جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع و مصالح، اور اغراض و مفادات اس کی زندگی کا نصب العین ہو جاتے ہیں یہ دنیادار مسلمانوں کا معاملہ ہے۔

ثانیاً اس بات کا کہ للّٰہیت اور آخرت پسندی کے باوجود کسی خاص دینی فلسفہ کے زیر اثر اسلام کی ہمہ گیری کو فراموش کر دیا گیا اور اس کے اجتماعی احکام کو دائرۂ دین اور عبادت کے معاملہ میں نامطلوب خیال کر لیا گیا ہے اور یہی اہلِ صلاح و تقویٰ کا معاملہ ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا
عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ
مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا
حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

تمہاری قسموں میں لغو قسموں پر اللہ تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا[۱۴۶]، لیکن ان قسموں پر ضرور مواخذہ کرے گا جنہیں تم نے جان بوجھ کر کھایا ہو[۱۴۷]۔ لہٰذا ایسی قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یہ کھانا درمیانے درجہ کا ہو، جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑے پہنا دینا یا ایک غلام آزاد کر دینا[۱۴۸]، اور جس کو یہ دستیاب نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب

تم قسم کھا بیٹھو[۱۷۹]۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو[۱۸۰]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے
احکام تمہارے لیے واضح کرتا ہے شاید تم شکر ادا کرو[۱۸۱]۔

تحریم کی ایک صورت قسم بھی ہے

گزشتہ آیات میں بتایا تھا کہ مسلمان دنیا کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے مادے کو اپنی روح کا قفس نہ گمان کرے۔ اپنی جبلی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت خیال نہ کرے، دو لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو رہنے، دُنیا چھوڑ دینے اور اللہ کو پالینے کے لیے گوشوں میں بیٹھ رہنے کی وہ روش اختیار نہ کرے جسے رہبانیت کہتے ہیں نہ کسی جائز لذت سے بہ قصد قربت حق اپنے کو ہمیشہ کے لیے محروم کرے اور نہ حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی قسمیں کھائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ قدرت کی ان نعمتوں سے گریز کو تقدس و پارسائی سمجھ لیں گے ان کے کراہت زدہ قلوب میں اُخروی نعمتوں کی قدر و قیمت کا وزن بھی نہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ مسلمانوں کے سب سے بڑے روحانی قائد سید الانبیاء تک کو قرآن نے یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے جس کا یہی مطلب ہے کہ روحانیت کے بلند سے بلند مقام تک میں ان چیزوں سے گریز جنہیں قدرت نے معاشی استفادے کے لیے پیدا کیا ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ مسائل حیات سے پوری طرح متعلق رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے۔ اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و بیدار رکھے۔ اپنے جبلی مطالبات کو مناسب حدود کے اندر پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے۔ اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔ اپنے فریضہ حیات کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھ کر کرے، دینی ذوق کے ساتھ کرے اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے میں دینداری کا نقصان ہے کمال بندگی سے محرومی ہے، عتاب الٰہی کا اندیشہ ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر قسم کھا کر کوئی چیز حلال اپنے اوپر حرام کر لی تو وہ اسے توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔ کیونکہ قسم بھی تحریم ہی کی ایک صورت ہے۔

۱۶۶ا۔ تمہاری قسموں میں لغو قسموں پر اللہ تمہارا مواخذہ نہ کرے گا۔ یعنی ان قسموں پر دنیا میں کفارہ نہیں جیسا کہ یمین منعقدہ میں واجب ہے لغو و بیہودہ قسم کی تفسیر دوسرے پارے میں گزر چکی ہے چونکہ اوپر تحریم طیبات کا ذکر تھا اور تحریم کی ایک قسم یمین بھی ہے اس لیے یمین کے احکام بیان کیے جاتے ہیں[1]

تعبیر کا انداز کہہ رہا ہے کہ یہ کسی اٹھے ہوتے سوال کا جواب ہے چنانچہ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی یا ایہا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ..الخ، تو صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہماری ان قسموں کا کیا بنے گا کہ جو ہم عورتوں کو اور گوشت وغیرہ کے حرام کرنے کے بارے میں کھا بیٹھے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی بنا پر بعض علماء نے یمین لغو اس قسم کو قرار دیا ہے جس میں کوئی شخص کسی حلال کو قسم کے ذریعہ اپنے لیے حرام کرے چنانچہ سعید بن جبیر کی یہی رائے ہے ورنہ لغو اور بیہودہ قسم تو یہی ہے کہ منہ سے عادت اور عرف کے مطابق بے ساختہ اور ناخواستہ نکل جاتے اور دل کو خبر تک نہ ہو ایسی قسم کا نہ کفارہ ہے نہ اس میں گناہ ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ آیت اس شخص کے بارے میں ہے جو لا واللہ، بلی واللہ، کلا واللہ جیسے الفاظ بولتا رہتا ہے یعنی بیہودہ طور پر منہ سے یہ الفاظ بغیر ارادے کے نکل جاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لغو کے موضوع پر سارے اقوال سمیٹ دیے ہیں اور قول راجح اسی کو قرار دیا ہے یہی امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

لغو قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے بالا قرار دیا ہے لیکن اس کے لیے لغو کی تعبیر اختیار کر کے اشارہ کر دیا ہے کہ بلند اخلاقی اور پاکبازی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے بچ کر رہے۔ زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیے ملی ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنے درست ہوں پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں۔ قرآن میں شائستہ لوگوں کے اوصاف میں یہ بات بتائی گئی ہے والذین ہم عن اللغو معرضون ۔ یعنی فضول باتوں سے اعراض کرنا وقار کی نشانی ہے۔ لغو کی حیثیت اقوال اور گفتگو میں بالکل وہی ہے جو افعال اور کردار میں عبث کی ہے۔

ابوبکر الجصاص رازی نے اس موقعہ پر ایک مفید بات لکھی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر قرآن میں لفظ لغو استعمال کیا ہے اور ہر موقعہ پر لغو کے معنے مقام اور موقع کے لحاظ سے الگ ہیں مثلاً بری بات کے معنے میں ہے لا تسمع فیہا لاغیۃ بیکار کے معنے میں ہے اذا مروا باللغو مروا کراماً، اسی طرح سلف صالحین سے لغو کے معنے یمین کی حد تک ایک سے زیادہ منقول ہوتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی کسی بات پر قسم کھائے کہ وہ ہے اور وہ جانتا ہو کہ ہے لیکن واقعہ میں نہ ہو، یہی معنے امام مجاہد اور ابراہیم نخعی سے ثابت ہیں، اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ دوران گفتگو بطور تکیہ کلام لا واللہ بلی واللہ بول دیا جاتے۔ ہمارے نزدیک اس کا منشا ماضی پر قسم کھانے سے روکنا ہے۔ چنانچہ حضرت عطا نے حضرت عائشہ سے منسوب کر کے انکشاف فرمایا ہے کہ آدمی کا یہ کہنا کہ بخدا ہم نے یہ نہیں کیا تھا اور بخدا ہم نے ایسا بنایا تھا یمین لغو ہے۔ امام حسن بصری اور امام شعبی نے بھی یہی معنے بتائے ہیں۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی حرام پر قسم اٹھاتے۔ چونکہ یمین لغو میں ان سب معانی کی گنجائش ہے اور سب جانتے ہیں کہ البقرہ میں و لکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم کا اور یہاں ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان کا عطف لا یواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم پر ہے دل کی کمائی اور عقد یہی ہے کہ جھوٹ اور گناہ پر مشتمل قسم ہو اس لیے ضروری ہے کہ اس میں مواخذہ سے مراد آخرت کا مواخذہ ہے۔

قابل مواخذہ قسمیں

۱۷۷۔ لیکن ان قسموں پر ضرور مواخذہ کرے گا جنہیں تم نے جان بوجھ کر کھایا ہو۔ قسم کی تین قسمیں ہیں۔ یمین لغو، یمین غموس اور یمین منعقدہ۔ لغو کے معنے بیان ہو چکے ہیں۔ یمین غموس یہ ہے کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم کھائی جائے اور بالارادہ کھائی جائے ان دونوں میں کفارہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان کی قانونی سزا کوئی نہیں ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ آخرت میں بھی کوئی سزا نہیں ہے قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ اوّل تو بے ضرورت قسم کھانا ہی بُرا ہے پھر جھوٹی قسمیں کھانا اور بھی بُرا ہے اسی لیے قرآن میں اس قسم کی قسم کھانے اور قسم کھانے والوں کی بہت بُرائی آئی ہے۔ یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ اس لیے اگر تم نے کسی آئندہ بات پر قسم کھالی تو یہ بھی من جملہ عقود کے ایک عقد ہے اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ جب تم نے کسی بھی شخص سے خدا کو درمیان میں ڈال کر مستقبل کے بارے کوئی قول قرار کر لیا تو یہ عہد اللہ ہو گیا ہے یعنی ایسا عہد جس کے لیے تم اللہ کے ذمہ دار ہو گئے ہو اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی وجہ سے پورا نہ کر سکے گا تو وہ عند اللہ گنہ گار ہے

اور اس پر کفارہ ہے، اسی کو یمین منعقدہ کہتے ہیں خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو۔ پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کر دے گا۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو۔ فرمایا درخت اراک کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت انس صحابی کہتے ہیں کہ بڑے بڑے گناہ یہ ہیں خدا کا شریک بنانا، ماں اور باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا ایک اور حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا جس شخص سے قسم کہلوائی جاتے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔ چہرہ کی خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا، اور بڑی ڈھٹائی دکھائی جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

قسموں کا کفارہ

۱۷۸۔ لہٰذا ایسی قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یہ کھانا درمیانے درجہ کا ہو جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنا دینا یا ایک غلام کو آزاد کر دینا۔ یعنی قسم توڑنے کے بعد یہ کفارہ دیا جائے گا۔ کھانا دینے میں اختیار ہے خواہ دس مساکین کو گھر بلا کر بٹھا کر کھانا کھلا دے یا صدقہ فطر کے برابر ہر مسکین کو غلہ یا اس کی قیمت دے دے اور کپڑا اس قدر جس سے بدن کا اکثر حصہ ڈھک جائے مثلاً کرتہ پاجامہ یا لنگی اور چادر اور غلام میں مومن ہونے کی شرط نہیں ہے[1]

قسم کے توڑ دینے کی صورت میں تین قسم کی نیکیاں اس کا کفارہ ہو سکتی ہیں اور ان تینوں میں اس کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

اول یہ کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، کتنا اور کیسا اور کس طرح، ان تینوں سوالوں کے جواب سے قرآن نے بظاہر خاموشی اختیار کی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو قرآن میں ہی اس کا جواب ہے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے دس مساکین کو کھانا کھلانا فرمایا ہے تو اس سے مقصود دس کا پیٹ بھرنا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک مسکین کا جتنی مقدار میں پیٹ بھر سکتا ہے آٹا دینا چاہیے۔ احناف نے ایک مسکین کے صدقہ پونے دو سیر گندم کی مقدار طعام کے لحاظ سے کی ہے وہ دور زمانہ تبادل اجناس تھا۔ جنس کے تبادلہ کے ذریعے طعام یعنی روٹی سالن مہیا ہوتا تھا۔ احناف اس کی اجازت دیتے ہیں کہ ایک ہی مسکین کو دس روز تک کھانا کھلا دے جبکہ دوسرے ائمہ دس مسکینوں کی تعداد کو ضروری بتاتے ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب قرآن نے من اوسط ما تطعمون اھلیکم میں دیا ہے یعنی وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو۔ یعنی نہ تو ادنیٰ درجہ کا ہو جو کبھی کبھار گھروں میں ہوتا ہے اور نہ ایسا اعلیٰ درجہ کا ہو جو معزز مہمانوں کی آمد کے موقعہ پر تیار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی گھر میں گیہوں کی روٹی اور سبزی گوشت عموماً کھایا جاتا ہے تو یہی کھلانا چاہیے آیت میں لفظ طعام آیا ہے۔ لغت میں اس کے دونوں معنے آتے ہیں کھانا دینا اور کھانا کھلانا۔ اس لیے فقہاء نے اس میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ تملیک و اباحت دونوں جائز ہیں۔ یعنی کفارہ دینے والے کو دونوں باتوں کا اختیار ہے چاہے تو دس مسکینوں کو گھر بلا کر کھانا کھلا دے اور چاہے تو کھانا ان کی ملکیت میں دے دے۔ مگر اباحت یعنی گھر بلا کر کھانا کھلانے کی صورت میں ضروری ہے کہ متوسط درجہ کا کھانا ہو جو عادۃً اپنے گھر کھاتا ہے دس مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھلائے اور تملیک کی صورت میں ایک مسکین کو پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت دے دے۔

دوسرے یہ کہ دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے۔ اصل ارشاد میں لفظ کسوہ آیا ہے۔ کسوہ کے معنے پہنا دینے کے آتے ہیں، اتنا کپڑا جو ستر پوشی کر سکے، ایک پاجامہ کرتہ یا ایک چادر اور تہ بند دے دے۔ امام الحسن اور ابن سیرین دو کپڑوں کو واجب کہتے ہیں۔ اور امام ابوجعفر باقر، امام عطاؒ، امام ابراہیم نخعیؒ ایک کپڑا واجب بتاتے ہیں۔ امام مالک اور امام احمد اتنا کپڑا واجب بتاتے ہیں جس میں نماز ہو سکے۔ سب کا حاصل یہی ہے کہ بقدر ستر پوشی دینا ضروری ہے۔

تیسرے یہ کہ غلام آزاد کرے۔ اس میں فقہاءؒ کا اختلاف ہے کہ کفارہ یمین میں آزاد ہونے والے غلام کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں ہے مومن ہو یا کافر سب کی آزادی کفارہ ہو سکتی ہے کیونکہ قرآن میں ایسی کوئی قید نہیں ہے لیکن امام مالک، امام شافعی، امام احمد کہتے ہیں کہ مسلمان ہونا ضروری ہے۔ وہ مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہیں۔ قتل و ظہار کے کفارہ میں فتحریر رقبۃ مومنۃ آیا ہے جیسے اشھدوا اذا تبایعتم میں گواہوں کے مسلمان ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ دوسرے موقعہ پر اشھدوا ذوی عدل منکم آیا ہے اور ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ قسم توڑنے کا جرمانہ نہیں ہے بلکہ توبہ اور کفارہ ہے۔ جرمانہ میں ندامت اور شرمساری اور

اصلاح نفس کی کوئی رُوح نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت کارِ خیر کے ذریعہ سے اس کا اثر اپنی رُوح سے دھوئے اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے اس طرح کفارے میں عبادت کی حیثیت آجاتی ہے اور عبادت ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ آزاد ہونے والا اہلِ ایمان میں سے ہو۔

قسم کے کفارے میں روزہ

۱۷۹۔ اور جس کو یہ دستیاب نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا بیٹھو۔ یعنی متواتر روزے تین دن کے رکھے۔ اور میسر نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ صاحبِ نصاب نہ ہو کما فی روح المعانی[1]

احناف اور حنابلہ نے روزوں میں پے درپے ہونے کی شرط لگائی ہے۔ ان بزرگوں نے بعض قرارت میں ایام متتابعات کی تصریح کی وجہ سے پے درپے کی قید لگائی ہے۔ لیکن امام شافعی اس قید کو نہیں مانتے اور اس نوع کی شاذ قرارت کو قابلِ استدلال بھی نہیں سمجھتے۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو ان تین میں سے کسی ایک پر مقدرت نہ ہو یعنی جو شخص بوجہ افلاس دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دینے اور غلام آزاد کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی قسم کا کفارہ تین دن کے روزے ہیں۔ روزوں کا رکھنا ایک رعائتی کفارہ ہے۔ جونہی عدم مقدرت کا عذر ختم ہو جائے گا رعایت بھی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ فقہا نے لکھا ہے کہ کسی نے کفارہ کے روزے شروع کیے اور دو روزے ہو بھی چکے تھے کہ اسے طعام یا لباس کی مقدرت حاصل ہو گئی تو اب تیسرا روزہ رکھنے کے بجائے اسے اصل کفارہ ہی دینا چاہیے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قسم توڑنے سے پہلے بھی کفارہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں دیا جا سکتا ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ کفارے کا وجوب قسم توڑنے کے وقت ہوتا ہے۔

قسموں کی حفاظت کا مطلب

۱۸۰۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ قسموں کی حفاظت یہ ہے کہ بے ضرورت بات بات پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قسمیں نہ کھائے یہ عادت بھلی نہیں ہے اور اگر قسم کھالی تو مقدور بھر پوری کرے اور اگر کسی وجہ سے توڑ دی تو کفارہ ادا کرے یہ سب چیزیں حفاظت یمین میں داخل ہیں [1]

قسم کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں ایک یہ کہ قسم کو صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اسے یاد رکھے ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے، تیسرے یہ کہ جب کسی معاملہ میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ [2]

اصل ارشاد میں احفظوا ایمانکم آیا ہے حفظ کے معنے نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ حفاظت یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی ہے اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کر سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ دینا اور کفارہ ادا کر دینا درست ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

قد فرض اللہ تحلۃ ایمانکم

احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے مثلاً صحیحین اور مسند احمد میں عبدالرحمٰن بن سمرہ کے حوالہ سے ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ

عبدالرحمان جب تو قسم اٹھائے بعد میں تجھے اسی کام میں بھلائی معلوم ہو تو بھلائی والا کام کر اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔

حافظ سیوطی نے اکلیل میں تا مقدور قسم توڑنے سے بچنے کو ہی قسم کی حفاظت قرار دیا ہے، ہاں یہ کہ قسم توڑنے ہی میں بھلائی ہو اور زیادہ قسموں کے کھانے سے بچ کر رہنا بھی اس میں داخل ہے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے حد درجہ بے اعتبار اور ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بہت بڑا عیب

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن۔

بتایا ہے۔ ارشاد ہے:

ولا تطع کل حلاف مھین

بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہا نہ مان

سوچنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس پر اعتبار کریں، لیکن اللہ تعالیٰ اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان کرتا ہے۔

غیر اللہ کی قسم حرام ہے

قسم کے مسائل میں بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کے علاوہ قسم جائز نہیں ہے اور یہ بھی قسموں کی حفاظت ہے۔ شیخین نے صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حفظان قسم کے سلسلے میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا

سن لو جس کو قسم کھانا ہی ہو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی قسم کھائے۔ قریش کی عادت تھی کہ وہ اپنے باپ دادوں کی قسم کھاتے تھے۔ آپ نے منع فرمادیا کہ ان کے نام کی قسمیں مت کھایا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قسمیں کھانے کی عادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں، لہٰذا بے ضرورت قسمیں نہ کھائی جائیں۔ اور اگر کسی مجبوری سے قسم کھانی ہی ہو تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی قسم کھائی جائے باپ دادے اور کسی کی قسم نہ کھائی جائے۔ حافظ ابن عبدالبر رقمطراز ہیں کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کے ناجائز ہونے پر اجماع ہے۔ علامہ شامی نے بھی اسے بالاتفاق مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ لڑکپن میں ہمیں اس بات پر تنبیہہ کی جاتی تھی کہ ہم باہم گفتگو میں شہادت یا عہد وغیرہ کے الفاظ بے محابا استعمال نہ کریں تاکہ ان کی اہمیت ہمارے ذہنوں سے نہ نکل جائے۔

ابوداؤد اور ترمذی میں یہ بات اور زیادہ وضاحت سے آتی ہے عبداللہ بن عمر کہتے ہیں میں نے یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے کہ:

جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہاں حلف بغیر اللہ کو ویسا ہی شرک کہا گیا ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں ریا کو شرک کہہ دیا گیا ہے۔ دونوں حدیثوں کا مطلب شرک کا حقیقۃً حکم لگا دینا نہیں ہے بلکہ ان

افعال کی شناعت ذہن نشین کرنا ہے اس لیے ان کو تغلیظاً شرک کہہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کی غیر معمولی عظمت قلب میں جاگزیں ہوتی ہے اس لیے اگر کوئی شخص غیر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو اس کے یہی معنے ہیں کہ اس کے قلب میں غیر اللہ کی عظمت اللہ کی عظمت کے برابر ہے۔ اس لیے جن لوگوں کے پیش نظر محلوف بہ کی تعظیم ہے انہوں نے حلف بغیر اللہ کو حرام قرار دیا ہے اور جن کے نزدیک معاملہ صرف تاکید کا ہے انہوں نے مکروہ قرار دیا ہے۔ اہلِ عرب قسم تعظیم کے لیے کھاتے تھے یا تاکید کے لیے اور بس۔

نذر بھی قسم ہی ہے

فقہاء نے نذر کو بھی قسم اور یمین ہی میں شمار کیا ہے کیونکہ فقہاء کے نزدیک علیّ نذرٌ کا ملفوظ بھی قسم ہے صرف یہ کہا کہ مجھ پر نذر ہے اور کچھ اضافہ نہ کیا اور نیت بھی نہ کی تو یہ قسم ہی شمار ہوگی۔ عدمِ ایفاء کی صورت میں قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ نذر کی تعریف یہ کی گئی ہے التزام مسلم مکلف قربۃ یعنی کسی مسلمان بالغ عاقل کا قربت کو اپنے ذمے لے لینا۔ نذر اور یمین معلق میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نذر سے مقصود تقرب ہوتا ہے جبکہ یمین معلق سے مقصد باز رہنا ہوتا ہے۔ علامہ شامی نے نذر کو قربت مشروعہ قرار دیا ہے۔ قربت تو اس لیے کہ یہ ذریعہ قربِ الٰہی ہے اور مشروعہ اس لیے کہ اس کے پورا کرنے کا قرآن میں حکم ہے ولیوفوا نذورھم۔ چونکہ نذر قربت مشروعہ ہے اس لیے اس کی صحت کی دو اہم اور بنیادی شرطیں ہیں۔

اولاً یہ کہ اللہ کے لیے ہو کسی مخلوق کے لیے نہ ہو۔ صاحب البحر الرائق نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ لانہ عبادۃ نذر عبادت ہے اور اسلام میں مخلوق کے لیے عبادت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ثانیاً یہ کہ جس چیز کی نذر مانی جائے اس کی جنس کی کوئی چیز اسلام میں بطورِ عبادت مقصودہ ہو آپ روزے کی، نماز کی، صدقہ کی، وقف کی اور حج کی اعتکاف کی نذر مان سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ عبادات مقصودہ ہیں لیکن آپ وضو کی، بیمار کی عیادت کی، مسجد میں جانے کی، نمازوں کے بعد تسبیحات کی نذر نہیں مان سکتے۔ نذر کی صحت کے یہ دو اصول ہیں۔ اسی بنا پر فقہاء احناف نے اہلِ قبور کی خاطر کی جانے والی تمام نذروں کو ناجائز کہا ہے۔ فقہ حنفیہ کی مشہور متداول اور مستند کتابوں میں یہ مسئلہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

تو بخوبی جان لے کہ وہ نذر و منت جو اکثر عوام مردوں کے لیے مانتے ہیں اور جو چیزیں از قسم روپیہ موم بتی، تیل اور اس قسم کی دوسری چیزیں بزرگوں کی قبروں تک ان کا تقرب

حاصل کرنے کے لیے پہنچائی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے اے میرے آقا فلاں اگر میرا گم شدہ آدمی واپس آگیا۔ یا میری حاجت پوری کردی گئی تو آپ کو اتنا سونا اتنی چاندی یا اتنا اناج یا اتنی موم بتیاں یا اتنا تیل دوں گا تو یہ نذر باطل اور حرام ہے اور اس کے باطل ہونے کی چند وجہیں ہیں۔ اولاً اس لیے کہ یہ نذر ہے اور نذر عبادت ہے جو مخلوق کے لیے ناجائز ہے۔ ثانیاً جس کے لیے نذر مانی گئی ہے وہ میت ہے اور میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی ثالثاً۔ نذر ماننے والے کا یہ گمان ہے کہ میت اللہ کے معاملات میں تصرف کرتی ہے۔ ایسا اعتقاد کفر ہے۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۹۸، رد مختار ج ۳ ص ۱۷۵۔)

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اور وہ نذر جو اکثر عوام سے عمل میں آتی ہے مثلاً یہ کہ کسی نیک کی قبر پر جا کر اس کی چادر اور پردہ ہٹا کر یہ کہے اے میرے سردار اگر میری حاجت پوری ہو گئی تو آپ کو اتنا سونا دوں گا یہ نذر بالاجماع باطل ہے، ہاں اگر یہ کہے کہ اے اللہ میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے کہ اگر تو نے میرے بیمار کو شفا دے دی تو میں سیدہ نفیسہ کے دربار میں رہنے والے فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مسجد کے لیے چٹائی خریدوں گا یا فقراء کے جلانے کے لیے وہاں تیل دوں گا یا جو شخص وہاں خدمت کرے گا اسے درہم دوں گا اور ایسے تمام کام جن میں فقراء کا فائدہ ہو اور نذر صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ حضرت اور شیخ کا ذکر محض نذر کے مستحقین پر صرف کرنے کی خاطر ہو تو یہ نذر جائز ہے لیکن اس نذر کو صرف فقراء پر ہی صرف کیا جا سکتا ہے نہ تو کسی عالم پر اس کے علم کی وجہ سے اور نہ وہاں شیخ کے دربار میں رہنے والوں پر، لیکن اگر کوئی وہاں رہنے والا فقیر ہو تو اور بات ہے جب یہ معلوم ہو گیا تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جو دراہم اولیاء کی قبروں پر ان کے تقرب کے لیے پیش کیے جاتے ہیں تو وہ بالاجماع حرام ہیں جب تک ان کو زندہ فقراء پر صرف کرنے کا ارادہ نہ ہو وہ حلال نہیں ہیں اس میں صرف ایک ہی بات ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے افسوس ہے کہ لوگ اس میں بکثرت مبتلا ہیں ایسا ہی النہر الفائق اور البحر الرائق میں ہے۔

اس سے یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ حضرات اولیاء کرام کے تقرب کے ارادے سے جو نذر مانی جاتی ہے وہ بالاجماع حرام ہے اور اکثر عوام اس میں مبتلا ہیں، ہاں نذر تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور اولیاء کرام کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہو کہ ان کے مزارات پر فقراء رہتے ہیں اور محل صرف

سمجھ کر وہاں صرف کرے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

نعمتوں کا شکر واجب ہے

۱۸۱- اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے لیے واضح کرتا ہے شاید تم شکر ادا کرو۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ تم نے طیبات سے گریز کیا تو ہم نے اس گریز سے منع کیا اور کسی نے غلطی سے طیبات کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو اس کو حفاظت یمین کے ساتھ اس سے حلال ہونے کا طریقہ بتلا دیا۔[1] اللہ سبحانہ نے جن جن نعمتوں کو پیدا فرمایا ہے ان کو منعم کی مرضی میں استعمال کرنا اور نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کا نام شکر ہے۔ انسان مختلف قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں رنگا رنگ خواہشیں اور ضرورتیں اور گوناں گوں جذبات و میلانات لے کر پیدا ہوا ہے۔

وہ غور و فکر کی استدلال و استنباط کی، ایجاد و اکتشاف کی غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اسے بولنے کی دیکھنے کی سننے کی قوتیں دی گئی ہیں۔ اسے جسمانی طاقت عطا ہوئی ہے۔ اسے بھوک اور پیاس لگتی ہے جس کی وجہ سے وہ کھانے اور پانی کا طلب گار ہوتا ہے۔ دھوپ سے بارش سے، گرمی اور سردی سے اسے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے وہ لباس اور مکان کی ضرورت محسوس کرتا ہے وہ محنت و مشقت کے بعد آرام کا اور بیداری کے بعد نیند کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ جنسی خواہش اور اولاد و بقائے نسل کی آرزوئیں رکھتا ہے اور ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ازدواجی رشتے قائم کرنے کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس کے دل میں اپنے اہل و عیال کی اپنے والدین کی اپنے قرابت داروں کی اور اپنے دوستوں کی محبت گھر کیے ہوتی ہے اس لیے وہ ان کے ساتھ خصوصی شفقت کا رویہ اختیار کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے جنس سے گہرا انس رکھتا ہے جس کی بناپر وہ ان سے الگ تھلگ ہو کر یکہ و تنہا زندگی گزارنے سے وحشت کھاتا ہے اور ان سے مل جل کر رہنے ہی سے سکون قلب پاتا ہے۔ اسی طرح اس کے اندر ایک طرف محبت اور رحمدلی کے صبر و تحمل کے، صلح اور درگزر کے مسرت و انبساط کے جذبات موجود ہیں تو دوسری طرف وہ بغض اور سخت دلی کے غصہ و نفرت کے، لڑائی اور انتقام کے رنج اور غم کے جذبات سے بھی خالی نہیں ہے۔ انسان کے اندر ان مختلف قوتوں اور خواہشوں کو سامنے رکھ کر قرآن نے بتایا ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکروا للہ ان کنتم ایاہ تعبدون یعنی اگر تم اللہ سے بندگی کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعلقات ہیں تو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اور مشرکانہ پابندیوں کی پروا نہ کرو۔ یہاں بھی فرمایا کہ تم کو اللہ نے جو حلال و طیب عطا فرمایا ہے رہبانیت کی لگائی ہوئی پابندیوں سے بے پروا ہو کر ان کو استعمال کرو۔ اللہ کا تم پر انعام ہے کہ اس نے نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی ہے اور اب اس اجازت کی توضیح فرما دی ہے تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بن جاؤ۔ یعنی اس نعمت کے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے رہو کہ عمل کو آسان کرنے کی یہی تجربی اور نفسیاتی راہ ہے۔ نہ صرف زبان سے بلکہ دوسرے اعضاء و جوارح سے بھی شکر کی مشق کر کے اپنے باطنی احساس کو بیدار رکھنا چاہیے۔ اصل مقصود تو عمل کی تصحیح ہے اسی کے لیے علم کی تصحیح کرائی گئی ہے اور علمی احساس کو مسلسل زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے قرآن نے شکر کی راہ بتائی ہے یعنی لوگ زبان سے بھی اور اعضاء سے بھی الغرض ہر اس ذریعہ سے جس سے اس احساس کی بیداری میں مدد ملے کام لینا چاہیے تاکہ اللہ نے جو احکام دیے ہیں ان کے صحیح استعمال میں آسانی ہو۔ اجمالاً اسی سارے کاروبار کا نام خواہ عملی شکل میں ہو یا علمی پھر زبان سے ہو یا جوارح سے اس کا تعلق ہو سب کا نام شکر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَا
يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ
وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٩٢﴾ لَيْسَ عَلَى
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا
اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ
اَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾

اے اہل ایمان شراب جوا آستھان اور پانسے گندے شیطانی کام
ہیں ان سے بچ کر رہو امید ہے کہ تم بامراد اور کامیاب ہو جاؤ گے [۱۸۲]
شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے

درمیان دشمنی اور بیر ڈال دے اور تمہیں یادِ الٰہی اور نماز سے ہٹا دے، بتاؤ کیا تم باز آؤ گے [۱۸۳]، اللہ اور اس کے رسُول کے کہے پر چلو اور محتاط رہو پھر اگر تم نے حکم عدولی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسُول کی ذمّہ داری صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے [۱۸۴]۔ یاد رکھو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے ان پر ماضی میں کھائے پیئے پر کوئی گرفت نہیں جب کہ اب وہ متقی ہو گئے اور ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کیے پھر پرہیزگار رہے اور ایمان لائے پھر پرہیز کیا اور نیک کردار ہو گئے، اللہ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے [۱۸۵]۔

شراب اور جوا دو معاشرتی برائیاں

شراب خوری ان بری عادات میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دُنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ یہاں طیبات کی تحریم سے ممانعت کے بعد شراب جوئے کا ذکر کیا ہے تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ شراب اور جوا بھی طیبات میں سے ہے ان کو بھی حرام نہ کر لینا چاہیے بتا دیا کہ یہ طیبات میں داخل نہیں ہیں۔ ارشاد ہے :

ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا

اس آیت میں سکر کو رزق حسن کے مقابلہ میں رکھ کر بتا دیا کہ نشہ رزق حسن نہیں ہے۔ اگرچہ شارحین قرآن نے اس آیت پر بہت کچھ لکھا ہے مگر میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں۔ اوپر دودھ اور گوبر اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح الآئشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

بہرحال اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف و تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا بیاں شوہروں کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔ اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی مگر سارا ملک اس بیماری میں گرفتار تھا۔ لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی۔ کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ دوست احباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا۔ ساتھ ہی جوا کھیلتے، اس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی۔ جو جیت جاتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کرتا اور لوگوں کو کھلا دیتا۔ کبھی نشہ میں سرشار ہو کر صاحب خانہ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا۔ لوگ گوشت بھونتے کباب بناتے کھاتے کھلاتے اور اپنی اسی بے جا فیاضی پر فخر کرتے رہتے۔ فاحشہ مغنیہ عورتیں گاتی بجاتی تھیں اور وہ اسی مخموری کی حالت میں بے شرمی کی باتیں کرتے۔ افسوس کہ معالم القرآن کا تقدس ان شعراء کے کلام کو نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جنہوں نے بے پردگی، عریانی اور بے حجابی کا اشعار میں مظاہرہ کیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا ہم معنے بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو قمیئہ کہتا ہے

إذا أسحب الريط والمروط إلى

أدنى تجاري وأنفض اللمما

وہ دن ہے جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

حضرت حمزہ سنہ ۳ھ میں مسلمان ہوتے اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی۔ شراب کی حرمت

جس تدریج سے ہوئی اسی سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا اور کس طرح وہ مقبول عام ہوچکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اور اشارے سے گزرکر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کردی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

۱۸۲ - اے اہل ایمان شراب، جوا، سنھان اور پانسے گندے شیطانی کام ہیں ان سے بچ کر رہو اُمید ہے کہ تم بامراد اور کامیاب ہوجاؤ گے۔ انصاب ازلام کی تفسیر اسی سورت کی ابتداء میں وما ذبح علی النصب وان تستقسموا بالازلام کے تحت گزرچکی اور اس آیت سے پہلے بعض آیات خمر کے بارے میں نازل ہوچکی تھیں۔ اوّل یہ آیت نازل ہوئی یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما گو اس سے نہایت واضح اشارہ تحریم خمر کی طرف ہورہا تھا مگر چونکہ صاف طور پر اس کے چھوڑنے کا حکم نہ تھا اس لیے حضرت عمر نے سُن کر فرمایا اللھم بین لنا بیانا شافیا" اس کے بعد دوسری آیت آئی یا ایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ اس میں بھی تحریم خمر کی تصریح نہ تھی گو نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہوتی اور یہ قرینہ اسی کا تھا کہ غالباً یہ چیز عنقریب کلیۃً حرام ہونے والی ہے مگر چونکہ عرب میں شراب کا رواج انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور اس کا یکبارگی چھڑا دینا مخاطبین کے لحاظ سے سہل نہ تھا اس لیے نہایت حکیمانہ تدبیر سے اوّلاً قلوب میں اس کی نفرت بٹھلائی گئی: اور آہستہ آہستہ حکم تحریم سے مانوس کیا گیا چنانچہ حضرت عمر نے دوسری آیت کو سُن کر پھر وہی لفظ کہے اللھم بین لنا بیانا شافیا" آخر کار مائدہ کی یہ زیرِ تشریح آیتیں نازل ہوئیں جس میں صاف صاف بت پرستی کی طرح اس گندی چیز سے اجتناب کرنے کی ہدایت تھی چنانچہ حضرت عمر فھل انتم منتھون سنتے ہی چلا اُٹھے انتھینا انتھینا لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، خم خانے برباد کردیے، مدینہ کی گلیوں اور کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہتی تھی۔ سارا عرب اس گندی شراب کو چھوڑ کر معرفت ربانی اور محبت و طاعت نبوی کی شراب طہور سے مخمور ہوگیا اور ام الخبائث کے مقابلے پر حضور کا یہ جہاد ایسا کامیاب رہا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ جس چیز کو قرآن حکیم نے اتنی شدت سے روکا تھا آج سب سے بڑے شراب خوار ملک امریکہ وغیرہ اس کی خرابیوں اور نقصانات کو محسوس کرکے اس کے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مولانا ابوالحسن علی میاں نے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین میں شراب کی حرمت کو جس انوکھے اور اچھے انداز میں پیش کیا ہے وہ بہت زیادہ دلآویز ہے فرماتے ہیں۔ شراب جوان گنت جسمانی اور روحانی بیماریوں کا سبب، اخلاقی اور معاشی خرابیوں کی جڑ اور فتنہ و فساد کی علت ہے۔ اسلام کے پاکیزہ نظام حیات میں اس کی کیونکر گنجائش ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قطعی کر دیا لیکن حرمت کا حکم آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل ہوا تاکہ لوگوں کو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں تو اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا فیہما اثم کبیر و منافع للناس فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہو جاتا ہے۔ صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے۔ لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ دوسروں کو بھی ان کی بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدے سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ تائب ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ ولا تقربوا الصلاۃ وانتم سکارٰی کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھا کرو۔ یہ آیات اس آخری حکم کا پیش خیمہ تھیں اگرچہ شراب کی حرمت کا صراحۃً ان میں ذکر نہ تھا لیکن کئی سلیم طبیعتوں نے اُس وقت ہی شراب چھوڑ دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم اس کی قطعی حرمت کے لیے بارگاہ الٰہی میں التجائیں کرتے اللھم بین لنا بیانا شافیاً اس اثنا میں چند ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جس سے شراب پینے کے مفاسد اور نقصانات کا صحابہ کرام کو زیادہ سے زیادہ احساس ہونے لگا جب ایمان پختہ ہو گئے۔ تعلیمات اسلامیہ قلب و روح کی گہرائیوں میں بس گئیں۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی عادت فطرت بن گئی، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی حضور رحمت عالمیان نے ایک خادم کو حکم دیا کہ مدینے کے گلی کوچوں میں پھر کر بلند آواز سے ان آیات کا اعلان کرے جب وہ منادی کرنے والا اعلان کرنے نکلا تو کئی جگہ شراب کی محفلیں آراستہ تھیں، مے خوار جمع تھے، پیمانے گردش میں تھے۔ جونہی کان میں ھل انتم منتھون کی آواز پہنچی، ہاتھوں پر رکھے ہوئے پیالے زمین پر پٹخ دیے گئے، ہونٹوں سے لگے ہوتے جام خود بخود الگ ہو گئے۔ جام و سبو توڑ دیے گئے۔ مشکوں اور مٹکوں میں بھری ہوئی مے ناب انڈیل دی گئی۔ وہ چیز جو انہیں از حد عزیز تھی اب گندے پانی کی طرح گلیوں میں بہ رہی تھی۔ حیرت یہ ہے کہ اس کے بعد کسی صحابی نے شراب پینے کی خواہش کا اظہار تک نہیں کیا۔ قرآن کی اثر آفرینی، حضورؐ کے فیض صحبت، صحابہ کرام کی کامل ترین اطاعت و فرمانبرداری اور اسلام کی انقلاب آفرین قوت کا یہ وہ عدیم النظیر مظاہرہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔ شراب کے زہریلے اثرات دیکھ کر یورپ اور امریکہ کے

ڈاکٹر اور دانشور لرزہ براندام ہیں۔ اس مصیبت سے اپنی قوم کو چھٹکارا دلانے کے لیے بڑی بڑی مخلصانہ اور حکیمانہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ حکومت امریکہ نے پورے چودہ سال تک شراب کے خلاف زور سے جہاد جاری رکھا اور اس جہاد میں نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے جدید ترین اور قوی ترین وسائل اختیار کیے، اخبارات و رسالے، لیکچرز، تصاویر اور فلمیں سبھی شراب سے نفرت دلانے کے لیے برسرِ پیکار رہے۔ اس عظیم مہم پر حکومت نے تقریباً چھ کروڑ ڈالر خرچ کیا۔ پچیس کروڑ پونڈ کا خسارہ برداشت کیا۔ تین سو افراد کو سزائے موت دی، پانچ لاکھ سے زیادہ اشخاص کو قید و بند کی سزائیں دیں، بھاری جرمانے کیے، بڑی بڑی جائدادیں ضبط کی گئیں لیکن یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔ آخر کار حکومت کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا اور اس نے شراب نوشی جس کے خلاف عرصہ دراز تک وہ معرکہ آرا رہی تھی اس کو ۱۹۳۳ء میں قانوناً جائز قرار دے دیا۔

بہرحال حرمتِ شراب کی یہ آخری آیت ہے جس وقت یہ آیت نازل ہوئی حضرت ابوعبیدہ امین الامت اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، حضرت ابوطلحہ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انس کی زبانی روایت ہے۔

میں ابوعبیدہ اور ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے۔

اس آیت میں چار چیزوں کی ممانعت کی جا رہی ہے۔ خمر، میسر، انصاب اور ازلام۔ علامہ مہائمی نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ خمر میں اگر عقلِ انسانی کی اضاعت ہے تو میسر میں اضاعت مال ہے، انصاب میں اگر انسانی شرف و مجد کی اضاعت ہے تو ازلام میں علم کی اضاعت ہے۔

اگرچہ ان کے بارے میں تشریحات دوسری اور چھٹی جلدوں میں گزر چکی ہیں لیکن ایک بار پھر ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

خمر اور اسلام کا اس کی حرمت پر اصرار

خمر اصل میں انگور کے کچے پانی کا نام ہے جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر ہے لیکن مجازاً ہر نشیلی چیز کو

خمر کہتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی لغوی صاحب تاج العروس شرح قاموس میں رقمطراز ہیں۔

یہ جان لینا چاہیے کہ باتفاق اہل لغت انگور کے کچے پانی کا جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر نام ہونا حقیقت ہے حتیٰ کہ خمر کا استعمال اس میں مشہور ہے۔ دوسری شرابوں میں کہ جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں اس کا استعمال مجازاً ہے۔

خمر یا تو اختمار سے ماخوذ ہے جس کے معنے خمیر اٹھنے کے ہیں چونکہ اس میں خمیر اٹھ کر جوش پیدا ہوتا ہے اور جھاگ اُٹھنے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام خمر ہوا، یا مخامرۃ سے مشتق ہے جس کے معنے چھپالینے کے ہیں چونکہ یہ وسواس کو گم کر دیتی ہے اور عقل و ہوش کو چھپا دیتی ہے اس لیے خمر سے موسوم ہوئی۔ خمر کا استعمال عربی میں مونث ہو کر شائع وذائع ہے اگرچہ بعض ائمہ لغت نے اس کی تذکیر کو جائز بتایا ہے لیکن لغت فصیح تانیث ہی ہے۔ اصل میں لفظ خمر کے معنے چھا جانے کے ہیں اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل و ہوش پر چھا جائے وہ خمر میں شامل ہے۔ حضرت عمر نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔ اگر صرف انگور کے کچے پانی نشہ آور کو ہی خمر کہتے ہیں تو پھر جیسا کہ بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں۔

خمر کے حرام ہونے کے وقت میں پانچ شرابیں تھیں لیکن ان میں انگوری شراب کوئی نہ تھی۔

کوئی بھی شراب نہ چھوڑتا کیونکہ حرام تو صرف انگوری شراب ہوئی تھی لیکن وہاں صورت معاملہ برعکس تھی، لکھا ہے کہ

فجرت فی سکک المدینہ

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی تھی

اگر ان کے نزدیک شراب انگوری کو ہی خمر کہتے تھے اور وہاں انگوری شراب موجود نہ تھی تو پھر بہانے اور گرانے کی ضرورت ہی کیا تھی اس لیے خمر کے لفظ سے یہ سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے جس کے لیے قرآن نے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ نے یہی سمجھا کہ نشہ آور شراب سے بچنے کا حکم ہو رہا ہے مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں عبداللہ ابن عمر کے حوالہ سے حضور انور کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ نشہ آور خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اس لیے خمر ہر نشہ آور شراب ہے۔ یہی مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا مذہب ہے۔

اور یہ بات بھی تو دھیان میں رکھیے کہ اگر خمر صرف انگوری شراب کو کہتے تو پینے والوں کے لیے وہاں ضرور دوسری شرابوں کے پینے کے لیے ایک بہانہ ہوتا جیسے پہلے دو بار ہو چکا تھا۔ لوگ انگوری نہ پیتے دوسری ان گنت شرابیں پی لیتے۔ امام قرطبی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔

حضرت انس کی احادیث اپنی صحت اور بہتات میں ان لوگوں کے خلاف کھلا چیلنج ہیں جو کہتے ہیں کہ خمر شیرہ انگوری کو کہتے ہیں اور کسی شراب کو خمر نہیں کہتے، ان کا یہ کہنا لغت، سنت اور تعامل صحابہ کے مخالف ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ نے یہی سمجھا کہ ہر نشہ آور مشروب سے بچنے کا حکم ہوا ہے۔ انہوں نے انگوری اور غیر انگوری کی کوئی تفریق نہیں کی بلکہ ہر نشہ آور شراب کو پھینک دیا۔ یہ لوگ صاحب زبان ہیں ان کی زبان ہی میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اگر ان کے خیال کے کسی گوشہ میں یہ بات ہوتی کہ خمر انگوری شراب کو کہتے ہیں وہ کبھی بھی شراب نہ پھینکتے۔

اگرچہ احناف نے خمر کے موضوع پر طول طویل بحثیں کی ہیں لیکن ہمیں امام محمد کا یہ فیصلہ پسند ہے۔ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ہر وہ شراب جس کا کثیر مسکر ہو اس کا تھوڑا بھی حرام ہے۔ انگور، گیہوں، کھجور، انجیر، شہد سے تیار شدہ مشروب امام محمد کے نزدیک قطعاً حرام ہیں۔ صاحب درمختار کا یہ کہنا ہے۔ یعنی کہ قانون حنفی میں اسی پر فتویٰ ہے اور صرف یہی نہیں کہ شراب جسے قرآن نے خمر کہا ہے وہ حرام ہے بلکہ احناف نے اس معاملہ میں کچھ دوسروں سے زیادہ تشدد آمیز پالیسی اختیار کی ہے۔ وہ اسے صرف حرام نہیں کہتے بلکہ ناپاک اور نجس العین بھی بتاتے ہیں اسے حلال بتانے والے کو دائرہ اسلام میں داخل نہیں سمجھتے، مسلمان کے حق میں اسے مالیت والی چیز نہیں مانتے۔ ہر طرح سے اس سے انتفاع پر قدغن قائم کرتے ہیں اس کے پینے پر حد قائم کرتے ہیں۔ دواءً بھی اس کے استعمال کو ناجائز کہتے ہیں۔ یاد رہے فقہ حنفی میں قانون وہ ہے جس پر ان کے یہاں فتویٰ ہو۔ اقوال منتشرہ کا نام فقہ حنفی نہیں ہے۔ بلکہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ شراب پینے والے کا پسینہ بھی ناپاک ہوتا ہے اور پسینہ آنے سے اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

بہرحال ہمیں احناف کی تفصیلی قانونی بحثوں سے ایک طرف ہو کر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا یہ فیصلہ ہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

نشہ آور ساری شرابیں ائمہ ثلاثہ اور امام محمد کے نزدیک حرام ہیں وہ سب کو خمر ہی قرار دیتے ہیں اور بغیر کسی تفصیل کے سب کو حرام قرار دیتے ہیں۔

اور

ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے شراب کی ساری قسموں کو حرام قرار دیا ہے اور بلا شبہ اس دور کے مطابق اس رائے کو اپنانا ہی احتیاط کا تقاضا ہے۔

اوجز المسالک

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم پر بھی سد ذرائع کے طور پر قانونی قدغن قائم کر دی۔ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کر دیا جن میں عموماً شراب بنائی جاتی تھی پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو ہٹا دیا۔

اس اصول کا ذکر کئی بار ہو چکا ہے کہ لا تعاونوا علی الاثم والعدوان گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو کے اصول کی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا بنانا فروخت کرنا، خریدنا، لینا لے جانا سب حرام قرار دیا، فرمایا

خدا نے شراب پر اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جاتے سب پر لعنت فرمائی ہے۔

آئیے ذرا شراب کے بارے میں قرآن کی اس سنگینی کے نتائج پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے اور اندازہ لگائیے کہ اسلام میں شراب کا مقام کیا ہے۔

شراب نگاہِ نبوت میں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گناہ سے بچانے کے لیے اور شراب کی نوعیت سمجھانے کے لیے مختلف طریقے اختیار فرمائے ہیں۔ ایک بار فرمایا:

ہر نشہ آور شراب ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے۔ جو شخص دُنیا میں شراب پیتا ہے اور اسی حال میں مرجاتا ہے اور اسے توبہ نصیب نہیں ہوتی ہے تو اسے آخرت میں شراب طہور نہ ملے گی۔

ایک بار جیشان کا ایک شخص بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ہمارے یہاں مکی کی شراب پی جاتی ہے وہاں اصطلاح میں اسے مذر کہتے ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا وہ نشہ آور ہوتی ہے اس نے جواب دیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا۔

ہر نشہ آور حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں طے ہے کہ جو شخص نشہ آور چیز استعمال کرے گا اسے دوزخیوں کا پسینہ اور دھوون پلایا جائے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے نفرت دلانے اور اس کے نقصان کو بتانے کے سلسلے میں فرمایا:

جو شخص کوئی نشہ آور چیز پیتا ہے اس کی چالیس دن کی نماز بے کیف اور معلق رہتی ہے جب وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔

اور اس بات کی بھی حضور انور نے صراحت فرمادی ہے کہ کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر استعمال کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہوگی مے نوشی مگر نام نئے ہوں گے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

لَيَشْرَبَنَّ ناس من امتی الخمر یسمونها بغیر اسمها

میری امت کے کچھ لوگ شراب نوشی اس کا نام بدل کر کریں گے

موجودہ دور میں یہی ہو رہا ہے۔ شراب کی بیسیوں قسمیں ہیں جنہیں لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھوکہ دے رہے ہیں کہ اس قسم پر شراب کی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شراب تمام بدکاریوں کی جڑ ہے اور سب سے بڑا گناہ۔ جو شخص پیتا ہے وہ ایسا مست ہوتا ہے کہ اسے خبر نہیں ہوتی کہ اپنی ماں پر جا پڑا یا خالہ پر یا پھوپھی پر۔

(جمع الفوائد)

جب عقل ہی زائل ہو جاتی ہے تو پھر اس کی ضمانت کیا ہے؟ کہ کیا نہیں کرے گا اور کیا کرے گا۔ اس وقت اور بھی جبکہ نشہ کے سرور میں اس کا دماغ آسمان سے باتیں کرتا ہو اور جنسی ہیجان قابو سے باہر ہو یقیناً نہ اس کو ماں کی تمیز باقی رہے گی اور نہ خالہ کی اور نہ پھوپھی کی۔

شراب اور ایمان

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

شراب پینے والا جس وقت شراب پیتا ہے ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا، اس سے بچو اس سے بچو۔

مطلب یہ ہے کہ شراب نوشی شانِ ایمان کے منافی ہے اور ایک مومن کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ شراب کو ہاتھ لگائے۔ ایمان عقل وشعور کو چاہتا ہے اور شراب نوشی ان کی موت ہے۔ جب ہوش وحواس قائم نہ رہیں تو جو زبان پر آئے آدمی بکتا چلا جائے خواہ وہ کلمات کفر ہی کیوں نہ ہوں۔ شراب کی ان ہی برائیوں کی وجہ سے ان تمام لوگوں پر لعنت ڈالی گئی ہے جو اس میں کسی حیثیت سے بھی حصہ لیں، اور اسی وجہ سے کسی حال میں بھی شراب نوشی کی اجازت نہیں ہے۔ دیلم الحمیری کا بیان ہے کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگ ایک سرد علاقہ کے رہنے والے ہیں، جہاں ہمیں سخت محنت کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ وہاں سردی کی شدت اور محنت شاقہ سے نمٹنے کے لیے شراب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں گیہوں سے شراب تیار کی جاتی ہے اور ہم لوگ اسے پیتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر پوچھا کیا وہ شراب نشہ آور ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا جی ہاں نشہ آور ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا تو پھر اس سے اجتناب کرو۔ حضرت دیلم کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ وہ لوگ نہیں چھوڑیں گے۔ حضور انور نے فرمایا کہ اگر وہ شراب بند نہ کریں تو ان سے قتال کرو۔ (ابوداؤد)

شراب اور اسلام

جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بات صراحت کے ساتھ معلوم ہوئی کہ شراب عقل کو زائل کرتی ہے اور اس میں دوسرے بیسیوں مفاسد ہیں وہ اسی لائق تھی کہ اسے حرام قرار دیا جائے اور لوگوں کو اس لعنت سے جس طرح بن پڑے بچایا جائے اور آج تجربہ کے بعد ساری دنیا یہی چاہتی ہے کہ شراب نوشی بند ہو جائے لیکن ناکام ہے یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے شراب کے نتائج بد دیکھ کر اس سے روکا۔ یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی بلکہ بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی گئی ہے۔ دیکھو قاضیوں ۱۳:۹ سموئیل ۲،۱۶ امثال ۳۱: ۶۔ ملکائے یہود میں سے بعض نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دواسیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔ یجر وید میں جو چیز دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ منوسمرتی میں ہے کہ مانس اور شراب ان دونوں کے کھانے میں کوئی دوش نہیں ہے۔ منوسمرتی ہی سے یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کوئی دوش نہیں ہے۔ عیسائیت نے تو یہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر رکھ دی۔ دیکھو انجیل یوحنا ۲: ۱-۱۱ میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں کچھ شراب کم ہو گئی لوگ پورے بدمست نہ ہوتے تھے تو حضرت مسیح نے پانی کے

مشکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کر دیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس معجزے میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جب تک سال بھر میں ایک بار شراب نہ پیئے کیونکہ عید فسح میں شراب جزولازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کے قائمقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راست باز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں۔ گو وہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں مگر شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لیے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں دی گئی اور آپ کی یہ قوت درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کو بچانا بھی مشکل ترین کام ہے۔ اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ایک ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔

شراب نوشی کی سزا

اسلام نے صرف سمجھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اس کے مرتکب کے لیے قانون بھی بنایا ہے تاکہ شراب نوشی بند ہو۔ اور اس راستہ سے جو خانہ جنگی، بغض و عداوت، ملکی امن و امان میں خلل اور دوسری مصیبتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ ان پر آہنی دیوار تعمیر ہو سکے۔ شراب نوشی کا جرم ثابت ہو جائے گا۔ اقرار سے ہو یا شہادت سے۔ اگر وہ عاقل و بالغ مسلمان ہے، مجبور و مضطر نہیں ہے تو اس پر حد جاری ہو گی۔ قانون کی کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں کہ کن صورتوں میں حد جاری ہوتی ہے اور کن حالتوں میں نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً صرف شراب کی بو یا اس کی قے پر حد نہیں لگتی ہے۔ اسی وجہ سے حکم ہے کہ مقدمہ جب حاکم کے پاس آئے تو وہ گواہوں سے دریافت کرے کہ شراب کی ماہیت کیا ہے؟ پینے والے نے بخوشی پی، یا جبراً اور دباؤ سے کب پی اور کہاں پی۔ پھر وہ یہ بھی دیکھے کہ گواہ شرعی قانون شہادت کے مطابق معتبر ہیں یا نہیں۔ مقدمہ جب ان تمام منزلوں سے گزر کر پورے طور پر ثابت کر دے کہ مجرم نے ٹھیک شراب پی ہے تو اس کے لیے عدالت اسی کوڑے مارنے کا فیصلہ دے گی۔ مگر یہ ہدایت ضروری ہے کہ کوڑے بدن کے مختلف حصوں پر مارے جائیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ سزا وہاں دی جائے گی جہاں اقتدار مسلمان کے پاس ہو یعنی وہ ملک دارالاسلام ہو۔

شرابی کی سزا زمانہ نبوت میں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں جس پر شراب نوشی کا جرم ثابت ہو جاتا یا وہ اقرار کرتا اور آپ سے حد جاری کرنے کی درخواست کرتا تو آپ اس کی ضرب و تادیب کا حکم دیتے، کوئی ہاتھ سے مارتا، کوئی جوتے مارتا کوئی کوڑے سے اور کوئی کھجور کی ٹہنیوں سے۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ ایک شرابی خدمت اقدس میں لایا گیا۔ اس کا جرم ثابت تھا۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا:

اس کی پٹائی کرو، حکم ملتے ہی ہم میں سے کوئی ہاتھ سے مارنے لگا کوئی اپنے جوتے سے کوئی اپنے کپڑے سے۔

اس سزا کے بعد جب وہ واپس ہوا تو کسی نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ اللہ تجھ کو ذلیل کرے اخزاک اللہ حضور انور نے جب یہ جملہ سنا تو فرمایا ایسا نہ کہو اور اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ شرابی کو سزا دینا درست ہے لیکن اسے بد دعا دینی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ بظاہر دعا کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے۔

حدیث میں عبداللہ نامی ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے جن کا لقب حمار تھا اور جن کی باتوں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہنس پڑتے تھے کیونکہ ان کے مزاج میں خوش طبعی تھی کہ ان کی باتوں پر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ شراب نوشی کے سلسلے میں ان کو سزا دی گئی۔ یہ جب مجرم کی حیثیت سے بارگاہ نبوت میں لائے گئے تو حسب دستور سزا دی گئی۔ اسی وقت حاضرین میں سے کسی کے منہ سے نکل گیا اے اللہ اس پر لعنت فرما کہ یہ شراب جیسی گندی چیز پیتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات سنی تو فرمایا:

اس پر لعنت نہ بھیجو۔ مجھے یہی معلوم ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

مطلب یہی ہے کہ قانونی سزا تو بے شک دی جائے لیکن ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر لعنت کی اجازت نہیں ہے۔ بد دعا کی جگہ ایسا شخص دعاؤں کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے حرام کے ارتکاب سے آئندہ بچائیں۔ اور اپنی مرضیات پر چلائیں۔

شرابی کی سزا زمانہ خلافت میں

حضرت صدیق اکبر کے زمانہ خلافت میں بلکہ فاروق اعظم کے ابتدائی دور خلافت میں شراب نوشی کی

سزا چالیس کوڑے تھی، مگر جب اس قسم کے مقدمات زیادہ آنے لگے تو حضرت عمر نے صحابہ کرام کو جمع کر کے اس موضوع پر مشورہ کیا۔ گفتگو اور بحث و مباحثہ کے بعد متفقہ طور پر اسی کوڑے کی سزا مقرر ہوئی۔ یہی سزا قرآن نے تہمت لگانے والے کے لیے مقرر کی ہے۔ حضرت انس کا بیان ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرابی کو کھجور کی شاخ اور جوتے لگوائے، پھر حضرت ابوبکر نے چالیس کوڑے سزا دی لیکن فاروق اعظم کے زمانے میں سبزہ زاروں اور دیہات سے لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عمر نے مشورہ کیا کہ شرابی کو کیا سزا دی جائے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ میری رائے میں قرآن کی بتائی ہوئی حدود میں جو سب سے ہلکی سزا ہے وہ آپ مقرر کر دیں۔ لہٰذا حضرت عمر نے اسی کوڑے سزا مقرر کر دی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سزا پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ سب نے اس کی تائید کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اس پر استدلال تہمت لگانے والے کی سزا سے اس طرح کیا کہ شراب پینے والے کی عقل جاتی رہتی ہے وہ حالتِ نشہ میں اول فول بکتا ہے اور خواہ مخواہ الزام لگاتا ہے۔ گویا افتراء پردازی کا جرم کرتا ہے اور افتراء کی سزا قرآن نے اسی کوڑے بتائی ہے لہٰذا شرابی کی سزا بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ثور بن زید الدیلمی کہتے ہیں کہ:

حضرت عمر نے شراب نوشی کی سزا کے سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ اسی کوڑے مقرر فرمائیے کیونکہ شرابی جب شراب پیتا ہے مدہوش ہو جاتا ہے اور ہوش و حواس کھو کر بکواس کرتا ہے اور بکواس میں افتراء پردازی کرتا ہے چنانچہ حضرت عمر نے شراب کے لیے اسی کوڑے سزا مقرر کر دی۔

صحیح مسلم میں حضرت علی کا بیان نقل ہوا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکر نے شرابی کو چالیس کوڑے سزا دی اور حضرت عمر نے اسی کوڑے سزا دی اور دونوں باتیں سنت ہیں۔

حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان نے بھی اسی کوڑے سزا دی اور یہ سب سنت ہے۔

یہاں سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمانۂ خلافتِ راشدہ کے کسی عمل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا خواہ اس کی نظیر زمانۂ نبوت میں موجود نہ ہو۔ یہ روایت صحیح مسلم کی ہے اور کہنے والے حضرت علی خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں وہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے

کے عمل کو بھی سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی حضرت عمر کے آثار کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حکم اور قول کو سنت کہتے تھے ۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کے بارے میں بھی ان کے یہی تاثرات تھے ۔

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں پوری قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ

شیخین کا قول حجت ہے جب دونوں یعنی ابوبکر و عمر متفق ہو جائیں تو اس سے ہٹنا جائز نہیں ہے اسی طرح ائمہ اربعہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کا اتفاق بھی حجت ہے ۔

پتہ نہیں امیر یمانی محمد بن اسماعیل نے یہ بات سبل السلام میں کیسے لکھ دی ہے کہ "خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عامل نہ تھے، حالانکہ اگر صحابہ کرام کا کسی بات پر اتفاق ہو جاتے تو اس کے حجت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی کلام کرتا ہو چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اقامۃ الدلیل میں رقمطراز ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع واجب الاتباع ہے بلکہ صحابہ کرام کا اجماع قوی تر حجت اور دوسری غیر منصوص حجتوں پر مقدم ہے ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں :

اہل السنۃ والجماعۃ اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے ۔

اسی بنا پر ملا علی قاری نے شرابی کی سزا اسی کوڑوں کے بارے میں لکھا ہے کہ

شراب نوشی کی سزا اسی کوڑے طے پائی جس پر صحابہ کرام نے اجماع کیا ۔ اب کسی کے لیے اس کی مخالفت جائز نہیں ہے چاہے سرکشی میں کتنا ہی اضافہ ہو جائے

(مرقاۃ ص ۱۰۱ ج ۴)

حافظ ابن عبدالبر کے حوالہ سے مولانا عبدالحی لکھنوی نے لکھا ہے کہ جمہور کے نزدیک شراب نوشی کی سزا طے ہے کیونکہ حضرت عمر کے زمانہ میں اس سزا پر صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے ۔ کسی صحابی نے اس کی مخالفت نہیں کی ہے ۔

شراب کے موضوع پر اہل علم مزید تفصیل دیکھنا چاہیں تو تفسیر المنار جلد ہفتم کا مطالعہ کریں مولف نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔

قمار بازی کی حرمت

اہل عرب میں شراب خوری کے ساتھ قمار بازی کا بھی عام رواج تھا ۔ عرب کی سوسائٹی میں جو تے

اور شراب کے جہاں بہت مضر پہلو تھے وہاں کچھ مفید پہلو بھی تھے۔ جیسا کہ ہم دوسری جلد میں تفصیل سے بتا آتے ہیں۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ خاص طور پر سردیوں کے زمانے میں وہ اکٹھے ہوتے خوب شراب پیتے، پھر شراب کی مستی میں جس کسی اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، پھر اس کے مالک کو منہ مانگے دام دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا وہ اس کو غریبوں اور فقیروں پر لٹا دیتا۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب تھی۔ جو لوگ اس قسم کی تقریب منعقد کرتے یا اس میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی سمجھا جاتا اور معاشرے میں ان کی بڑی عزت ہوتی اس کے برعکس جو لوگ اس سے الگ رہتے ان کے لیے برم کا لفظ استعمال کرتے۔

میسر یا قمار ہر وہ معاملہ ہے، جو نفع و نقصان کے درمیان دائر اور مبہم ہو، اُردو زبان میں اس کو جوا کہتے ہیں مثلاً دو شخص باہم ایک دوسرے سے معاملہ کریں کہ دونوں دوڑتے ہیں اگر تم آگے نکل گئے تو میں تم کو ہزار روپیہ دوں گا اور اگر میں نکل گیا تو تم مجھے ہزار روپیہ دینا، یا اس طرح کہ اگر آج بارش ہو گئی تو تم ایک ہزار دینا اور اگر نہ ہوئی تو میں تم کو دوں گا۔ یا بند ڈبے میں ایک مقررہ قیمت مثلاً چار آنہ فی ڈبہ کے حساب سے فروخت کیے جائیں، کسی ڈبے میں پانچ روپے کی چیزیں ہوں اور کسی ڈبے میں دو پیسے کی تو اس ابہام اور دائر بین النفع والضرر صورت میں اس کی خریداری قمار ہے۔ اس کی لاتعداد صورتیں ہو سکتی ہیں اور تمدن میں تغیر و تبدیلی کے ساتھ اس کی صورتوں میں بھی تنوع ہوتی رہتی ہے قرآن نے شراب کے ساتھ میسر اور قمار بھی حرام کیا ہے۔

قمار کی مروجہ صورتیں

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرماتے ہیں کہ شطرنج بھی قمار میں داخل ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہر چیز جو قمار میں داخل ہے وہ میسر کے حکم میں ہے یہاں تک کہ بچے جو اخروٹ کھیلتے ہیں وہ بھی قمار ہے۔ حضرت راشد بن سعد اور حمزہ ابن حبیب کہتے ہیں کہ بچے جو لکڑیوں سے یا اخروٹ سے اور بیضوں سے ہار جیت کا جو کھیل کھیلتے ہیں یہ بھی قمار میں داخل ہے۔

قمار کی مذکورہ بالا تعریف اور صحابہ کرام کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے مختلف اقسام کے کھیل بھی قمار میں داخل ہیں۔

موجودہ زمانے میں ہر قسم کی لاٹری بھی قمار میں داخل ہے جس کی سینکڑوں صورتیں بازاروں اور کارخانوں میں رائج ہیں جن میں مشہور و معروف اقسام کے احکام یہ ہیں۔

آج کل وبا کی طرح قمار کی ایک صورت معمّوں کی شکل میں عام ہو گئی ہے جو حل معمّہ کے عنوان سے بہت سے اخبارات اور ماہوار رسالوں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ معمّہ کی مختلف صورتیں لکھ کر اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کا کوئی حل کر کے روانہ کرے اور اس کے ساتھ اتنی فیس روانہ کرے۔ مثلاً ایک روپیہ فیس بھیجے تو جن لوگوں کے حل صحیح ہوں گے ان میں سے انعام اس شخص کو دیا جائے گا جن کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعے نکل آئے۔ یہ صورت قمار ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

اسی طرح بازاروں اور نمائشوں میں بند ڈبے فروخت کیے جاتے ہیں کسی میں ایک پیسہ کا بھی مال نہیں ہوتا ہے اور کسی میں زیادہ مال ہوتا ہے۔ لوگ اس کو قسمت آزمائی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں یہ بھی کھلا ہوا میسر ہے جو حرام ہے۔

بعض شہروں میں بچّے بادام، اخروٹ یا کانچ کی گولیوں وغیرہ سے ہار جیت کرتے ہیں۔ یہ بھی قمار وغیرہ میں داخل ہے اور حرام ہے۔ بعض شہروں میں کنکوے اڑا کر پیسوں کی ہار جیت کا کھیل کھیلا جاتا ہے دیہات میں لکڑیوں کی گٹھریوں یا سرکنڈے کے پوروں سے ہار جیت کا کھیل ہوتا ہے یہ بھی قمار ہے۔

اسی طرح سٹّہ کا سارا کاروبار سٹّہ ہی ہے اور بنصِ قرآن حرام ہے اس کاروبار میں کسی قسم کی اعانت بھی حرام ہے۔

بعض لوگ پتنگ بازی اور کبوتر بازی پر روپیہ کی ہار جیت کھیلتے ہیں۔ یہ کھیل قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔

بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا نام دے کر جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کی مروجہ صورتیں جتنی ہمیں معلوم ہیں سود اور قمار سے خالی نہیں ہیں اس لیے حرام ہیں۔ اس کی تفسیر تیسری جلد میں گزر چکی ہے۔

کیا ریس قمار میں داخل ہے؟

گھوڑ دوڑ جسے آج کل ریس کہا جاتا ہے۔ اس میں ابتلائے عام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنت نے جن کھیلوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جن کے ذریعے قوتِ جہاد اور تربیتِ جسمانی ہوتی ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے عمل سے اس کے استحسان کو ظاہر فرمایا۔ آپ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی۔ پیادہ دوڑ پر انعام دیا، تیر اندازی اور پیراکی سیکھنے کی ترغیب دی۔ حبشیوں کی نیزہ بازی کو خود کھڑے ہو کر معائنہ فرمایا اور صدیقہ عائشہ کو دکھلایا۔ اس کے مقابلے میں ان کھیلوں کی حوصلہ شکنی فرمائی جن میں کوئی دینی یا

دنیاوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی و اجتماعی نقصانات ہیں۔ ان ہی مضر رساں صورتوں میں وہ کھیل ہیں جن میں قمار ہو۔

گھوڑ دوڑ بلا شبہ ایک مفید ریاضت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً و فعلاً اس کی اجازت دی ہے اور اس میں بازی لگانے اور بازی لے جانے والے کے لیے مشروط انعام کی بھی خاص شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔ آئیے اسی موضوع پر چند ارشادات نبوت گوش گزار فرما لیجئے۔

سنن اربعہ، مسند امام احمد اور مستدرک حاکم بحوالہ حضرت ابوہریرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا سبق الا فی خف او نصل او حافر

سبق کے معنے اس معاوضہ یا انعام کے ہیں جو کسی بازی میں آگے بڑھنے والے کو دیا جاتا ہے اور یہ انعام سرکار کی جانب سے ہو یا متسابقین میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو۔ جیسا کہ جمہور کی رائے ہے۔ حدیث کے معنے یہ ہیں، کسی مسابقت میں معاوضہ یا انعام مقرر کرنا جائز نہیں ہے بجز اونٹوں کی دوڑ کے یا گھوڑ دوڑ کے یا تیر اندازی کے۔ ان تین کے علاوہ بعض فقہا نے پیادہ دوڑ کو بھی بیان کیا ہے۔ کیونکہ پیادہ دوڑ بھی جہاد میں معین و مددگار ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل بھی ہے کہ عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور انور نے گھوڑ دوڑ کرائی۔

اس لیے گھوڑ دوڑ کی جائز صورتیں یہ ہیں۔

اول یہ کہ فریقین جو اپنے اپنے گھوڑے دوڑا رہے ہوں ان کو باہم ایک دوسرے سے کچھ لینا دینا نہ ہو بلکہ سرکار یا کسی تیسرے شخص یا جماعت کی طرف سے بطور انعام کے کوئی رقم آگے بڑھنے والے کے لیے مقرر ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آگے بڑھنے والے کے لیے معاوضہ یا انعام فریقین ہی میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو دونوں طرف سے نہ ہو۔ مثلاً رشید اور حامد گھوڑوں کی دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں۔ رشید یہ کہے کہ اگر حامد آگے بڑھ گیا تو میں ایک ہزار دوں گا۔ حامد کی طرف سے ایسی کوئی بات نہ ہو دونوں جانب سے اگر شرط ہو گی تو یہ قمار ہے۔

تیسری صورت میں فریقین میں دو طرفہ شرط بھی حنفیہ کے نزدیک اس وقت جائز ہے جب کہ فریقین ایک تیسرے گھوڑے سوار کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ معاملہ اس طرح طے ہو کہ رشید آگے بڑھ جائے تو حامد ایک ہزار روپیہ اس کو دے اور اگر حامد آگے بڑھ جائے تو رشید اتنی رقم اس کو دے گا اور اگر خالد آگے بڑھ جائے تو اس کو کچھ نہ ملے گا۔ دوسرے یہ کہ شرط

اس طرح ہو کہ خالد آگے بڑھ جائے تو رشید و حامد دونوں اس کو ایک ہزار روپیہ دیں۔ اور رشید و حامد دونوں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک آگے بڑھے تو خالد کے ذمہ کچھ نہیں ہے لیکن رشید و حامد میں باہم جو آگے بڑھے دوسرے پر اس کو ایک ہزار روپیہ ادا کرنا لازم ہو۔

ان دونوں صورتوں میں جو تیسرا آدمی شریک کیا گیا ہے اس کو حدیث کی اصطلاح میں مُحلّل کہا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ امر مشترک ہے کہ تیسرے آدمی کا معاملہ نفع و ضرر میں دائر نہیں ہے بلکہ ایک صورت میں اس کا نفع متعین ہے۔ دوسری میں اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ اس تیسری صورت کے لیے حدیث میں یہ ضروری شرط بتائی گئی ہے کہ یہ تیسرا خالد کا گھوڑا رشید و حامد کے گھوڑوں کا ہم پلہ ہو ایسا نہ ہو کہ کمزور ہو یا اس میں کوئی عیب ہو یا ان سے زیادہ طاقتور ہو کہ اس کا آگے بڑھ جانا یقینی ہو ارشاد ہے:

جس شخص نے دو گھوڑوں میں تیسرا گھوڑا داخل کیا اور اسے اس کے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور آگے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے تو یہ قمار ہے (ابوداؤد)

فقہ احناف کی مختلف کتابوں مثلاً بدائع الصنائع، فتاویٰ عالمگیری اور درمختار میں بھی یہ سب تفصیل موجود ہے۔

اس کے علاوہ فقہا نے یہ شرطیں بھی لکھی ہیں کہ مسابقت میں ابتدا اور انتہا معلوم ہو۔ مسافت بھی معلوم ہو اور انعام کی مقدار بھی مقرر ہو اور دو گھوڑے یا دو سے زائد بھی معین ہوں۔

گھوڑ دوڑ کی ناجائز صورتیں

اوّل، معاوضہ یا انعام کی شرط فریقین میں دو طرفہ ہو تو یہ قمار ہے۔

دوسرے، ریس کی مروجہ شکل کہ گھوڑوں کی دوڑ کسی کمپنی کی جانب سے ہو، گھوڑے کمپنی کی ملک ہوں اور سوار کمپنی کے ملازم ہوں۔ اور تماشہ بین گھوڑوں کے نمبر پر اپنا داؤ لگائیں اور اس کی فیس داخل کریں۔ جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اس پر داؤ لگانے والے کو انعام کی رقم مل جائے باقی سب کی فیس ضبط ہو جائے۔

یہ صورت قطعاً میسر میں داخل ہے اور بالکل حرام ہے۔ اسی طرح اگر اونٹوں کی دوڑ ہو یا پیدل دوڑ ہو اور نشانہ بازی لگانے کا مقابلہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ میسر ہے جو از روئے قرآن حرام ہے۔ ہاں ایسے کھیل جن کا مقصد بدن کی ریاضت ہو اور کوئی معاوضہ یا انعام باہم مقرر نہ ہو جائز ہیں مثلاً والی بال،

فٹ بال، ہاکی، پہلوانوں کی کشتی، معمہ بازی، شعر بازی اور تعلیمی تاش وغیرہ میں ہار جیت کی بازی لگانا جائز ہے مگر اس پر کوئی رقم معاوضہ مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔

انعامی بانڈز

صحیح صورت یہ ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بانڈز بھی اسی نوعیت کے قرضے ہیں جو حکومت اپنے مختلف کاموں میں لگانے کے لیے لوگوں سے لیتی ہے اور ان پر سود ادا کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ہر وثیقہ دار کو اس کی دی ہوئی رقم پر فرداً فرداً سود دیا جاتا تھا مگر اب جملہ رقم کا سود جمع کر کے اسے چند وثیقہ داروں کو بڑے بڑے انعامات کی شکل میں دیا جاتا ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ یہ انعامات کن کو دیے جائیں۔ قرعہ اندازی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ پہلے ہر وثیقہ دار کو سود کا لالچ دے کر اس سے قرض لیا جاتا تھا اب اس کے بجائے ہر ایک کو یہ لالچ دیا جاتا ہے کہ شاید ہزاروں روپے کا انعام تیرے ہی نام نکل آئے اس لیے قسمت آزمائی کر لے۔ یہ صورت واقعہ صاف بتاتی ہے کہ اس میں سود بھی ہے اور قمار بھی ہے۔ جو شخص وثائق خریدتا ہے وہ اولاً اپنا روپیہ جان بوجھ کر ایسے کام میں قرض دیتا ہے جس میں سود لگایا جاتا ہے، ثانیاً جس کے نام پر انعام نکلتا ہے اسے دراصل وہ سود اکٹھا ہو کر ملتا ہے جو عام سودی معاملات میں فرداً فرداً ایک ایک وثیقہ دار کو دیا جاتا تھا۔ ثالثاً جو شخص بھی یہ وثیقے خریدتا ہے وہ مجرد قرض نہیں دیتا بلکہ اس لالچ میں قرض دیتا ہے کہ اسے اصل سے زائد انعام ملے گا اور یہی لالچ دے کر قرض لینے والا اس کو قرض دینے پر آمادہ کرتا ہے اس لیے اس میں نیت سودی لین دین ہی کی ہوتی ہے۔ رابعاً جمع شدہ سود کی وہ رقم جو بصورت انعام دی جاتی ہے اس کا کسی وثیقہ دار کو ملنا اس طریقہ پر ہوتا ہے جس پر لاٹری میں لوگوں کے نام انعامات نکلا کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ لاٹری میں انعام پانے والے کے سوا باقی تمام لوگوں کے ٹکٹوں کی رقم ماری جاتی ہے اور سب ٹکٹوں کا روپیہ ایک انعام دار کو مل جاتا ہے لیکن یہاں انعام پانے والوں کے سوا باقی سب وثیقہ داروں کی اصل رقم قرض ماری نہیں جاتی بلکہ صرف وہ سود جو سودی کاروبار کے عام قاعدے کے مطابق ہر دائن کو اس کی دی ہوئی رقم قرض پر ملا کرتا ہے انہیں نہیں ملتا بلکہ قرعہ کے ذریعے سے نام نکل آنے کا اتفاقی حادثہ ان سب کے حصوں ایک یا چند آدمیوں تک اس کے پہنچنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ بعینہٖ قمار تو نہیں مگر اس میں روح قمار ضرور موجود ہے۔

بہرحال میسر یا قمار لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھانے کی ایک وہ شکل ہے جس میں لاکھوں اور

کروڑوں کی دولت ملنے والے کو اس طرح مل جاتی ہے کہ پورے ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا ہے۔ غور فرمائیے کہ قمار اور میسر میں جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے اس کے بدلے میں ہارنے والوں کو نہ سہی کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے قمار میں جتنے غصہ میں بھرے ہوتے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ تو چوروں اور ڈاکوؤں پر ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری ہوتا ہے۔
حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صحیح فرمایا ہے۔

جوئے باز جوئے میں لوگوں کے اموال کو اس طرح اچکتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہوتا ہے۔ اور دھوکہ پر سوار ہوکر اس میدان میں کودتا ہے اور حرص، غلط آرزو وغیرہ اسکو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہے جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر اور نہ باہمی امداد میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی ونامرادی کی چنگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن میں وہ اپنے قصد وارادے سے گھسا تھا۔ یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کاروبار کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور اس کی حرص اس کو اس فعل سے باز آنے کی اجازت نہیں دیتی ہے بالآخر کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کا تاوان اس پر اس کے سر پر مسلط ہوجاتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس عادات بد کا رواج ہوجاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ۔

ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور باہمی طویل جھگڑوں کے سلسلے کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور حصول معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں، لوگ اس باہمی امداد و اعانت سے لاپرواہی برتنے لگتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔

فرماتے ہیں:

دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ اس باب میں تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے کبھی بھی کسی اور چیز کا مشاہدہ کیا ہے۔

بہرحال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہوجاتا ہے اس لیے اسلام

نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ عرب میں خرید و فروخت کی کچھ صورتیں ایسی تھیں جنہیں موجودہ زمانے کا سٹہ کہنا چاہیے اور متمدن ممالک میں اب تک ان کا رواج ہے۔ اسلام نے اسی قمار کی وجہ سے ان کو غیر قانونی قرار دیا۔ مثلاً منابذہ، کپڑے کو پھینک دیا جاتا تھا جس پر کسی کا ہاتھ پڑ جاتا وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا۔ ملامسہ، جس کپڑے پر ہاتھ پڑ گیا جبراً اس کی خریداری ناگزیر تھی۔ اسی طرح کی اور بہت سی صورتیں تھیں جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کر دی گئیں۔

انصاب اور ازلام کے بارے میں ہم تشریحی نوٹ چھٹی جلد میں لکھ چکے ہیں۔ بہرحال خمر ہو یا میسر انصاب ہو یا ازلام، قرآن نے یہاں ان کو رجس اور عمل شیطانی قرار دیا ہے۔ رجس کے معنے ناپاک، پلید، گندہ، عقوبت، عذاب اور بلا کے آتے ہیں

امام راغب فرماتے ہیں کہ رجس چار طرح سے ہوتا ہے۔ ۱۔ طبعی طور پر، ۲۔ عقلی طور پر، ۳۔ شرعی طور پر۔ ۴۔ طبعی، عقلی اور شرعی طور پر۔ رجس شرعی جوا اور شراب ہے۔ رجس عقلی شرک اور لحم الخنزیر ہے۔ تینوں کا مجموعہ مردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے رجس استعمال کیا ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ من عمل الشیطان کہ یہ شیطانی کام ہیں۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور بتوں کے چڑھاوے اور بانٹ کے پانسوں کو ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں شمار کیا ہے اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شبہ نہیں ہے اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے جیسا کہ آیت ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین میں ہے مطلب یہ ہے کہ شراب جوتے بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کے لیے بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ ہیں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ کون نہیں جانتا شراب خوری قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی مثالیں ان گنت موجود ہیں۔

شراب اور جوئے کی معاشرتی و مذہبی برائی

۱۸۳۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بیر ڈال دے اور تمہیں یادِ الٰہی اور نماز سے ہٹا دے بتلاؤ کیا تم باز آؤ گے؟ شراب پی کر جب عقل جاتی رہتی ہے تو بعض اوقات

شرابی پاگل ہوکر آپس میں لڑپڑتے ہیں حتیٰ کہ نشہ اترنے کے بعد بھی بعض دفعہ لڑائی کا اثر باقی رہتا ہے اور باہمی عداوتیں قائم ہوجاتی ہیں۔ یہی حال بلکہ کچھ بڑھ کر جوئے کا ہے۔ اس میں ہار جیت پر سخت جھگڑے اور فساد برپا ہوتے ہیں جس سے شیطان کو ادھم مچانے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔ یہ تو ظاہری خرابی ہوئی اور باطنی نقصان یہ ہے کہ ان چیزوں میں مشغول ہوکر انسان خدا کی یاد اور عبادتِ الٰہی سے بالکل غافل ہوجاتا ہے اس کی دلیل مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ شطرنج کھیلنے والوں ہی کو دیکھ لو نماز تو کیا کھانے پینے اور گھر بار کی بھی خبر نہیں رہتی ہے۔ جب یہ چیز اس قدر ظاہری و باطنی نقصانات پر مشتمل ہے تو کیا ایک مسلمان اتنا سُن کر بھی باز نہ آئے گا۔[1]

یہاں قرآن نے شیطانی کاموں کی دو برائیاں بتائی ہیں۔ ایک معاشرتی اور دوسرے مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہوکر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے کتنے قتل کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت پیش آتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ بُرائی پھیل جاتی اس میں عفت، عزّت، ناموس اور حیا کا احساس مٹ جائے گا اور یہ بجائے خود ایک حادثہ ہے۔ عرب عفت و عصمت، خوداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ ان کی بڑی خوبی تھی لیکن ساتھ ہی شراب اور جوئے کے بھی متوالے تھے اس لیے جامِ شراب اور جُوئے سے عشق ان کے لیے بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کی عزّت و ناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا اور جوئے میں ہارنے والے پر آوازہ کس دیا وہیں فریقین تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی پشتم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی۔ اور انتقام در انتقام کا ایسا لامتناہی سلسلہ قائم ہوتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں بلکہ پوری صدی گزر جاتی اور لڑائی ختم نہ ہوتی۔ عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قماربازی کا نتیجہ تھی۔ حصولِ دولت اور کسبِ شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان تباہ ہوجاتے۔

مذہبی بُرائی کو قرآن نے ویصدکم عن ذکر اللہ و عن الصلوٰۃ کے بلیغ فقرے میں بیان کیا ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہوجاتا ہے کہ خدا کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہوجاتا ہے بلکہ خود اپنے مفید کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دُنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہوکر رہ جاتی ہے۔

---

[1] فوائد شیخ الاسلام

اللہ کی یاد کا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے کبھی بے پرواہ نہیں ہونے دیتی جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی راہ سے بے راہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو خدا کی یاد اسے سنبھال لیتی ہے۔

آیت قرآنی میں قانونی نکتہ

قرآن نے یہاں شراب اور جوئے کی حرمت کی وجہ بیان کر کے اسلامی مملکت کی قانون ساز مشینری کے لیے ایک قانونی اساس بتائی ہے بلکہ اسلامی دستور کے لیے ایک رہنما اصول پیش کر دیا ہے کہ جو چیزیں، جو اعمال اخلاقی اعتبار سے معاشرے میں فساد، باہمی عداوت و بغض پیدا کرتے ہوں، اسلامی سرکار کو اس پر قدغن قائم کرنے کا حق ہے۔ اور اسی بنا پر جو چیزیں اور معاشرے میں جو اعمال افراد کو یاد الٰہی سے غافل بناتے ہوں ان پر اسلامی قانون پابندی لگانے کا مجاز ہے خواہ کھیل اور تماشہ کی کوئی نوع ہو۔ اسی سے آپ اپنے معاشرے میں سرکس، سینما اور دوسرے تماشوں کا حکم معلوم کر سکتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں ذکر اللہ سے افراد میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے لگاؤ اور جس کی اجتماعی زندگی میں عداوت و بغض کی جگہ اتحاد، ایتلاف، امتزاج اور نظم موجود ہو۔

آخر میں فرمایا ہے فھل منتھون عربی زبان میں کسی کام سے باز رکھنے اور روکنے کے لیے یہ تعبیر زیادہ بلیغ ہے۔ یہ امر کے مفہوم میں ہے۔ صاحب کشاف نے لکھا ہے من ابلغ ما ینھی بہ ممانعت کے اسالیب اور پیمانوں میں یہ انداز سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔ انداز کلام بتا رہا ہے کہ شراب اور جوئے کے مفاسد اب جبکہ کھل کر سامنے آ گئے ہیں تو ان آیات میں سات عنوانوں سے اللہ سبحانہ نے شراب اور جوئے کی خباثت کو پیش کیا ہے۔ مثلاً،

اولاً شراب اور جوئے کو رجس یعنی پلید بتایا

ثانیاً، جملہ کی پیشانی پر انما لگا کر بتایا کہ صرف پلید ہی نہیں بلکہ ان دونوں میں پلیدی کے سوا کسی اور بات کا تصور ہی نہیں۔

ثالثاً ان دونوں کو انصاب و ازلام کے ساتھ بیان کیا تاکہ جاننے والے جان لیں کہ کس قدر بری چیز ہے۔

رابعاً ان کو شیطانی عمل قرار دیا ہے اور شیطانی عمل ہونا علامت ہے اللہ کی ناراضگی کی۔

خامساً ممانعت کے لیے اجتناب سے فعل امر لاتے ہیں۔ ترک سے امر کو چھوڑ کر اجتناب سے امر لانا نشاندہی کر رہا ہے کہ شراب اور جوئے کو صرف چھوڑنا نہیں بلکہ ان دونوں سے دور رہنا ہے۔

قرآن نے یہ لفظ شرک و طاغوت کے سوا کسی چیز سے ہٹنے کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے شرک و طاغوت اور شراب و جوا برائی میں ہم پلہ ہیں۔

سادساً، شراب و جوئے سے اجتناب پر فلاح کو موقوف کیا ہے یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان دونوں کا مرتکب دُنیا و آخرت میں ناکام اور نامراد ہوتا ہے۔

سابعاً، شراب اور جوئے کو معاشرے میں عداوت اور دشمنی کا سامان بتایا ہے یعنی شراب اور جوئے کے ذریعہ معاشرے میں دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکتی ہے گویا ان دونوں میں دُنیا کے دوسرے ایسے مفاسد ہیں جن کے نتیجے میں قسم قسم کے معاصی رونما ہوتے ہیں۔

ثامناً ان دونوں کو افراد میں بیر اور کینہ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے شراب کو ام الخبائث اور ام الفواحش کہتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ شراب سے بچو کیونکہ یہ ساری خباثتوں کی جڑ ہے اور اس کے بعد یہ قصہ سنایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں ایک شخص پر ایک بدکار عورت کا دل آگیا۔ اس نے اپنی خادمہ کو اس کے پاس بھیجا کہ تو جا اور ان سے میرا نام لے کر کہہ کہ وہ آپ کو گواہی کے لیے بلا رہی ہے خادمہ گئی پیغام سنایا، وہ صاحب اس خادمہ کے ساتھ آگئے، جوں ہی وہ اندر داخل ہوتے دروازہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک پیکر حسن و جمال بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے پاس ایک لڑکا اور شراب کا جام ہے۔ اس آنے والے کو دیکھتے ہی وہ ملکۂ حسن و جمال آگے بڑھی اور ان سے کہا خدا کی قسم میں نے آپ کو شہادت کے لیے نہیں بلایا بلکہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ ہم بستر ہوں یا شراب کا ایک جام میرے سے پی لیں اور یہ بھی منظور نہیں ہے تو اس لڑکے کو قتل کر دیں۔ ان میں سے ایک کام آپ کو بہر حال کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر چھٹکارا نہیں ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے سوچ کر کہا کہ شراب ایک جام پلا دو یہ گناہ ذاتی ہے اس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہے۔ عورت نے شراب کا ایک پیالہ دیا، پی گئے۔ شراب نے اپنا اثر دکھایا، ہوش و حواس جاتے رہے، کہنے لگے اور پلا پھر اس عورت نے اس سے منہ کالا کیا اور لڑکے کو بھی قتل کرایا۔ یہ قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت عثمان نے فرمایا:

> شراب سے بچو خدا کی قسم شراب اور ایمان ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان شراب پینے والے سے نکل بھاگتا ہے۔

تاسعاً۔ شراب اور جوا انسان کو یادِ الٰہی سے روکتے ہیں۔ اسلامی زندگی کی تمام رفعت و عظمت ذکر اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ذکر ہی کے ذریعہ اُمتِ اسلامیہ اس بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدے تک پہنچ گئی تھی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھی ذکر معاشرت کو

متاثر کرنے والا زندگی اور اس کے متعلقات پر حاوی تھا۔ وہ لوگ اس خداوند قدوس پر ایمان لاتے تھے جس کو بہترین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

عاشرًا، شراب اور جوا نماز سے روکنے والا ہے جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی ہے۔ فرد اور جماعت، نظام اور اقتدار کی، اسلامیت کی بنیادی شرط نماز ہے۔ یہ نماز ایک کامیاب اخلاقی مدرسہ اور نفسیاتی تربیت گاہ ہے جو نمازی کو اعلیٰ درجہ کی قوت ارادی، محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی ہے۔ تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سراغ نہیں ملتا جو نفس کی ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی۔

حادی عشر، صیغہ استفہام کے ساتھ شراب اور جوئے سے روکا گیا ہے اس میں امر کے ساتھ زجر، موعظت اور تاکید و تنبیہہ اور اتمام حجت کا پہلو بھی مضمر ہے۔

پورے قرآن میں کسی چیز کے حرام کرنے کے لیے ایسا موکد انداز بیان اختیار نہیں کیا گیا ہے جیسے یہاں شراب اور جوئے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو جس وقت یہ آیت سنائی گئی خوشی سے بھڑک اٹھے اور فھل انتم منتھون؟ سن کر بول پڑے انتھینا انتھینا ہم باز آگئے ہم باز آگئے انما تذھب العقل و تذھب المال یہ مال اور عقل کو برباد کرتی ہے۔

مکمل سپردگی اختیار کرو

۱۸۴۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے کہنے پر چلو اور محتاط رہو، پھر اگر تم نے حکم عدولی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسولؐ کی ذمہ داری صرف پیغام کو پہنچانا ہے۔ اگر کسی چیز کے منافع اور مضار کا احاطہ نہ کر سکو تب بھی خدا اور رسولؐ کے احکام کا امتثال کرو اور قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔ اگر نہ سمجھو گے تو ہمارے پیغمبر تم کو قانون و احکام الٰہی کھول کر پہنچا چکے ہیں۔ نتیجہ خلاف ورزی کا خود سوچ لو کہ کیا ہوگا[1] اس کے ذریعے پہلی بات میں زیادہ زور پیدا کیا گیا ہے کہ ایک طرف شیطان اور اس کی دعوت ہے۔ نفسیاتی طور پر جذبات اور خواہشوں کو یہ اپیل کرتی ہے اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت ہے۔ تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ نفس کی ساری چاہتوں، خواہشوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور رغبتوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت میں داخل ہو جاؤ اور اللہ و رسول کی نافرمانی و سرکشی سے بچو اور احکامِ الٰہی کی غیر مشروط اطاعت کرو اور حکمِ الٰہی کے سامنے اپنے اختیارات سے کلیۃً دستبردار ہو جاؤ۔ اپنی عقل اپنی رائے اپنے افکار اور اپنے اعمال، اپنے احساسات اور اپنے جذبات، اپنے رجحانِ طبع اور اپنے ذوق سب کی گردنوں میں اس بے قید غلامی کا قلادہ ڈال لو، تم اللہ کے بندے ہو جاؤ۔ تمہیں صرف اس کی مرضیات پوری کرنے کا فرض انجام دینا ہے۔ اس آیت میں اسی غیر مشروط طاعت کا حکم ہوا ہے۔ آگے فرمایا کہ اگر اس کے باوجود تم نے اعراض کی راہ اختیار کی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ رسول کی ذمہ داری تو صرف خدا کے احکام کو پہنچانا ہے۔ اللہ کے رسول کے صحابہ نے اطاعت اور فوری تعمیل کا کہاں تک مظاہرہ کیا۔ اس کے بارے میں شراب کے موضوع پر کچھ باتیں سن آئے ہو۔ اسی کی مثال وہ واقعہ بھی ہے جو حافظ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ

> ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اٹھا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضری دوں اور سلام کروں۔ ادھر قرآن کی یہ آیت نازل ہو چکی تھی یا ایھا الذین امنوا انما الخمر میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور میں نے یہ آیت فھل انتم منتھون تک پڑھ کر سنا دی، کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں ساغر تھا کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا جو شراب ہونٹوں میں پہنچ گئی تھی فوراً تھوک دی گئی۔

یہ مکمل سپردگی کا عملی مظاہرہ تھا۔ اطاعت و تابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب صحابہ محبت کی دولت سے مالا مال ہوئے تو انہوں نے اپنی ساری طاقت آپ کی طاعت میں صرف کر دی۔

روحانی ترقیات کا انتہائی مقام

۹۳۔ یاد رکھو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے ان پر ماضی میں کھانے پینے پر کوئی گرفت نہیں ہے جبکہ اب وہ متقی ہو گئے اور ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کیے پھر پرہیزگار رہے اور ایمان لاتے پھر پرہیز کیا اور نیک کردار ہو گئے اور اللہ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے۔

نہایت صحیح اور قوی احادیث میں ہے کہ جب تحریمِ خمر کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ان مسلمانوں کا کیا حال ہو گا جنہوں نے حکمِ تحریمِ خمر آنے سے پہلے شراب پی اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔ مثلاً بعض صحابہ جو جنگِ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے اور

اسی حالت میں شہید ہو گئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ عموم الفاظ اور دوسری روایات کو دیکھتے ہوئے ان آیات کا مطلب ہے کہ زندہ ہوں یا مردہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کے لیے کسی مباح چیز کے بوقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ لوگ عام حالات میں تقویٰ اور ایمان کے خصائل سے متصف ہوں۔ پھر ان خصائل میں برابر ترقی کرتے رہے ہوں حتیٰ کہ مدارج تقویٰ اور ایمان میں ترقی کرتے کرتے مرتبہ احسان تک جا پہنچے ہوں جو ایک مومن کے لیے روحانی ترقیات کا انتہائی مقام ہے جہاں پہنچ کر حق تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خصوصی محبت کرتا ہے وفی حدیث جبریل الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ لہٰذا جو پاکباز صحابہ ایمان و تقویٰ میں عمر گزار کر اور نسبت احسان حاصل کر کے خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ان کی نسبت اس قسم کے خلجان اور توہمات پیدا کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ ایک ایسی چیز کا استعمال کرتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں جو اس وقت حرام نہیں تھی مگر بعد کو حرام ہوئی۔ محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے کے کئی درجے ہیں اور ایمان و یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت و ضعف متفاوت ہیں، تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر و فکر عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت و جلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان و یقین مستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی و عروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام احسان اور اس کے ثمرہ پر بھی متنبہ فرمادیا۔ اور جن حضرات صحابہ کے متعلق سوال کیا گیا تھا اس کا جواب ایک عام و تام ضابطہ بیان فرما کر ایسے عنوان سے دے دیا گیا جس میں ان مرحومین کی فضیلت و منقبت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہو گیا ذخیرہ احادیث میں دو موقعے ایسے ہیں جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس قسم کا سوال کیا ہے۔ ایک موقع تو یہی تحریم خمر کا ہے اور دوسرا تحویل قبلہ کے وقت سوال کیا گیا تھا کہ یا رسول اللہ جو لوگ حکم تحویل سے پہلے وفات پا گئے اور ایک نماز بھی کعبہ کی طرف نہیں پڑھی، ان کی نمازوں کا کیا حال ہوگا؟۔ اسی پر آیت وماکان اللہ لیضیع ایمانکم نازل ہوئی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی دو مسئلے ایسے تھے جن میں صاف صاف دوٹوک حکم نازل ہونے سے پہلے نہایت ہی واضح آثار و قرائن ایسے موجود تھے جن کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم ہر آن نزول حکم صریح کا انتظار کر رہے تھے۔ خمر کے متعلق تو ابھی چند فوائد پہلے ایسی روایات نقل کر آئے جن سے ہمارے اس دعویٰ کا کافی ثبوت ملتا ہے اور اور تحویل قبلہ کے باب میں قرآن کریم کی آیت قد نریٰ تقلب وجہک فی السماء فلنولینک

قبلہ" ترضاھا جو بار مدوم کے شروع میں ہے خبر دے رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت منتظر تھے کہ کب تحویل قبلہ کا حکم آتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے واضح حالات صحابہ پر مخفی نہیں رہ سکتے تھے اس لیے تحویل قبلہ کا حکم جب ایک آدمی نے کسی محلہ کی مسجد میں جاکر سنایا تو سارے نمازی محض خبر واحد کو سن کر بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھر گئے، حالانکہ بیت المقدس کا استقبال قطعی طور پر انہیں معلوم تھا اور خبر واحد ظنی قطعی کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتی تھی اس لیے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ یہ خبر واحد محفوف بالقرائن ہونے کی وجہ سے قطعی سمجھی گئی۔ پس چونکہ قرائن و آثار حتمی طور پر خبر دے رہی تھی کہ تحریم خمر یا تحویل قبلہ کا حکم اب زندہ فردا میں پہنچنے والا ہے۔ گویا ایک طرح سے وہ صحابہ کو نزول حکم سے پہلے مرضی الٰہی پر فی الجملہ مطلع کر رہے تھے اس لیے ان دو مسئلوں میں نزول حکم سے پہلے کی حالت کے متعلق سوال کرنا محل استبعاد نہیں خصوصاً خمر کی نسبت جس کی ممانعت کے نہایت واضح اشارات " اثمھما اکبر من نفعھما" وغیرہ میں موجود تھے واللہ سبحانہ اعلم [1] ۔

اس آیت میں تحریم خمر سے پہلے شراب پینے والوں کی بے گناہی کو بتانے کے لیے تین بار تقویٰ کی دو بار ایمان کی اور ایک بار احسان کی شرط سے شارحین قرآن جس حیرت کا شکار ہو رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام کے اس تشریحی نوٹ نے اس راہ کی ساری مشکلات کو اس خوبصورت انداز میں حل فرما دیا ہے کہ کم از کم میں علم کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ آیت کی اس سے بہترین تشریح کہیں دیکھنے میں نہیں آئی ہے اگرچہ یہاں زمخشری، خفاجی، وغیرہ نے خوب داد تحقیق دی ہے مگر علامہ قرطبی نے اس موقعہ پر اچھوتی بات ارشاد فرمائی ہے۔

> منشاء یہ ہے کہ اہل ایمان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ کام و دہن کی لذتوں سے بچ کر رہیں اور طیبات سے کنارہ کش ہوں بلکہ ان سے یہ مطالبہ ہے کہ تقویٰ و ایمان کے درجات میں مرتبہ کمال یعنی اخلاص و یقین پیدا کریں اور اس کی راہ یہ ہے کہ شرک سے بچیں اور ایمان کے سارے تقاضے پورے کریں اور اعمال صالحہ پر مداومت کریں تاکہ وہ استقامت حاصل ہو سکے جس کے ذریعے ایک مومن مرتبہ احسان اور مشاہدہ حق تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی منشا ہے واحسنوا کا، اور اسی پر اللہ کی محبت و قرب کی انتہا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں واللہ یحب المحسنین اشارہ کر رہا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ
أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ
بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا
الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا
قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ
كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِيَذُوقَ وَبَالَ
أَمْرِهِ ۗ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ ۗ وَاللَّهُ
عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٩٥﴾ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَ
لِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ
الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩٦﴾

اے اہل ایمان، اللہ تمہاری کچھ ضرور آزمائش لے گا اس شکار
کے ذریعہ جسے تمہارے ہاتھ اور نیزے پا رہے ہوں گے تاکہ

اللہ معلوم کرے کہ کون اللہ سے غائبانہ ڈرتا ہے، اس کے بعد
جس نے اللہ کے قانون سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک عذاب
ہے[۱۸۶]۔ اے اہل ایمان حالت احرام میں شکار کے جانور کو نہ مارو
اور اگر کوئی تم میں سے جان بوجھ کر یہ کام کرے تو اسے بدلہ دینا
چاہیے یعنی جیسا جانور مارا ہے اسی کی مانند مویشی میں سے ایک
جانور قربان کرے اور اس کا فیصلہ دو منصف کریں اور یہ قربانی
خانہ کعبہ میں پہنچا کر کی جائے یا کفارہ دے یعنی مسکینوں کو کھانا
کھلائے اور یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ وہ اپنے کیے کی جزا
کا مزا چکھ لے[۱۸۷]۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے خدا نے اسے
معاف کر دیا ہے اور جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے نافرمانی
کا بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب اور بدلہ لینے والا ہے[۱۸۸]۔ تمہارے
لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے تاکہ اس سے

تمہیں بھی فائدہ ہو اور قافلے کے لیے بھی زادِ راہ ہو، اور تم پر خشکی کا شکار جب تک تم حالت احرام میں ہو حرام ہے، اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے حضور میں تم سب جمع کیے جاؤ گے۔[۱۸۹]

اتباع واطاعت کی آزمائش

بات میں تسلسل قائم ہے۔ آغاز سورت میں کھانے کے موضوع پر حلال وحرام اور حج سے متعلق خاص طور پر سرزمینِ حرم میں اور حالتِ احرام میں شکار کے احکام بیان ہوتے تھے۔ اس کے بعد روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہو گیا اور الشئ یذکر بالشئ بات میں سے بات نکلنے سے مضمون طویل ہو گیا۔ بالآخر پھر گفتگو کھانے کی طرف پھر گئی۔ اور اہلِ ایمان کو طیبات کو حرام کرنے سے روکا۔ اور حلال وطیب کھانے کی تلقین کی۔ چونکہ بعض متقشفین طیبات استعمال نہ کرنے کی قسمیں کھا بیٹھے تھے ان کو بتایا کہ کفارہ دینا چاہیے پھر کھانے ہی کے سلسلے میں شراب اور جوئے پر پابندی لگائی۔ کھانے سے متعلق تتمہ بیان کرنے کے بعد اب حج سے متعلق حالتِ احرام میں شکار کا تتمہ بیان ہو رہا ہے اور اس کے لیے تمہید یہ اٹھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اتباع وطاعت کی ضرور آزمائش لے گا۔ چونکہ اُمتِ اسلامیہ کا قیام ایک عہد ومیثاق کے ذریعے عمل میں آیا ہے، جس کا ذکر اسی سورت کے آغاز میں اس آیت میں ہو چکا ہے واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہ اذ قلتم سمعنا واطعنا اسی میثاق کا تقاضا ہے کہ خدا اور رسول کی غیر مشروط طاعت کی جائے۔ اور یہ جب تقابلی طور پر ہو تو اسی کو آزمائش کہتے ہیں۔ یعنی اگر مقابلہ پر کوئی فکر کوئی عمل ہو اور پھر ان کے مقابلے میں اللہ ورسول کی طاعت کا حکم دیا جائے تو یہ اطاعت کرنے والوں کی آزمائش ہے یہاں اگرچہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ مقابلہ پر کام ودہن کی لذت تھی اور سفر کی حالت میں اس کی شدید ضرورت بھی ہوتی ہے اس لیے یہاں امتحان بولا گیا ہے۔ اس صورت میں مقابلہ جذبات اور چاہتوں سے ہو گا۔ پھر ابتلا اور بلا اپنے وجود کے لیے ایک تقابلی حالت کو چاہتا ہے۔

۱۸۶۔ اے اہلِ ایمان، اللہ تمہاری کچھ ضرور آزمائش لے گا اس شکار کے ذریعے جسے تمہارے ہاتھ اور

نیزے پا رہے ہوں گے تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون اللہ سے غائبانہ ڈرتا ہے اس کے بعد جس نے اللہ کے قانون سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ پچھلے رکوع میں تحریم طیبات اور اعتداء سے منع فرماکر بعض چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا تھا جو دائمی طور پر حرام ہیں۔ اس رکوع میں بعض ایسی اشیاء کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے جن کی حرمت دائمی نہیں ہے بلکہ بعض احوال واوضاع سے مخصوص ہے یعنی بحالت احرام شکار کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مطیع و فرمانبردار بندوں کا امتحان یہ ہے کہ وہ حالت احرام میں جبکہ شکار ان کے سامنے ہو اور بسہولت اس کے مارنے پر یا پکڑنے پر بھی قادر ہوں کون ہے جو بن دیکھے خدا سے ڈر کر اس کے حکم کا امتثال کرتا اور اعتداء یعنی احکام خداوندی سے تجاوز کرنے کی خدائی سزا سے خوف کھاتا ہے۔ اصحاب سبت کا قصہ سورہ بقرہ میں گزر چکا کہ ان کو حق تعالیٰ نے خاص شنبہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت فرمائی تھی مگر انہوں نے مکاری اور حیلہ سازی سے اس حکم کی مخالفت کی اور حد سے تجاوز کر گئے۔ خدا نے ان پر نہایت رسوا کن عذاب نازل فرمایا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے اُمت محمدیہ کا تھوڑا سا امتحان اس مسئلہ میں لیا کہ حالتِ احرام میں شکار نہ کریں۔ حدیبیہ کے موقع پر جب یہ حکم بھیجا گیا تو شکار اس قدر قریب تھا کہ ہاتھوں اور نیزوں سے مار سکتے تھے مگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کر دکھایا کہ خدا کے امتحان میں ان کے برابر دُنیا کی کوئی قوم نہیں ہے اور لیعلم اللّٰہ کے لفظ سے جو حدوث علم باری کا وہم گزرتا ہے اس کے ازالہ کے لیے پارہ دوم کے شروع میں الا لنعلم من یتبع الرسول کا فائدہ ملاحظہ کر دیئے۔

اس آیت میں سب سے پہلے امتحان اور آزمائش کی بات سمجھنے کی ہے لیبلون بلا سے بنا ہے۔ مضارع موکد کا صیغہ ہے مصدر اس کا بلاء ہے۔ اسی سے ابتلا بنا ہے جو اُردو میں مستعمل ہے۔ امتحان، آزمانا اور جانچنا ان کا ترجمہ ہے تو اب لیبلون کا ترجمہ اس طرح ہوا کہ ضرور آزمائش لے گا، اللہ امتحان لے گا آزمائے گا اور جانچے گا یہ تو اس لفظ کے لغوی معنے ہوئے، رہا مطلب تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امتحان، آزمانے جانچنے کے الفاظ جب انسانوں کے لیے بولے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے اس کے ایسے حالات سے امتحان لینے والا باخبر ہونا چاہتا ہے جن کی اسے واقفیت نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کی معلومات کیسی ہیں، فلاں علم میں استعداد کیسی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف جب امتحان کی نسبت ہوگی تو اس کا مطلب تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ العیاذ باللہ خدا بندوں کے جن حالات سے

ناواقف ہے امتحان لے کر ان حالات کو وہ جاننا چاہتا ہے۔ قرآن میں صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے مقامات پر بھی یہ اور اسی کے ہم معنے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے بولے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ الفاظ جب اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ جب یہ بات مانی ہوئی ہے بلکہ خود قرآن ہی کی بتائی ہوئی ہے کہ اللہ کی باتوں کو مخلوقات اور مخلوق کی صفات و افعال کے مماثل قرار دینا ممنوع ہے اور قرآن نے لیس کمثلہ شیئ کہہ کر اہل ایمان کو منع کیا ہے کہ ذات میں ہو یا صفات میں اور یا افعال میں کسی اعتبار سے کسی چیز کو خدا کے مماثل نہ قرار دینا چاہیے۔ اسی لیے سماعت، بصارت، علم حیات وغیرہ جو صفات قرآن میں خدا کی طرف منسوب ہو کر آئی ہیں سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ان کا وہ مطلب نہیں ہے جو انسانوں کی طرف نسبت کرنے میں ہوتا ہے۔ مثلاً بصارت ایک صفت ہے آدمی کی طرف جس بصارت اور بینائی کے الفاظ کو ہم منسوب کرتے ہیں تو اس سے مراد ایسی صفت ہے جو عمل کرنے میں رنگ اور روشنی کی محتاج ہوتی ہے اور بعد مُفرط نہ ہو قرب مفرط نہ ہو۔ ان شرطوں کے ساتھ اس کے آثار کا ظہور وابستہ ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسی بصارت کے لفظ کو خدا کی طرف جب منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا بصیر ہے تو ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ خدا کی یہ صفت نہ رنگ کی محتاج ہے نہ روشنی کی نہ دوسرے شرط کی بلکہ وہ دیکھتا ہے اور ہر حال میں دیکھتا ہے۔ پھر دیکھنے کے اس لفظ کا جو حال ہے اگر ابتلا اور امتحان کے الفاظ کا بھی یہی حال ہو یعنی انسان کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں اور معنے ہوں اور خدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دوسرے معنے ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ ایک عام قانون کلی ہے جو ذات و صفات و افعال وغیرہ سب پر حاوی ہے وہ اپنی تمام شانوں میں جیسے نرالا بے مثل بے نظیر ہے اسی طرح ابتلا و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا لیتی ہے قطعاً مختلف ہے۔ قرآن میں بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت و کیفیت ہی نہیں بلکہ جس زندگی کو انسان اس وقت زمین پر گزار رہا ہے اس کی یہ ساری زندگی ہی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا اس کا حاصل یہی ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو خاص رُخ نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے۔ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے فی الواقع فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلا و امتحان

کی زندگی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی طرف ابتلا و امتحان کے جو الفاظ منسوب ہوتے ہیں تو ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا امتحان سے کر ان کو جاننا چاہتا ہے بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار اختیار اور انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلا و امتحان ہے۔

آیت میں اس آزمائش سے آگاہ کیا جا رہا ہے جو حالتِ احرام میں دفعتہً شکار نظر آجانے کی وجہ سے پیش آسکتی ہے۔ چونکہ اس ممانعت جذبات کے ہجوم میں لوگوں کے ایمان و تقویٰ کو جانچنے کے لیے کی گئی ہے اس لیے پہلے ہی فرما دیا گیا ہے کہ ایسے مواقع درپیش رہیں گے کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو گے اور تمہاری نگاہوں میں شکار کا تماشا ہو گا۔ اس موقعہ پر اپنے ایمان و تقویٰ اور احساس بندگی کی حفاظت کرنا اس طرح اس امتحان میں ناکام نہ ہو جانا جیسے بنی اسرائیل یوم سبت کے معاملہ میں ناکام ہو گئے۔ اہل عرب جانوروں اور پرندوں کا شکار کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ احرام کی حالت میں ان کا شکار سے باز رہنا ایک صبر آزما مسئلہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان کی تفریح اور معاش دونوں کا انحصار بڑی حد تک اس زمانے میں شکار ہی پر تھا۔

آخر میں لیعلم اللہ میں اس آزمائش کا مقصد بتایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ امتحان اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو ممتاز کر دے جو بن دیکھے اللہ سے ڈرتے ہیں یعنی مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اس امتحان کا اصلی مقصد بندوں کی اطاعت اور وفاداری کو منظر عام پر لانا ہوتا ہے۔

یہاں لیبلونکم اللہ کے بعد بشیٔ کے لفظ سے اگرچہ علامہ زمخشری نے یہی سمجھا ہے کہ یہ آزمائش بہت ہلکی سی ہو گی اور سخت نہیں ہو گی یعنی یہ کوئی بڑی آزمائش نہ ہو گی لیکن علامہ ناصر نے انتصاف میں زمخشری کی اس رائے سے اختلاف کر کے بشیٔ میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائش اللہ تعالیٰ کی عظیم آزمائشوں میں سے کچھ ہے سب کچھ نہیں ہے ورنہ اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ اس سے بڑی آزمائش لے آتے۔ اسی لیے آزمائش کے ذکر سے پہلے آزمائش کے بارے میں تنبیہہ کر دے تاکہ مدافعت میں آسانی ہو جاتے بالکل آخر میں اسی بنا پر یہ فرمایا فمن اعتدی بعد ذالك فله عذاب الیم یعنی جو اس آزمائش میں حد سے تجاوز کر جائے گا اس کے لیے عذاب الیم ہے۔ یہ بات اس لیے فرمائی گئی ہے کہ تم سے پہلی اُمتوں کو اس قسم کی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا مگر وہ ناکام ہو گئے اور انہوں نے حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ بنی اسرائیل کے امتحان کا ذکر اشارۃً پہلے ہو چکا ہے اور تفصیلاً اعراف میں آرہا ہے۔ ان کو سبت کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس معاملہ میں اعتدار سے کام لیا ولقد علمتم الذین

اعتدوا منکم فی السبت اسی طرح اہلِ ایمان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر اس امتحان میں تمہارے دامانِ عمل میں بھی اعتداء حد سے تجاوز کر گیا تو تم بھی اللہ کے قانونِ مجازات کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت

۹۵۔ اے اہلِ ایمان حالتِ احرام میں شکار کے جانور کو نہ مارو۔ اگر کوئی تم میں سے جان بوجھ کر یہ کام کرے تو اسے بدلہ دینا چاہیے یعنی جیسا جانور مارا ہے اسی کی مانند مویشی میں سے ایک جانور قربان کرے اور اس کا فیصلہ دو منصف کریں اور یہ قربانی خانہ کعبہ میں پہنچا کر کی جائے یا کفارہ دے، یعنی مسکینوں کو کھانا کھلائے اور یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ وہ اپنے کیے کی جزا کا مزہ چکھ لے۔ اس کے متعلق بعض احکام سورہ مائدہ کے شروع میں گزر گئے۔ جان کر مارنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا محرم ہونا یاد ہو اور یہ بھی مستحضر ہو کہ حالتِ احرام میں شکار جائز نہیں۔ یہاں صرف متعمداً کا حکم بیان فرمایا کہ اس کے فعل کی جزا یہ ہے اور خدا جو انتقام لے گا جیسا کہ ومن عاد فینتقم اللہ منہ سے تنبیہ فرمائی اور اگر بھول کر شکار کیا تو جزا تو بھی رہے گی یعنی ہدی یا طعام یا صیام البتہ خدا اس سے انتقامی سزا اٹھالے گا۔ احناف کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑا تو فرض ہے کہ چھوڑ دے اگر مار دیا تو دو صاحب بصیرت اور تجربہ کار معتبر آدمیوں سے اس جانور کی قیمت لگوائے اسی قدر قیمت کا مویشی میں سے ایک جانور لے کر مثلاً بکری، گائے اونٹ وغیرہ کعبہ کے نزدیک یعنی حدودِ حرم پہنچا کر ذبح کرے اور خود اس میں سے نہ کھائے یا اسی قیمت کا غلہ لے کر محتاجوں کو فی محتاج صدقۃ الفطر کی مقدار تقسیم کر دے یا جس قدر محتاجوں کو پہنچتا ہو اتنے ہی دنوں کے روزے رکھ لے[1]

اس آیت میں متعدد باتیں تشریح طلب ہیں، احرام، حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت، جان بوجھ کر شکار کی صورت میں جزا، جزا کے بارے میں اربابِ بصیرت کا فیصلہ۔ جزا قربانی ہونے کی صورت میں ہو تو اس کا کعبہ میں پہنچانا، کفارہ طعامِ مسکین کی صورت میں، یا روزوں کی شکل میں۔

احرام اور اس کی حج میں حیثیت

حج کی حقیقت جن ارکان سے ترکیب پاتی ہے ان میں احرام کی کلیدی حیثیت ہے، تمام اعمال

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہوتا ہے۔ نماز کے لیے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے۔ احرام ہی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمول کی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔ وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ بی بی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوتے کپڑوں کو اتار دیں ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جاتے اور دوسری سر کھوا کر گردن سے لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لیے باہر رہے۔ یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے یہ گویا شہنشاہ کائنات کے دربار میں حاضری کی یونیفارم ہے۔

حالت احرام میں شکار کی ممانعت

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہ شکار آدمی خواہ خود کرے یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور سے مدد دے۔ دونوں باتیں حالتِ احرام میں منع ہیں۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے خود شکار کیا اور پھر وہ اس میں سے محرم کو بھی تحفہ دے دے تو اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے صید کا لفظ عام ہے خواہ وہ جانور ہو جس کا گوشت کھانا حلال ہے اور خواہ وہ جانور ہو جس کا گوشت حرام ہے سب کا شکار حالتِ احرام میں حرام ہے اور پھر قتل کا لفظ یہ بتانے کے لیے بولا ہے کہ حالت احرام میں جو شکار کیا جاتا ہے وہ محرم کے حق میں ذبیحہ نہیں بلکہ مردار ہے۔ اور صید کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن جانوروں کا شکار نہیں کیا جاتا مثلاً گائے بھینس بکری ان کا ذبح کرنا اور کھانا احرام والے کے لیے جائز ہے ہاں اس سے وہ موذی جانور مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر صحیحین میں حضرت عائشہ کی حدیث میں آتا ہے جیسے کوا، چیل، بچھو، چوہا، کٹ کھنا کتا، زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ کٹ کھنا کتا میں سارے درندے شامل ہیں۔ یعنی ایسے دوسرے جانور جو انسان کو نقصان پہنچانے والے ہیں حالت احرام میں ان کو مارنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حالتِ احرام میں شکار کا کفارہ

۱ ارشاد ہے من قتلہ منکم متعمداً " اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر شکار مار ڈالا تو اس کا کفارہ یہ ہے

کہ اس کا خون بہا دے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی دے۔ یہ مماثلت کس چیز میں ہونی چاہیے۔ خلقت میں یا قیمت میں جمہور کی رائے ہیں خلقت میں ہونی چاہیے۔ یہی امام مالک، امام شافعی اور امام محمد بن الحسن کا مذہب ہے اور جن جانوروں کی نظیر نہ ہو جیسے چڑیا اس کی قیمت دینی چاہیے لیکن امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مماثلت خلقت میں نہیں بلکہ قیمت میں مراد ہے اور قیمت کے ذریعہ قربانی کا جانور خریدنا ہے۔ یہی ابراہیم نخعی کی رائے ہے۔ آگے ارشاد دو ارباب بصیرت سے فیصلہ کرانے کی قید سے یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے کہ مماثلت قیمت میں مراد ہے۔ اگر جسامت اور قامت میں مماثلت مراد ہوتی تو اس کے لیے یحکم بہ ذوا عدل منکم کی قید کی چنداں حاجت نہ تھی۔

قرآن میں گرچہ متعمداً کی قید ہے لیکن سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ اتفاق ہے مطلب یہ ہے شکار حالت احرام میں جان بوجھ کر کیا ہو یا غلطی سے بھول کر کیا ہو دونوں کا حکم ایک ہے اگرچہ کچھ لوگ خطا کی صورت میں کفارے کے قائل نہیں ہیں لیکن حافظ ابن کثیر نے اسے مذہب غریب قرار دے کر اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ جمہور کی رائے یہی ہے کہ اس معاملہ میں عامد اور ناسی کی حیثیت ایک ہے امام زہری نے بھی اسی کو اپنایا ہے حضرت فاروق اعظم نے یہی بات مملکت کے گورنروں کو لکھ کر روانہ کی تھی کہ خطاء اور عمد دونوں میں کفارہ ہے صحابہ میں سے کسی سے اس پر کوئی نکیر ثابت نہیں ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر مجھے الجصاص کی یہ رائے زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کہ متعمداً کی قید صرف یہ بتانے کے لیے کہ نسیان کی صورت میں آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا جبکہ عمداً شکار کرنے میں کفارہ دینے کے باوجود مواخذہ آخرت سے بری نہ ہوگا۔ ہر حال میں حالت احرام میں اگر شکار کیا ہے خواہ جان کر کیا یا غلطی سے کیا ہو ہر حال میں اسے کفارہ دینا ہوگا۔ کفارہ اولین یہ ہے کہ اس مقتول جانور کی قیمت کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی کرے۔

جزا کے بارے میں ارباب بصیرت کا فیصلہ

یہ فیصلہ کہ کون سا جانور کس قیمت کا ہے خود نہ کرے بلکہ دو منصف آدمیوں سے کرائے اور ان دونوں کے لیے شرط یہ ہے کہ مسلمان ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جزا سے مراد وہ قیمت ہے جو دو معتبر آدمی اس شکار کی تجویز کریں اور یہ قیمت اس مقام کے اعتبار سے ہو جہاں وہ شکار مارا گیا ہے یا اس کے قریب تر مقام کے اعتبار سے ہو کیونکہ ایک چیز کی قیمت مختلف مقامات کے اعتبار سے بدل جاتی ہے نیز اس زمانہ کے اعتبار سے ہو جس زمانہ میں وہ شکار مارا گیا ہے کیونکہ مختلف اوقات میں ایک چیز کی قیمت مختلف ہوتی ہے اور دو منصف مسلمانوں کو حکم بنانے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ شکاری جانوروں اور دوسرے پالتو جانوروں میں

قیمت کے توازن کا پتہ لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور پھر اس میں یہ بات بھی ہے کہ اگر مجرم کو خود ہی فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جاتے تو ہر شخص اپنے لیے رعایتوں کے معاملہ میں بڑا فراخ حوصلہ ہوتا ہے اس لیے صحیح قیمت مقرر نہیں کر سکے گا اور جن بزرگوں کے خیال میں مماثلت سے مراد قیمت میں نہیں بلکہ خلقت، قامت اور جسامت میں مماثلت مراد ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ شکاری جانوروں اور پالتو جانوروں میں مماثلت کا عام لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا ہے اس لیے دو منصف مسلمانوں سے فیصلہ کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔

یحکم بہ ذوا عدل منکم سے علامہ جمال الدین قاسمی نے یہ نکتہ خوب معلوم کیا ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ مماثلت کے معاملہ میں اہل عدل و تقویٰ سے دریافت کرنا چاہیے۔ اس سے دلالۃً معلوم ہو رہا ہے کہ اسلامی قانون میں جمود نہیں ہے بلکہ وہ ایک لچکدار ضابطہ ہے اور اس میں نہ صرف اجتہاد کی گنجائش ہے بلکہ اس میں مجتہدین کی تصویب کی ضمانت ہے اور آئین و قانون کی زندگی میں غالب ظن پر عمل کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی رہنما اصول اس میں موجود ہے کہ نادان کو دانا سے دریافت کرنا چاہیے اور اہل فن پر اعتماد کرنا چاہیے اور جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو ارباب بصیرت سے فیصلہ کرانا چاہیے۔

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے حالت احرام میں شکار کر لیا ہے مجھ پر کفارہ کیا ہے۔ صدیق اکبر نے حضرت ابی بن کعب کی طرف روئے سخن کر کے فرمایا کہ اس دیہاتی کے معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔ دیہاتی بول پڑا کہ میں آپ کے پاس خلیفہ ہونے کی حیثیت میں مسئلہ پوچھنے آیا ہوں اور آپ دوسرے سے دریافت کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ مجھے آپ کے سوا کسی اور سے پوچھنا ہوتا تو مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ صدیق اکبر نے فرمایا اللہ کے بندے میں ان سے اس لیے دریافت نہیں کر رہا کہ مجھے مسئلہ معلوم نہیں ہے بلکہ اس لیے مشورہ کر رہا ہوں کہ قرآن کا حکم یہ ہے کہ یحکم بہ ذوا عدل منکم اب ہم دونوں مشورہ کے بعد باتفاق رائے پیش پا افتادہ معاملہ کا فیصلہ کریں گے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ فاروق اعظم کے بارے میں حافظ ابن جریر اور ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ قبیصہ ابن جابر کہتے ہیں کہ ہم حج کے ارادے سے چلے۔ معمول یہی تھا کہ صبح کی نماز کے بعد روانگی ہوتی۔ راہ میں ہم باتیں کرتے چلتے ایک روز اسی طرح صبح صبح جا رہے تھے کہ سامنے ایک ہرن نظر آگیا۔ ساتھیوں سے ایک شخص نے پتھر اٹھا مارا۔ خدا کا کرنا یہ کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم چل تو دیے مگر پریشان کافی تھے۔ مکہ پہنچے۔ میں اس ہرن مارنے والے ساتھی کو لے کر فاروق اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے

ساری کہانی دہرادی۔ ان کے پاس ایک صاحب سپید مُک جھلکے چاندی جیسے رنگ کے بزرگ تشریف فرما تھے ان کا نام عبدالرحمان بن عوف تھا۔ حضرت عمر نے ان کی طرف متوجہ ہو کر ان سے باتیں کیں اور پھر ہم سے دریافت کیا عمداً قتل کیا ہے یا غلطی سے ایسا ہو گیا ہے عرض کیا نشانہ تو عمداً لگایا تھا مگر قتل کا ارادہ نہ تھا۔ فرمایا بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت کو صدقہ کر دو۔ ہم یہ سن کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ راستہ میں میں نے اپنے دوست سے کہا برادر اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو۔ اونٹ ذبح کرو۔ شاید یہ کفارہ ہو جائے۔ امیرالمؤمنین بیچارے کو تو خود مسئلہ کا پتہ نہیں ہے دیکھا نہیں کہ وہ ہماری موجودگی میں اس شخص سے پوچھ رہے تھے قبیصہ کہتے ہیں کہ مجھے قرآن کی اس آیت یحکم بہ ذوا عدل منکم کا کوئی پتہ نہ تھا۔ حضرت عمر کو میری گفتگو کا علم ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ہاتھ میں درہ لیے آ رہے ہیں۔ درہ میرے ساتھی پر اٹھا کر فرمایا حالت احرام میں شکار مارتے ہو اور فتویٰ میں غلطیاں نکالتے ہو۔

قربانی ہونے کی صورت میں کعبہ میں پہنچانا

اصل ارشاد ھدیا بالغ الکعبۃ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شکاری جانور کے مقابلے میں جس جانور کا جیسا کہ جمہور کی رائے ہے یا جس قیمت کا جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور ابویوسف کی رائے ہے۔ ان دو منصف مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ اس قیمت سے اس کو اختیار ہے کہ کوئی جانور قربانی کا خرید کر حرم بھیج دے اور وہ وہاں ذبح کر دیا جائے۔ تفصیل یہ ہے کہ وہ مقتول جانور اگر غیر ماکول ہے تب تو یہ قیمت ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہو گی اور اگر وہ جانور ماکول ہو تو جو تخمینہ لگایا جائے گا وہ سب واجب ہو گا۔ اور اس کی قیمت کا کوئی جانور لا کر حرم میں ذبح کرے۔

آیت میں لفظ بلوغ سے کچھ بزرگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قربانی کو حرم سے باہر سے لے کر حرم میں روانہ کرنا واجب ہے یہ امام مالک کا خیال ہے لیکن جمہور کو امام مالک کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے ان کے خیال میں حرم ہی میں خرید کر قربان کر دینا جائز ہے۔ ان کے خیال میں بالغ الکعبہ کی قید صرف بتانے کے لیے ہے کہ حد حرم ذبح کے لیے شرط ہے۔ قربانی کا بیرون حرم سے آنا یا لانا مقصود نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

یہ بات کہ حرم میں قربانی کرنے کے بعد قربانی کا گوشت فقراء مکہ ہی پر صدقہ کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ جمہور کی رائے میں ایسا کرنا ضروری ہے۔ ان کے خیال میں آیت میں کعبہ کی قید اس کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ قربانی کے لیے تو حرم کا ہونا ضروری ہے لیکن گوشت کی

تقسیم کے لیے فقراء حرم کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ صدقہ والے کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ جہاں چاہے صدقہ کرے۔ وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ ذبح ایک خالص غیر معقول المعنے عابدانہ پیمانہ ہے اس میں تو مکان کی شرط ہونی چاہیے لیکن گوشت کی تقسیم کا مسئلہ ایک معقول پیمانہ عبادت ہے۔ اس میں حرم کے مساکین کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

کفارہ طعام مسکین اور روزے کی صورت میں

اصل ارشاد میں او کفارۃ طعام مساکین او عدل ذالك صیاماً مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں ہونے کے باوجود عمداً شکار کے گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے کفارہ ادا کرنا چاہیے اس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح کا جانور شکار کیا ہے اس کی قیمت کا دو منصف آدمیوں سے اندازہ کرا کے اس قیمت کا جانور خرید کر حرم بھیج دے اور وہ وہاں ذبح کر دیا جائے، دوسری یہ کہ اس جانور کی قیمت سے گیہوں وغیرہ مول لے کر ہر فقیر کو ایک مقدار صدقہ فطر کی ادا کرے تیسری یہ کہ ہر مسکین کے کھانے کے بدلے ایک ایک روزہ رکھ لے۔ اگر قیمت اس قدر واجب ہوتی ہے کہ اس سے قربانی نہیں ہو سکتی تو پھر صرف دو ہی باتوں کا اختیار ہے صدقہ دینے اور روزہ رکھنے کا، اور اگر قدر قیمت واجب ہوتی ہے کہ اس میں ایک مقدار صدقہ فطر بھی نہیں بنتی ہے تو اختیار ہے کہ جس قدر مل جائے اسی قدر خرید کر محتاج کو دے یا اس کے بدلے روزہ رکھ لے لیکن اگر شکار کسی کا مملوک ہو تو اس کے قاتل کو دو قیمتیں ادا کرنی ہوں گی۔ ایک وہ جو دو منصف تجویز کریں گے اسے صدقہ کرے گا دوسرے وہ قیمت جو شکار کے مالک کو ادا کرے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جمہور کے نزدیک اس آیت میں او تخییر کے لیے ہے۔ یعنی یہ شکار کرنے والے کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ چاہے تو قربانی دے دے چاہے تو مسکین کو کھانا کھلا دے اور چاہے تو روزے رکھ لے۔ امام ابوحنیفہ ان کے صاحبین مالک شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کا یہی مسلک ہے اور کچھ بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ آیت میں او ترتیب کے لیے ہے امام شعبی نے ایک روایت میں امام احمد کا یہی مسلک بتایا ہے۔

آخر میں فرمایا لیذوق وبال امرہ تاکہ مجرم اپنے کیے کا مزہ چکھ لے۔ اس سے حضرت امام ابوحنیفہ نے یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اگر احرام والے نے شکار کیا اور اس کے نتیجے میں اس کو حرم میں قربانی دینی پڑی۔ اگر احرام والے نے اس شکار میں سے کھا لیا تو جتنا کھایا اس کی قیمت کو

صدقہ کرنا احرام والے کے ذمہ لازم ہو گا۔

گزشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط

۱۸۸۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا خدا نے اسے معاف کر دیا ہے اور جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے نافرمانی کا بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔ یعنی نزول حکم سے پہلے یا اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کسی نے یہ حرکت کی تھی تو اس سے اب خدا تعرض نہیں کرتا حالانکہ اسلام سے پہلے بھی عرب میں حالت احرام میں شکار کو نہایت برا سمجھتے تھے اس لیے اس پر مواخذہ ہونا بے جا نہ تھا کہ جو چیز تمہارے زعم کے موافق جرائم میں داخل تھی اس کا ارتکاب کیوں کیا گیا اور عزیز ذوانتقام کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مجرم نہ اس کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ سکتا ہے اور نہ مقتضائے عدل جو جرائم سزا دینے کے قابل ہیں نہ خدا ان سے درگزر کرنے والا ہے۔[۱]

یعنی احرام کی حالت میں شکار کی ممانعت سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے وہ اللہ نے معاف کر دیا ہے یہ ایک ضابطہ عام ہے سیاسی، معاشرتی، دیوانی اور اخلاقی معاملات کے متعلق قرآن نے یہ بات واشگاف لفظوں میں بتائی ہے کہ قانون آنے سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کچھ معاف ہے۔ خالص مالیاتی مسائل میں سود کے موضوع پر فرمایا فلہ ما سلف یعنی سود حرام ہونے سے پہلے جو کچھ لے چکا لے چکا۔ معاشرتی زندگی کے مسائل میں والد کی منکوحہ اور دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دے کر فرمایا الا ما قد سلف یعنی اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہو چکا اب اس پر باز پرس نہیں ہے۔ اخلاقیات میں ابھی یہ آیت ہو لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحت جناح فیما طعموا اور سیاسیات میں صاف طور پر کھلے لفظوں میں اعلان ہوا ہے ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف اگر وہ باز آ جائیں تو پچھلے گناہوں کی باز پرس نہ ہو گی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے بتاتے ہوتے رحمت وعفو کے اس ضابطہ عام کو ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے۔

الاسلام یجب ما قبلہ من الذنوب

اسلام پہلے تمام گناہوں کا قصہ تمام کر دیتا ہے

جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور سب ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے

[۱] افادات شیخ الاسلام

کہ وہ گنہگاروں کی سب سے زیادہ اس مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے کہ اس کے ماضی کے گناہ معاف ہو گئے ہیں اور فطرۃً بھی ایک گنہگار کی سب سے بڑی خواہش ہے اس لیے قرآن قدم قدم پر یہ اعلان کرتا ہے کہ جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کے لیے ضامن ہو گا۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص پھر اس جرم کا تکرار کرے گا تو اللہ اس سے بدلہ لے گا۔ اصل ارشاد ومن عاد فینتقم اللہ منہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس ارشاد کو بالکل الفاظ کی سطح تک محدود رکھ کر یہ مطلب بتایا ہے کہ اگر کوئی احرام والا ایک مرتبہ شکار کرتا ہے اور اس کا کفارہ ادا کرتا ہے تو اس کو اللہ سزا دے گا چنانچہ ان کے یہاں جب کوئی محرم کے شکار کا کیس آتا تو وہ دریافت کرتے کہ اس سے پہلے بھی یہ جرم کیا ہے اگر وہ کہتا کہ ہاں تو فرما دیتے جاؤ تم سے اللہ بدلہ لے گا اور اگر کہتا نہیں تو کفارہ کا فیصلہ فرما دیتے لیکن جمہور اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں سزا عذاب آخرت سے اس وقت بچائے گی جب کہ جرم کا تکرار نہ ہو اگر جرم میں تکرار ہو گا تو وہ دنیوی سزا کے ساتھ اخروی سزا کا بھی مستحق ہو گا۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اگر محرم نے شکار کیا اور کفارہ ادا کر دیا تو اللہ ماضی کے گناہ کو معاف کر دے گا اور اگر دوبارہ بھی گناہ کیا اور کفارہ ادا نہ کیا تو اللہ اسے آخرت میں سزا دے گا۔

حالتِ احرام میں سمندری شکار حلال ہے

۹۶۔ تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال ہے تاکہ اس سے تمہیں بھی فائدہ ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی ہو، اور تم پر خشکی کا شکار جب تک تم حالتِ احرام میں ہو حرام ہے اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے حضور میں تم سب جمع کیے جاؤ گے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ احرام میں دریا کا شکار یعنی مچھلی حلال ہے اور دریا کا کھانا یعنی مچھلی پانی سے جدا ہو کر مر گئی۔ اس نے نہیں پکڑی وہ بھی حلال ہے فرمایا کہ یہ تمہارے فائدے کو رخصت دی پھر کوئی یہ نہ سمجھے کہ حج کے طفیل سے حلال ہے فرمایا کہ اور سب مسافروں کے فائدے کو مچھلی اگر تالاب میں ہو وہ بھی دریا کا شکار ہے۔ یہ حکم شکار کا معلوم ہوا احرام کے اندر۔ اور احرام قصد ہے مکہ کا اس شہر اور گرد و پیش میں ہمیشہ شکار مارنا حرام ہے بلکہ شکار کو ڈرانا اور بھگانا بھی۔[1]

یہاں دو چیزیں ہیں ایک صید البحر دوسرے طعام، مطلب یہ ہے کہ سمندر، دریا، نہر، تالاب کا شکار

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کرنا احرام والے کے لیے جائز ہے اور اس کے ساتھ دریائی شکار کا تیار کیا ہوا کھانا بھی محرم کے لیے حلال ہے یہ رخصت اللہ نے اس لیے عطا فرمائی ہے کہ احرام والوں کو اور اہلِ قافلہ کو زادِ راہ میں آسانی ہو۔ شاید صید البحر پر طعام کا عطف کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ صید البحر دو قسم کا ہے ایک وہ جو کھایا جاتا ہے اور دوسرے وہ جو کھایا نہیں جاتا ہے۔ طعام وہ ہے جو کھایا جاتا ہے۔ یا یہ کہ صید البحر تر و تازہ شکار ہے اور طعام باسی اور خشک شکار ہے۔ جمہور نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ سمندر میں مرا ہوا جانور حلال ہے۔ روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ اگر طعام بحر کے موضوع پر روایات نہ ہوتیں تو آیت قرآنی کا بظاہر مطلب یہی ہوتا کہ تمہارے لیے سمندر سے شکار کرنا حلال ہے اور سمندری شکار کا تیار شدہ کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے خواہ تم نے خود شکار کیا ہو یا نہ کیا ہو، طعامہ میں ضمیر بحر کی طرف نہیں بلکہ صید کی طرف راجع ہے۔

یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ احرام والے کے لیے حالتِ احرام میں شکار منع ہے لا تقتلوا الصید و انتم حرم۔ ظاہر ہے کہ یہی بات دہرائی نہیں جا رہی ہے بلکہ اب بتایا جا رہا ہے کہ خواہ بغیر قتل کے شکار پکڑا ہو۔ ہر حال میں احرام والے کے لیے شکار حرام ہے۔ کچھ بزرگوں نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ احرام والے کے لیے خشکی کا شکار مطلقاً حرام ہے خواہ کسی غیر محرم نے محرم کی اعانت، اشارے دلالت کے بغیر شکار کیا ہو اس کا کھانا بھی احرام والے کے لیے ناجائز ہے۔ طاؤس اور سفیان ثوری نے یہی رائے ظاہر کی ہے لیکن دوسرے جمہور علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے شکار کیا ہو تو احرام والے کے لیے اس کے کھانے کی ممانعت نہیں ہے اس پر اہل ایمان کا اتفاق ہے۔ احادیث صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے آیت میں لفظ صید مصدری معنے میں ہے یعنی احرام والوں کے لیے شکار کرنا حرام ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ احرام والوں کے لیے شکار حرام ہے۔

البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر کسی شخص نے احرام والے ہی کے لیے شکار کیا ہو تو احرام والے کے لیے اس کا کھانا کیسا ہے۔ امام ابوحنیفہ اسے محرم کے لیے حلال بتاتے ہیں جبکہ امام مالک احرام والے کے لیے اور حلال کے لیے اس کا کھانا ناجائز کہتے ہیں اور امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ جو شکار احرام والے کے لیے کسی نے کیا ہو اس کا کھانا احرام والے کے لیے ناجائز ہے اور غیر محرم کے لیے جائز ہے اور ایسے اس محرم کے لیے بھی جائز ہے جس کی خاطر شکار نہ کیا گیا ہو۔ روایات دونوں قسم کی ہیں۔ بعض روایات سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کا کیا ہوا شکار حالتِ احرام میں کھایا اور بعض سے حضور انور کا عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکار کر دیا۔ ان روایات میں کچھ لوگ مفاہمت اس طرح کرتے ہیں کہ جو شکار شکاری نے اپنے لیے کیا وہ حضور نے نوش فرمایا اور جو شکار شکاری نے حضور ہی کے لیے کیا حضور نے اس کے کھانے

سے انکار فرمایا اور دوسرے بزرگ ان روایات میں مفاہمت اس طرح کرتے ہیں کہ شکار جو محرم ہی کے لیے کیا گیا ہو اس کا کھانا محرم کے لیے جائز ہے لیکن افضل نہ کھانا ہے۔ حضور انور نے نہ کھا کر درجہ استحباب و فضیلت بتا دیا اور کھا کر جواز کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اور اس موضوع پر جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ اگرچہ صریح ہے مگر صحیح نہیں ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اللہ نے کعبہ کو حرمت والا گھر بنایا ہے لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ ٹھہرا دیا ہے نیز حرمت کے مہینوں کو اور حج کی قربانی کو اور قربانی کے ان جانوروں کو جن کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوں[۱۹۰]۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ تم جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ سب کا حال جانتا ہے اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے[۱۹۱]۔

کعبہ انسانی اجتماعیت کا سنگ میل ہے

اس سے پہلی آیت میں ھدیا بالغ الکعبۃ میں کعبہ کا ذکر آیا تھا لیکن وہاں کعبہ سے حرم اور جوار کعبہ مراد تھا اب یہاں اسی تقرب سے کعبہ کا ذکر ہو رہا ہے اور تصریح موجود ہے کہ یہاں کعبہ سے البیت الحرام مراد ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلے ذکر تھا کہ احرام والے پر شکار حرام ہے اب بتایا جا رہا ہے کہ

جیسے حرم حیوانوں کے لیے سامانِ امن ہے ایسے ہی بیت اللہ انسانی زندگی کے لیے امن کا ذریعہ ہے۔ کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز رہا ہے سب سے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا اول بیت وضع للناس لیکن حضرت ابراہیم سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدے میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چار دیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جاتے چنانچہ قرآن کی تصریح کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں بھی البیت العتیق تھا۔ کوئی گھر نہ تھا۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو تلاش کر کے پھر نئے سرے سے ان پر چار دیواری قائم کی۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے اس افتادہ بنیاد کو از سرِ نو بلند کیا۔ حضرت ابراہیم نے عراق، شام، مصر ہر جگہ پھر کر آخر اس گمنام گوشہ کو منتخب کیا جو باسطوت جبّاروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چہار طرف سے پہاڑیوں میں گھرا تھا اس لیے ارشاد ہوا ہے واذ بوّانا لابراھیم مکان البیت - اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں۔

۱۹۰ - اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو حرمت والا گھر لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نیز حرمت والے مہینے کو اور حج کی قربانی کو اور قربانی کے ان جانوروں کو جن کے گلوں میں پٹے پڑے ہوں۔ کعبہ شریف دینی و دنیوی دونوں حیثیت سے لوگوں کے قیام کا باعث ہے، حج و عمرہ تو وہ عبادات ہیں جن کا ادا کرنا براہِ راست کعبہ ہی سے متعلق ہیں لیکن نماز کے لیے بھی استقبال قبلہ شرط ہے - اس طرح کعبہ لوگوں کی دینی عبادات کے قیام کا سبب بن گیا۔ پھر حج وغیرہ کے موقع پر تمام بلاد اسلامیہ سے لاکھوں مسلمان جب وہاں جمع ہوتے ہیں تو بے شمار تجارتی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی فوائد حاصل کر سکتے ہیں خدا نے اُس جگہ حرم امن بنایا اس لیے انسانوں بلکہ بہت سے جانوروں تک کو وہاں رہ کر امن نصیب ہوتا ہے - عہدِ جاہلیت میں جبکہ ظلم و خونریزی اور فتنہ و فساد محض معمولی بات تھی - ایک آدمی اپنے باپ کے قاتل سے حرم شریف میں تعرض نہ کرتا۔ مادی حیثیت سے انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اس وادی غیر ذی زرع میں اتنی افراط سے سامان خورد و نوش اور نفیس قسم کے پھل اور میوے کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ سب حیثیات قیاماً للناس میں معتبر ہو سکتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ نوعِ انسانی کے لیے اس جگہ سے عالمگیر ابدی ہدایت کا

چشمہ پھوٹے گا اور مصلح اعظم سید کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد ومسکن مبارک بننے کا شرف بھی سارے جہاں میں سے اسی خاک پاک کو حاصل ہوگا - ان سب وجوہ سے کعبہ کو قیاماً للناس کہہ سکتے ہیں کیونکہ کعبہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے حق میں اصلاح اخلاق تکمیل روحانیت اور علوم ہدایت کا مرکزی نقطہ ہے اور کسی چیز کا قیام اپنے مرکز کے بغیر نہیں ہو سکتا - اس کے علاوہ محققین کے نزدیک قیاماً للناس کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ شریف کا مبارک وجود کل عالم کے قیام اور بقا کا باعث ہے دُنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانہ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق موجود ہے۔ جس وقت خدا کا ارادہ یہ ہوگا کہ کارخانہ عالم کو ختم کیا جائے تو سب کاموں سے پہلے اسی مبارک مکان کو جسے بیت اللہ شریف کہتے ہیں اٹھا لیا جائے گا جیسا کہ بنانے کے وقت بھی زمین پر سب سے پہلے یہی مکان بنایا گیا تھا ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ بخاری کی حدیث میں ہے کہ ایک سیاہ فام حبشی جسے ذوالسویقتین کے لقب سے پکارا ہے۔ عمارت کعبہ کا ایک پتھر اکھاڑ کر ڈال دے گا جب تک خدا کو اس دُنیا کا نظام قائم رکھنا منظور ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم جس کا مقصد کعبہ کو ہدم کرنا ہو اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتی - اصحاب فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے لیکن ان کے بعد بھی ہر زمانے میں کتنی قوموں اور شخصوں نے ایسے منصوبے باندھے ہیں اور باندھتے رہتے ہیں۔ یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے کہ باوجود سامان اور اسباب ظاہرہ کے فقدان کے آج تک کوئی شخص اس ابلیسانہ مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ ہو سکے گا انشاء اللہ اور جب عمارت کعبہ کے گرا دینے میں قدرت کی جانب سے مزاحمت نہ رہے گی تو سمجھ لو کہ عالم کی ویرانی کا حکم آن پہنچا۔ دُنیا کی حکومتیں اپنے دارالسلطنت اور قصر شاہی کی حفاظت کے لیے لاکھوں سپاہی کھڑا دیتی ہیں لیکن کبھی خود ہی قصر شاہی کو کسی مصلحت سے تبدیل یا ترمیم کرنا چاہیں تو معمولی مزدوروں سے اس کے گرا دینے کا کام لیا جاتا ہے - شاید اسی لیے امام بخاری نے باب جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس ، میں ذوالسویقتین کی حدیث درج کر کے قیاماً للناس کے اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں نبہ علیہ۔ شیخنا المترجم قدس اللہ روحہ فی درس البخاری بہر حال آیت زیر بحث میں احکام محرم بیان فرمانے کے بعد کعبہ شریف کی عظمت وحرمت کو بیان کرنا مقصود ہے - پھر کعبہ اور احرام کی مناسبت سے شہر حرام اور ہدیٰ و قلائد کا بھی ذکر فرما دیا جیسا کہ اسی سورت کے آغاز میں غیر محلی الصید وانتم حرم کے لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد کو ملحق فرما دیا۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

کعبہ لغت میں چوکھٹے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ گھر چوکھٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے مشہور ہوگیا اور کچھ کے خیال میں کعب کے معنے بلند مقام کے ہیں۔ آدمی کے ٹخنے کو بھی کعب اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ قدم سے اونچا ہوتا ہے گویا کعبہ کو کعبہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عظمت اور بزرگی کے اعتبار سے دوسرے تمام امکنہ سے بلند ہے۔ امام رازی نے اسی کو اپنایا ہے لیکن پہلے معنے زیادہ صحیح ہیں۔ اور بیت الحرام اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں چھت اور دیواریں ہیں اور یہی بیت کی حقیقت ہے نہ اس لیے کہ اس میں کسی کی سکونت ہے۔

خود مکہ بھی قدیم زمانوں کے بعض محققین کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنے گھر کے ہیں۔ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل اور کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس شہر کی [illegible] گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے۔ یونان کے مشہور مورخ ڈیودرس جو حضرت عیسٰی سے ایک صدی پہلے گزرا ہے وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے۔

> ثمودیوں اور عرب والوں کے درمیان ایک معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔

اور ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی سارے عرب عزت کرتے ہیں کعبہ ہے۔ رومیوں کی تاریخ میں خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے۔ پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ سنہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا۔ اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کردے گا اس پر سالار نے کہا۔

> تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانے میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ (نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام)

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

قرآن نے یہاں کعبہ کو البیت الحرام کہنے کے بعد قیاماً للناس کہا ہے یعنی اللہ نے کعبہ کو لوگوں کے

قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ بنانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ خلقی اور تکوینی طور پر اللہ نے کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور دوسرے یہ کہ امری اور تکلیفی طور پر اللہ نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ تکوینی لحاظ سے اس طرح کہ اللہ نے اس گھر کی عزت و عظمت لوگوں کے دلوں میں اس طرح مستحکم کر دی ہے کہ وہاں کے باشندوں کی تمام معاشی، سیاسی شیرازہ بندی اس گھر کی بدولت تھی اور امری طور پر اس طرح کہ حج اور عمرہ کی عبادات یہاں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں دونوں لحاظ سے کعبہ لوگوں کے لیے حفظ و بقاء کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہ پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا۔ اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہو گیا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے۔ شاعری کے مقابلے سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی ہوتی۔ تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا ایک پورا تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا۔ بس یہی ایک ایسا زمانہ تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی[1]۔

اس موضوع پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جو دادِ تحقیق دی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سینۂ قاسم سے اُبلے ہوئے علوم لوگوں کے سامنے پیش کر دوں لیکن معالم القرآن کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں۔ مولانا عثمانی نے محققین کے نام سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لیجئے سب کچھ نہیں تو کچھ تو ضرور پڑھ لیجئے۔ مولانا فرماتے ہیں :

جب بیت المقدس تجلی گاہ مرتبہ حکومت ٹھہرا اور خانہ کعبہ تجلی گاہ مرتبہ محبوبیت تو بیت المقدس کو تو بمنزلہ کچہری حکام یا دیوانِ عام خیال فرمائیے اور خانہ کعبہ کو بمنزلہ محل سرائے بادشاہی یا دیوان خاص بلکہ بمنزلہ جلوہ گاہ و محفل محبوب انام اور ظاہر ہے کہ کچہری کا مکان فقط دادرسی مظلوماں اور سزادہی ظالمین کے واسطے ہوتا ہے۔ سو یہ جب ہی تک متصور ہے جب تک عمائد رعیت بر سر اطاعت ہوں۔ اور اگر

---

[1] تفہیم القرآن۔

عمائدِ رعیت خود سرکش ہو جائیں تو پھر وہ مکان کسی کام کا نہیں اور اُس زمانہ میں اگر وہ ویران اور مسمار ہو جاتے تو بلا سے اور محل سرا اور دیوانِ خاص چونکہ شب و روز کے رہنے کے لیے ہوتا ہے۔ اُس کی نگہبانی ہمیشہ کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے اس لیے خانہ کعبہ کو کوئی شخص مسمار نہ کر سکا۔ اور بیت المقدس بوجہ سرکشی بنی اسرائیل جو اُس زمانہ میں بمنزلہ عمائدِ رعیت تھے بیکار ہو گیا۔ اور اس وجہ سے اس کی نگہبانی بے سود نظر آئی۔ یہاں تک کہ کفار کے ہاتھوں سے ویران اور مسمار ہونے کی نوبت آئی۔ علاوہ بریں کارحکام کیا ہے۔ عزل و نصب اہلِ خدمات اور رتق و فتقِ مہمات سو یہ بات بدون تبدیل و تغیر ممکن الوقوع نہیں اس لیے بیت المقدس مظہر خاصیت تغیر و تبدیل ہو گا اور اس لیے اگر وہاں آبادی کی جا ویرانی اور ویرانی کی جا آبادی ہوتی رہے تو دور از عقل نہیں کیونکہ جس چیز میں خاصیت تغیر و تبدیل ہوتی ہے۔ مثلاً آتش وہ جہاں خود ہوتی ہے وہاں زیادہ تغیر و تبدیل کا احتمال ہوتا ہے اور تاثیرِ محبوبیت یہ ہے کہ ہجوم خلائق اور ہنگامۂ اجتماع ہو اگر ویرانہ میں بیٹھ جائے تو ہر عام و خاص پروانہ وار دل و جان قربان کرنے کو تیار ہو جائیں یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کے گرداگرد ایسا ملک رکھا جہاں سامان عیش و عشرت کو چراغ لے کر ڈھونڈھئے تو پتہ نہ ملے تاکہ اس ہجوم خلائق سے جو ہر سال ہر موسم حج میں اس قدر ہوتا ہے کہ عالم میں کسی میلہ اور ہنگامہ میں آتا نہ ہو گا ہر کوئی یہ سمجھ جائے کہ واقعی یہاں کوئی ایسا دلبر جلوہ گر ہے جس کے جمال عالم فریب کا ایک عالم دیوانہ ہے بالجملہ یہ ہفت اقلیم کے آدمیوں کی آمد جس میں خانہ کعبہ تمام عالم کے مقامات متبرکہ اس مقام مقدس اور زیارت گاہ مکہ معظمہ سے بالبداہتہ بالاتفاق ممتاز ہے اور پھر اُس پر اس ملک کی یہ خشکی اور کمی پیداوار مفقودہ عقل کو زہر اس بات پر شاید ہے کہ ہو نہ ہو یہاں جلوہ محبوب حقیقی ہے اور اس لیے احرام کی حالت کی یہ کیفیت کہ نہ عمامہ نہ ٹوپی نہ موزہ نہ جراب نہ سیا ہوا کپڑا نہ خوشبو نہ مرد کو عورت سے مطلب نہ عورت کو مرد سے سروکار، پھر ذکر لبیک کی نعرہ زنی اور پروانہ وار طوافِ کعبہ و صفا و مروہ اور میدانِ عرفات و مزدلفہ کی تضرع و زاری اور منیٰ کی قربانی و جاں نثاری اور جمراتِ ثلٰثہ کی سنگساری جس سے ناصح نادان کی طرف سنگ باری یاد آتی ہے اور سوا اس کے اور وہ ارکان جو منجملہ خواص عاشقان جاں نثار ہوتے ہیں۔ اوّل سے آخر تک چسپاں نظر آتے ہیں۔ علاوہ بریں حکومت خداوندی بدلالت تقریرات گزشتہ منجملہ آثار محبوبیت ہے کیونکہ مرتبہ وجود جو صادر اوّل اور مصداق اسم مالک اور حاکم ہے۔ اُس تجلی اوّل سے صادر ہوا ہے جو بوجہ اجتماع جملہ محاسن مصداق اسم جمیل ہے۔ اس لیے مرتبہ حکومت میں جو کچھ ہو گا۔ وہ مرتبہ محبوبیت کا پرتو ہو گا۔ اور باہم ایسا فرق ہو گا جیسا آفتاب اور زمین میں نظر آتا ہے۔ یعنی آفتاب کے تو رگ و ریشہ میں نور رچا ہوا ہوتا ہے اور زمین کے اوپر اوپر اور گرداگرد اور اس لیے زمین میں کبھی نور آ جاتا ہے،

کبھی چلا جاتا ہے۔ اور آفتاب میں برابر یکساں رہتا ہے مگر یہ ہے تو پھر برکات کا خانہ کعبہ سے جدا ہونا ممکن نہیں اور بیت المقدس سے منفصل ہو جائیں تو عجب نہیں اور شاید یہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ جو یہ نسبت خانہ کعبہ لفظ مبارکاً قرآن میں آیا اور بہ نسبت بیت المقدس بارکنا حولہ، قرآن میں فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جیسے لفظ مبارک میں ہیئت صیغہ جو موصوف بالبرکت پر دلالت کرتی ہے اور مادہ مصدری جو وصف برکت پر دلالت کرتا ہے باہم ایسے مخلوط ہیں کہ جدا کرو تو جدا نہیں ہو سکتے۔ ایسے ہی خانہ کعبہ سے اس کی برکات منفصل نہیں ہو سکتیں اور جیسے لفظ بارکنا حولہ، میں بدلالت لفظ حول اور نیز بایں وجہ کہ دال علی البرکت

اعنی لفظ بارکنا اور دال علی الموصوف بالبرکت اعنی ہائے حولہ، میں فاصلہ ہے۔ موصوف بالبرکت اور وصف برکت میں انفصال ہے ایسے ہی بیت المقدس کی برکات اُس سے اتصال ذاتی نہیں رکھتیں جو جدا ہی نہ ہو سکیں۔ مگر جب خانہ کعبہ کی برکات ممکن الانفصال نہیں، اور بیت المقدس کی برکات ممکن الانفصال ہیں تو بیت المقدس کا بے دینوں کے ہاتھوں سے مسمار ہو جانا اور خانہ کعبہ کا مسمار نہ ہو سکنا دور از عقل نہیں مگر چونکہ یہ ارتباط برکات اس مرتبہ محبوبیت کا نتیجہ ہے جس کے اثبات سے ہم بوجہ اکمل فراغت پا چکے ہیں تو اگر وہ تجلی محبوبانہ جس کی تاثیر محبت ہے مبدل بہ تجلی غضبان ہو جاتے تو پھر بجائے محبت خوف اور بجائے اجتماع وہجوم تفرق اور افتراق لازم ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ باقی بجائے محبوبیت بعد محبوبیت تجلی غضب کا ہونا۔ اول تو یوں مستبعد نہیں کہ غضب اور اُن کے افعال ناشائستہ کا ثمرہ ہوتا ہے اور اس لیے بدون ظہور نافرمانی اُس کے ظہور کی کوئی صورت نہیں۔ اور محبوبیت کسی غیر کے کسی فعل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ایک صفت اصلی اور ذاتی ہوتی ہے۔ مثل حکومت اور غضب اور اُن کے افعال سے سروکار نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ یقین کامل چاہیے کہ محبوبیت اول ہے اور غضب اس کے بعد دوسرے صفات انسانی نمونہ صفات ربانی ہیں جیسے یہاں نوبت بہ نوبت ظہور ہوتا ہے۔ اور ایک کے ظہور کے وقت اُس کی صفات متضادہ کا اثر بھی محسوس نہیں ہوتا ایسے ہی جناب باری کی صفات کو خیال فرمایئے اور کیوں نہ ہو۔ یہاں جو کچھ ہے وہیں کا پرتو ہے سو جو کیفیت یہاں ہوگی وہ وہاں اول ہوگی سو جیسے یہاں وقت محبت وعنایت غضب کا نام ونشان نہیں ہوتا اور وقت غضب محبت کا پتہ نہیں لگتا۔ ایسے ہی وقت ظہور محبوبیت جو محبت کی بھی اصل ہے غضب کا اثر نمایاں نہ ہوگا اور وقت ظہور غضب محبوبیت کا اثر عیاں نہ ہوگا کیونکہ محبوبیت اور غضب میں باہم تضاد ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت جو ضد عداوت

ہے خود ایک سامان محبوبیت ہے - یہی وجہ ہے کہ محبت اور اخلاق والوں سے محبت و اخلاق سے پیش آیا کرتے ہیں - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خدا کا جو وصف ہے علی الاطلاق ہے اور اُس کا جو کمال ہے بدرجہ کمال ہے ورنہ کسی وجہ سے اگر مقید اور کسی طرح سے اگر ناقص تصور کریں تو اُس سے اوپر اور کسی میں اُس وصف کو علی الاطلاق اور کامل ماننا پڑے گا کیونکہ ہر مقید کے لیے وجود مطلق ضروری ہے اور ہر ناقص کے لیے کامل کی ضرورت جس کے لحاظ سے اس کو کامل کہا ورنہ اور کوئی اگر کامل نہیں تو یہ ناقص بھی نہیں کانے اور لنگڑے اور لنجے کا نقصان اگر معلوم ہوتا ہے تو دو آنکھوں والوں اور دو پاؤں والوں اور دو ہاتھ والوں کے کمال کے مقابل میں معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کو نقصان کہنا غلط مگر جب خدا سے اوپر کسی کمال اور وصف میں کوئی کامل نکلا تو پھر اُسی کو خدا کہنا چاہیے - وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا کو خدا اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود موجود ہوتا ہے کسی اور کے موجود کرنے کی حاجت نہیں بلکہ وہی اوروں کو موجود کرتا ہے لیکن یہ بات بجز اس کے متصور نہیں کہ وجود اس کے حق میں خانہ زاد اور وصف ذات اور لازم ذات ہو اور جب وجود خانہ زاد اور لازم ذات ہوگا تو ہر کمال اور ہر وصف کمالی بدرجہ کمال ہوگا کیونکہ سب کمالات وجود کے حق میں لازم ذات ہیں - یہی وجہ ہے کہ بے وجود صاحب کمال اُن کا وجود ممکن نہیں مگر جب وجود کے حق میں تمام کمالات لازم ذات ہوتے تو لاجرم ممکنات میں جن کا وجود مطلق نہیں مقید ہے وہ کمالات بھی مقید ہو کر آئیں گے سو اگر خدا میں بھی کمال محبوبیت مقید ہو علی الاطلاق اور بدرجہ کمال نہ ہو تو یوں کہو وہ خدا نہیں ممکن ہے اور اُس کے اوپر کوئی اور ہے جس کے اصل میں خدا ہے اس لیے اس کی محبوبیت بھی بدرجہ کمال اور علی الاطلاق اور بوجہ اتم ہوگی اور بالضرور بوجہ محبت بھی وہ محبوب ہوگا اور اس لیے وصف غضب کو جو منجملہ آثار عداوت ہے اس کی محبوبیت کے ساتھ تضاد ہوگا اور یہ جو اقربا اور احباب کا غصہ اور ان کا رنج اس قول کے مخالف نظر آتا ہے تو وہ بوجہ قلت تدبر مخالف نظر آتا ہے احباب و اقارب کا رنج اور غصہ اگر ہوتا ہے تو بے وجہ تو ہوتا ہی نہیں کسی نہ کسی بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ بے اعتدالی اور چیز ہے اور قرابت اور دوستی اور چیز ہے درصورت اجتماع موجب محبت وہ قرابت اور دوستی ہوگی اور موجب رنج و غضب وہ بے اعتدالی اور بدافعالی سو جیسے قرابت اور محبت بذاتِ خود محبوب ہیں ایسے ہی بے اعتدالی اور بدافعالی بذاتِ خود مبغوض، سو اس صورت میں وہ رنج اور غصہ احباب سے نہیں ہوتا اعداء ہی سے ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں نہ اقرباء اور احباب بجمیع الوجوہ محبوب ہوتے ہیں - اور نہ بجمیع الوجوہ مبغوض بجہت قرابت و محبت محبوب ہوتے ہیں اور بجہت بدافعالی اور بے اعتدالی مبغوض سو وہ غصہ حقیقت میں اقربا اور احباب پر نہیں

ہوتا اعداء ہی پر ہوتا ہے۔ بالجملہ وصف غضب کو بایں وجہ کہ وہ منجملہ آثار عداوت اور بغض ہے۔ صفت محبوبیت کے ساتھ تضاد ہے۔ اور جب تضاد ہوگا تو پھر باعتبار ظہور اجتماع ممکن نہیں بلکہ وقت ظہور غضب مرتبہ محبوبیت کا استتار اسی طرح لازم ہے جیسے ایک جسم کی آڑ میں دوسرا جسم مستور ہو جاتا ہے اور ایک رنگ کے پردہ میں دوسرا رنگ چھپ جاتا ہے۔ سو جیسے کسی جسم کے اور آئینہ کے بیچ میں کوئی دوسرا جسم حائل ہو جاتا ہے تو بجائے جسم اول جسم ثانی اس میں منعکس ہو جاتا ہے اور جسم اول کا عکس مفقود ہو جاتا ہے ایسے ہی اگر تجلی محبوبیت اور آئینہ بعد مجرد یعنی خانہ کعبہ کے بیچ میں تجلی غضب و جلال

حائل ہو جائے تو تجلی اول کے عکس کے بدلے تجلی ثانی کا انعکاس لازم ہے۔ اور درصورت حیلولت یہ ہو کہ خدا کا جامع الکمالات ہونا تو مسلم اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ محبوب عالم ہے۔ گو گنہگاروں کے حق میں غضب ناک بھی ہو۔ مگر اور کمالات کو دیکھا تو باعتبار ظہور آثار محبوبیت سے ان کو تضاد نہیں۔ بلکہ ایک طرح کا لزوم ہے۔ چنانچہ حکومت کا منجملہ لوازم محبوبیت ہونا بذریعہ ضرورت رضا جوئی پہلے ثابت ہو چکا اور سوا اس کے اور صفات کو چنداں محبوبیت سے بعد نہیں اگر تھا تو حکومت ہی کو یہ بعد تھا کیونکہ بوجہ قرب جو حکومت کو لازم ہے مبغوضیت کا احتمال ظاہر وباہر ہے اور سوا اس کے اور صفات میں کوئی وجہ تضاد نہیں جو بعد ہو۔ بلکہ سمع و بصر وجود و علم و حیا کا تناسب سب پر ظاہر ہے علیٰ ھذا القیاس اور صفات کو سمجھ لیجئے مگر ہاں صفت غضب کا باعتبار ظہور آثار متضاد ہونا بھی ظاہر ہو چکا گو باعتبار اصل غضب جس کو بالقوہ کہیے صفت غضب بھی منجملہ مبادی اور متمات جمال اور سامان محبوبیت ہے کیونکہ جمال کے لیے مرتبہ تجلی میں تمام کمالات مکنونہ کا ظہور ضرور ہے اور جب غضب باعتبار ظہور آثار تہ و بالا و مخالف محبوبیت ہے تو پھر جیسے اجزاء آب وقت حرکت تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً آب حوض و تالاب اور وہ بھی فوق و تحت کی حرکت کے وقت ایسے ہی صفات بنی آدم وغیرہم کو ہم دیکھتے ہیں کہ باعتبار ظہور آثار تہ و بالا ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ وقت غضب محبت اور رحمت کا پتہ نہیں لگتا اور وقت رحمت و محبت غضب اور عداوت کا نشان نہیں ملتا۔ اس لیے یہ ضرور ہے کہ وقت ظہور آثار غضب محبوبیت مستور ہو جاتے اور اس استتار کے باعث بجائے عکس محبوبیت عکس غضب و جلال جلوہ گر ہو کیونکہ مبداء جملہ صفات وہی تجلی اول ہے چنانچہ پہلے عرض کر چکا ہوں بالخصوص صفت غضب جو حسب تحریر بالا ضد محبوبیت ہے کیونکہ اوصاف متضادہ محل واحد پر متوارد ہوا کرتے ہیں اس لیے مبداء ظہور اور محل نمود صفت غضب بھی وہ تجلی اول ہو

ہو گی الغرض وقت ظہور آثار صفات متضادۃ الآثار کا تہ و بالا ہونا لازم ہے اور بوجہ تقابل مذکور اس خانہ کعبہ میں ان سب کا انعکاس ضرور ہے مگر جیسے انعکاس محبوبیت کو بوجہ تضمن محبت جس کی طرف ابھی اشارہ گزرا ساختگی اور پرداختگی عالم ضرور تھا ایسے ہی انعکاس غضب کو ویرانی اور بربادی زمین و آسمان اور انسانوں کا جن و حیوان لازم ہے۔ اس صورت میں سب میں بوجہ اتصال و قرب خانہ کعبہ کے ویرانی چاہیے اس کے بعد اور عالم کی بربادی بقدر قرب علی الترتیب مناسب ہے۔ چنانچہ مشاہدہ حال آتش سے جو مظہر غضب ذوالجلال ہے یہ بات عیاں ہے کہ اشیائے قریبہ اور متصلہ اوّل طعمہ آتش ہوتی ہیں۔ پھر جوں جوں آتش بھڑکتی جاتی ہے دُور دُور اور اشیائے زیر تصرف آتی جاتی ہیں بالجملہ جس وقت ظہور تجلی صفت غضب ہو اُس وقت اس عالم کی خیر نہیں اس لیے جیسے یہ خانہ پاک جس کو خانہ خدا کہیے یعنی خانہ کعبہ وقت ظہور آثار محبوبیت و رحمت مظہر اوّل تھا ایسے ہی وقت ظہور آثار غضب و جلال بھی یہی مظہر اوّل ہوگا اور اس لیے خانہ کعبہ کی ویرانی کو قیامت یعنی عالم کی ویرانی کی ابتدا سمجھتے اور کیوں بادشاہی مکانات آبادی اور بربادی میں اور خیمہ حکام نصب اور قلع قمع میں اوروں کے مکانات اور اوروں کے خیموں کی نسبت اوّل رہتے ہیں۔ یعنی جب دار الخلافت آباد کیا جاتا ہے تو اوّل شاہی مکانات کے لیے زمین اور میدان تجویز کر کے تہیہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امراء وزراء وغیرہم شاگرد پیشوں کے مکانات کے نقشے جمائے جاتے ہیں۔ علی ھذا القیاس اگر دار الخلافت بوجہ تبدیل دار الخلافت یا کسی اور وجہ سے ویران ہوتا ہے تو اوّل بادشاہ اپنے مکانات کو ترک کرتے ہیں پھر اُن کے سبب اور سب اپنے اپنے گھروں کو ترک کر کے چل دیتے ہیں ایسے ہی وقت دورہ حکام جہاں کہیں ڈیرہ ہوتا ہے اوّل کہیں خیمہ حکام نصب کیا جاتا ہے اُس کے بعد اس کے گرد و پیش میں اوروں کے خیمے اور پالیں قائم کی جاتی ہیں اور پھر وقت روانگی اوّل خیمہ حکام اکھاڑا جاتا ہے اس کے بعد اوروں کے خیمے اُکھڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سو اس عالم اجسام میں خانہ کعبہ کو بمنزلہ مکان شاہی یا خیمہ شاہی خیال فرمایئے اور کیوں نہ ہو تجلی گاہ ربانی اور آئینہ جمال یزدانی ہے اس لیے بنانے میں بھی اسی کو اوّل رکھا وقت ویرانی عالم وقت بھی اُسی کو اوّل رکھیں گے۔ چنانچہ آیت ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ جس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے جو کہ مکہ معظمہ میں ہے اس کی اوّلیت تعمیر پر دلالت کرتی ہے اور اہل اسلام اُس روایت پر نظر کیجیے جس میں کچھ ایسا ہے کہ اوّل پانی تھا اور اُس پانی ہی پر عرش کبریائی تھا۔ پھر اُس پانی میں سے اس جگہ سے جہاں پر اب خانہ کعبہ ہے ایک بلبلا سا اُٹھا، جھاگ سے اُٹھے اور وہیں سے زمین کی بنا شروع ہوئی تو اوّلیت خانہ کعبہ دُور تک پہنچتی ہے کیونکہ موافق اشارات قرآنی مثل خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ثم استویٰ الی السماء

فسوّٰھن سبع سمٰوٰت - زمین جملہ عناصر اور تمام افلاک سے پہلے پیدا ہوئی ہے گو اس کا پھیلاؤ آسمانوں کے بعد وقوع میں آیا ہو پھر جب زمین کا یہ ٹکڑا خاص جہاں خانہ کعبہ ہے زمین کے اجزاء میں بھی سب میں اوّل نکلا تو یوں کہو بعد عرش کے جو عالم سے ایک علیحدہ چیز ہے کیونکہ وہ تخت ربانی ہے۔ اور عالم بمنزلہ ملک و رعیت یزدانی خانہ کعبہ کی جگہ سب میں اوّل ہوئی - بہر حال ان اول بیت اور روایت مشارٌ الیہا در اشارہ مذکورہ جن کا حاصل یہ ہے کہ سب میں پہلا گھر اور سب میں پہلی جگہ یہ ہے جہاں خانہ کعبہ ہے - اوّلیت تعمیر خانہ کعبہ اور اولیت پیدائش بقیہ خانہ کعبہ پر دلالت کرتی ہے اور آیت جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ گھر لوگوں کے قیام کا باعث ہے اس کی اولیت ویرانی پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ حاصل اشارہ قرآنی یہ ہوا کہ جب تک یہ گھر قائم ہے لوگ بھی اس عالم میں قائم ہیں - جس روز یہ گھر ویران ہوا اس روز عالم کو خراب اور ویران سمجھو - الغرض بوجہ عکس تجلی مشارٌ الیہ خانہ کعبہ کا آبادی اور بربادی دونوں میں اوّل رہنا ضرور ہے اور چونکہ خانہ کعبہ نمائش گاہ اصل تجلی ہے چنانچہ تحقیق متعلق عکس سے یہ بات اول بخوبی واضح ہو چکی ہے اور تجلی مذکور ابتداء معبودیت ہے تو اس کی طرف سجدہ عبادت بھی ہوتا ہے اور سوا اس کے اور ارکان عبادت بھی اُس سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ وہ تجلی اوّل مسمیٰ اسم جلیل اور مصداق محبوبیت ہے تو تمام انداز عاشقانہ یعنی ارکان حج اُس کے ساتھ متعلق ہے اور چونکہ وہ تجلی مذکور بوجہ محبوبیت مرتبہ میں صادر اوّل یعنی وجود اوّل ہے تو آئینہ عکس محبوبیت اعنی خانہ کعبہ بھی بہ نسبت آئینہ عکس حکومت یعنی بیت المقدس مرتبہ میں اوّل رہا اور اس لیے اُس کے استقبال کی نوبت بعد میں آئی اور اس لیے حج بھی علی العموم جب ہی فرض ہوا - شرح اس معمہ کی یہ ہے کہ دیوانِ عام اور کچہری حکام تک تو ہر کسی کو رسائی ممکن ہے اور دیوانِ خاص اور محل سرائے شاہی اور عشرت کدہ دلآرام خاص و عام تک ہر کسی کو پہنچنا نصیب نہیں ہوتا اور جسے یہ دن نصیب ہوتے ہیں اُس کو بھی بہت دنوں میں نصیب ہوتے ہیں - القصہ اُس در دولت تک سوائے حبیب رب العالمین خاتم النبیین صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالاصالت کسی کو اجازت نہ ہوئی - حضرت ابراہیم خلیل اللّٰہ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام جو بنی آدم میں سے بانی اوّل کعبہ ہیں اگر اوّل باریاب ہوتے تو وہ باریاب ہوتا ایسا تھا کہ وقت تعمیر عشرت کدہ جو ملاقات یاران خاص و ہمدمانِ بااختصاص کے لیے بنایا جاتا ہے یاران خاص سے پہلے معمار اور مہتممان تعمیر اُس میں آتے جاتے ہیں اور سوا اُن کے اور کوئی آیا تو کیا ہوا - گو چہ دلآرام عالم فریب میں کون نہیں آتا مگر بلایا ہوا وہی جاتا ہے جس کے لیے عشرت کدہ

خاص بنایا جاتا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بیان کے لفظ لفظ پر غور فرمائیے اور اندازہ لگائیے کہ مولانا کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔ ان بلندیوں تک ہم کم علموں کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے نقل کی توفیق عطا فرما دی والحمدللہ علی ذالک۔

کعبہ کی مرکزیت کا راز

۱۹۱- یہ اس لیے کہا گیا ہے تاکہ تم جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ سب کا حال جانتا ہے اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔ یعنی کعبہ وغیرہ کے قیاماً للناس بنانے میں جو مصالح دینی و دنیوی کی رعایت فرمائی اور بظاہر بالکل خلاف قیاس جو عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے وہ اس کی دلیل ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز حق تعالیٰ کے غیر محدود علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتی ہے[1] یعنی اگر تم اس انتظام پر غور کرو تو تمہیں خود اپنے ملک کی تمدنی و معاشی زندگی ہی میں اس امر کی بیّن شہادت مل جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور ان کی ضروریات کا کیسا مکمل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک حکم کے ذریعہ سے انسانی زندگی کے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ بدامنی کے یہ سینکڑوں برس جو محمد عربی کے ظہور سے پہلے گزرے ہیں ان میں تم لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوتے تھے مگر اللہ تعالیٰ تمہاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیت قائم کر کے تمہارے لیے وہ انتظام کر دیا جس کی بدولت تمہاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمہیں یقین حاصل ہو جاتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام تمہیں دیے ہیں ان کی پابندی میں تمہاری بھلائی ہے اور ان میں تمہارے لیے وہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو نہ تم خود سمجھ سکتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔[2]

اس آیت میں کعبہ کو قیاماً للناس بنانے کی حکمت بیان ہوئی ہے۔ کعبہ کو انسانوں کے مرکز بنانے میں جن مصالح دینی و دنیوی کی رعایت کی گئی ہے اس کا احاطہ تو علم الٰہی کر سکتا ہے لیکن اس علم الٰہی کا جو ایک قطرہ اس کے بندوں کو نظر آ رہا ہے اسی سے علم الٰہی کی پہنائی معلوم ہو سکتی ہے فی الواقع خانہ کعبہ دنیا میں وہ آئینہ ہے جس میں اللہ کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا۔ اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا یہ روحانی علم و معرفت کا وہ منبع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرّے ذرّے کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوتے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں مختلف زبانیں بولتے ہیں مختلف لباس پہنتے ہیں مختلف تمدّنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں۔ اور ایک مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدّن و معاشرت، رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت، ایک تمدّن و معاشرت اور ایک ہی زبان میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دُنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس میں ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل، اور فتنہ و فساد کے اسباب کا گہوارہ ہیں اس لیے یہ کعبہ نہ صرف اس معنے میں قیاماً للناس ہے کہ یہاں ہر قسم کی خون ریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قیاماً للناس ہے کہ تمام دُنیا کی قوموں کی ایک برادری کعبہ کے ذریعے قائم کر کے ان تمام ظاہری امتیازات کو جو دُنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

کعبہ بین الاقوامی برادری بناتا ہے

لوگ آج یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کی وسعت آباد میں داخل ہوں مگر خانہ کعبہ کو قیاماً للناس بنا کر علم الٰہی کی پہنائیوں نے ہزاروں برس پہلے انسانی زندگی کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا۔ لوگ آج تمام دُنیا کے لیے ایک واحد زبان کی ایجاد کی کوشش میں ہیں مگر کعبہ کو قیاماً للناس بنا کر اللہ سبحانہٗ نے مدت دراز سے انسانیت کے لیے اس مشکل کو حل کر دیا۔ لوگ آج دُنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن اللہ سبحانہٗ کے بیکراں علم نے کعبہ کو

قیاماً للناس بنا کر یہ مجلس دنیا میں قائم کردی ہے جو اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے۔ آج دنیا کی قومیں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت یو این او کی وساطت بنا رہی ہیں۔ لیکن اقوام عالم کے مسلمانوں کے لیے یہ مشترکہ عدالت اللہ تعالیٰ نے جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس فرما کر قائم کردی ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود اللہ احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلے سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں ہے۔

آیت بالا میں الشھر الحرام، الھدی اور القلائد کو اگرچہ عام شارحین نے کعبہ پر عطف مان کر ان کو بھی قیاماً للناس سے مربوط کیا ہے اور مطلب یہی بتایا ہے۔ کہ کعبہ، شہر حرام اور قربانی کے پٹوں کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن شارحین کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے ہماری رائے میں ان سے متعلق مفعول ثانی محذوف ہے اور وہ شعائر ہے اسی سورت میں پہلے بتایا گیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تحلوا شعائر اللہ و لا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد۔

اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے ٹھہرنے کا ذریعہ بنایا اور الشھر الحرام الھدی اور القلائد کو شعائر بنایا ہے۔ شعائر کسی اہم دینی و روحانی حقیقت کے مظہر اور پیکر ہوتے ہیں، ان میں اصل مقصود کی حیثیت تو ان روحانی و معنوی حقائق کی ہے جو ان مظاہر کے اندر مضمر ہیں۔ چونکہ کعبہ کے معمار اول حضرت ابراہیم ہیں اور ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصل خصوصیت تھی اور اسی امتحان و آزمائش میں پورے اترنے کی وجہ سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی ان حقائق کی احساس دلانے کے لیے ان کو بطور نشان مقرر کیا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن میرا خیال یہی ہے کہ ان دو باتوں کی رعایت سے پہلی یہ کہ اللہ نے کعبہ کو قیاماً للناس بنایا اور دوسری یہ کہ اللہ نے الشھر الحرام، الھدی اور القلائد کو شعائر بنایا۔ یہاں حکمت کے موقعہ پر خدا کے فعلی اور وضعی علم کا حوالہ دیا ہے۔ کعبہ کو قیاماً للناس بنایا تاکہ تمہیں پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی فعلاً سب کچھ جانتا ہے اور الشھر الحرام، الھدی اور القلائد کو شعائر بنایا ہے تاکہ علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی کا علم بطور صفت رکھتا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے[۱۹۲]۔ خدا کے پیغمبر کے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پیغام پہنچا دے اور جو کچھ تم کھلے طور پر کرتے ہو اور جو کچھ چھپا کر کرتے ہو خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے[۱۹۳]۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاکیزہ اور گندی چیز برابر نہیں ہو سکتی اگرچہ تمہیں گندی چیز کی بہتات بھلی لگے، لہذا اے ارباب دانش اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ[۱۹۴]۔

قدر و قیمت کا فیصلہ کثرت سے نہیں ہوتا

اسلامی نظام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسانیت کو چند اخلاقی جھلکیاں دکھانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس تک پہنچنے کے سارے راستوں سے پوری طرح آگاہ کرتا ہے۔ اس نے انسان کو بتایا ہے کہ اس کی زندگی میں کبھی سکون اور اطمینان نہیں پیدا ہو سکتا جب تک وہ روحانی ترقی نہ کرے مگر یہاں روحانیت کے معنے وہ نہیں جو عموماً اس سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ اسلام روح اور جسم کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتا اس لیے اسلام کا روحانی نظام بھی دنیا کے تمام فلسفی اور مذہبی نظاموں سے مختلف ہے۔ یہاں خدا کی رضا ترکِ دنیا، ترک علائق، صحرا نشینی، رہبانیت، خودکشی اور جسمانی تعذیب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اس کارگاہِ حیات میں اپنی قابلیت کا ثبوت دے۔ جسم روح کا قیدخانہ نہیں بلکہ اس کا کارخانہ ہے اس لیے اس پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کارخانے کے آلات اور طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی قابلیت کا اظہار کرے مگر اس استعمال میں بھی ایک مومن دوسرے لوگوں سے بالکل جدا گانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ وہ ایک دنیا پرست کی طرح دنیا پر جھپٹتا نہیں بلکہ کائنات کے خزانوں اور خود اپنے جسم و اعضا کو خدا کی امانت سمجھتے ہوئے انہیں خالق کائنات کے دیئے ہوئے قواعد و ضوابط کے تحت برتتا ہے۔ اس عالم اور زندگی کے بامقصد ہونے کا خیال اور انسان کے آزاد ہونے کا اعتقاد انسان میں اپنی ذمہ داری اور زندگی کی حقیقی قدر و قیمت کا شعور پیدا کرتا ہے مگر یہ شعور اس لیے نہیں کہ عیش و تفریح کے لیے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کرے بلکہ اس لیے کہ اللہ کی معصیت سے بچ کر اور طاعت کی دولت سے سرشار ہو کر آخرت کی زندگی کے لیے راحت کا سامان پیدا کرے۔ شدید العقاب اور غفور رحیم سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک مسلمان اس دنیا کو آزمائش گاہ سمجھتے ہوئے اس میں داخل ہوتا ہے اور اس کا ہر قدم سوچ سمجھ کر پڑتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ جد و جہد بالکل بیہودہ ہے جو خالص مادی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے۔ وہ اشیا و اعمال اور اشخاص کو وزن کرنے کے لیے اپنی ایک الگ میزان رکھتا ہے اور وہ دینی نفع اور اخروی اجر ہے اور بس۔ ان کے نزدیک برائی ہر حال میں برائی ہے اس کی کثرت اس کے جواز اور استحسان کی دلیل نہیں ہے۔ ان کے عمل و عمل اور شخص کی قدر و قیمت کا فیصلہ کثرت سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہوتا ہے۔

۱۹۲- جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی

جو احکام حالتِ احرام یا احترامِ کعبہ وغیرہ کے متعلق دیے گئے اگر ان کی عمداً خلاف ورزی کرو گے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب بڑا سخت ہے اور بھول چوک سے اگر کوئی تقصیر ہو جائے تو پھر کفارہ وغیرہ سے اُس کی تلافی کر لو تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے[1]

یہ آیتِ قرآنی ہمارے سامنے یہ رہنما اصول پیش کرتی ہے کہ قرآن کی نگاہ میں اصلی اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی۔ ہر فرد سے انفرادی حیثیت میں خدا کی نافرمانی سے بچنے کا اور خدا کی طاعت اور فرمانبرداری کا سرمایہ فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہر فردِ انسانی کو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے شعورِ شخصیت عطا کیا ہے خودی کا احساس دیا ہے۔ انفرادی خصوصیات دی ہیں۔ اسی بنا پر ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور اسی حیثیت سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن عزیز نے اس آیت میں شدید العقاب اور غفور رحیم کے عنوان سے پیش کیا ہے اور اسی بات کو قرآن نے آخرت کے ذکر میں بڑی کثرت سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے پیش ہوگا اور اسی حیثیت سے اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح ہر شخص ہر فرد کی شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے اسی طرح اس کا نتیجہ اور انجام بھی آخر کا انفرادی ہے۔ لہٰذا اس آیت کی روشنی میں یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا فرد مخاطب ہے۔ خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے۔ حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں۔ طاعت و جزا کی اُمید فرد کو دلائی گئی اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے اور بھول چوک، غلطی اور قصور پر معافی کا مطالبہ فرد سے کیا گیا ہے اور مغفرت و رحمت کا فرد سے وعدہ ہوا ہے۔ نافرمانی پر شدید العقاب اور معافی مانگنے پر غفور رحیم کا فرد ہی مخاطب ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے اپیل کی جاتی ہے۔ اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بنایا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جماعت اور اجتماعیت قرآن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ فی الواقع ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مقصود ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل اجتماعی نظام کی بہتری پر منحصر ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

رسول کی ذمہ داری

۱۹۳- خدا کے پیغمبر کے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پیغام پہنچا دے اور جو کچھ تم کھلے طور پر کرتے ہو اور جو کچھ چھپا کر کرتے ہو خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے پیغمبر علیہ السلام نے خدا کا قانون اور پیام پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا اور خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو چکی ہے۔ اب ظاہر و باطن میں جیسا عمل کرو گے۔ وہ سب خدا کے سامنے ہے۔ حساب و جزا کے وقت ذرہ ذرہ تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا [1] پہلی آیت میں ممنوعات کا بے باکی کے ساتھ ارتکاب کرنے والوں اور اس پر تکرار کرنے والوں کو شدید العقاب کہہ کر دھمکی دی تھی اور اللہ کی قائم کردہ حدود کی نگرانی کرنے والوں سے مغفرت و رحمت کا وعدہ کیا تھا۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ رسول اپنی ذمہ داری کا فرض ادا کر چکا ہے اب تقصیر کوتاہی کے باب میں کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اب تمہیں خلوت اور جلوت میں قانون کا مطیع و فرمانبردار اور وفادار بن کر رہنا چاہیے۔ رسول کا کام رسول ہونے کی حیثیت میں پیغام پہنچانا ہے۔ لوگوں کے جلوت و خلوت کے اعمال و اقوال کا حساب لینا اور ان کے اعمال کی جزا دینا رسول کا کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف اللہ کی ذات کا ہے۔ اس آیت میں کلمہ حصر کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ رسول کا کام اللہ کے احکام کا پہنچانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول احکام الٰہی کے علم کا ذریعہ ہے اس میں دو باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہے ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے قانون کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے۔ اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہرصورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور بھی نہیں کر سکتی انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور ان احکام کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف رسول ہی ہے تو رسول کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے اور آلات پرواز استعمال کیے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے تو رسول کی باتوں کو مانے بغیر اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے۔

دوسری بات اسی فقرے ما علی الرسول الا البلاغ سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ قرآن نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس نے اس کے اصول بتائے ہیں۔ اس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہے، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہے۔ حصر کا یہ پیمانہ بتا رہا ہے کہ رسول کا کام صرف لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے لوگوں کو مجبور کرنا نہیں ہے۔ قرآن نے نہ صرف اسلام کی جبری اشاعت پر قدغن قائم کی بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ دین زبردستی کی چیز نہیں ہے۔ دین کا اولین جزایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی طرح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔ آخر میں واللہ یعلم ما تبدون وما تکتمون کہہ کر بتا دیا کہ رسول تو صرف احکام پہنچانے آیا ہے وہ تمہارے اعمال کی جزا دینے کا منصب لے کر نہیں آیا اور نہ ہی اس کا کام تمہارے اعمال کا حساب لینا ہے یہ اللہ سبحانہ کا کام ہے کہ وہ تمہارے اعمال کا حساب لے گا اور ان کی جزا دے گا۔ اس لیے تمہاری خلوتوں اور جلوتوں کا علم رکھنا صرف اللہ کا کام ہے۔

قدر و قیمت کا اسلامی معیار

۱۹۴۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاکیزہ اور گندی چیز برابر نہیں ہو سکتی اگرچہ تمہیں گندی چیز کی بہتات بھلی لگے لہٰذا اے ارباب دانش اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ۔ اس رکوع سے پہلے رکوع میں فرمایا تھا کہ طیبات کو حرام مت ٹھہراؤ بلکہ ان سے اعتدال کے ساتھ تمتع کرو۔ اس مضمون کی تکمیل کے بعد خمر وغیرہ چند ناپاک اور خبیث چیزوں کی حرمت بیان فرمائی۔ اسی سلسلے میں محرم کے شکار کو حرام کیا یعنی جس طرح خمر، میت وغیرہ خبیث چیزیں ہیں اسی طرح محرم کے شکار کو سمجھو۔ محرم کی مناسبت سے چند ضمنی چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد اب متنبہ فرماتے ہیں کہ طیب اور خبیث یکساں نہیں ہو سکتے ہیں۔ تھوڑی چیز اگر طیب و حلال ہو وہ بہت سی خبیث و حرام چیزوں سے بہتر ہے عقل مند کو چاہیے کہ ہمیشہ طیب و حلال کو اختیار کرے گندی اور خراب چیزوں کی طرف خواہ وہ دیکھنے میں کتنی زیادہ ہوں اور بھلی لگیں نظر نہ اٹھائے[1] الخبیث نافرمان یا نافرمانی ذات و صفات سب کے لیے جامع تعبیر ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ:

صحیح یہ ہے کہ لفظ اپنے عموم کی وجہ سے مکاسب اعمال معارف اور اشخاص کو

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اپنے دامن میں سمیٹے رہتے۔

منشا یہ ہے کہ اچھی اور بری چیزیں، اچھے برے اعمال اچھے برے اموال اور اچھے برے اشخاص برابر نہیں ہوتے۔ خواہ دنیا میں بری چیزوں، برے کاموں، برے سرمایے اور برے اشخاص کتنے زیادہ ہوں نقصان دہ اور نفع بخش چیز، غلط اور عمدہ کردار، حرام اور حلال، ظالم اور عادل، جاہل اور عالم، مفسد اور مصلح، نیک اور بد، مومن و کافر کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اشیاء، اعمال، اشخاص کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا پیمانہ اس کی کثرت نہیں ہے۔ دیانت دار ملازم کی تھوڑی سی تنخواہ، ایماندار تاجر کی تھوڑی کمائی رشوت اور بے ایمانی سے پیدا کی ہوئی زیادہ دولت کے مقابلہ میں حسن عاقبت کے اعتبار سے دنیا و آخرت میں زیادہ قیمتی ہے۔

ایسے ہی اچھے لوگ خواہ تھوڑے ہوں اچھے ہیں ان بہتوں سے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔ دراصل یہ آیت قدر و قیمت کا ایک دوسرا ہی معیار پیش کرتی ہے جو ظاہر بین انسان کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہر بین نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہیں تو وہ ناپاک ہیں اور پانچ روپے اگر خدا کی فرمانبرداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو وہ پاک ہیں اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو بہرحال وہ پاک کے مقابلہ میں کسی طرح برابر نہیں ہو سکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے۔ اور پیشاب کی ایک بھری ناند کے مقابلہ میں پاک پانی کی ایک چلو زیادہ وزنی ہے لہٰذا ایک سچے دانشمند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہیے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو۔ اور حرام کی طرف کسی حال میں ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر اور شاندار ہو۔[1]

گویا خدا نے جن چیزوں سے روک دیا ہے وہ گندی اور مضر چیزیں ہیں جن کی اجازت دی ہے وہ اچھی اور مفید چیزیں ہیں۔ گندی چیزیں کتنی ہی زیادہ ملیں اور اچھی چیزیں کتنی ہی کم میسر آئیں لیکن گندی چیزوں کی طرف رغبت نہ کرو۔ کیونکہ دانشمند آدمی اشیاء کی قلت و کثرت نہیں دیکھتا۔ ان کے نفع و نقصان پر نظر رکھتا ہے۔ یہ کلمہ جامع ہے۔ اس کو ترازو میں رکھ کر ہم سارے افکار و نظریات، زندگی تشکیل کرنے والے سارے اصولوں، دنیا میں قائم شدہ تمام نظامہائے حیات کو تول سکتے ہیں۔ قرآن کے اس نظریہ کی گہرائی میں جا کر جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی ایک ایسا نظریہ

---

[1] تفہیم القرآن

ہے جس کے ذریعہ ہم ہر فکر، ہر عمل، ہر نظام، ہر شخص، ہر علم، ہر معاشی ذریعہ کے بارے میں بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس انسان کو آگے بڑھا کر انسانیت کے کلی مفاد پر جمع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایک ایسے نظامِ حیات کا تصور ملتا ہے۔ جس کو قائم کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ بلا شبہ وہ تمام انسانوں کے لیے مفید ہے۔ اس کے مقابلے میں خدا نے جن نظاموں سے روک دیا ہے وہ سر تا سر مضر اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ یہ نظریہ انسانیت کو خیر و شر کی ایسی معروضی اقدار دیتا ہے جو زمان و مکان کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتی ہیں۔ وہ گورے کالے، آقا و غلام، امیر و غریب، ظالم و مظلوم سب کے لیے ایک ہی ہیں۔ اور حسی تمدن کے سیمابی اصولوں کی طرح رفتارِ زمانہ ان میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی موضوع پر علامہ اقبال نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے تو سوائے اسلامی نظام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تاریخی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی ہے کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پوری ہوئی کہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم و نسل کی بنیاد پر بنایا نہیں جا سکتا نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ صرف معتقدات پر ہی اس کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور بقا کے لیے ضروری ہے۔

اس آیت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف خدا کا پسندیدہ اسلامی نظام ہے جو خالصۃً انسانی ہے

اور دوسری طرف دنیا کے دوسرے نظام ہیں۔ اسلامی نظام خدائی نظام ہونے کی وجہ سے سرتاسر طیب ہے۔ دوسرے نظام انسانی فکر کی تخلیقات ہونے کی وجہ سے سرتاسر خبیث ہیں۔ اگر دنیا میں خبث پر مبنی نظام زیادہ ہیں ان کو اپنانے والے اکثریت میں ہیں اور اس کے مقابلہ میں اسلامی نظام کو اپنانے والے تھوڑے ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ کسی نظام کی حقیقت کا فیصلہ اس کے ماننے والوں کی اقلیت اور اکثریت سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہونے میں ہے۔ اسلام چونکہ خدا کی جانب سے ہے اس لیے وہ حق ہے خواہ وہ کیسی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں ہو۔ مشرکین مکہ کہتے تھے نحن اکثر اموالا و اولادا ہمارے پاس مالی طاقت اور عددی طاقت زیادہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہل ایمان مالی قوت اور عددی طاقت سے محروم ہیں۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ حق اہل ایمان کے پاس ہے۔

درحقیقت راہِ حق کے علمبرداروں کو اس آیت میں سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کر دیا۔ وہ یہ کہ بہت سے لوگوں کے لیے کسی برائی کی کثرت اس کے جواز و استحسان کی دلیل بن جاتی ہے جیسے اس دور میں غیر اسلامی نظامہائے حیات کی کثرت نادان مسلمانوں کے لیے ان کے استحسان کی دلیل ہے بلکہ ایک لیڈر نے اسی سے دھوکہ کھا کر ماضی میں برملا کہہ دیا تھا۔

المغربیون اولئک ھم المومنون حقاً

انگریز ہی سچے اور پکے مومن ہیں۔

جو فتنہ عام ہو جاتا ہے اور جو بدی فیشن میں داخل ہو جاتی ہے وہ اپنے دروازے بھی اس کے لیے چوپٹ کھول دیتی ہے۔ بے خبر اور نادانوں کا ضمیر اول تو اس سے کوئی انقباض محسوس ہی نہیں کرتا اور اگر شروع شروع میں کچھ محسوس کرتا بھی ہے تو وہ اس کو اس عقلی تسلی سے مطمئن کر لیتے ہیں۔ بھلا اس دور میں کوئی اپنے آپ کو اس چیز سے کس طرح الگ رکھ سکتا ہے۔ اس طرح پورا معاشرہ برائی کا معاشرہ بن جاتا ہے اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شریف اور مہذب وہ نہیں کہلاتا جو کپڑے پہن کر نکلتا ہے بلکہ وہ کہلاتے ہیں جو اپنی عریانی کی نمائش کرتے ہیں۔ اگر ان سے ان کے اس رویہ کے جواز کی دلیل پوچھئے تو وہ اس کے حق میں جو سخن سازی بھی کریں اس کی تہ میں صرف یہ چیز نکلے گی کہ کیا کیا جائے یہی زمانے کا چلن ہے اور یہی وقت کا فتویٰ ہے یعنی اکثریت کا عمل ان کے لیے دلیل راہ بن جاتا ہے۔

قرآن کے الفاظ سے پہلا یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ کسی برائی کا غلبہ اور خبیث کی کثرت اپنے اندر کشش تو رکھتی ہے لیکن اس کشش سے مغلوب ہو کر جو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے

ہیں وہ سب بیوقوفوں کی دُنیا میں بستے ہیں۔ اولوالالباب اور دانش مند وہ ہیں جو اس وبائے عام میں بھی اس کے اثرات سے محفوظ اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہیں۔ فلاح ان کا ہی مقدر ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے یہاں خبیث و طیب برابر نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَ
إِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ
حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ﴿١٠٢﴾

اے اہلِ ایمان ان چیزوں کی نسبت سوال نہ کرو کہ وہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔ اگر نزولِ قرآن کے وقت میں ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔[195] خدا نے ان کو معاف کر دیا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔[196] تم سے پہلے لوگوں نے ایسے سوالات کیے تھے پھر بالآخر وہ منکر ہو گئے تھے۔[197]

اسلامی نظام میں فکر ورائے کا مقام

اسلام میں قانون سازی کے لیے اصولِ استناد اور اصولِ اجتہاد دونوں کو اپنایا ہے کیونکہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور کسی ایک میں غلو برتنے سے دوسرا مجروح ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی فکر کو غیر محدود آزادی دی جاتی ہے تو تمدنی زندگی کی بنیاد اور اس کے مقصد و نصب العین پر کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کی بے قید آزادی قانون کے لیے خطرہ ہے۔ تمدنی امور اور انسانی معاملات میں محض عقلی بنیادوں پر کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عقل جذبات کی تابع، خواہشات کی غلام، تعصبات کی اسیر اور انفرادی تجربات میں محصور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر صرف اصول استناد پر زور دیا جائے اور اصولِ اجتہاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کے فکری ارتقا کی راہیں بالکل مسدود ہو جاتی ہیں اور اس کی حیثیت صرف ایک مشین کے پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اصول استناد میں غلو برتنا انسان کی ذہنی موت ہے۔ اسلام نے اصول استناد اور اصولِ اجتہاد میں مصالحت کی راہ بتائی ہے۔ اصول استناد کی حد تک قانون کا ماخذ یہاں قرآن و سنت ہیں جن امور کی بابت قرآن نے صاف صریح احکام دیے ہیں ان کی نسبت اور کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح جہاں کسی معاملہ کے بارے قرآن ساکت ہو اور اس سے کوئی ہدایت نہ ملتی ہو وہاں سنتِ رسول یا صحابہ کرام کے متفقہ تعامل سے مدد لینا ضروری ہے۔ ان حدود کے اندر اسلام عقل کی مداخلت گوارا نہیں کرتا لیکن اسلام نے اصولِ اجتہاد کی مناسب رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے اور انسان کو موقع دیا ہے کہ وہ مذکورہ بالا حدود سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائے جہاں کسی صورتِ حال کی نسبت قرآن و سنت دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعتوں کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلے بتایا گیا تھا کہ رسول کا فریضہ اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو پیغام رسول پہنچاتے اسے اپناؤ اور اس کے مطیع بن کر رہو اور جو نہ پہنچائے تو اس کے بارے میں نہ سوالات کرو اور نہ بحث و کرید کرو۔ اگر کرو گے تو اصول استناد کا وزن بڑھتا جائے گا اور تمہاری فکری صلاحیتوں پر زیادہ سے زیادہ قدغن قائم ہوگی۔ خدا یہ نہیں چاہتا کہ انسانی تمدن و معیشت کی سختیاں اور جکڑبندیاں پیدا کرے یہ شریعت کامل شریعت ہے اس میں کوئی بات بھی معیار سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ اگر سوالات کرو گے تو اصول استناد کا زور بڑھے گا اجتہاد و رائے اور آزادی فکر کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اسلام کی تاریخ میں اصحابِ حدیث اور اصحاب رائے کے مدرسے اصول استناد اور اصولِ اجتہاد میں مفاہمت نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے۔ اصحابِ حدیث اصول استناد پر زور دیتے ہیں۔ اجتہاد و رائے اور آزادی فکر کا اصحابِ حدیث کے یہاں کوئی مقام نہیں۔ اصحاب رائے کی اموی اور عباسی دور میں سارے ممالک محروسہ میں کامیابی دراصل اصولِ اجتہاد کی کامیابی تھی۔

۱۹۵ — اے اہلِ ایمان ان چیزوں کی نسبت سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں، اگر نزولِ قرآن کے وقت ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔

پچھلے دو رکوع کا حاصل احکامِ دینیہ میں غلو اور تساہل سے روکنا تھا یعنی جو طیبات خدا نے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام مت ٹھہراؤ اور جو چیزیں خبیث و حرام ہیں خواہ وہ دائمی طور پر یا خاص احوال و واقعات میں ان سے پوری طرح اجتناب کرو۔ ان آیات میں تنبیہہ فرمادی کہ جو چیزیں شارع نے تصریحاً بیان نہیں کیں ان کے متعلق فضول اور دور از کار سوالات مت کرو۔ جس طرح تحریم و تحلیل کے سلسلے میں شارع کا بیان موجب ہدایت ہے اس کا سکوت بھی ذریعہ رحمت و سہولت ہے۔ خدا نے جس چیز کو کمال حکمت اور عدل سے حلال یا حرام کر دیا وہ حلال یا حرام ہو گئیں اور جس سے سکوت کیا اس میں گنجائش اور توسیع رہی مجتہدین کو اجتہاد کا موقع ملا عمل کرنے والے اس کے فعل و ترک میں آزاد رہے۔ اب اگر ایسی چیزوں کی نسبت کھود کرید اور بحث و سوال کا دروازہ کھول دیا جائے گا بحالیکہ قرآن شریف نازل ہو رہا ہے اور تشریع کا باب مفتوح ہے تو بہت ممکن ہے کہ سوالات کے جواب میں بعض ایسے احکام نازل ہو جائیں جن کے بعد تمہاری یہ آزادی اور گنجائش اجتہاد باقی نہ رہے۔ پھر یہ سخت شرم کی بات ہوگی کہ جو چیز خود مانگ کر لی ہے اس کو نباہ نہ سکیں۔ سنت اللہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں بکثرت سوال اور کھود کرید کی جائے اور خواہ مخواہ شقوق و احتمالات نکالے جائیں تو ادھر سے تشدید و سختی بڑھتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس طرح کے سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ گویا سائلین کو اپنے نفس پر بھروسہ ہے اور جو حکم ملے گا اس کے اٹھانے کے لیے وہ بہمہ وجوہ تیار ہیں۔ اس قسم کا دعویٰ جو بندہ کے ضعف و افتقار کے مناسب نہیں مستحق بنا دیتا ہے کہ ادھر سے حکم میں کچھ سختی ہو اور جتنا یہ اپنے کو قابل ظاہر کرتا ہے اسی کے موافق امتحان بھی سخت ہوتا ہے چنانچہ بنی اسرائیل کے ذبح بقرہ والے قصہ میں ایسا ہی ہوا۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو خدا نے تم پر حج فرض کیا۔ ایک شخص بول اٹھا کیا ہر سال یا رسول اللہ، فرمایا اگر میں ہاں کر دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا پھر تم ادا نہ کر سکتے جس چیز میں میں تم کو آزاد چھوڑ دوں تم بھی مجھ کو چھوڑ دو۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا مجرم ہے جس کے سوالات کی بدولت ایسی چیز حرام کی گئی جو حرام نہ تھی۔ یہ بہرحال یہ آیت احکامِ شرعیہ کے باب میں اس طرح کے دور از کار اور بے ضرورت سوالات کا دروازہ بند کرتی ہے باقی بعض احادیث میں جو یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جزئی واقعات کے متعلق لغو سوالات کرتے تھے ان کو روکا گیا وہ ہماری تقریر کے مخالف نہیں ہم لا تسئلوا عن اشیاء میں اشیاء کو عام رکھتے ہیں جو واقعات و احکام دونوں کو شامل ہے اور تسؤکم میں جو برا لگنے کے معنے ہیں سے تعمیم رکھی جاتی ہے۔ حاصل یہ ہوگا کہ نہ احکام کے باب میں فضول سوالات کیا کرو اور نہ واقعات کے سلسلے میں کیونکہ ممکن ہے کہ جو جواب آئے وہ تم کو ناگوار ہو۔ مثلاً کوئی

سخت حکم آیا یا کوئی قید بڑھ گئی یا ایسے واقعہ کا اظہار ہوا جس سے تمہاری فضیحت ہو یا بیہودہ سوالات پر ڈانٹ بتا دی گئی ۔ یہ سب احتمالات تسئوکم کے تحت میں داخل ہیں۔ باقی ضروری بات پوچھنے میں یا شبہ ناشی عن دلیل کے رفع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے [1]

آیت کا پس منظر

اس آیت کے پس منظر میں مختلف واقعات پیش کیے ہیں۔ صاحب محاسن التاویل نے ان واقعات کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آیت کے مدلول اور مفہوم کے عموم میں جو بات داخل نظر آتی ہے بتانے والوں نے اسی کو آیت کا پس منظر بتا دیا ہے ہم ان میں سے صرف دو واقعہ کو ہدیہ ناظرین کرتے ہیں ایک واقعہ وہ ہے جسے انس بن مالک کے حوالہ سے امام بخاری نے کتاب الاعتصام میں بیان کیا ہے،

انس بن مالک کہتے ہیں کہ آفتاب ڈھلنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ جب سلام پھیر چکے تو منبر پر کھڑے ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا۔ اس ضمن میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ قیامت سے پہلے بڑے بڑے واقعات ہوں گے ، اس کے بعد فرمایا جو شخص چاہے وہ مجھ سے جو چاہے پوچھ لے۔ خدا کی قسم جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوں تم مجھ سے جو دریافت کرو گے میں تم کو بتا دوں گا۔ انس کہتے ہیں لوگ یہ سن کر بہت روئے۔ ادھر آپ بار بار فرماتے تھے کہ پوچھو پوچھو۔ آخر عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہوئے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ میرے والد کون ہیں؟ فرمایا تیرے والد حذافہ ہیں۔ جب اس کے بعد بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ اور پوچھو اور پوچھو تو حضرت عمر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا ہم خدا کو رب اور اسلام کو دین اور محمد کو رسول مان کر راضی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر کی اس معذرت کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ خبردار اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے ابھی ابھی دیوار کی طرف جنت اور دوزخ مثالی طور پر میرے سامنے پیش کی گئی تھیں میں نے برائی اور بھلائی کا ایسا منظر جیسا آج دیکھا ہے کبھی نہیں دیکھا۔ امام محمد بن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شہاب زہری اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حذافہ کی والدہ نے عبداللہ سے کہا کہ تجھ جیسی نالائق اولاد میں نے نہیں دیکھی۔ تیرے پاس اس کی کیا ضمانت تھی کہ تیری ماں نے زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح کوئی ناز یبا حرکت نہیں کی۔ اگر کہیں ایسا ہوا ہوتا تو آج بھری محفل میں تو نے اپنی ماں کو رسوا کر دیا ہوتا۔ عبداللہ بن حذافہ نے کہا خدا کی قسم اگر حضور مجھے کسی حبشی غلام کی بھی اولاد کہہ دیتے تو میں اپنے آپ کو اسی کی اولاد سمجھ لیتا۔

امام بخاری نے اس واقعہ کو کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے مگر کتاب الاعتصام میں ایک ایسی قید مذکور ہے جو اور جگہ موجود نہیں اور وہ مادمت فی مقامی ھذا یعنی جب تک میں اس جگہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ہر سوال کے جواب کے لیے تیار ہو جانا صرف وقتی کیفیت تھی۔ جیسا کہ سامنے دیوار پر اس وقت جنت اور نار کا تمثل۔ اس کی علت یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو رسالت کے ذیل میں قیامت تک کے انسان اور ان کے باپ دادوں کے نام بھی بتا دیے جاتے ہیں۔ اگر یہ بھی علوم رسالت میں داخل ہوتا تو ان کے دریافت کرنے سے آپ کو غصہ ہی کیوں آتا۔ لیکن گاہ گاہ ایسا ہو جاتا ہے کہ جب رسول کو تنگ کیا جاتا ہے تو قدرت الٰہی اس کا تکفل فرما لیتی ہے کہ جو الٹے سے پوچھا جائے گا اس کا جواب وہ اسی وقت القا کر دے گا جیسا کہ سیر معراج کے واقعہ میں جب آپ کا بیت المقدس کا سفر مشرکین مکہ کو بعید نظر آیا تو انہوں نے امتحاناً آپ سے مسجد اقصیٰ کے متعلق سوالات شروع کیے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ کو اس وقت اتنی بے چینی ہوئی کہ کبھی نہ ہوئی تھی ظاہر ہے کہ ایک دیکھنے والا ہمہ وقت اتنے غور سے تو نہیں دیکھتا کہ ہر چیز کے سارے خط وخال محفوظ کر لے۔ اب اگر آپ ان کے سوالات کا جواب نہیں دیتے تو منکرین کو مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے اور اگر جواب دیتے ہیں تو اس ارادے سے کہ آپ نے بیت المقدس کو دیکھا نہ تھا کہ قریش مکہ کو اس کا امتحان بھی دینا ہے۔ یہ بے چینی آپ کے مربی حقیقی اللہ سبحانہ نے محسوس کی۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ بیت المقدس میرے سامنے کر دیا گیا۔ وہ مجھ سے سوال کرتے جاتے میں بڑی سہولت سے دیکھ دیکھ کر جواب دیتا جاتا تھا۔ بہر حال اس قسم کی جزئیات بھی رسول کی زندگی میں ملتی ہیں مگر یہ منصب رسالت کا نہ جزء ہے اور نہ اس کا کمال بلکہ حق تعالیٰ کی اس وقت مشیت پر موقوف ہے۔ اگر چاہے تو خرق عادت کے طور پر اس کا نقشہ بھی دکھا دے۔ یہی حال تمام معجزات کا ہے۔ وہ بھی نبی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کی طاقت سے ظاہر نہیں ہوتے نہ اصولی طور پر معجزات کی کلی طاقت ان کو دی جاتی ہے بلکہ وقت و مصلحت کے لحاظ سے اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو اپنی غیر متناہی طاقت کا ان کے ہاتھوں پر ظہار کر دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا تو نہیں کرتا۔

اس کے ساتھ اسی آیت کے پس منظر میں یہ واقعہ بھی شارحین قرآن نے بڑے کروفر سے نقل کیا ہے۔
حضرت علی فرماتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت جب نازل ہوئی وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً تو لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ بتایئے کہ کیا ہر سال حج ہے۔ حضور انور خاموش رہے پھر دریافت کیا کہ کیا ہر سال حج فرض ہے پھر آپ نے سکوت فرمایا۔ پھر پوچھا کیا ہر سال حج ہوگا۔ فرمایا نہیں۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا اور اگر واجب ہو جاتا تو تمہارے بس سے باہر ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ سوال کرنے والے حضرت اقرع بن حابس تھے۔ یہ حدیث بھی حدیث کی متعدد کتابوں میں آئی ہے۔
پس منظر میں اگرچہ اور بھی واقعات ہیں۔ لیکن عام شارحین قرآن نے زیادہ تر ان دو واقعوں کو اس آیت کی تشریح میں اپنایا ہے۔

سوال سے ممانعت کا پس منظر

ان دو واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سوال سے ممانعت کا پس منظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں کے عجیب عجیب سوالات تھے۔ جن کی نہ دین کے کسی معاملے میں ضرورت تھی اور نہ دنیا ہی کے کسی معاملہ میں ایسے لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔ اس صورت میں آیت گرامی کا مطلب کیا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شارحین قرآن نے اس کا جواب وضاحت کے ساتھ نہیں دیا۔ یعنی ان واقعات کو تو آیت کے پس منظر میں بڑی قوت کے ساتھ درج کیا ہے لیکن واقعات کے ساتھ مطالب کی تطبیق میں قوت کا وہ مظاہرہ نہیں کیا جو کرنا چاہیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ لوطرح ہی دے گئے گویا انہوں نے کوئی پس منظر لکھا ہی نہیں ہے۔ صرف شیخ الاسلام نے آیت کے عموم میں ان واقعات کو کھپانے کی تھوڑی سی کوشش فرمائی ہے جیسا کہ آپ ان کے افادات میں مطالعہ فرما چکے ہیں۔ دوسرے شارحین قرآن اور خود شیخ الاسلام نے سوال سے ممانعت کا پس منظر ان واقعات سے ہٹ کر پیش کیا ہے اور ہے بھی یہی۔ امام بخاری نے صحیح میں اسی آیت کا حوالہ دے کر عنوان قائم کیا ہے باب مایکرہ من کثرۃ السوال۔ اور یہ ارشاد نبوت اس میں درج کیا ہے کہ

> مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام ہو گئی۔

حافظ ابن کثیر نے ایک اور صحیح حدیث پیش کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لوگو! اللہ نے تمہارے ذمے کچھ فرائض لگائے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کردیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو، کچھ حدود مقرر کردی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اس کو بھول لاحق ہوتی ہو لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

یہ حدیث ابو ثعلبہ خشنی کے حوالے سے سنن دار قطنی میں ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ میں درج کی ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں یہ اہم حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جن امور کو شارع نے مجمل چھوڑ دیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی ہے یا جو احکام بر سبیل اجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہوگئی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود کرنا نہیں چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔

اس پس منظر کے تحت شارحین قرآن نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ شیخ المفسرین امام محمد ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

اے اہل ایمان تم جو میرے رسول سے ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرتے ہو جن کے بارے میں میں نے وحی نازل نہیں کی۔ ان چیزوں کے بارے میں سوالات مت کیا کرو کیونکہ اگر وحی کے ذریعے ان کو ظاہر کردیا جاتے تو یہ تمہاری پریشانی کا سامان ہوگا کیونکہ زبان وحی پر جو بات آئے گی اس میں تمہیں کسی نہ کسی پابندی کے ذریعے امتحان سے دوچار ہونا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مشقت ہی مشقت ہے اور اگر کسی بات کی حرمت وحی کے ذریعے یا کسی چیز کی حلت مقرر ہوگئی تو اس سے بھی تمہاری پریشانی میں اضافہ ہوگا۔ اور یہ آیت اس حدیث کی نظیر ہے جس میں ہے کہ اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو، کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ آخر حدیث تک۔ اور اسی کی تائید میں عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان بھی ہے کہ ان اشیا کے بارے میں سوالات نہ کرو کہ اگر قرآن ان کے بارے میں کوئی سختی پر مبنی حکم نازل کردے تو تم غمگین ہو جاؤ بلکہ انتظار کرو، پھر جب قرآن نازل ہو رہا ہو تو تم کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کروگے لیکن تمہیں اس کی توضیح مل جائے گی۔

اور حافظ ابن کثیر ارشاد فرماتے ہیں:

کسی چیز کے بارے میں تم نئے نئے سوالات نہ کرو ممکن ہے کہ تمہارے سوال کی وجہ سے کوئی سختی نازل ہوجائے۔ حدیث میں ہے مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو لوگوں پر حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کی وجہ سے حرام ہوگئی۔ لیکن جب قرآن میں کوئی بات مجمل نازل ہوئی ہو اور تم نے اس کی توضیح پوچھ لی تو اس کو بیان کرنا تمہاری خاطر ضروری ہوگیا۔ اور عفا اللہ عنہا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس چیز کا ذکر نہیں کیا سمجھ لو کہ اس نے معاف کر دیا تم بھی خاموش رہو جیسے اللہ نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ حدیث صحیح ہے۔ مجھے چھوڑ دو جب تک میں چھوڑے رکھوں تم سے پہلے لوگ کثرۃ سوال کی وجہ سے تباہ ہوگئے ہیں اور حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں ان کو ضائع نہ کرو آخر حدیث تک۔

ابن جریر اور ابن کثیر کی تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے سے منع کیا گیا جن کا اظہار تمہارے لیے پریشانی کا سامان ہوجائے۔ ہاں صرف ایک صورت میں سوال کرنا روا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں قرآن نے اجمالاً کچھ کہا ہو اور تم سوال کے ذریعے اس کی توضیح چاہتے ہو جیسا کہ مسئلہ خمر میں پہلے سن چکے ہو۔

صاحب المنار علامہ سید رشید رضا نے یہ بھی مطلب بتایا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کے بارے میں نزول وحی کے زمانے میں سوال کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہارے سوال کا جواب ضرور دے گا۔ اگر سوال کا تعلق فکر و عقیدہ سے ہوگا تو اس کی اس حد تک توضیح ضرور ہوگی جتنی اعتقاد کے لیے ناگزیر ہے اور عملی زندگی سے متعلق سوال ہوگا تو اس کا حکم ضرور بیان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اصول استناد کی حد تک بندوں کی ان تمام چیزوں میں رہنمائی کرتا جن کی بندوں کو اپنی معاش اور معاد کی حد تک ضرورت ہے اور اصول اجتہاد کی حد تک اللہ نے اپنے بندوں کو آزادی دی ہے اسی میں دین کی آسانی ہے لہٰذا تشریع کی حد تک ایسے سوالات ہرگز نہ کیے جائیں کہ اگر ان کا جواب دیا جائے تو وہ پریشانی کا سامان ہوجاتے اور زمانہ نزول وحی میں جواب ناگزیر ہے لیکن یہ جواب تمہاری فکری آزادی کا خاتمہ کر دے گا اور اجتہاد کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں اگر سوالات ہوں گے تو جواب بھی ضروری ہوگا لیکن یہ جواب تمہاری پریشانی کا باعث ہوگا اس لیے سوالات سے بچ کر رہنا چاہیے۔

مولانا عثمانی کی تشریح ہو یا ابن جریر اور ابن کثیر کی تشریح ہو اور یا بالآخر سید رشید رضا کی تفسیر ہو

ان سب سے جو بات بھی جاری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں قانون کا مأخذ عام رائے یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں ہیں۔ کیونکہ قانون کا ماخذ تمام تر قرآن ہے جس کے احکام و ہدایات اور جس کے متعین کردہ اصول کار اور مقاصد جملہ افراد معاشرہ کے لیے یکساں تسلیم ہیں۔ اسلام میں قانون کا پہلا ماخذ قرآن ہے جن امور کی بابت قرآن نے صاف اور صریح احکام دیے ہیں ان کی نسبت اور کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا الا یہ کہ کسی ایسے حکم کے تحت ضمنی قوانین و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئے ایسی صورت میں سنت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح جہاں کسی معاملہ میں قرآن خاموش ہو وہاں سنت رسول یا صحابہ کرام کے متفقہ تعامل سے مدد لی جائے گی۔ یہ اصول استناد ہیں ان میں اسلام نے عقل کی مداخلت کو بالکل رد کر دیا ہے اور کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس دائرے میں اپنی عقلی موشگافیوں سے فکر و عمل کا انتشار پیدا کرے جب کسی معاملہ میں اصول استناد کی صاف و صریح ہدایت موجود ہو تو پھر قطعاً ناجائز ہے کہ اس کی ہدایت کو چھوڑ کر افراد اپنی عقل و فہم کی رہنمائی قبول کریں لیکن قرآن نے قانون کی خاطر اصول استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کی مناسب رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے اور اہل ایمان کو موقع دیا ہے کہ وہ اصول استناد سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائیں جہاں کسی صورت حال کے بارے میں اصول استناد خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعتوں کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں اس پس منظر کی روشنی میں اس آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ ایسے سوال نہ کرو جن کے جواب اگر دیے جائیں تو اجتہاد کا دروازہ تمہارے لیے تنگ سے تنگ تر ہو جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت واضح کر دی کہ یہ زمانہ نزول قرآن کا زمانہ ہے اس وقت جو سوال بھی کرو گے اس کا جواب نازل ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے سوچ سمجھ کر وہی سوالات کرو جو تمہارے لیے نافع ہوں اور علم شریعت میں اضافہ کا موجب ہوں۔ جن باتوں کو ہم نے بیان نہیں کیا اس لیے نہیں کہ ہم بھول گئے بلکہ اس لیے کہ ہماری رحمت نے تمہارے لیے عفو و درگزر سے کام لیا ہے۔ ہم تمہاری فکری آزادی کو سلب کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے ان معاملات کو تمہاری عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے جن میں تمہاری عقل تمہاری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ یہ شریعت آخری شریعت اور کامل شریعت ہے۔ کمال یہی ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس میں کسی پہلو سے نقصان نہ ہو۔ اصول استناد میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ کم سے کم رکھے گئے اور اصول اجتہاد حالات زمانہ کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور بلاشبہ بہت سے تفصیلی امور میں تبدیلی حالات کے لحاظ سے تبدیلی حکم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہی طریقہ اعتدال

ہے کہ اصول استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کی رعایت دی جائے۔

اصول استناد اور اصول اجتہاد

دراصل اصول استناد ہوں یا اصول اجتہاد دونوں اجتماعی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہیں۔ ان میں ضروری ہونے کے ساتھ نزاکت یہ ہے کہ اصول استناد اور اصول اجتہاد میں کس طرح مصالحت کی جائے۔ علمی طور پر یہ اسلامی زندگی کا نازک ترین موڑ ہے۔ حافظ ابن حزم ظاہری اور ان کے ہمنوا صرف اصول استناد کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جب کہ کچھ لوگ صرف اصول اجتہاد پر زور دیتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اور کسی ایک میں غلو برتنے سے دوسرا مجروح ہوتا ہے۔ اگر انسانی فکر کو غیر محدود آزادی عطا کی جاتی ہے تو تمدنی زندگی کی بنیاد اور اس کے مقصد و نصب العین پر کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا۔ اور افراد متضاد نظریات رکھنے والے گروہوں میں بٹ جاتے ہیں جس میں سے ہر گروہ دوسرے گروہوں کا رقیب اور خصم بن جاتا ہے۔ اس طرح سے اعمال و عقائد کی وہ یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو قانون کے موثر وجود کی شرط ہے۔ اس قسم کی بے قید آزادی خطرات سے خالی نہیں ہے اور اس طرح تمدنی امور اور انسانی معاملات میں محض عقلی بنیادوں پر کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عقل جذبات کی تابع، خواہشات کی غلام تعصبات کی اسیر اور انفرادی تجربات میں محصور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر صرف اصول استناد پر زور دیا جائے اور اصول اجتہاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کے فکری ارتقاء کی راہیں بالکل مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اس کی حیثیت صرف ایک مشین کے پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اصول استناد میں غلو برتنا انسان کی ذہنی موت ہے۔ جو اجتماع محض اصول استناد پر استوار ہو اس میں ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ مغربی تمدن کبھی ان دونوں اصولوں کے مابین مصالحت پیدا نہ کر سکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی اصول میں غلو برتتا رہا۔ کیتھولک تسلط کے عہد میں اصول استناد کا زور تھا جس شخص نے ذرا بھی آزادی سے کام لے کر راسخ الوقت مذہبی قوانین کے خلاف آواز نکالی اسے طاقت کے زور سے بالکل دبا دیا گیا۔ اجتہاد و رائے اور آزادی فکر کے لیے اس سوسائٹی میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی کامیابی دراصل اجتہاد کی کامیابی تھی۔ کیونکہ اس فرقہ کا اصول ہی یہ تھا کہ انسان اپنی آزادی رائے استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے بعد جو دور آیا اس میں انفرادیت بطور ایک سیاسی اور مذہبی اصول کے مغربی تمدن پر حاوی ہو گئی اور یورپ عقل و فکر کی بے قید آزادی کا میدان کارزار بن گیا۔ اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تمدن کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ یہ تو ہم بیگانوں کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ آئیے اپنے ہی آئینے میں ذرا اپنا چہرہ بھی دیکھ لیجیے خلفائے راشدہ کی حکومت

کی کامیابی کا راز اصول استناد اور اصول اجتہاد میں مصالحت اور مفاہمت ہی رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں خلافتِ عباسیہ میں اعتزال و سنت کا خلق قرآن کے نام پر تصادم دراصل اصولِ استناد اور اصول اجتہاد کا تصادم ہے۔ اعتزال کا اصول ہی یہ تھا کہ قرآن وسنت کے معاملہ میں انسان کو آزادی رائے حاصل ہے۔ اس لیے معتزلہ کی کامیابی دراصل انفرادی عقلیت کی کامیابی تھی۔ مولانا آزاد نے اس دور کی پوری تصویر پیش کی ہے۔

"تیسری صدی ہجری کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعت معضلۂ تکلم بالفلسفہ وانحراف از اعتصام بالسنہ نے سر اٹھایا اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیر استبداد و قہر نے حکومت کا ساتھ دیا حتیٰ کہ بقول علی ابن المدینی فتنۂ ارتداد کے بعد یہ دوسرا فتنہ تھا جو اسلام کو پیش آیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قیامِ سنت و دینِ خالص کا قیامت تک فیصلہ ہونے والا تھا اور مامون و معتصم کے جبر و قہر اور بشر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جبابرہ معتزلہ کے تسلط و حکومت نے علمائے حق کے لیے صرف دو راستے باز رکھے تھے یا اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ خلق قرآن پر ایمان لاکر اس کی نظیر قائم کردیں کہ شریعت میں اتنا ہی نہیں ہے جو رسول نے بتلا گیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جاسکتا ہے اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے، ہر رائے اس پر قاضی و آمر ہے ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے۔"

ظاہر ہے کہ امام احمد کا موقف یہی تھا کہ اصول اجتہاد میں انتہا پسندی نہ برتی جائے بلکہ اصول استناد اور اصول اجتہاد میں توازن قائم رکھا جائے۔ معتزلہ اس توازن کو نہیں مانتے تھے اور وہ اجتہاد کو خود رائی کا لبادہ پہنا کر اصول استناد کو بے جان بنائے ہوئے تھے۔ اصول استناد اور اصول اجتہاد میں مفاہمت صرف امام احمد ہی کا مسلک نہیں بلکہ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی سب کا یہی مسلک ہے۔ یہ سب بزرگ اصولِ استناد کے ساتھ اسلام کی سیاسی زندگی میں اصول اجتہاد کے قائل ہیں۔

اسلامی نظام میں اجتہاد کا مقام

اصول استناد کے ساتھ قرآن نے اہلِ ایمان کے لیے اصول اجتہاد کی بنیاد رکھی ہے اور اہل ایمان کو موقع دیا ہے کہ وہ متذکرہ بالا حدود سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائیں۔ جہاں کسی بھی صورتِ حال کی نسبت اصولِ استناد قرآن وسنت دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر

سکتے ہوں۔ تاریخ فقہ اسلامی کے آغاز میں اجتہاد رائے کے معنے میں بولا گیا ہے۔ رائے کے مقابل علم کی اصطلاح تھی جس کے معنے اصول استناد کے تھے یعنی ایک بات اگر قرآن وسنت میں ہے تو وہ علم ہے اور اگر نہیں ہے تو وہ رائے ہے۔ اس میں انکار حدیث یا ترک حدیث کا سوال ہی نہ تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ایک مسئلہ کا حل ایک عالم قرآن وسنت میں نہ ملنے کی وجہ سے اپنی سوچی اور سمجھی ہوئی رائے سے تلاش کرتا تھا۔ یہ رائے اس عالم کی دانست میں قرآن وسنت کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ کسی واقعہ میں اگر قرآن وسنت کی کوئی ظنی الدلالہ نص موجود ہو اس کی مراد متعین کرنے کا نام اجتہاد نہیں ہے۔ ایسے ہی اصول استناد میں نص نہ ہونے کی صورت میں غیر شرعی راہوں سے تفکیر کا نام اجتہاد نہیں ہے بلکہ اجتہاد نام ہے کسی واقعہ میں قانون معلوم کرنے کا جس میں نص نہ ہو ان راہوں پر غور و فکر کر کے جن کے رہنما اصول خود اصول استناد میں بتاتے ہیں اسی کو قرآن نے نبوت کی طرف نسبت کر کے لتبین للناس پیغمبر کا بیان کہا ہے اور اسی کو اہل ایمان کی طرف نسبت کر کے لعلھم یتفکرون اہل ایمان کا تفکر کہا ہے۔ ارشاد ہے:

انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون۔

اور ہم نے تجھ پر الذکر یعنی قرآن اتارا تاکہ جو کچھ لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے تو اسے بیان کر دے اور تاکہ لوگ غور و فکر کر لیں۔

نبوت کا بیان تو اللہ کی ارات ہوتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے۔

لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

رسول کے مقابلے میں دوسروں کی تفکیر کی حیثیت ارارت خداوندی کی نہیں بلکہ رائے کی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر کے منشی نے حضرت عمر کے فیصلے پر یہ الفاظ لکھ دیے ھذا ما اراى اللہ امیر المومنین یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین کے خیال میں ڈالا۔ اس پر حضرت عمر نے منع فرمایا اور کہا یوں مت لکھو بلکہ یہ لکھو ھذا ما رای امیر المومنین یہ امیر المومنین کی رائے ہے۔

ایک بار بر سر منبر اعلان فرمایا:

لوگو! دیکھو حضور انور کی رائے دین کے بارے میں اس لیے صواب ہوتی ہے کہ وہ خدا کی ارارت ہوتی تھی ہماری رائے تو صرف ایک ظن اور تکلف ہے۔

یعنی وہ رائے جو اصول استناد کے پیش کردہ رہنما اصولوں کی روشنی میں نہ ہو وہ ظن اور تکلف ہے اور جو تفکیر قرآن وسنت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں ہو وہ رائے محمود ہے۔ یہی اجتہاد ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا والی مقرر کیا گیا اور وہ روانگی کے لیے تیار ہو گئے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان سے سوال کیا کہ تم معاملات کا تصفیہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ قرآن کی رو سے۔ حضورِ انور نے پوچھا کہ اگر قرآن کسی معاملہ میں خاموش ہو تو پھر کیا کرو گے؟ حضرت معاذ نے کہا کہ اس صورت میں سنت رسُول پر عمل کروں گا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اگر میری سنت میں بھی زیرِ بحث معاملہ کے متعلق کوئی ہدایت نہ ہو۔ معاذ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں میں اپنی رائے سے کام لوں گا۔ اور اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اظہارِ پسندیدگی فرمایا۔

لیکن فکر و اجتہاد کی یہ آزادی غیر مشروط اور بے قید نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہے کیونکہ اگر بنیادی امور و مسائل اور اساسی اصولوں کو طے کرنے کے بعد انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس و بنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین و ضوابط مبنی ہیں اور ایسی صورت میں اسلامی قوانین و احکام ایک بے ربط مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتے جن کی اصل و اساس اور فروع و تفصیلات کے مابین کوئی موافقت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کی ترتیب اور اصولوں کے عملی انطباق میں اجتہاد اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس عمل میں اصل کی اسپرٹ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ یعنی ایسا اجتہاد جو اسلام کی رُوح اور قرآن و سنت کے بنیادی اصُول و احکام سے متعرض ہو جائز نہیں ہے۔ اسی غرض سے یہ قید لگا دی گئی ہے کہ اجتہاد صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم و اطلاع، اپنی اصابت رائے اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں۔ قرآن و سنت پر جو قانون کے اساس و ماخذ ہیں ایمان راسخ اور یقین کامل رکھتے ہوں اور متقی و متبع شریعت ہوں۔

اسلام میں فکر و اجتہاد کی آزادی نے بالعموم چھ صورتیں اختیار کی ہیں جنہیں علی الترتیب اجماع، قیاس، استحسان، استصلاح، عرف اور استصحاب کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت فکری اجتہاد کے بڑے اصُول ہیں جنہیں اسلامی فکر نے زمانہ کے تبدیل پذیر مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دیا ہے افسوس کہ یہاں ان پر تفصیلی بحث کا موقعہ نہیں ہے۔ اگر انفاس حیات باقی رہے تو انشاء اللہ اس کے تفصیلی مباحث ہماری مجوزہ کتاب "اصول استناد و اصُول اجتہاد" میں آپ کو ملیں گے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی نظام دونوں اصولوں یعنی اصُول استناد اور اصول اجتہاد پر یکساں زور دیں اور کسی ایک اصُول کی یک طرفہ حمایت نہ کریں جس سے دوسرا مجروح و معطل ہو جائے نہ تو معتزلہ کی طرح عقلیت پر زور دیں کہ فکری آوارگی کا شکار

ہو کر رہ جائیں اور نہ داؤد ظاہری اور ابن حزم کی طرح استناد پر زور دیں کہ پیش پا افتادہ حالات میں فکری جمود کا نشانہ بن جائیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو یورپ کی لائی ہوئی جمہوریتوں کی تقلید میں اصول اجتہاد اور آزادی فکر پر غیر متوازن زور دے کر اصول استناد کو خطرہ میں ڈال رہا ہے اس طبقہ کے افراد انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات و مسائل میں سرے سے قرآن و حدیث کی ہدایت ہی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم نے صراحت کر دی ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کے فیصلوں کو اپنی زندگی کے معاملات اور تمدنی مسائل میں آخری فیصلہ نہیں مانتا اس کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے زندگی کے مسائل میں اصول استناد کی ہدایت سے انحراف اس اساس و بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے جس پر اسلامی معاشرہ قائم ہے اور اس اساس کے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی زندگی کی حقیقت کو باقی رکھنا ہے تو قرآن و سنت کے مرکز سے وابستہ رہنا ہوگا۔ اور اصول اجتہاد کے ساتھ اصول استناد کو ترتیب دینا ہوگا۔ دوسری طرف علم بردارانِ مذہب ہیں جو خدا اور رسول کے دیے ہوئے حق اجتہاد کو سلب کر لینا چاہتے ہیں اور خدا پرستی و اتباع رسول کے سوا کچھ اور اضافہ چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ائمہ فقہ کے ہر قول کو خدا اور رسول کے حکم کی طرح اٹل سمجھتے ہیں۔ نظری حیثیت سے اجتہاد کی ضرورت کے قائل ہوتے ہوئے عملاً یہ لوگ اجتہاد کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک بعد کے لوگ فطرۃً اجتہاد کے نااہل ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اجتماعی زندگی میں بیداری اور حرکت کی روح اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب استناد کے ساتھ اجتہاد کا عمل جاری رہے۔ اسلام کی مثال ایک تناور درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں ایسی مضبوطی سے گڑی ہوئی ہوں کہ حوادث کا کوئی طوفان اور انقلاب کی کوئی آندھی اسے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور جس کی وسیع اور پھیلی ہوئی شاخیں آندھیوں میں ادھر اُدھر ہلتی رہتی ہیں اور جس کے کہنے پتے گرتے اور پھر نکل آتے ہیں۔ اس درخت کی حفاظت جس طرح جڑوں کی مضبوطی پر موقوف ہے اسی طرح شاخوں کی لچک اور پتوں کے گرنے اور پھر نکلنے پر بھی منحصر ہے جو لوگ اس کی جڑوں کو کاٹتے ہیں، وہ اس کے دشمن ہیں جو اس کی شاخوں کی لچک برباد کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے نادان دوست ہیں۔

اباحت، توقف اور حرمت

۱۹۶۔ خدا نے ان کو معاف کر دیا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ یا تو یہ مراد ہے کہ ان اشیاء سے درگزر کیا۔ یعنی جب خدا نے ان کے متعلق کوئی حکم نہ دیا تو انسان ان کے بارے میں آزاد ہے۔ خدا ایسی چیزوں پر گرفت نہیں کرے گا چنانچہ اسی سے بعض علمائے اصول نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اصل

اشیا میں اباحت ہے اور یا یہ کہ ان فضول سوالات سے جو پہلے کر چکے ہو اللہ نے درگزر کی آئندہ احتیاط رکھو۔[1]
یہ دونوں مطلب ہم پہلے ابن جریر اور ابن کثیر کے حوالہ سے پیش کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک راجح پہلا مطلب ہے اور عبداللہ بن عباس کا بیان بھی اسی کا مؤید ہے جیسا کہ پڑھ آئے ہو۔ اس موضوع پر علمار کے خیالات مختلف ہیں کہ جن معاملات، احوال، کوائف اور اشیا کے بارے میں قرآن خاموشی اختیار کرے اس کے بارے میں عام قانونی پالیسی کیا ہے۔ کچھ علمار اصول کی رائے تو وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے بتائی ہے۔ یعنی اباحت اور قانون کے مزاج کے بھی ہم آہنگ ہے لیکن ہمارے خیال میں یہاں عفو کے معنے آسانی بہم پہنچانے کے ہیں۔ قرآن میں عفوان معنے میں آیا ہے فتاب علیکم و عفا عنکم عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں حلال وہ ہے جو اللہ نے حلال کیا ہے اور جس سے خاموشی اختیار کی ہے وہ معاف ہے یعنی ان میں اُمت کے لیے تسہیل اور وسعت ہے۔ کچھ علمار کی رائے میں اصل توقف ہے جیسا کہ صاحب درمختار نے تصریح کی ہے اور کچھ کی رائے میں اصل حرمت ہے جیسا کہ ملا جیون نے اسے جمہور کا مذہب قرار دیا ہے ہمارے نزدیک ان تینوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہاں انسانی زندگی کے دوائر تین ہیں، افکار، عبادات اور معاملات۔ افکار کی حد تک اصل توقف ہے۔ یعنی عالم غیب سے متعلق ہر فکر کے بارے میں اس وقت تک توقف رہے گا جب تک نبوت کی رہنمائی نہ ہو۔ ہم کسی عقیدہ کی کوئی عمارت بطور خود گھڑنے کے مجاز نہیں ہیں اور اصل عبادات میں حرمت ہے یعنی دین کے نام پر عبادت کا ہر پیمانہ ممنوع ہے جب تک قرآن وسنت سے اس کی اجازت نہ ہو خواہ صراحۃً ہو یا دلالۃً یا اشارۃً اور اصل اشیا و معاملات تمدن و تہذیب اور حکومت و سیاست میں اباحت ہے یعنی صرف وہ چیزیں منع ہیں جن سے قرآن و سنت نے صراحۃً یا دلالۃً منع کیا ہو اس لیے تینوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

عقائد و احکام میں موشگافیاں

۱۹۷۔ تم سے پہلے لوگوں نے ایسے سوالات کیے تھے پھر بالآخر وہ منکر ہو گئے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ پہلی قومیں کثرت سوال اور انبیار سے اختلاف کرنے کی بدولت ہلاک ہو گئیں۔[2] یعنی پہلے انہوں نے خود ہی عقائد و احکام میں موشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلق سوال کر کر کے تفصیلات اور قیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کرایا۔ پھر خود ہی اس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے۔

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

اس گروہ سے مراد یہودی ہیں جن کے نقش قدم پر چلنے میں قرآن اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے پہلے سوالات کرکے پابندیاں بڑھائیں اور اصول استناد میں دفعات کا اضافہ کرلیا۔ پھر جب دائرہ تنگ ہوگیا تو سرے سے عمل کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ انسانی معیشت کے لیے سختیاں اور جکڑ بندیاں پیدا کرے اور تمہارے ہر عمل کو کسی نہ کسی پابندی سے ضرور باندھ دے جو کچھ ضروری تھا بتلا دیا جو کچھ چھوڑ دیا گیا وہ معاف ہے۔ اب تم اپنے جی سے کاوشیں کرکے طرح طرح کے سوالات نہ کرو۔ اگر کروگے تو دین میں آسانی کی جگہ تنگی ہو جائے گی اور تمہارا وہی حال ہوگا جو بنی اسرائیل کا ہوا۔ لفظ سوال کے اندر کئی مفہوم ہیں۔ سوال بعض صورتوں میں اعتراض کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بعض حالات میں تحقیق کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا صلہ عن ہوتا ہے۔ یہاں قرآن کی بلاغت پر غور فرمائیے کہ صحابہ کے سوال کے تذکرے کے موقعہ پر سوال کا ذکر کیا ہے اور دونوں جگہ عن استعمال کیا ہے اور یہودیوں کے سوال کے ذکر میں عن ہٹا دیا۔ لا تسئلوا عن اشیاء . ان تسئلوا عنہا صحابہ مخاطب ہیں اور قد سألہا قوم من قبلکم میں یہود کی کہانی ہے۔ اس اندازِ تعبیر نے بتادیا کہ صحابہ کے سوالات تحقیقی نوعیت کے تھے جب کہ یہودیوں کے سوال کی نوعیت اعتراض کی تھی۔

---

[1] تفہیم القرآن

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ
وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا
يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ
قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٤﴾

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام لیکن جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے وہ اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے ہیں، اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں[۱۹۸] - اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا یہ لوگ باپ دادا ہی کی تقلید کریں گے چاہے

ان کے باپ دادا بے علم ہوں اور بے ہدایت ہوں۔[199]

اللہ کے شعائر سے رسوم کا مقابلہ

یہ آیت گرامی پہلی آیت جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام کے مقابلہ پر ہے۔ وہاں بتایا گیا تھا کہ یہ اللہ کے بنائے ہوئے اور قائم کردہ شعائر ہیں اور یہاں بتایا گیا ہے کہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اللہ کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ لوگوں کے افترائی اور اختراعی شعائر ہیں۔ وہ نشان توحید ہیں اور یہ نشان شرک ہیں۔ ان کو مشرکین نے رسوم کا درجہ دے کر مذہبی تقدس کا جامہ پہنا رکھا ہے۔ ان کی حیثیت رواجی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اللہ کے قائم کردہ شعائر اور لوگوں کی افترائی رسموں کو ایک دوسرے کے مقابل ذکر کیا ہے کیونکہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے مقابل تصور کو بھی ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اسی بنا پر اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدہ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ شعائر اللہ کے ساتھ ان رسوم کا بھی ذکر دیا جائے جن کی بنیاد ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہے۔ یہ قرآن کا عام انداز بیان ہے چنانچہ توحید کی تعلیم دیتے ہوئے بات صرف اسی پر ختم نہیں کی کہ توحید اسے کہتے ہیں بلکہ پوری پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ شرک کیا ہے اس کے اعمال کیا ہیں؟ چنانچہ یہاں ان مشرکانہ رسوم کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ سب جھوٹ کا گھروندا ہے اور بے عقلوں کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اور اس کے بعد اس عملی زندگی کی اس فکری اساس پر یہ کہہ کر ضرب کاری لگائی کہ جب ان سے اپنے اس مشرکانہ کردار پر دلائل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان کے پاس ایک جواب ہوتا ہے۔ حسبنا ما وجدنا علیہ اباءنا۔ اس پر قرآن نے کھلے لفظوں میں کہا اولو کان اباءھم لا یعلمون شیئا و لا یھتدون یعنی تمہاری زندگی کی ساری عمارت جن معماروں کے ہاتھوں بنی ہے وہ بے علم اور بے ہدایت تھے۔ تو یہ صرف جہل و کوری اور گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟

۱۹۸۔ اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ لیکن جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے وہ اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں۔ مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف

کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو۔ ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ بحیرہ جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام نہ لاتا تھا۔ سائبہ جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانے کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے۔ درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ حام نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک میں سے تھیں جس سے جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری وغیرہ سے منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت و حرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا گویا اپنے لیے منصب تشریع تجویز کرنا تھا۔ اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنی ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں۔ ان کے بڑوں نے خدا پر بہتان باندھا ہے۔ اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کر لیا۔ الغرض یہاں تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول اور بے کار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء سے حلال و حرام تجویز کر لیے جائیں۔[1] واقعی ان کی معنوی تشریح میں شارحین قرآن نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ اہل شرک کی رسوم ہر ملک میں ہر قوم میں اور تاریخ کے ہر دور میں الگ ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں لیکن روح کے اعتبار سے ملتی جلتی ہیں۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس قسم کی گھڑی ہوئی رسمیں اور ایسے جانوروں کا ادب و احترام ہرگز مشروع نہیں ہے اور اللہ نے یہ ہرگز مشروع نہیں کیا۔ جس طرح ہمارے ملک میں بھی گائے، بیل کسی بت، قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی خدمت لینا یا انہیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

ان ہی میں سے قرآن نے یہاں چار کا ذکر کیا ہے۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔

بحیرہ کان پھٹا۔ حضرت شاہ عبد القادر فرماتے ہیں یہ کفر کی رسمیں تھیں کہ مواشی میں کوئی بچہ نیاز رکھتے بت کی، تو اس کا کان پھاڑ دیتے نشان کو اور اس کو بحیرہ کہتے۔ چونکہ بحر کے مادہ میں وسعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور کثرت ہے اس لیے اونٹ کے اچھی طرح کان پھاڑنے کے لیے عرب والے بولتے تھے بحرت البعیر میں نے اونٹ کے اچھی طرح کان چیر دیے۔ اس لحاظ سے یہاں فعیلۃ بمعنے مفعولہ ہے۔ صحیح بخاری میں سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ بحیرہ کا دودھ بتوں کے نام پر محفوظ کر دیا جاتا۔ اس لیے کوئی شخص اس کے تھن نہیں دوھ سکتا تھا۔ مصنف عبدالرزاق میں قتادہ سے روایت ہے کہ بحیرہ اونٹنی ہوتی تھی۔ جب پانچویں مرتبہ بچہ دیتی اگر بچہ نر ہوتا تو صرف مرد ہی کھاتے عورتیں نہ کھاتی تھیں۔ اور اگر مادہ ہوتا تو اس کے کان پھاڑ کر چھوڑ دیتے۔ پھر نہ اس کی اون کاٹتے اور نہ دودھ پیتے نہ اس پر سوار ہوتے۔ اور جو بچہ مردہ پیدا ہوتا تو پھر مرد اور عورتیں سب مل کر کھاتے۔ بحیرہ کی تعیین میں اہل لغت کے دس سے زیادہ اقوال ہیں۔

سائبہ، امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں۔ سائبہ بروزن فاعلہ ہے اور ساب سے بنا ہے جو بسطح آب پر کسی چیز کے رواں ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کہتے ہیں "ساب الماء"، پانی رواں ہوا۔ سابت الحیۃ، سانپ رواں ہوا۔ بس جو جانور اس لیے چھوڑ دیا جاتے کہ جدھر چاہے چلا جاتے وہ سائبہ ہے۔ اور یہ بمعنی مسیبہ ہے رواں شدہ، اسم فاعل بمعنے اسم مفعول جیسا کہ عیشۃ راضیۃ میں راضیۃ بمعنے مرضیہ ہے اور اس کے متعلق علماء نے متعدد صورتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ ابوعبید کا بیان ہے کہ کوئی شخص جب بیمار ہوتا یا سفر سے واپس ہوتا یا کوئی منت مانتا یا کسی نعمت کا شکرانہ ادا کرتا تو اونٹ چھوڑ دیتا جو تمام احکام میں بحیرہ کی طرح ہوتا تھا۔

۲۔ فراء کا قول ہے کہ جب ناقہ دس بچے دے چکتی جو سب کے سب مادہ ہوتے تو اسے چھوڑ دیا جاتا۔ نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کا دودھ دوہا جاتا اور نہ اس کی اون کاٹی جاتی اور نہ بحیرہ یا مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ پیتا تھا۔

۳۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ سائبہ وہ ہے جو بتوں کے لیے لی جاتی یعنی ان کے لیے چھوڑ دی جاتی تھی۔ ایک شخص اپنے مال میں سے جو چاہتا چھوڑ دیتا اور اسے لے کر پجاریوں کے پاس آتا تھا اور وہ مسافروں کو اس کا دودھ پلاتے تھے۔

۴۔ سائبہ وہ غلام ہے جو اس طرح پر آزاد کر دیا جاتا کہ نہ اس پر ولاء ہوگی نہ دیت اور نہ میراث۔ شیخ نورالحق محدث دہلوی تیسیر القاری میں فرماتے ہیں:

ابوعبید گوید سائبہ از ہمہ انعام می باشد کہ نذر بتان کردند می گزاشتند و بعضے میگویند کہ مخصوص بشتر است۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں جہنم میں گھسیٹ رہا ہے یہ پہلا شخص ہے جس نے سوائب یعنی سانڈنیوں کو چھوڑا ہے۔ وصیلہ، وہ نوخیز بکری جو یکے بعد دیگرے مادہ جننے چونکہ دونوں مرتبہ کے گابھن میں مادہ بچہ پیدا ہوتا تھا درمیان میں نر کا فاصلہ نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس کو وصیلہ کہتے تھے نوخیز اونٹنی کو بھی جس کے یکے بعد دیگرے مادہ ہو وصیلہ کہتے تھے۔ امام راغب فرماتے کہ اہل عرب میں رواج تھا کہ بکری پہلے پیٹ میں نر اور دوسرے پیٹ میں مادہ جنتی تو عرب والے کہتے کہ بہن بھائی میں ملاپ ہو گیا اور اس بہن کی وجہ سے اس کے بھائی کو ذبح نہ کرتے تھے اور عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ وہ بکری جس کے سات بچے ہو جاتے تو اگر ساتواں بچہ مادہ ہوتا تو اسے ذبح نہ کرتے اور اسے وصیلہ کہتے اور علامہ منظور افریقی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اونٹنی ہو یا بکری اہل عرب ان کو بتوں کے نام پر بطور سانڈ چھوڑ دیتے اور اس کا دودھ نہ پیتے تھے۔

حامی یہ حمایت سے اسم فاعل ہے جو نانے والا اونٹ، موضح القرآن میں شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پورے ہوتے لائق سواری کے اور بوجھ کے اس باپ کو لادنا موقوف کرتے اور چارے پانی پر سے نہ ہانکتے وہ حامی تھا"۔

پھر ان چاروں الفاظ کی تفسیر میں شارحین قرآن اور اہل لغت کا اختلاف ہے۔ ان سب میں قوی تر اور مضبوط ترین وہ ہے جو امام بخاری نے سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے اور جسے مولانا عثمانی نے نقل کیا ہے۔

آیت کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے تشریع کا حق اللہ سبحانہ کا ہے کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے لیے شارع بن بیٹھے۔ ان کا سنگین جرم یہ ہے کہ وہ انسانوں پر قانون سازی کرکے خدائی قائم کر رہے ہیں اور انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ وہی ہے جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیر اعظم بنا دینے کا ہوتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

> اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا، ان کو فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر دیا۔

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی جڑ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصلی رکاوٹ ہے۔ یہی وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق، اس کی روحانیت کو اس کی

علمی اللہ تخریبی قوتوں کو اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو اس کی سیاست، اور اس کی معیشت کو اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا جاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ فرما کر ان کی اس بیماری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ سب غلط رسمیں ڈال کر اس کو حکم شرعی سمجھتے تھے۔

اور مولانا عثمانی نے بھی اسی کی نشاندہی یہ کہہ کر فرمائی ہے۔

اس سے کہیں بڑھ کر جرم یہ ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء و اہواء سے حلال و حرام تجویز کر لیے جائیں۔

بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اللہ کے حکم کے بغیر تحریم کی مثالیں ہیں۔ یعنی یہ انسانی تحریمات کے پیمانے ہیں۔ ان کا خدائی تحریمات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور طرہ یہ کہ اپنی ان تحریمات کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ صاحب جواہر القرآن نے اپنے افادات میں اس کی نشاندہی کی ہے فرماتے ہیں:

مشرکین جس طرح غیر اللہ کی خوشنودی اور اپنے معبودان باطل کی رضا جوئی کے لیے نذریں مانتے تھے۔ اسی طرح وہ بعض جانوروں کو اپنے معبودوں کی خاطر آزاد چھوڑتے تھے نہ ان کا گوشت کھاتے تھے نہ دودھ پیتے تھے نہ ان پر سواری کرتے نہ بوجھ لادتے۔ یہ تحریمات وہ اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے کرتے۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام تحریمات غیر اللہ میں داخل ہیں۔ مشرکین غیر اللہ کی نیازوں کو حلال سمجھتے تھے۔ اور جن چیزوں کی اپنی طرف سے تحریم کر دی تھی ان کو حرام سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا حکم بیان فرمایا کہ غیر اللہ کی نذریں حرام ہیں۔ ان کو نہ کھاؤ اور بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تحریمات خود ساختہ ہیں اور یہ حلال ہیں۔ ان کو کھاؤ اور اپنی خود ساختہ تحریمات کو اٹھاؤ۔ کیونکہ جو چوپائے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے حلال کیے ہیں وہ حلال ہی رہیں گے اور بندوں کے حرام کرنے سے حرام نہ ہوں گے۔ بعض مفسرین نے بحیرہ، سائبہ وغیرہ کو نذر غیر اللہ میں شمار کر کے حرام قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف یہ حکم دیا ہے لا تحرموا طیبات ما احل اللہ اور دوسری طرف یہ فرمایا کہ ما جعل اللہ من بحیرۃ و لا سائبۃ یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ و سائبہ وغیرہ کی تحریم کا کوئی حکم نہیں دیا اور نہ اس کی اجازت دی ہے اس لیے یہ جانور حلال ہی رہیں گے۔ بندوں کی تحریم سے حرام نہیں ہو سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ بندگی کی حدود میں اللہ کی بندگی صرف ان قوانین کے ذریعے کی جا سکتی ہے جو اللہ نے انبیاء کے ذریعے لوگوں کو بتائی ہیں۔ نہ پرستش کے حدود میں کوئی عبادت اور نہ بندگی کی حدود میں کوئی طاعت اس سے باہر ہو سکتی ہے۔ اس کا کسی کو حق نہیں ہے اور اس کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ صرف

نبوت اس کی بنیاد ہے کہ وہ خدائی قانون بتاتے۔ اگر کوئی شخص تحریم و تحلیل کا پیمانہ خدا کے نام پیش کرتا ہے تو وہ افتراءً علی اللہ کذباً کا سنگین جرم کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود ساختہ تحریم سے نہ تو کوئی چیز حرام ہوتی ہے اور نہ یہ تحریم کا قانون بنانا کسی کے لیے روا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اکثرھم لا یعقلون یعنی ان کی اکثریت کو اس کے افتراء علی اللہ کذباً ہونے کا اور اس عمل کے کفر ہونے کا پتہ نہیں ہے بلکہ ان کی خیالی پلاؤ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ کے قرب کا ایک ذریعہ ہے۔ دین میں ہر موجد کا حال یہ ہی ہوتا ہے۔ ایجاد و اختراع خوش گمانی کی بنیاد پر بے سمجھی کی حالت میں کی جاتی ہے۔

یہاں ایک سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ بحیرہ ہوں یا سائبہ اور وصیلہ ہوں یا حام یہ اور اس قسم کے جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں جن کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اہل ہنود اپنے دیوتاؤں کے یا مردوں کے نام پر داغ لگا کر چھوڑتے ہیں یا مسلمان شیخ سدو یا پیران پیر کا نام لے کر بکرا یا مرغا چھوڑتے ہیں۔ ایسی گائیوں کی اولاد بھی ہو جاتی ہے کیا اس قسم کے جانوروں کو پکڑ کر ذبح کر کے کھا لینا جائز ہے؟ شارحین قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ جانور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں اور یہ کہ اس طرح آزاد کرنے سے یہ جانور ملک غیر سے خارج نہیں ہوتے ہیں اس موضوع پر حضرت مولانا عبدالحی کا فتویٰ یہی ہے باقی رہی آیت ما جعل اللہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کفار مکہ نے جانوروں میں اپنی رائے سے تحلیل و تحریم کر دی تھی۔ کبھی مادہ شتر کو کان شق کر کے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور اس کا دودھ کسی کو نہیں دیتے تھے اور اس کے ذبح کو حرام سمجھتے تھے اور اس کے اکرام میں خوشنودی اصنام تصور کرتے تھے۔ اسی کو بحیرہ کہتے ہیں۔ اور سائبہ اس جانور کو کہتے ہیں جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتے و اس سے کسی قسم کی باربرداری کی محنت نہ لی جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کا ان سے ابطال کر دیا اور ما جعل اللہ من بحیرۃ فرمایا۔ بس آیت سے ان کے احکام کا بطلان ثابت ہوتا ہے نہ کہ ان جانوروں کا ذبح کرنا ہرگاہ یہ امر ممہد ہوا بس سمجھنا چاہیے کہ جو جانور لنگا پر چڑھاتے جاتے ہیں یا بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے ہیں ان کو پکڑ کر ذبح کرنا نہ اس وجہ سے حرام ہے کہ وہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہیں اور نہ اس وجہ سے حرام ہیں کہ بحیرہ اور سائبہ کا ذبح کرنا حرام ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جانور اس آزادی سے ملک مالک سے خارج نہیں ہوتے ہیں لہٰذا بغیر مالک کی اجازت کے ان کا حکم مسروق و مغصوب کا ہے۔ اگر مالک اجازت دے دے یا اباحت عامہ کر دے تو اس وقت ان کو بسم اللہ کہہ کر ذبح کرنا اور ان کو کھانا درست ہوگا

اور جانور کو آزاد کرنے والے کی حرکت قبیحہ اور نیت شنیعہ سے حکم حرمت نہ ہوگا۔ در مختار میں ہے۔ شکار میں مختار یہی ہے کہ کسی کی ملک کا مالک نہ ہوگا جب تک کہ مالک اس کو مباح نہ کرے اور ایسے ہی وہ جانور جسے مالک نے سائبہ بنا دیا ہو، الشرنبلالی نے اسے تفصیل سے لکھا ہے اور زیلعی نے شرح کنز میں لکھا ہے :

اگر جانور آزاد چھوڑ دیا گیا ہے تو وہ ملک غیر ہے اسے بغیر مالک کی اجازت کے پکڑنا جائز نہیں ہے۔

اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نے بھی اسی قسم کا فتویٰ دیا ہے کہ جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں اور ان کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے وہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں۔ ان کو سائبہ کہتے ہیں۔ اور ان کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے کہ وہ مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتا۔ اگر مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دے دے تو وہ حلال ہیں اور ایسی گایوں کی اولاد بھی مالک کی ہوتی ہے۔ پس ان گایوں کا اور ان کی اولاد کو بلا اجازت مالک کے کھانا حلال نہیں ہے۔

اسی بنا پر السیوطی نے لکھا ہے کہ یہ آیت جیسے ان کاموں کی حرمت بتا رہی ہے یہ بھی بتا رہی ہے کہ منافع کو کلی طور پر معطل کر دینا ناجائز ہے۔

بے علموں اور بے عقلوں کی تقلید

۱۹۹۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا یہ لوگ باپ دادا کی تقلید ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے علم ہوں اور بے ہدایت ہوں۔ جاہلوں کی سب سے بڑی حجت یہ ہوتی ہے کہ جو کام باپ دادا سے ہوتا آیا ہے اس کے خلاف کیسے کریں۔ ان کو بتلایا گیا کہ اگر تمہارے اسلاف بے عقلی یا بے راہی سے قعرِ ہلاکت میں جا گرے ہوں تو کیا پھر بھی تم ان ہی کی راہ پر چلو گے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ باپ کا حال معلوم ہو کہ حق کا تابع اور صاحبِ علم تھا تو اس کی راہ پکڑنے نہیں عبث ہے یعنی کیف ما اتفق ہر کسی کی کورانہ تقلید جائز نہیں ہے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عام شارحین قرآن نے اس آیت کا لب لباب جو کچھ بتایا ہے یہ ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں والحاصل ان الاقتداء لایجوز الا بالعلماء المهتدين یعنی تقلید تو صرف اہل علم اور ہدایت یافتہ لوگوں کی جائز ہے۔ اور امام رازی فرماتے ہیں الاقتداء بالعالم المهتدی وانما یكون عالما مهتديا اذا بنى قوله على الحجة والدليل ۔ یعنی تقلید تو صرف ان لوگوں کی کرنی چاہیے جو وہ عالم ہوں اور ہدایت یافتہ ہوں اور ان کی ہر بات دلیل و حجت پر مبنی تلی ہو۔ اور علامہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں والمعنى ان الاقتداء انما يصح بالعالم المهتدى تقلید تو صرف اہل علم اور اہل ہدایت کی درست ہے۔ مفسر قرآن جناب نواب صدیق حسن خاں فتح البیان میں لکھتے ہیں والمعنى انما يصح الاقتداء بالعالم المهتدى الذى يبنى قوله على الحجة والبرهان مطلب یہ ہے کہ تقلید تو صرف اس ہدایت یافتہ عالم کی ہونی چاہیے۔ جس کی بات دلیل پر مبنی ہو۔ اسی طرف حدیث ذیل میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے :

"اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے یکبارگی نہیں نکالے گا بلکہ علماء کو ایک ایک کر کے اٹھائے گا۔ یہاں تک جب کوئی صحیح عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنا لیں گے وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے" (بخاری)

ظاہر ہے کہ یہاں اصل زور اس طرز عمل پر ہے کہ لوگوں کی قیادت بے علموں نادانوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور بے علم لوگ علمی سہارے کے بغیر لوگوں کو فتویٰ دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے۔ اگر تقلید جائز نہ ہوتی تو ارشاد نبوت میں افتوا بغیر علم نہ ہوتا۔ قرآن اور نبوت کے نزدیک قابل اعتراض بات تقلید نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے کہ وہ بے علموں کی تقلید کرتے ہیں یعنی اگر وہ اہل علم کی تقلید کرتے اور اہل علم علم کے ذریعے ان کو مسائل بتاتے تو پھر نہ قرآن کو ان پر کوئی اعتراض ہوتا اور نہ نبوت ان پر گمراہ کرنے کا فتویٰ لگاتی۔ الغرض سارے ہی شارحین قرآن نے اس آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ اگر ان کے آباؤ اجداد میں علم کی روشنی یا نور ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں کورانہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے علمی کی تقلید کی جائے اور یہ پیچھے معلوم کر آئے ہو کہ قرآن کی نظر میں دلیل نام ہے اصول استناد اور اصول اجتہاد کے سہارے بات کہنے کا۔ یعنی اللہ کی کتاب اللہ کے رسول کی سنت اجماع اور قیاس کے ذریعے بات بتلانے کا۔

اجتہاد کے ساتھ تقلید ضروری ہے

اصول استناد اور اصول اجتہاد پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے اور یہ سن چکے ہو کہ اسلامی نظام کی گاڑی ان

دو مہینوں سے چلتی ہے اور یہی ۔ ۔ کمال کی نشانی ہے۔ اگر اجتہاد حجت شرعیہ ہے تو ظاہر ہے کہ غیر مجتہد کے لیے بجز اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے۔ جو خود ان مخفی علل اور دلائل تک نہیں پہنچ سکتا تو دانایان اسرار و علل کے سامنے جھک جائے کیونکہ بقول حضرت مولانا اسماعیل شہید حصول علم کی دو ہی راہیں ہیں۔ تحقیق اور تقلید یعنی خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی دو مرتبے بلا کسی واسطے کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ روز قیامت اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ　　خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل کی سنی

قالوا لوکنا نسمع او نعقل ماکنا فی اصحاب السعیر۔

کہیں گے اے کاش اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

یہی ذریعہ جمع جماعت　　جو علم والے کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق عمل میں لاتا ہے تقلید کہلاتا ہے۔ یہ فی نفسہ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام لوگ غیر اہل اجتہاد کے حق میں اہل اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو خود اجتہاد کا اسلامی نظام میں ہونا ہی بے کار ہو کر رہ جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے کوئی معنے نہ رہیں گے۔

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

اگر تم بے علم ہو تو علم والوں سے سوال کرلو

لہٰذا اگر اجتہاد شرعی حجت ہے اور غیر مجتہد قرآن کے بیان کے مطابق دنیا میں موجود ہیں تو غیر مجتہد کے لیے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔ اس لیے حضور کا ارشاد ہے

جس شخص نے بغیر تحقیق کے کوئی فتویٰ دیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا

(ابوداؤد)

ظاہر ہے کہ اگر تقلید جائز نہ ہوتی اور کسی کے فتوے پر دلیل جانے بغیر عمل جائز نہ ہوتا تو گنہ گار ہونے میں مفتی کی تخصیص نہ ہوتی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح پوچھنے والے کو بلا دلیل ماننے اور عمل کرنے پر گناہ ہوتا۔ حضور انور کا پوچھنے والے کو گنہ گار قرار نہ دینا جواز تقلید کی نشاندہی کر رہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر دلیل کے مسئلہ پوچھنے والے کو گنہ گار نہیں فرما رہے ہیں تو پھر کون ہے جو کسی مسئلہ دریافت کرنے والے کو غلط رو قرار دے یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟

صحابہ میں تقلید کا رواج

صحابہ کرام میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید بھی رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد کے فتویٰ پر دلیل دریافت کیے بغیر محض اس حسن ظن کی بنا پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب دین کے مسائل پر بحث ہوگی تو سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں صحابہ کی کیا رائے تھی اور ان کی رائے کے بالمقابل دوسری سب آراء اسی طرح ٹھکرا دینے کے قابل ہوں گی۔ جس طرح ہائی کورٹ کے نظائر کے مقابلے میں دوسری عدالتوں کے فیصلے ٹھکرا دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں وہ دین کا ہائی کورٹ تھے اور ان سے زیادہ صحیح مراد حاصل کرنا عقلاً تو ممکن ہے مگر واقعات کے دائرے میں ممکن نہیں ہے۔

آئیے ہم اس موضوع پر ان بزرگوں کا طرز عمل دیکھیں۔

موطا امام مالک میں ہے حضرت سالم فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے پر کچھ دین میعادی واجب ہے اور صاحب حق اس میں سے اس شرط پر کچھ معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا۔

اس مسئلہ میں چونکہ اصول استناد میں کوئی آیت قرآنی اور کوئی حدیث نبوی منقول نہیں ہے اس لیے ابن عمر کا اصول اجتہاد میں سے قیاس کا سہارا ہے اور چونکہ پوچھنے والے نے ابن عمر سے دلیل نہیں پوچھی ہے اس لیے اس کا قبول کرنا تقلید ہے کیونکہ تقلید نام ہے کسی بات کو بلا دلیل مان لینے کا۔ اور پھر ابن عمر کا سائل کے سامنے دلیل پیش نہ کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ خود ابن عمر جواز تقلید کے قائل ہیں۔

اسی طرح موطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کر دے۔ حضرت عمر نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا کہ باربرداری کا کرایہ کہاں گیا؟

چونکہ اس موضوع پر کوئی صریح ارشاد نبوت نہ تھا۔ اس لیے حضرت عمر نے اصول اجتہاد میں سے قیاس سے کام لیا اور چونکہ سائل نے جواب کا ماخذ دریافت کیے بغیر حضرت عمر کی بات مان لی یہی تقلید ہے۔ لہذا تقلید کا جواز حضرت عمر کے فعل سے بھی ثابت ہوگیا۔ اسی طرح بروایت مالک بن انس

ثابت ہے کہ:

حضرت ابوایوب انصاری حج کے لیے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہو گئیں اور حج کا وقت نکلنے کے بعد پہنچے۔ حضرت عمرؓ سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ افعال عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے۔ چنانچہ ابوایوب انصاری نے صرف حضرت عمرؓ سے حکم سُنا اور دلیل کی تحقیق نہ کی۔ یہی تقلید ہے۔

یہی صورت حال زمانہ تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ان ادوار میں جن کو خیر القرون کہا جاتا ہے اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد و اشخاص الگ الگ تھے یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کے لیے اجتہاد جائز نہیں ہے تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس و ناکس کے لیے تقلید کے سوا چارہ کار بھی نہیں ہے۔

اجتہاد و تقلید کے حدود

اسلام کی یہ شان کمال ہے کہ اس نے اُمت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتا ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد یہی اس کی جامعیت اور عدل و اعتدال کا تقاضا بھی ہے ورنہ جیسے اجتہاد بلا تقلید افراط ہے ایسے تقلید بلا اجتہاد تفریط ہے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں ہوں۔ پھر ساتھ ہی اسلام تقلید و اجتہاد کا ایک نظم بھی چاہتا ہے۔ کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مقتدی ہو کر اپنے دین کی حفاظت کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام چونکہ کمال اعتدال اور شان جامعیت رکھتا ہے۔ اسی لیے یہ اُمت بھی قرآن کی زبان میں اُمت وسط ہے اس لیے منشأ قانون یہ ہے کہ اُمت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور اجتماعیت ہر پہلو میں نظم رکھتی ہو۔ خواہ نظام سیاسی ہو یا غیر سیاسی۔ نظم اس طرح ہو کہ نہ اس میں تشتت و پراگندگی ہو جو بدنظمی ہے اور نہ جمود و استبداد ہو جو اجتماعیت اور جمہوریت کے منافی ہے اس لیے اس نے اُمت کے ہر نظام میں یہی معتدل صورت قائم رکھی ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

مثلاً اسلام کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تا کہ اُمت میں وہ فوضویت (انارکی) اور

لام کزیت نہ آنے پائے جو پراگندگی اور بدنظمی کی رُوح ہے اس سے حکومت میں امیر کی بالادستی قائم ہوتی۔ دوسری طرف امیر کے لیے شوریٰ لازم قرار دیا تاکہ امیر میں ڈکٹیٹرشپ اور استبدادیت کی راہ نہ پا سکے۔ اور اُمت کے اجتماعی فکر و تدبیر کی صلاحیتیں معطل ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس صورت میں اُمت میں جمہوریت باقی رہے۔ لہٰذا اسلام کے سیاسی نظام میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لام کزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بیکار کر دے اور عوام ہی اس پر حکومت کرنے لگیں۔ امیر کی شخصیت سے تو اُمت میں طوائف الملوکی اور پراگندگی کا خاتمہ کیا اور اُمت کی شورائی تشکیل سے امیر کے استبداد کی روک تھام کر دی۔ اس طرح امارت اور جمہوریت کو مفاہمت کے ذریعے ایک معتدل درجہ کے ساتھ اسلام کے سیاسی نظام میں شامل کر دیا۔ یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کر لیے گئے یہی کمالِ اعتدال ہے۔

اسلام کا قانونی نظام

ٹھیک اسی طرح اسلام کے قانونی نظام میں اسلام نے اصُولِ استناد میں تصریح نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام فکر کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا کہ اُمت کا ہر شخص مدعی اجتہاد ہو اور اصُولِ استناد میں ہر کہ و مہ کے قیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس اُمت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کی فکری و اجتہادی قوتیں معطل ہو کر جمود کا شکار ہو جائیں بلکہ ایک طرف تو قانون سازی میں اصُولِ استناد کے ساتھ اصُولِ اجتہاد کو باقی رکھا تاکہ اُمت کے قوائے فکر و تدبر ترقی پذیر دُنیا کا مقابلہ کر سکیں، اور دوسری طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عامی اور ناواقف آدمی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے نظام قانون کو آراء و قیاسات کا مجموعہ نہ بنا دے اور اس طرح خود قانون میں تشتت و پراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں۔ گویا اُمت کے قانونی تشتت کو تقلیدی سمع و طاعت سے رفع کر دیا، اور تقلیدی جمود کو شانِ اجتہاد و تحقیق سے رفع کر دیا۔ اور اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے اُمت کے لیے شاہراہِ اعتدال قائم کر دی جس میں نافع پہلو سب موجود ہیں چنانچہ اُمت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے۔ اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اُسوہ سلف کی مقلد بھی ہے۔ غرض اس درجہ اعتدال ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شانِ تحقیق نمایاں ہے اس لیے نہ تو تقلید کو ایک قانون بنا کر اس سے جنس اجتہاد کی تردید ہو سکتی ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر رد و انکار کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے۔

اختلافی مسائل میں تقلید شخصی

یہیں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی ناگزیر ہے۔ کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں کبھی دائر نہیں ہو سکتا نہ اعتقاداً اور نہ عملاً، ایک ہی وقت میں آپ ناسخ و منسوخ، راجح و مرجوح اولیٰ و غیر اولیٰ، حقیقت و مجاز، مشترک و مؤول واجب و مکروہ اور فرض و حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے کر سکتے ہیں۔ چار و ناچار آپ کو ایک پہلو کو ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو غیر مجتہد ہونے کی حالت میں اختلافی مسائل میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنی پڑے گی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک مسئلہ میں سب کی نہیں ایک ہی کی بات مانیں گے تو امام ایک ہوا اور تقلید بھی ایک ہی کی ہوئی۔ یہ تو نہیں ہوا کہ اسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعددہ ہو گئیں، امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واضح ہوئی وہ شخصی رہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عملاً کوئی چارہ کار ہی نہیں خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کر لیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کون سی مذموم ہے اور کون سی محمود۔ مگر اختلافی مسائل میں کوئی نوعیت لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لیے اور تحقیق شخصی کے سوا مجتہد کے لیے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ آدمی عقلاً بیک وقت دو مختلف سمتوں میں نہیں چل سکتا۔ اور پھر دین میں شرعاً تناقض ممکن نہیں ہے جو بھی کوئی جانب اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے علماً اس کی ایک طرف بڑھے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب اختیار کر رہا ہے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک پر عمل کرتے ہوئے دوسری پر بھی عمل کرے۔[1]

بہر حال یہ حقیقت تو بے نقاب ہو کر سامنے آگئی کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہو اس میں جانکار کی تقلید ضرور کرنی چاہیے اس لیے کہ مطلق تقلید کو تمام محققین اہل حدیث بھی واجب جانتے ہیں بلکہ اکثر اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے بھی قائل نہیں۔ اختلاف صرف تقلید شخصی میں ہے یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ میں کرنا یہ علماء مذاہب اربعہ کے نزدیک واجب ہے کیونکہ مطلق تقلید

---

۱ من افادات الشیخ القاری محمد طیب زادت معالیہ

جس کی فرضیت قرآن کی آیت، فاسئلوا اھل الذکر سے فریقین کے نزدیک مسلم ہے۔ اس کے دو فرد تقلید شخصی اور غیر شخصی اس لیے جائز ہے کہ اس مطلق فرض کو اس کے جس فرد میں چاہیں ادا کریں۔ تقلید غیر شخصی کر کے بھی اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکیں جیسے تقلید شخصی کر کے بری ہوتے ہیں۔ کیونکہ مامور بہ جب مطلق ہوتا ہے تو لا علی التعیین اس کے کسی فرد کو ادا کر دینے سے مامور بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ مامور بنص قرآن مطلق تقلید ہے اور اس کے دو فرد ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں دونوں فرد پر عمل ہوتا رہا۔ کوئی تقلید شخصی کرتا تھا اور کوئی غیر شخصی۔ تقلید شخصی کرنے والے غیر شخصی تقلید کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرتے تھے اور علی ہذا تقلید غیر شخصی کرنے والے شخصی کرنے والوں کو باطل پر نہ کہتے تھے۔ الغرض دونوں قسم کی تقلید زمانہ صحابہ و تابعین میں ہوتی رہی لیکن جب دوسری صدی کے آخر میں دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین بکثرت پیدا ہو گئے بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کی حرمت جواز میں یا کراہت و استحباب میں اختلاف نہ ہو۔ ادھر لوگوں میں ہوا و ہوس کا غلبہ اس قدر ہو گیا کہ وہ رخصتوں کو تلاش کرنے لگے۔ اندیشہ ہو گیا کہ اللہ کا دین لوگوں کی خواہشات کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ حالات کی سنگینی کا احساس علامہ شاطبی کی تصریح کے مطابق عدم تقلید کے بہت بڑے علمبردار حافظ ابن حزم کو بھی ہوا اور انہوں نے بھی اس پر اجماع نقل کیا کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔ اسی لیے دور اندیش علما نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ لوگوں کو تقلید غیر شخصی سے روکا جائے اور سب کو تقلید شخصی پر جمع کر دیا جائے۔ اس پر اجماع منعقد ہو گیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جن کی جلالت قدر کا اہل حدیث کو بھی اعتراف ہے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں :

> من جملہ ان کے ایک بڑا مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے اس امت کے وہ تمام علما جن کی حیثیت استدلالی ہے اس پر متفق ہیں۔ یہ چار مذہب جو آج کل اسلامی دنیا میں مروج ہیں اور ہر ایک مذہب کے مسائل و احکام مدون صورت میں موجود ہیں۔ ان کی تقلید کرنا جائز ہے۔ اس تقلید میں کئی ایک مصالح ہیں خصوصاً آجکل کے زمانے میں جبکہ ہمتیں پست ہو گئی ہیں۔ لوگوں پر ہوائے نفسانی کا بھوت مسلط ہے اور ہر ایک اپنی ہی سمجھ اور اپنی ہی رائے پر نازاں ہے ۔

اور عقد الجید میں فرماتے ہیں :

> جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے

اور ان سے روگردانی میں بڑا فساد ہے۔

اور الانصاف میں فرماتے ہیں:

دوسری صدی کے بعد لوگوں میں خاص خاص ائمہ کے مذہب کی پابندی یعنی تقلید شخصی شروع ہوئی اور اس زمانے میں بھی واجب تھی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس پر اجماعِ اُمت کا دعویٰ کیا ہے کہ اپنی خواہش نفسانی کے مطابق سمجھ کر بغرضِ اتباعِ ہوائے کسی حدیث یا کسی امام کے مذہب کو اختیار کرنا حرام ہے۔

ہم نے یہاں اس بحث کو طول اس لیے دیا ہے کہ حافظ ابن حزم ظاہری اور زیدی علماء نے اسی آیت کو تقلید کے عدم جواز کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے اور عام منکرین تقلید قرآن کی اس آیت سے ہی استدلال کرتے ہیں ائمہ اربعہ کسی ایک کی تقلید کی حد تک حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حافظ ابن حزم کے اس استدلال کا حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلی جواب دیا ہے۔ ایک جگہ تقلید شخصی کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حزم کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

سائل کا سوال کرنا اور مجتہد کا جواب دینا زمانہ نبوت سے مسلمانوں میں چلا آرہا ہے اور اس سے اصل مسئلہ ہرگز متاثر نہیں ہوسکتا کہ ہمیشہ ایک ہی سے مسئلہ دریافت کیا جائے یا کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے، جبکہ نفس تقلید پر سب کا اجماع ہے جیسا کہ ہم بتا چکے اور اجماع آخر کیسے نہ ہو جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا کسی بھی فقیہہ و مجتہد کے بارے میں یہ گمان نہیں ہے کہ اس کے پاس فقہ کی وحی آتی ہے اور اس کی طاعت فرض ہے اور وہ معصوم ہے اگر ہم ان میں سے کسی ایک کی تقلید کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسُول کی سنت سے واقف ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

بہرحال آیت کا مدلول یہ ہے کہ چونکہ ان کے باپ دادے بے علم اور بے ہدایت تھے اس لیے قرآن کے نزدیک ان کا یہ کہنا حسبنا ما وجدنا علیہ آباءنا لغو اور عذر لنگ ہے۔ اگر ان کے باپ دادے عالم اور ہدایت یافتہ ہوتے تو پھر قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

اے اہلِ ایمان! تم پر تمہاری ذمہ داری ہے اگر تم سیدھے راستہ پر گامزن ہو تو کسی کا گمراہ ہونا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا[200] یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے وہی تم کو ان کاموں کے بارے میں بتائے گا جو تم کرتے تھے۔[201]

فرد و جماعت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر

اسلام ایسے تجریدی فرد کا تصور نہیں کر سکتا جو اجتماعی زندگی سے قطعاً بے نیاز ہو۔ فرد کی امتحان گاہ جس میں اسے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے وہ اس کی اجتماعی زندگی ہی ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اسے بتایا گیا ہے کہ اس کے وہ اعمال جو وہ خالصۃً اللہ کے لیے اور آخرت کی کامیابی کے لیے کرتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں اجتماعی نوعیت کے ہوتے ہیں، اسے حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں رکھ کر پھر اس سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اپنی قوتوں کو اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق بروئے کار لائے۔ اسلام اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا کہ انسان کی زندگی میں ان تعلقات کا اثر انداز ہونا لازمی ہے جو وہ سوسائٹی کے دوسرے افراد سے ساتھ رکھتا ہے۔ ان تعلقات کی گوناگونی ان کی وسعت اور ان کی معنوی تنظیم سے شعور کی گہرائیوں پر اثر پڑتا ہے اور انسان کی تخلیقی استعدادوں میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ اسلام فرد اور جماعت کے ظاہری تضاد کو بڑی خوبی سے دور کرتا ہے۔

انفرادیت کے پاسبان کی حیثیت سے وہ انسان کو انتہائی حریت ضمیر کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ اس کے بغیر فرد کی تکمیل ذات ممکن نہیں ہے مگر اس کا نقطہ نظر ان نظامات سے مختلف ہے جو جماعت سے قطع نظر کر کے فرد کو مجرد فرد ہونے کی حیثیت میں لیتے ہیں۔ اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اس کو روحانی ارتقائے مدارج طے کرانا چاہتے ہیں۔ وہ اس معاملہ میں ان لوگوں سے بھی اختلاف کرتا ہے جو فرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بلا کسی روک ٹوک پورے سماج کو اپنے ذاتی منافع پر قربان کر دے۔ اس کے برعکس وہ اس نظام حیات کو بھی قبول نہیں کرتا جس میں فرد کی زندگی بحیثیت فرد بے مقصد بنا دی گئی اور اسے صرف اس صورت میں بامعنے تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ وہ اجتماعی مقصد کے لیے وقف ہو۔ ان تینوں نقطہ ہائے نظر سے الگ قرآن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کے لیے جوابدہ ہے اس لیے ہر فرد کو فرداً فرداً خدا کے امتحان میں کامیابی کے لیے تیار رہنا چاہیے مگر چونکہ خدا کے سامنے اس کی جوابدہی بڑی حد تک اجتماعی حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے اور آخری امتحان میں اس کی کامیابی بھی بہت حد تک اجتماعی صلاح و فلاح ہی پر منحصر ہے۔ نیز اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک حتی الامکان فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین میں اور اس کی مخلوق پر جاری کرنے کا وہ فریضہ انجام نہ دے جو شہداء علی الناس ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی تیاری محض ذاتی اصلاح کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اجتماعی تقاضوں کو بھی پورا کرے جو مومن سوسائٹی ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہ طرز فکر اختیار کر کے انفرادی حریت اور اجتماعی گرفت کے ظاہری تضاد میں جو درحقیقت تضاد نہیں ہے ایک معنوی وحدت پیدا کر دی۔

۲۰۰۔ اے اہل ایمان، تم پر تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر تم سیدھے راستہ پر گامزن ہو تو کسی کا گمراہ ہونا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی اگر کفار رسوم شرکیہ اور آباؤ اجداد کی تقلید سے باوجود اس قدر فہمائش و نصیحت کے باز نہیں آتے تو تم زیادہ اس غم میں نہ پڑو کسی کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوتا بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ سیدھی راہ یہ ہے کہ آدمی ایمان و تقویٰ اختیار کرے۔ خود برائی سے رکے اور دوسروں کو روکنے کی کوشش کرے۔ پھر بھی اگر لوگ برائی سے نہ رکیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اس آیت سے یہ سمجھ لینا کہ جب ایک شخص اپنا نماز روزہ ٹھیک کرے تو امر بالمعروف چھوڑ دینے سے اسے کوئی مضرت نہیں ہوتی سخت غلطی ہے۔ لفظ اہتداء امر بالمعروف وغیرہ تمام وظائف ہدایت کو شامل ہے۔ اس آیت میں گو روئے سخن بظاہر مسلمانوں کی طرف ہے لیکن ان کفار کو بھی متنبہ کرنا ہے

جو باپ دادا کی کورانہ تقلید پر اڑے ہوئے ہیں۔ یعنی اگر تمہارے باپ دادا راہِ حق سے بھٹک گئے تو ان کی تقلید میں اپنے کو جان بوجھ کر کیوں ہلاک کرتے ہو۔ انہیں چھوڑ کر تم اپنی عاقبت کی فکر کرو اور نفع و نقصان کو سمجھو۔ باپ دادا اگر گمراہ ہوں اور اولاد ان کے خلاف راہِ حق پر چلنے لگے تو آباؤ اجداد کی یہ مخالفت اولاد کو قطعاً مضر نہیں۔ یہ خیالات محض جہالت کے ہیں کہ کسی حال میں بھی آدمی باپ دادا کے طریقہ سے باہر قدم نہ رکھے، رکھے گا تو ناک کٹ جائے گی عقل مند کو چاہیے کہ انجام کا خیال کرے[1]

اصل ارشاد میں علیکم انفسکم آیا ہے۔ علیکم اسمائے افعال میں سے ہے اور انفسکم اس کا مفعول بہ ہے۔ شارحین نے یہاں علیکم کے معنے لازم پکڑ لو چمٹ جاؤ لکھے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سے چمٹ جاؤ اور اپنی فکر کرو۔ اللہ نے جن فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے اس کی فکر کرو۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خطاب فرد فرد سے ہے لیکن یہ درست نہیں بلکہ خطاب اہلِ ایمان کی جماعت سے ہے اور منشا یہ ہے کہ من حیث الجماعت تم اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی فکر کرو۔ یہ نہ سوچو کہ اس کے نتائج کیا ہیں اور لوگ کیا کہہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ اگر لوگ گمراہ ہو جائیں تو تم سے یہ دریافت نہ کیا جائے گا کہ وہ کیوں گمراہ ہوئے تم سے تو تمہارے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کسی کی گمراہی تمہارے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتی کہ تم کہو کہ آوہ کا آوہ خراب ہے ہم اکیلے کیا کریں۔ تم پر اپنی ذمہ داری ہے دوسروں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر ساری دُنیا بھی گمراہ ہو جائے پھر بھی تمہیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔

اُمت کی مخصوص ذمہ داری

قرآن نے اہلِ ایمان کی ذمہ داری یہ بتائی ہے لتکونوا شھداء علی الناس تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے فرضِ شہادت ادا کرو۔

اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی عملی صورت یہ ہے کہ:

۱۔ اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام اللہ کا رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے یہی کام اس کے پیروؤں کے ذمے ہو گیا ہے اور اب یہ لوگ اس وقت تک اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس سرزمین پر موجود ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

۲- اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ نہیں ہے بلکہ ایسی تبلیغ واشاعت ہے جسے شہادت کہہ سکیں۔

۳- اسلام کی شہادت دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے۔ یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان اپنے بس تک ٹھیک اسی طرح کریں گے جس طرح کہ آنحضرت نے خود ان تک اس کے پہنچانے کا کام کیا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو یہ امت اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس طرح عملی نمونہ اس کا رسول اس کے سامنے رکھ گیا۔ دراصل اس معاملہ میں صورت واقعہ ہی یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی صورت اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے اور فطری طور پر یہی ممکن بھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قائمقام ایک ایسا گروہ تیار ہو جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ ہو اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلم ہو کہ وہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح فرض شہادت انجام دے سکے۔ قرآن کی یہ آیات غور سے پڑھیے۔

والذی اوحینا الیک من الکتاب ھو الحق مصدقاً لما بین یدیہ ان اللہ بعبادہ لخبیر بصیر ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔

اور وہ جو ہم نے کتاب کی تمہاری طرف وحی کی یعنی قرآن وہی حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اپنے سے اگلی کتابوں کی۔ بے شک اللہ اپنے بندوں سے خبردار دیکھنے والا ہے پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنادیا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ یعنی پیغمبر کے بعد اس قرآن کا وارث اس امت کو بنایا جو بحیثیت مجموعی تمام امتوں سے بہتر اور برتر ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

کذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً

اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں نیک ترین امت ہونے کا درجہ عطا کیا

تاکہ تم انسانوں کے روبرو حق کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور رسول تمہارے روبرو حق کی گواہی دینے والا ہو جائے۔

ایک اور مقام پر ہے

وجاھدوا فی اللہ حق جھادہٖ ھو اجتباکم و ماجعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل و فی ھذا لیکون الرسول شھیدا علیکم و تکونوا شھداء علی الناس۔

اور اللہ کی راہ میں جان لڑادو اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے۔ اس نے تمہیں برگزیدگی کے لیے چن لیا۔ تمہارے لیے دین میں کسی طرح تنگی نہیں رکھی۔ وہ ہی طریقہ تمہارا ہو جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا۔ پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی اور یہ اس لیے کیا تاکہ رسول تمہارے لیے حق کا گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے حق کے گواہ ہو جاؤ۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے،

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر

مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کی ارشاد و صلاح کے لیے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہو۔

ان آیات میں امت کی ذمہ داریوں کا واشگاف اعلان ہوا ہے کہ یہ امت اس کتاب کی جو محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں وارث ہے۔ اس کا کام نبی کی طرح لوگوں کے سامنے شہادت حق کا فرض انجام دینا ہے۔ اس فرض کی پاسبانی کے لیے اسے جان لڑا دینے کا حکم ہوا ہے۔ دنیا میں انسانوں کے منافع اس سے وابستہ ہیں اس کا کام نیکی کا حکم دینا اور برائی کو روکنا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کی وجہ سے اس امت کو ان القاب سے نوازا گیا ہے کہ یہ امت مصطفیٰ ہے، امت وسطاً ہے، یہ امت مجتبیٰ ہے اور یہ امت خیر امت ہے۔ افسوس لوگوں نے القاب یاد کر لیے ہیں لیکن وہ ذمہ داریاں بھول گئے جن کی بنا پر یہ القاب بارگاہِ الٰہی سے ملے تھے۔ قرآن علیکم انفسکم کہہ کر امت کو بھی اجتماعی ذمہ داری یاد کرا رہا ہے۔ یہی بات اس آیت سے حضرت صدیق اکبر نے سمجھی ہے۔ فرمایا کہ لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنے دھوکے میں نہ ڈال دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر ظالم کو لوگ ظلم کرتے دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب

عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔ ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہ سے اس آیت کے معنے دریافت کیے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنے دریافت کیے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دُنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو۔ کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ میں پکڑنے کے مترادف ہو گا۔

دراصل شہادت کی ذمہ داری دو طرح کی ہے ایک خارجی دوسرے داخلی۔ خارجی تو یہی ہے کہ اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام کیا جائے اور داخلی کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے کے اندر جو برائیاں سر اٹھاتی نظر آئیں ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے اور انہیں پھلنے اور پھولنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ اندر کی برائیاں شہادت اسلام کی راہ میں بڑی خطرناک بلکہ سب سے خطرناک رکاوٹ ہوتی ہیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت ابو ثعلبہ اسی کی نشاندہی فرما رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ جماعت کے افراد پر دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دُنیا کے مذاہب میں اسلام کے اخلاق کی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور اہل ایمان کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوم کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ تورات میں ہابیل کا یہ فقرہ کہ

کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں۔

عیسائی مذہب کے لیے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی کی بحالی ہے لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا۔ آیت میں انفسکم کی تعبیر اس کی غمازی کر رہی ہے۔ قرآن حکیم میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

اس آیت نے اخلاق کے تورات والے غلط اصول کو منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک

اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہ رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسوم و آداب اسی اصول پر قائم ہیں۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اخلاقی امور میں ہر شخص کی پرائیویٹ اور نجی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلنے لگتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاق فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ اسی موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے،

مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اس کو اپنی امت میں ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کیے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے۔ پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا یہ حال ہوا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کا حکم نہ ہوتا۔ بس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں ہوتا۔ (صحیح مسلم)

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں کی ہر شکل جہاد ہے۔ کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے اور اسلام کی شہادت حق انجام پاتے رہنے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے اور حق کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام جہاد ہے۔

برائیوں کو مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد کہا گیا ہے ٹھیک ان ہی کو بعض احادیث میں "تغییر منکر" بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً

تم میں سے جس شخص کو کوئی برائی نظر آئے تو چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اس کے لیے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس کی بھی جرأت نہ ہو تو یہ کوشش اپنے دل سے کرے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔ (مسلم)

پھر ان ہی کوششوں کو نہی عن المنکر بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً

نیکی کی ایک دوسرے کو تلقین کرو اور برائی سے ایک دوسرے کو روکو۔ (سنن ترمذی)

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ مسلم معاشرے کے برے افراد سے جہاد کرنا ان کی برائیوں اور ضلالتوں کو بدل ڈالنا اور انہیں برائیوں سے روکنا یہ سب دراصل ایک ہی مدعا کے بیان کرنے والے مختلف الفاظ ہیں اور ہم ان میں سے جس لفظ یا اصطلاح کو بھی لیں۔ منشاء مقصد میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

پھر ایک بات قرآن کی اس آیت اور ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ جہاد امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس فریضہ سے نہ تو افراد بری الذمہ ہیں نہ اسٹیٹ۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں جس کی قرآن نے علیکم انفسکم کے ذریعہ ہدایت کی ہے سبھی شریک ہیں مزید دلیل اور وضاحت کی ضرورت ہو تو قرآن عزیز کی یہ آیات تلاوت فرمایئے۔ افراد کے بارے میں ہے:

والمومنون والمومنات بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر۔

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں وہ باہم نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا مسلمان کی ایمانی صفت کا تقاضا ہے بلکہ یہ ایمان کی فطرت ہے یہ اسلام کا خاصہ ہے جہاں مومن ہوگا یہ کام بھی وہاں ضرور کیا جارہا ہوگا اور جو مسلمان ہوگا وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

اسلامی حکومت کے متعلق حکم ہوتا ہے

الذين ان مكناهم في الارض اقاموا الصلوٰة واٰتوا الزكوٰة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنكر

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں گے تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس طرح اپنی عام اور انفرادی حیثیت میں برائی کو پنپتے دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح صاحب اقتدار ہوکر بھی وہ یہی کرے گا اور منکرات کو مٹانا اس کے اقتدار کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں شامل ہوگا۔

اسی روشنی میں علیکم انفسکم کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانو! تم اپنی فکر کرو اور جو فرائض اور ذمہ داریاں

تمہارے سپرد کی گئی ہیں ان کو ادا کرو۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں ملک نے کیوں نہیں مانا بلکہ یہ دریافت کیا جائے گا کہ تم نے اپنے فرائض ادا کیے یا نہیں بیگانوں کی حد تک شہادت اور یگانوں کی حد تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہاری ذمہ داری ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ بیگانوں کی حد تک تو شہادت میں ایک معنویت مگر یگانوں کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کیوں اس قدر زور ہے؟ اوروں کا پتہ نہیں مگر جہاں تک میں اپنے مطالعہ قرآنی کی روشنی میں سمجھا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب وہ کسی گروہ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو اس میں کبھی تغیر نہیں کرتا جبکہ وہ خود اس گروہ کے افراد اپنی حالت متغیر نہیں کر دیتے۔ چنانچہ اُمتوں کی عموماً اور اُمت اسلامیہ کی خصوصاً اس موضوع پر بھرپور شہادت ہے۔ ہر قوم خود اپنے افکار اپنے اعمال اور اپنے اخلاق سے اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودتی ہے۔ ارشاد ہے:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی قوم کو حاصل ہوتی ہے جب تک وہ خود ہی اپنی حالت نہ بدل ڈالے۔

مابقوم سے مراد دنیوی برکتوں کے دروازے، اللہ کے انعامات، آسمان و زمین کی برکتیں، عزت و جاہ اقتدار حکومت ہے اور ما بانفسہم سے مراد وہ ایمان اور عمل صالح ہے جس کے نتیجے میں اللہ انعامات سے سرفراز فرماتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایمانی زندگی میں ما بانفسہم کو ایمان و عمل صالح کے جادہ حق پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے کیونکہ جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے وہیں اس کا ایک عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان و عمل صالح کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی نہیں چل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس طرح گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ما بانفسہم کے لیے ایمان کے تقاضوں کے مطابق اسلامی زندگی کو سوسائٹی اور اُمت میں قائم رکھنے کی ایک محسوس تدبیر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے اُمت میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر کے اُمت میں اسلامی زندگی کو ایمان کے تقاضوں کے مطابق قائم رکھا تو پھر دنیائے کفر کی کوئی ضلالت، اہل باطل کا بطلان، اہل بدعت کا ابتداع، ظالموں کا ظلم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

ذمہ داریوں کی باز پرس ہوگی

۲۰۱۔ یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے وہی تم کو ان کاموں کے بارے میں بتلائے گا جو تم کرتے تھے۔ یعنی جو گمراہ رہا اور جس نے راہ پائی سب کے نیک و بد اعمال اور ان کے نتائج سامنے کر دیے جائیں گے[1]۔ جس طرح دنیا میں مادی اشیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات معانی و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ایمان و کفر امر بالمعروف نہی عن المنکر، شہادت حق دعوت الی اللہ جہاد فی سبیل اللہ ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی اور طبیعیاتی اشیا میں ہے۔ اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں۔ وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں۔ جس طرح ایک سائنٹسٹ حکیم کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت ہے۔ اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ انبیاء کی تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار اور نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہمیں جسمانی اشیا کے آثار و خواص کا ہوتا ہے۔ سائیکالوجی علم النفس اور سوشیالوجی علم الاجتماع نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ
اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ
تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ
لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ
اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا
فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا
وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى
اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ
بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ۝

اے اہل ایمان! جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو تو بوقت وصیت گواہی کے لیے تم میں سے دو معتبر آدمی گواہ ہونے چاہئیں ، اگر ایسا ہو کہ تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت آجائے تو مسلمان گواہوں کی جگہ غیر مسلم بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔[۲۰۲] اگر تمہیں ان گواہوں کے بارے میں شبہ پڑ جائے تو ان کو نماز کے بعد روک لو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں، ہم نے اپنی قسم کسی معاوضہ کے بدلے فروخت نہیں کی ہے ہمارا قریب و عزیز کیوں نہ ہو ہم اللہ کے لیے سچی گواہی کبھی نہ چھپائیں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم گنہ گاروں میں سے ہوں[۲۰۳]۔ پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دو گواہ ان میں سے کھڑے ہوں جن کا حق گواہوں میں سے ایک نے دبانا چاہا تھا اور یہ گواہ ان میں سے ہوں جو فریق مظلوم سے

تعلق رکھنے والے ہوں پھر یہ دونوں خدا کی قسم کھا کر کہیں ہماری گواہی پچھلے گواہوں کی گواہی سے زیادہ درست ہے ہم نے گواہی دینے میں کسی طرح کی زیادتی نہیں کی اگر کی ہو تو ہم ظالموں میں سے ہوں[۲۰۴]۔ اس قسم سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے کہ گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے یا کم از کم ان کو اس کا اندیشہ رہے گا کہ کہیں ہماری قسمیں فریق ثانی کی قسموں کے بعد رد نہ کر دی جائیں۔ بہر حال اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرتے رہو اور اس کا حکم سنو اور یاد رکھو اللہ بدکاری کرنے والوں کو کامیاب اور بامراد نہیں بناتا ہے[۲۰۵]۔

وصیت اور اس کی گواہی کا حکم

قرآن نے وراثت کا قانون مقرر کرنے کے ساتھ مسلمان کو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کرے۔ ارشاد ہے:

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف۔

تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجاتے اور وہ کافی مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے جائز طریقہ سے وصیت کر دے۔

اس کا منشا یہ ہے کہ ایک تو مرنے والا خصوصیت کے ساتھ اپنے والدین کے حق میں اپنی اولاد کو حسن سلوک کی وصیت کر جائے کیونکہ ان سے بوڑھے دادا دادی کی خدمت کی توقع کم ہی ہو سکتی ہے۔ دوسرے اس کے خاندان میں جو افراد ایسے ہوں جنہیں قانون کے مطابق میراث میں حصہ نہ پہنچتا ہو مگر مرنے والا ان کو مدد کا مستحق سمجھتا ہو تو انہیں اپنے ترکہ میں سے حصہ دینے کی وصیت کر دے۔ اس کے علاوہ ایک شخص اگر بہت مال چھوڑ رہا ہے تو وہ رفاہ عام کے کاموں کے لیے بھی وصیت کرنے کا مجاز ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وصیت کی اجازت صرف والدین اور رشتہ داروں تک محدود رہے۔

وصیت اور میراث کے قانون سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شخصی املاک کے ترکوں میں اسلامی اسکیم یہ ہے کہ دو تہائی تو لازماً قانون میراث کے مطابق تقسیم ہو اور ایک تہائی مرنے والے کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس غرض کے لیے چاہے اسے صرف کر دے بشرطیکہ وہ جائز طریقے پر ہو۔ یعنی وہ کام بھی جائز ہو جس کے لیے وصیت کی گئی ہے اور اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

اس آیت میں اسی وصیت کے بارے میں قانون شہادت کو بتایا جا رہا ہے۔ یہاں خالص مالیاتی مسئلہ لا کر اشارہ کر دیا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں جدائی نہیں بلکہ ہم آہنگی ہے۔ حفاظت دین کے سلسلے میں حفاظت مال کا طریقہ بتانا اور یہ ہدایت کرنا کہ مرتے وقت کسی کو وصی اور گواہ بنا لینا چاہیے اسی کی غمازی کر رہا ہے، جیسے دینی مصلحت پر ہدایات دی گئی ہیں ایسے ہی اس آیت میں خالص دنیوی مصلحت پر زور دے کر بتا دیا کہ یہ بھی دین ہے۔

اس آیت کی یہاں ٹھیک وہی حیثیت ہے جو دوسرے پارے میں روزے، اعتکاف اور حج کے ذکر میں اس مالیاتی دفعہ کی حیثیت تھی۔

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل و تدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون۔

مطلب یہ تھا کہ صرف یہی عبادت نہیں ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے حلال روزی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ بھی عبادت ہے کہ ہمیشہ کے لیے حرام روزی سے بچ کر رہو۔ یہاں بھی گویا یہی فرمایا کہ صرف حالت احرام میں شکار سے رک جانا ہی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ بھی عبادت ہی ہے کہ دوسروں کے مال سے بچ کر رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک معاشیات اور اقتصادیات

کی کس قدر اہمیت ہے۔ گویا ایک ہی ذات ہے جو اپنی رحمت سے بندوں کے لیے اصلاح معاد اور اصلاح معاش دونوں کا انتظام کرتی ہے اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ قرآن محض ایک پندنامہ اخلاق نہیں ہے قانون کی کتاب بھی ہے۔ زندگی میں قانون اخلاق خطابت سب ہی کی اپنی اپنی جگہ ضرورت ہے اور قرآن مکمل ہدایت نامہ اور زندگی کا مکمل دستور ہے۔ اس میں سب کچھ موجود ہے۔

۲۰۲۔ اے اہل ایمان جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو تو بوقت وصیت گواہی کے لیے تم میں سے دو معتبر آدمی گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر ایسا ہو کہ تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت آجائے تو مسلمان گواہوں کی بجائے غیر مسلم بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ باقی اگر دو نہ ہوں یا معتبر نہ ہوں پھر بھی وصی بنا سکتا ہے۔ گواہ سے مراد وصی ہے۔ اسی کے اقرار و اظہار کو گواہی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ وصی مسلمانوں میں سے ہوں اور اگر مسلمان نہ ہوں تو غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں۔[1] علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ شہادۃ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے حاضر کرنا، فیصلہ کرنا، حکم کرنا، قسم لینا، جاننا اور وصیت کرنا۔ یہاں شہادت وصایۃ کے معنے میں ہے۔ وصایۃ وہ معاملہ ہے جس کے ذریعے مالک اپنی زندگی میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے ترکہ کا ایک حصہ متعین فرد یا متعین افراد کی میری نیابت میں فلاں شخص ملکیت بنائے گا۔ وصایۃ کے لیے وصی، موصی لہ موصی بہ اور موصی کا ہونا ضروری ہے۔ جس کے یہ معاملہ مرنے والا سپرد کر رہا ہے وہ وصی ہے اور خود وصیت کرنے والا موصی ہے اور جن کی خاطر وصیت کی جا رہی ہے وہ موصی لہ ہیں اور جس چیز کی وصیت کی جا رہی ہے وہ موصی بہ ہے اور اس عمل کا نام وصایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص مرتے وقت اپنے ترکہ کے متعلق عزیزوں کو وصیت کرنا چاہے اور اپنا مال و متاع ان کے حوالہ کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ مسلمانوں میں دو معتبر شخصوں کو اپنا وصی بنائے تاکہ وہ اس کی وصیت پوری کریں اور اس کے مال میں خیانت نہ کریں۔

ان اوصیاء کے قرآن نے یہ اوصاف بتائے ہیں

ایک یہ کہ دو ہوں، دوسرے یہ کہ عادل و انصاف والے ہوں، تیسرے یہ کہ مسلمان ہوں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ قانونی ہے یا اس کی حیثیت صرف ایک اخلاقی کردار کی ہے۔ اگر اس کی حیثیت قانونی ہے تو ایسا کرنا ضروری ہے اور اوصیاء کے لیے دو کا ہونا، عادل ہونا اور مسلمان ہونا ناگزیر اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

واجب ہے اور اگر اس کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ اخلاقی ہے تو پھر یہ ایک استحبابی عمل ہے۔ دو کا ہونا ضروری نہیں ایک ہی کام دے سکتا ہے عادل ہونا بھی صرف افضل ہے شرط لازم نہیں ہے بلکہ فقہا نے یہاں تک لکھا ہے کہ وصی اگر دو نہ ہوں بلکہ ایک بھی نہ ہو پھر بھی وصیت جائز ہے۔

اخلاق و قانون میں فرق

ٹھہر جائیے ذرا قانون اور اخلاق کا فرق معلوم کر لیجیے۔ قرآن و سنت میں تمام احکام و ہدایات انسانی مصالح کی محافظ ہیں اور سب کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ان تمام احکام اور ہدایات کی تعمیل مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ لیکن ہر حکم یا ہدایت کو لازمی اور واجب التعمیل قرار نہیں دیا گیا ہے۔ فرائض اور اختیاری اعمال کی یہ تقسیم اس بنیادی حکمت سے ہم آہنگ ہے جو نوع انسانی کے سلسلے میں خالق کائنات کے پیش نظر رہی ہے یعنی امتحان و آزمائش کھرے اور کھوٹے اور عالی ہمت اور کم ظرف کے درمیان تمیز، بہت سے اعمال خیر کو اختیاری قرار دے کر اور ان کے سلسلے میں صرف ترغیب و تلقین پر اکتفا کر کے اسلام نے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ فرد اپنے تزکیہ اور ارتقاء میں جتنے مدارج طے کر سکتا ہے کرے اور جو فرد خود کو جتنا اونچا لے جا سکتا ہے لے جائے یہ تقسیم عبادات میں بھی پائی جاتی ہے اور سیاست و معیشت اور دوسرے معاملات زندگی میں بھی۔ مالیاتی مسائل میں بھی، اسلامی ہدایات دونوں قسم پر مشتمل ہیں۔ املاک کے سلسلے میں اسلام کے ترغیبی احکام پر جو فرد جتنا زیادہ عمل کرے گا اتنا ہی زیادہ مسلم اور اتنا ہی اچھا بندہ سمجھا جائے گا ان رضاکارانہ اعمال خیر سے اسے دنیا میں بھی سکون و راحت میسر ہو گی اور اس کا اخروی انجام بھی بہتر ہو گا۔

ہدایات کے ایک حصہ کو قانوناً نافذ کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ ایسا کرنا زندگی کے بقا تسلسل اور انسانیت اور خیر کے اس کم سے کم معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے جن کے بغیر نہ فرد کو ارتقاء کا موقع مل سکتا ہے نہ اجتماع کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔ ہدایات کے ایک حصہ کو قانونی نفاذ کے ذریعے اس بات کو یقینی کر لیا گیا کہ سماج جب تک اطاعت الٰہی کے بنیادی فیصلے پر قائم ہے اور قانون اسلامی نافذ ہے۔ اس سماج کی سمت سفر نہ بدلنے پائے منزل کی طرف اس کا اقدام جاری رہے اور شر پسند عناصر کو پورے سماج کی فضا خراب کر دینے کا موقع نہ ملے۔ قانون کے ذریعے نافذ کی جانے والی ہدایات انسان کے بنیادی مصالح جان و مال عقل و دین اور نسل کا ایک ناگزیر حد تک تحفظ عمل میں لاتی ہیں۔

شریعت کے قوانین کا منشا مقاصدِ شریعت کا اس حد تک حصول ہے کہ انسانی زندگی بحیثیتِ مجموعی حکمت تخلیق سے ہم آہنگ رہے۔

اسلامی قانون کی بعض ہدایات ایسی ہیں جن کو عام حالات میں اخلاقی ذمہ داری کا درجہ قرار دیا گیا ہے اور ترغیب و تلقین کے ذریعے افراد کو ان کی تعمیل پر آمادہ کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ وصیت کا معاملہ بھی اسلامی قانون میں ایسا ہی ہے۔ اسی لیے علماء نے اسے استحبابی مقام دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے خدائی وصیت کے ذریعے مال کے ورثا کے لیے حصے مقرر کر کے مالک مال کو اپنی وصیت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔ قرآن نے میراث کے قانون کا آغاز ہی یوصیکم اللہ کے پرشوکت عنوان سے کیا ہے اور اسی بنا پر وصیت کے موضوع پر اس کے جواز کی دو اہم ضروری شرطیں عائد کی گئی ہیں ایک یہ کہ وصیت صرف ترکہ کے ایک تہائی حصہ کی حد تک کی جا سکتی ہے۔ بقیہ املاک کی تقسیم ضابطہ میراث کے مطابق عمل میں آئے گی۔ یہ تحدید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہے اور تمام مکاتب قانون کے درمیان متفق علیہ ہے جیسا کہ آپ چوتھی جلد میں پڑھ چکے ہیں۔ اسلام نے ایک تہائی کی حد تک وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثا کے موجود ہونے کی وجہ سے ترکہ میں حقدار نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ ناداری کے باعث اس کا مستحق ہوتا ہے۔ یا اس سے تعلق یا کسی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔ کہ ترکہ میں اسے بھی حصہ ملے حق وصیت کے ذریعے مالک کو اس بات کا موقعہ ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں بھی کچھ مال چھوڑ جائے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے، کمزور کو سہارا دینے اور رفاہ عامہ یا دینی امور کے نگران کسی ادارے کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔ وصیت کے محرکات زیادہ تر یہی ہیں۔ اور عملاً ان اغراض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے اس حق کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر کسی فرد کا کوئی وارث نہ ہو تو احناف کے نزدیک وہ اپنے پورے ترکہ پر وصیت کا حق استعمال کر سکتا ہے کیونکہ اس حق کی تحدید کا اصل مقصد ورثا کے حق کا تحفظ ہے۔ لیکن امام شافعی اور امام مالک اس صورت میں بھی تہائی ترکہ سے زیادہ کی وصیت کو درست نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جب کوئی متعین فرد اس کا وارث نہیں تو مسلمانوں کی جماعت اس کی وارث ہو گی۔ اور اس شخص کو ان لوگوں کا حق کالعدم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیت کا حق ورثا کے علاوہ دوسروں کو مال منتقل کرنے کے لیے دیا گیا ہے کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی ہے جو وارث کی حیثیت سے ترکہ کے ایک حصہ کا

حقدار ہو۔ وارث کے حق میں وصیت عملاً اس تناسب میں ترمیم کر دیتی ہے جس کے مطابق مال کو شرعاً تقسیم ہونا چاہیے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

ان اللّٰہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث

اللہ نے ہر حقدار کا حق مقرر کر دیا ہے لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔

عام قانون ساز اداروں کے نزدیک اگر تمام ورثا مل کر اس پر رضامندی کا اظہار کریں تو کسی وارث کے لیے بھی وصیت کی جا سکتی ہے۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانو اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اس کو اپنے مال کے بارے میں کوئی وصیت کرنی ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ اس کے دو متدین اور عادل مسلمانوں کو اپنا وصی بنا لے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور مسلمان نہ ہوں تو دو غیر مسلموں کو بھی وصی بنایا جا سکتا ہے۔ اس مطلب کی تائید اس پس منظر سے بھی ہوتی ہے جو اسی آیت کے تحت شارحین قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور احادیث کی کتابوں میں محدثین نے مختصر اور مطول کر کے اسے روایت کیا ہے کہ تمیم بن اوس داری، اور عدی بن بدار، کہ اس وقت دونوں عیسائی تھے بغرض تجارت مدینہ سے شام گئے اور ان کے ہمراہ حضرت عمرو ابن العاص کے آزاد کردہ غلام حضرت بدیل رضی اللہ عنہ بھی گئے۔ موصوف رضی اللہ عنہ، وہاں جا کر بیمار ہو گئے۔ انہوں نے بیماری کی حالت میں اپنے کل مال کی فہرست بنائی اور اسے اپنے سامان میں رکھ دیا اور ان دونوں عیسائیوں کو انہوں نے اس کا پتہ نہ دیا۔ اتفاقاً زیادہ بیمار ہو گئے اور جب موت یقینی ہو گئی تو انہوں نے اپنے ان دونوں ہم سفر عیسائیوں کو اپنا سارا سامان یہ کہہ کر سپرد کر دیا کہ جب مدینہ پہنچو، میرا یہ کل سامان میرے گھر پہنچا دینا۔ حضرت بدیل کا انتقال ہو گیا اور وہ دونوں عیسائی اپنے کام سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آئے۔ اس سامان میں ایک چاندی کا پیالہ تھا جس پر سونے کا جھول تھا اور اس میں تین سو مثقال چاندی تھی۔ ان دونوں ہم سفر عیسائیوں نے سامان میں سے پیالہ رکھ لیا اور باقی سارا سامان بدیل کے ورثا کے سپرد کر دیا۔ وارثوں نے جب مال کی پڑتال کی تو ان کو اس میں ایک فہرست بھی ملی جس میں پوری تفصیل درج تھی۔ فہرست کے مندرجات میں سے ان کو پیالہ نہ ملا۔ بدیل کے ورثا تمیم اور عدی کے پاس گئے اور جا کر دریافت کیا کہ کیا بدیل نے اپنی بیماری میں اپنا کچھ مال فروخت کیا تھا؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا اس پر ورثا نے بتایا کہ ہمیں سامان میں سے ایک پورے سامان کی فہرست ملی ہے اس فہرست کے مطابق ہمیں چاندی کا وہ پیالہ نہیں ملا جس پر سونے کا جھول تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ ہمارے سپرد کیا تھا ہم نے وہ تمہارے حوالہ کر دیا۔ یہ

مقدمہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا۔ دونوں عیسائی مدعی علیہ تھے اور میت کے ورثا مدعی تھے۔ مدعیوں کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور مدعا علیہ انکاری تھے اس لیے دونوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں خیانت نہیں کی۔ فیصلہ قسم پر ہوا۔ کچھ مدت کے بعد پتہ چلا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے میت سے خریدا تھا چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لیے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔ میت کے وارثوں نے پھر بارگاہِ نبوت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ اب پہلی صورت کے برعکس میت کے وصی یعنی دونوں عیسائی خریداری کے مدعی تھے اور وارث منکر تھے۔ شہادت موجود نہ تھی۔ وارثوں سے قسم لی گئی کہ پیالہ میت کی ملک تھا اور یہ دونوں عیسائی جھوٹے ہیں چنانچہ اب فیصلہ کیا گیا کہ پیالہ کی قیمت ورثا کو دی جائے۔ یعنی ایک ہزار درہم وارثوں کو دیے گئے۔

غیر مسلموں کی شہادت

ارشاد میں اگرچہ حکم یہی ہے کہ مسلمانو! قربِ موت میں تمہارا وصی یا تمہاری وصیت کے گواہ ذوا عدل منکم دو مسلمان انصاف والے ہوں۔ لیکن اس کی بھی اجازت ہے او آخران من غیرکم یہ گواہ اور وصی غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم سفر میں ہو اور مسلمان دستیاب نہ ہو۔ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ سفر میں وصیت پر غیر مسلموں کی شہادت بالکل دُرست ہے جبکہ مسلمان موجود نہ ہوں۔ آیت میں غیرکم سے کفار مراد ہیں۔ عبداللہ ابن عباس، ابوموسیٰ اشعری، سعید بن المسیب، شریح القاضی، ابن سیرین، اوزاعی، سفیان ثوری، ابوعبید اور امام احمد کا حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہی مسلک نقل کیا ہے۔ ظاہر آیت اور آیت کا پس منظر اسی موقف کا مؤید ہے۔ احناف نے اس موضوع پر عجیب پالیسی اختیار کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کافر کی شہادت کا جو جواز اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے وہ قرآن میں البقرہ میں مالیات والی اس آیت ممن ترضون من الشہداء سے منسوخ ہے لیکن ساتھ ہی وہ امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت کر کے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس سے امام ابوحنیفہ نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ کفار کی شہادت بعض کی بعض پر جائز ہے کیونکہ اس آیت میں کفار کی شہادت مسلمانوں پر جائز قرار دی ہے تو کفار کی شہادت بعض کی بعض پر بطریق اولیٰ جائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی یہ آیت اپنے منطوق کے اعتبار سے ناقابلِ عمل اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے قابلِ عمل ہے۔ حالانکہ قرآن کی واضح آیت ایسی کوئی رہنمائی نہیں کر رہی ہے بلکہ دونوں باتیں آیت کی رو سے صاف

ہیں غیر مسلموں کی شہادت مسلمانوں کے حق میں اور غیر مسلموں کی غیر مسلموں کے حق میں جائز ہے۔ یہ کہنا کہ بقرہ کی آیت نے آیت کے منطوق کو منسوخ کر دیا حیرتناک ہے۔ حالانکہ سورہ مائدہ کے بارے میں تاریخی طور پر یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں آخری سورت ہے۔ یہاں حافظ ابن القیم کی یہ بات بہت زیادہ اپیل کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شہادت کے موضوع پر سفر میں وصیت کے لیے اجازت دی ہے کہ دو مسلمانوں کو گواہ بنائیں یا دو غیر مسلموں کو گواہ بنائیں۔ یہ آیت اس موضوع پر صاف ہے کہ سفر میں وصیت پر اگر دو مسلمان گواہ نہ ہوں تو غیر مسلموں کو گواہ بنا لینا جائز ہے۔ اسی کے مطابق دربارِ نبوت میں فیصلہ ہوا ہے اور آپ کے بعد صحابہ نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے۔ اس حکم کا ناسخ کوئی نہیں۔ کیونکہ سورہ مائدہ باعتبارِ نزول قرآن کی آخری سورت ہے۔ اس سورت میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اس آیت کا کوئی معارض نہیں ہے۔

امام رازی نے تفسیر میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور دوسرے شارحین قرآن نے بھی جی کھول کر خوب دادِ تحقیق دی ہے۔

گواہوں کی بحلف گواہی

۲۰۳۔ اگر تمہیں گواہوں کے بارے میں شبہ پڑ جائے تو ان کو نماز کے بعد روک لو۔ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اپنی قسم کسی معاوضے کے بدلے فروخت نہیں کی ہے ہمارا قریب و عزیز ہی کیوں نہ ہو، ہم اللہ کے لیے سچی گواہی نہ چھپائیں گے۔ اگر ایسا کریں تو ہم گنہگار ہوں گے۔ یعنی نمازِ عصر کے بعد کہ وہ وقت اجتماع اور قبول کا ہے۔ شاید ڈر کر جھوٹی قسم نہ کھائیں یا کسی بھی نماز کے بعد یا وصی جس مذہب کے ہوں ان کی نماز کے بعد۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے پاس سب کو جانا ہے تو جانے سے پہلے سب کام ٹھیک کر لو اسی میں سے ایک اہم کام ضروری امور کی وصیت اور اس کے متعلقات ہیں۔ ان آیات میں وصیت کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ یعنی مسلمان اگر مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالہ کرے تو بہتر ہے کہ وہ معتبر مسلمانوں کو گواہ کرے۔ مسلمان اگر نہ ملیں جیسے سفر وغیرہ میں اتفاق ہو جاتا ہے تو دو کافروں کو وصی بنالے۔ پھر اگر وارثوں کو شبہ پڑ جائے کہ ان شخصوں نے کچھ مال چھپا لیا ہے اور وارث دعویٰ کریں اور دعوے کے ساتھ شاہد موجود نہ ہوں تو

وہ دونوں شخص قسم کھائیں کہ ہم نے نہیں چھپایا اور کسی طرح یا قرابت کی وجہ سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے اگر کہیں تو گنہ گار ہیں۔[1]

یہ گواہوں سے متعلق خاص ہدایت ہے کہ اپنوں میں سے جن دو معتبر گواہوں کو گواہی کے لیے منتخب کرو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ اپنی گواہی کسی جانب داری کی وجہ سے بدل نہ دیں تو اس کو زوردار بنانے کے لیے یہ تدبیر کر سکتے ہو کہ کسی نماز کے بعد ان کو روک لو اور ان سے اللہ کے نام پر قسم لو کہ وہ اپنی گواہی کسی نفع دنیوی کی خاطر اور کسی کی جانبداری میں خواہ وہ ان کا عزیز ہی کیوں نہ ہو بدلیں گے نہیں، اگر وہ بدلیں گے تو گنہ گار ٹھہریں گے۔

من بعد الصلاۃ میں صلاۃ سے مراد کوئی مخصوص نماز نہیں۔ عبداللہ ابن عباس نے شاید نمازِ عصر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر بتائی ہے ورنہ جیسا کہ امام زہری کہتے ہیں کہ عصر کی کوئی تخصیص نہیں ہے کوئی نماز ہو۔ نماز کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ جو قول و قرار اور جو شہادت و قسم نماز کے بعد اور مسجد میں نمازیوں کی موجودگی میں انجام پائے ایک صاحب ایمان سے توقع ہے کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ کوئی ترغیب و تحریص اسے نہ بدلے گی۔

قسم کے لیے زمان و مکان کی قید

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ کیا قرآنی نقطہ نظر سے قسم کو مؤکد بنانے کے لیے زمان و مکان ناگزیر ہیں۔ جمہور کا خیال تو یہی ہے کہ زمان و مکان کی اثر انگیزی قسم کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے من بعد الصلاۃ سے یہی بات سمجھی ہے کہ وقت نماز عصر کا بعد ہو اور جگہ مدینہ میں حضور کے منبر کے پاس اور مکہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ہو یا بیت المقدس میں صخرہ سلیمان کے پاس ہو اور کسی دوسرے شہر میں جامع مسجد میں ہو۔ یہ امام مالک، امام شافعی کا خیال ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا خیال ہے کہ قسم کے زوردار بنانے میں زمان و مکان کا کوئی دخل نہیں ہے۔

آیت میں من بعد الصلاۃ کی قید واقعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس دور میں عرف یہی تھا کہ نماز کے بعد یہ کام کرتے تھے ورنہ مقصود صرف قسم لینا ہے۔

اور یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ قرآن میں یہ قید بھی ہے ان ارتبتم اگر تمہیں گواہوں کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بارے میں کوئی شک ہو تب قسم لی جاتے۔ اگر کوئی اندیشہ نہ ہو گواہ ثقاہت وعدالت کے اعتبار سے ایسے مرتبہ کے ہوں کہ ان سے کسی سوء ظن کا احتمال نہ ہو تو بلا وجہ ان سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے روایت کے بارے میں بھی یہ وضاحت کی ہے۔

ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا

اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لو۔

مطلب یہی ہے کہ اگر خبر رساں فاسق نہیں بلکہ عادل ہو تو پھر تحقیق و جستجو اور چھان بین کی ضرورت نہیں ہے۔ حافظ ابن القیم نے یہی بات اس آیت سے سمجھی ہے اور مدارج السالکین میں تصریح کی ہے۔ اس طرح قرآن نے شہادت اور روایت دونوں کی اہمیت واضح کر دی اور بتا دیا کہ نہ تو عادل سے قسم لی جاتے اور نہ عادل کی خبر کو رد کیا جاتے۔ کیونکہ قرآن نے فاسق کی خبر کی تحقیق کا حکم دیا ہے یہ حکم نہیں دیا کہ رد کر دو ایسے ہی یہاں گواہوں کے بارے میں فرمایا کہ قسم لی جائے بشرطیکہ تمہیں ان کی دیانت پر شبہ ہو۔ اور آخر میں لا نکتم شہادۃ اللہ کہہ کر شہادت کی عظمت واضح فرمائی ہے کیونکہ مومن کی ہر گواہی چھوٹی ہو یا بڑی شہداء بالقسط کی وجہ سے اس عظیم فریضہ منصبی کا ایک حصہ ہے جس پر اسے اللہ نے مامور فرمایا ہے۔ اگر اس میں ادنیٰ خیانت بھی اس سے صادر ہو تو وہ صرف بندوں ہی کا خائن نہیں بنتا بلکہ اپنے رب کا بھی خائن ہوتا ہے۔

وارثوں کا عدالت سے رجوع

۲۰۴۔ پھر اگر معلوم ہو جاتے کہ وہ دونوں گواہ گناہ کے مرتکب ہوئے تو ان کی جگہ دوسرے دو گواہ ان میں سے کھڑے ہوں جن کا حق گواہوں نے دبانا چاہا تھا اور یہ گواہ ان میں سے ہوں جو فریق مظلوم سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ یہ دونوں قسم کھا کر کہیں کہ ہماری گواہی پچھلے گواہوں سے زیادہ بہتر ہے ہم نے گواہی دینے میں کسی طرح کی زیادتی نہیں کی۔ اگر کی ہو تو ہم ظالموں میں سے ہوں۔ یعنی اگر قرائن سے اوصیاء کی قسم کا جھوٹ ہونا معلوم ہو جاتے اور وہ بذریعہ شہادت شرعی اپنا سچا ہونا ثابت نہ کر سکیں تو میت کے وارثوں کو قسم دی جائے گی کہ ان کو اوصیاء کے دعوے کی واقعیت کا کوئی علم نہیں اور یہ کہ ان کی گواہی اوصیاء کی گواہی سے زیادہ احق بالقبول ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شیخ الاسلام نے آگے آیت کی شان نزول لکھی ہے وہ چونکہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں اس لیے یہاں چھوڑ دی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کا سفر میں وقت رحلت آجائے تو اسے چاہیے کہ دو مسلمانوں کو اپنا وصی بنالے اور اپنا اثاثہ ان کے سپرد کر دے۔ اگر مسلمان نہ ہوں تو غیر مسلم بھی وصی ہو سکتے ہیں۔ یہ اوصیا میت کی وصیت کے مطابق اس کا سامان میت کے وارثوں کو دیں۔ اگر میت کے ورثہ ان اوصیا کی بات میت کے ترکہ کے بارے میں قبول کر لیں تو فبہا۔ اور اگر ان کو اوصیا کی بات کا اعتبار نہ ہو تو وہ عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کریں، عدالت کا کام یہ ہے کہ ان اوصیا سے حلف لے۔ اگر میت کے اولیاء کو قرآن سے پتہ لگ جائے کہ اوصیا نے جھوٹ بولا ہے اور جھوٹی قسم کھائی ہے تو اب عدالت اولیاء میت سے قسم لے اگر میت کے اولیا قسم کھالیں تو اوصیا کی شہادت کو مردود قرار دے کر اولیا کے حق میں فیصلہ کرے۔

ارشاد میں عثر آیا ہے اس کا مصدر عثر اور عثور ہے۔ اس کے معنی راز سے آگاہ ہونے کے ہیں۔ اولیان اولی کا تثنیہ ہے ولی سے بنا ہے۔ اس کے معنے لگاؤ اور تعلق کے ہیں۔ یعنی اولیان بالمیت میت کے اولیاء اور ورثہ ان سے مراد میت کے وہ ورثا ہیں جو میت کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں۔ پہلی آیت اوصیا سے قسم شہادت کو مستحکم کرنے کے لیے لی گئی تھی۔ اب میت کے ورثا سے قسم لی جا رہی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر پتہ لگ جائے کہ اوصیا نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ان میں سے دو آدمیوں سے قسم لی جائے کہ ہماری گواہی ان دونوں اوصیا کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم ذرا بھی حق سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں حاکم تشا‌ .... حسین قرآن کی تشریح کے مطابق جوہری فرق ہے۔ پہلی صورت میں اولیاء میت مدعی تھے اور ان کے پاس گواہ نہ تھے۔ اس لیے اوصیا سے قسم لی گئی۔ دوسری صورت میں اوصیا مدعی تھے اور ان کے پاس کوئی گواہ نہ تھا اس لیے وارثوں سے قسم لی گئی یہاں وارثوں سے قسم لینے کا ذکر ہے۔ اور رسم نے پہلی قسم کو اوصیا کے لیے تاکیدی قرار دیا ہے یعنی وصیت کو مستحکم کرنے کے لیے قسم لی جائے بشرطیکہ اوصیا کی دیانت و امانت پر موصی کو کوئی شبہ ہو۔

شہادت کا فائدہ

۲۰۵ - اور اس قسم سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے کہ گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے یا کم از کم

ان کو اس بات کا اندیشہ رہے گا کہ کہیں ہماری قسمیں فریق ثانی کی قسموں کے بعد رد نہ کر دی جائیں۔ بہرحال اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرتے رہو اور اس کا حکم سنو اور یاد رکھو کہ اللہ بدکاروں کو کامیاب و بامراد نہیں بناتا ہے یعنی وارثوں کو شبہ پڑ جائے تو قسم دینے کا حکم رکھا اس لیے کہ قسم کے ڈر سے اول ہی جھوٹ ظاہر نہ کریں، پھر اگر ان کی بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم کھائیں۔ یہ بھی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں۔ جانیں کہ آخر ہماری قسم الٹی پڑ جائے گی، کذافی موضح القرآن۔ خدا کی نافرمانی کرنے والا انجام کار رسوا اور ذلیل ہوتا ہے، حقیقی کامیابی کا چہرہ نہیں دیکھتا۔[1]

یہاں شہادت کو اس طریق سے لینے کا فائدہ بتایا ہے کہ اگر شہادت کے بارے میں یہ طریق کار اپنایا جائے گا تو شاہدوں کی شہادت سے واقعہ کی حقیقت سب کے سامنے کھل کر آ جائے گی اور احتساب کے خیال سے گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے ورنہ ان کو ڈر ہو گا کہ اگر ان سے کوئی بدعنوانی ہوئی تو ان کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل ہو جائیں گی۔

---

[1] افادات شیخ ابو سلام

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ
عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ
فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَ
الْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔــةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ
فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ
وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ
جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

وہ دن کہ اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر ان سے دریافت کرے گا کہ بتاؤ تمہیں تمہاری امتوں کی جانب سے تمہاری دعوت کا کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں ہے

یہ تو تیری ہی ہستی ہے جو غیبوں کی باتوں کو جاننے والی ہے[206]۔ اس دن اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسٰی میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو انعام کیے ہیں ان کو یاد کرو[207]۔ میں نے رُوح القدس سے تمہیں قوّت دی تھی تم لوگوں سے گہوارے میں باتیں کرتے تھے اور بڑی عمر میں پہنچ کر بھی، اور یاد کرو اس کو بھی کہ میں نے کتاب حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی تھی، اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مٹی لیتے اور پرندے کی شکل جیسی چیز بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ میرے حکم سے ایک پرندہ بن جاتا اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے اندھے اور برص کے بیمار کو اچھا کر دیتے اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے مُردوں کو نکالتے تھے[208]۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب میں نے تم سے بنی اسرائیل کو ہٹا دیا اس وقت جبکہ تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر پہنچے تھے تو انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا

تھا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا کچھ نہیں ہیں۔[۲۰۹]

روزِ قیامت کی ہولناکی

کچھ کی رائے ہے کہ یوم یجمع اللہ اپنے سے پہلے فقرے لا یھدی القوم الفاسقین سے مربوط ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس روز فاسقین کے لیے راہِ نجات نہیں کھولے گا جس روز تمام رسُولوں سے پوچھا جائے گا اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ مستقل بات ہے اور مقصود قیامت کی ہولناکی کو بیان کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ روز اس قدر ہولناک ہو گا کہ اس روز اللہ انبیاء سے بھی پوچھے گا۔ اس سوال سے مقصود امتوں اور قوموں کی توبیخ اور سرزنش ہے۔ تاکہ امتیں سن لیں اور ڈر جائیں۔ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے واذا الموٗدۃ سُئلت بای ذنب قتلت؟ کہ زندہ درگور لڑکی کس گناہ میں ماری گئی۔ یہ سوال اگرچہ موٗدہ سے ہو گا لیکن سوال سے مقصود زندہ درگور کرنے والوں کی توبیخ ہو گی۔ ایسے یہاں سوال اگرچہ انبیاؑ و رسل سے ہو گا مگر مقصود اس سے ان انبیاؑ کی امتوں کی توبیخ ہو گی۔ اور امام رازی فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کا عام اندازِ بیان یہ ہے کہ احکام و قوانین ذکر کرنے کے بعد فوراً اللہ کی صفات کو پیش کرتا ہے یا انبیاؑ کے احوال و ظروف کو بیان کرتا ہے اور قیامت کے کچھ مناظر کی جھلک دکھا دیتا ہے اور مقصد اس سے عمل کے لیے اور تعمیلِ احکام کے لیے دلوں میں گرمی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ آغاز میں اگرچہ تمام انبیاء سے سوال کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے بعد خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جن کو عیسائیوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ کیونکہ اوپر سے سلسلہ کلام اہلِ کتاب کے غلو اور افراط و تفریط کے متعلق آرہا ہے۔ اس تذکرہ سے اصل مقصد تو عیسائیوں کے افکار کا بودا پن ظاہر کرنا ہے جو ان کو خدا یا خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں کیونکہ دوسری امتوں کا کفر انبیاؑ کی ذات تک محدود ہے لیکن عیسائیوں کا کفر نبوت سے آگے اللہ تعالیٰ تک پہنچا ہوا ہے اور تو یہی کہتے ہیں کہ یہ نبی نہیں ہے اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ یہ نبی نہیں بلکہ خدا کا بیٹا ہے۔ یہ جنابِ الٰہی عظیم میں گستاخی ہے اور پھر حضرت عیسٰی کا خاص طور پر اس لیے بھی ذکر کیا ہے کہ آنجناب اسرائیلی سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔

۲۰۶۔ وہ دن کہ اللہ تمام رسُولوں کو جمع کرے گا اور ان سے دریافت کرے گا کہ بتاؤ تمہیں

تمہاری امتوں کی جانب سے تمہاری دعوت کا کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں ہے یہ تو تیری ہی ہستی ہے جو غیبوں کی باتوں کی جاننے والی ہے۔ یہ سوال محشر میں امتوں کے روبرو پیغمبروں سے کیا جائے گا کہ دنیا میں جب تم ان کے پاس پیغام لے کر گئے تو انہوں نے کیا جواب دیا اور کہاں تک دعوتِ الٰہی کی اجابت کی۔ گزشتہ رکوع میں بتایا تھا کہ خدا کے یہاں جانے سے پہلے بذریعہ وصیت وغیرہ یہاں کا انتظام ٹھیک کر لو اب فرماتے ہیں کہ وہاں کی جوابدہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یعنی محشر کے دن جب خدائے قہار کی شانِ جلالی کا انتہائی ظہور ہو گا اور اعاظم کے بھی ہوش بجا نہ رہیں گے اولو العزم انبیاء کی زبان پر نفسی نفسی ہو گا اس وقت انتہائی خوف و خشیت سے حق تعالیٰ کے سوال کا جواب لا علم لنا ہمیں کچھ خبر نہیں کے سوا نہ دے سکیں گے۔ پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں سب کی طرف خدا کی نظرِ لطف و رحمت ہو گی تب کچھ عرض کرنے کی جرأت کریں گے۔ امام حسن اور امام مجاہد سے ایسا ہی منقول ہے لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس کے نزدیک "لا علم لنا" کا مطلب یہ ہے کہ خداوندا تیرے علم کامل و محیط کے آگے ہمارا علم کچھ بھی نہیں ہے گویا یہ الفاظ تادیب مع اللہ کے طور پر کہے۔ ابن جریج کے نزدیک لا علم لنا سے مراد یہ ہے کہ ہم کو معلوم نہیں کہ انہوں نے ہمارے پیچھے کیا کیا۔ ہم صرف ان ہی افعال و احوال پر مطلع ہو سکتے ہیں جو ہمارے سامنے ظاہری طور پر پیش آتے تھے۔ بواطن و سرائر کا علم علام الغیوب ہی کو ہے۔ آئندہ رکوع میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی جو جواب نقل فرمایا ہے وکنت علیھم شھیدا مادمت فیھم اس سے آخری معنے کی تائید ہوتی ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حوض پر بعض لوگوں کی نسبت حضور فرمائیں گے ھٰؤلاء اصحابی تو جواب ملے گا لا تدری ما احدثوا بعدك۔ یعنی آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کے پیچھے انہوں نے کیا حرکات کیں [1]

حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ یہ اللہ صاحب پوچھے گا کافروں کے سنانے کو کہ میں نے تم کو جن کی طرف روانہ کیا تھا انہوں نے قبول کیا یا نہیں اور پیغمبر حوالے رکھیں گے اللہ کے علم پر کہ ہم کو دل کی خبر نہیں، ظاہر کی ہے۔ یہ ان کو سنایا جو مغرور ہیں پیغمبروں کی شفاعت پر تا معلوم کریں کہ اللہ کے آگے کوئی کسی کے دل پر گواہی نہیں دیتا اور کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرتا۔

یہاں لا علم لنا کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو صرف اس محدود اور ظاہری جواب کو جانتے ہیں جو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہمیں اپنی زندگی میں محسوس ہوا۔ باقی رہا یہ کہ فی الحقیقت ہماری دعوت کا ردعمل کیا کہاں کس صورت میں کتنا ہوا تو اس کا صحیح جواب رب کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے[1]

انبیا سے یہ سوال کہ ماذا اجبتم؟ ان کے منکروں یعنی اُمت دعوت سے متعلق نہیں کیا جاتے گا بلکہ ان کی اُمتوں کے بارے میں ہوگا۔ جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ یعنی امت اجابت کہ جن لوگوں کو تم نے اسلام کی دعوت میں داخل کیا ان کا رویہ اور ردِ عمل کیا رہا؟ انبیا علیہم السلام پر سوال کی حقیقت چونکہ واضح ہوگی۔ اس وجہ سے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی محدود ہوگا اور اس سوال کے صحیح جواب کا انحصار اس پر ہے کہ انہیں اپنی امتوں کی بعد کی تبدیلیوں کا بھی علم ہو۔ چونکہ بعد کی تبدیلیوں کا انہیں علم نہ ہوگا۔ اس وجہ سے وہ اس جواب کے معاملے کو خدا ہی کے سپرد کریں گے۔

بہر حال علماء نے لا علم لنا پر بہت کچھ لکھا ہے ایک تو یہی کہ ہمیں علم نہیں کہ انہوں نے ہمارے بعد کیا کیا۔ ہم تو اپنے سامنے ان کے صرف ظاہری اقوال و اعمال کو جانتے تھے باطن کا علم تو صرف تجھی کو ہو سکتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ جواب محض غلبہ خشیت سے ادباً ہوگا یعنی تیرے علم محیط و کامل کے آگے ہمارا علم ہیچ ہے جو کچھ ہمیں علم ہے۔ بھی خود اس کا بھی تو ہم سے زیادہ عالم ہے عبد اللہ ابن عباس سے یہی منقول ہے۔ امام المفسرین ابن جریر طبری اور امام رازی دونوں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ دونوں تفسیروں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ امام رازی نے ایک تیسرے معنے بھی بیان کیسے ہیں کہ ہمیں جو کچھ حاصل ہے وہ محض درجہ ظن کی چیز ہے اور آج جو کشف حقائق کا دن ہے محض ظن کام نہیں دے سکتا۔ آج تو علم ہی کام دے گا اور وہ آپ ہی کو حاصل ہے۔

حضرت عیسٰی پر انعام الٰہی

۱۱۰ - اس روز اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسٰی میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر جو انعام کیسے ہیں ان کو یاد کرو۔ غالباً یہ پورا رکوع آنے والے رکوع کی تمہید ہے۔ احسانات یاد دلا کر وہ سوال ہوگا جو آئندہ رکوع میں مذکور ہے اول تو اولاد پر احسان کرنا من وجہ ماں پر احسان ہے دوسرے ظالم لوگ جو تہمت مریم صدیقہ پر لگاتے تھے حق تعالیٰ نے حضرت عیسٰی السلام کو ان کی برائت و نزاہت کے لیے

---

[1] تفہیم القرآن۔

برہان مبین بنا دیا اور تولد مسیح سے پہلے اور بعد عجیب و غریب نشانات حضرت مریم کو دکھلائے جو ان کی تقویت و تسکین کا باعث ہوئے یہ احسانات بلا واسطہ ان پر تھے[1] ابتدائی سوال تمام رسولوں سے ہوگا پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائے گی جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر تصریح ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت عیسٰی سے جو سوال کیا جائے گا وہ یہاں بطور خاص اس لیے نقل کیا جارہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو بتا دیا جائے کہ دنیا میں حضرت عیسٰی کے بارے میں دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار تھے۔ عیسائیوں کو بتا دیا کہ حضرت عیسٰی خدا کے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے محسن ہیں ان میں جو کچھ خوبی تھی وہ اللہ کا عطیہ اور دین تھی۔ عیسائیوں نے حضرت عیسٰی کو ان کے کمالات کی وجہ سے خدا بنا لیا اور حضرت عیسٰی کے محسن یعنی خالق کمال کو بھول گئے۔ اور یہودیوں کو جتا دیا کہ جس ذات پر اللہ سبحانہٗ نے ایسے عجیب و غریب انعامات فرمائے ہیں اس پر تہمت لگاتے ہیں اور اسے کذاب کہتے ہیں یہاں حضرت کی والدہ پر احسانات کی تفصیل نہیں کی بلکہ اشارہ کر دیا ہے اس کی پوری تفصیل سورہ آل عمران معالم العرفان کی جلد سوم میں آچکی ہے۔

حضرت عیسٰی کی شان اعجاز

۱۰۸۔ جب کہ میں نے روح القدس سے تمہیں قوت دی تھی، تم لوگوں سے گہوارے میں باتیں کرتے اور بڑی عمر میں پہنچ کر بھی۔ اور یاد کرو اس کو بھی کہ میں نے کتاب حکمت تورات اور انجیل کی تمہیں تعلیم دی تھی۔ اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مٹی لیتے اور پرندے کی شکل جیسی چیز بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ میرے حکم سے ایک پرندہ بن جاتا اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے اندھے اور برص کے بیمار کو اچھا کر دیتے اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے مردوں کو نکالتے تھے۔ گود میں جو کلام کیا اس کا ذکر سورہ مریم میں آئے گا انی عبد اللّٰہ اتانی الکتاب تعجب ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کے تکلم فی المہد کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ بارہ برس کی عمر میں یہود کے سامنے انہوں نے ایسی حکیمانہ دلائل اور براہین بیان فرمائیں کہ تمام علماء عاجز و مبہوت رہ گئے اور سامعین عش عش کرنے لگے یوں تو روح القدس سے حسب مراتب سب انبیاء علیہم السلام بلکہ بعض مومنین کی بھی تائید ہوتی رہی ہے۔ لیکن حضرت عیسٰی علیہ السلام کو جن کا وجود "نفخہ جبرئیلیہ" سے ہوا کوئی خاص فطری تائید اور مناسبت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حاصل ہے جسے تفضیل انبیاؑ کے بیان میں پیش کیا ہے تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض منھم من کلم اللہ ورفع بعضھم درجات و اتینا عیسی ابن مریم البینات وایدناہ بروح القدس۔

"روح القدس" کی مثال عالم ارواح میں ایسی سمجھو جیسے عالم مادیات میں قوت کہربائیہ (بجلی) کا خزانہ جس وقت اس خزانہ کا مالک معین اصول کے موافق کرنٹ چھوڑتا ہے اور جن اشیاء میں بجلی کا اثر پہنچاتا ہے ان کا کنکشن درست کر دیتا ہے تو فوراً خاموش اور ساکن مشینیں بڑے زور و شور سے گھومنے لگتی ہیں۔ اگر کسی مریض پر بجلی کا عمل کیا گیا تو مشلول اعضا اور بے حس ہو جانے والے اعصاب میں بجلی کے پہنچنے سے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بیمار کے حلقوم میں جس کی زبان بالکل بند ہو گئی ہو قوت کہربائیہ کے پہنچانے سے قوت گویائی واپس کی گئی ہے حتیٰ کہ بعض غالی ڈاکٹروں نے تو یہ دعویٰ کر دیا کہ ہر قسم کی بیماری کا علاج قوت کہربائیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ (دائرۃ المعارف)

جب اس مادی قوت کہربائیہ کا حال یہ ہے تو اندازہ کر لو کہ عالم ارواح کی کہربائیہ میں جس کا خزانہ روح القدس ہے کیا کچھ طاقت ہو گی۔ حق تعالیٰ نے حضرت عیسی السلام کی ذات گرامی کا تعلق روح القدس سے کسی ایسی خاص نوعیت اور اصول کے تحت رکھا ہے جس کا اثر کھلے ہوئے غلبہ روحیت تجرد اور مخصوص آثار حیات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان کا روح اللہ سے ملقب ہونا، بچپن، جوانی اور کہولت میں یکساں کلام کرنا۔ خدا کے حکم سے افاضہ حیات کے قابل کالبد خاکی تیار کر لینا۔ اس میں باذن اللہ رُوح حیات پھونکنا، مایوس العلاج مریضوں کی حیات کو باذن اللہ بدون توسط اسباب کے کارآمد اور بے عیب بنا دینا۔ حتیٰ کہ مردہ لاشہ میں باذن اللہ دوبارہ روح حیات کو واپس لے آنا۔ بنی اسرائیل کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا کر آپ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا۔ وغیرہ وغیرہ سب آثار اسی تعلق مخصوص سے پیدا ہوتے ہیں جو رب العزت نے کسی مخصوص نوعیت و اصول سے آپ کے اور روح القدس کے مابین قائم فرمایا ہے۔ ہر پیغمبر کے ساتھ کچھ امتیازی معاملات اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں۔ ان کے علل و اسرار کا احاطہ اسی علام الغیوب کو ہے۔ ان ہی امتیازات کو علماء کی اصطلاح میں فضائل جزئیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ایسی چیزوں سے کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی چہ جائیکہ "الوہیت" ثابت ہو۔ واذ تخلق من الطین میں خلق کا لفظ محض صوری اور حسی لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ خالق حقیقی احسن الخالقین کے سوا کوئی نہیں۔ اسی لیے باذنی کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور آل عمران میں باذن اللہ کی تکرار کرائی گئی ہے۔ بہر حال جو خوارق ان آیات میں اور ان سے پہلے "آل عمران" میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف سے ہوئے ہیں۔ ان کا انکار یا تحریف

صرف اسی ملحد کا کام ہے جو آیات اللہ کو اپنی عقل شخصی کے تابع کرنا چاہے۔ باقی جو لوگ قانون قدرت کا نام لے کر معجزات وخوارق کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا جواب ہم نے ایک مستقل مضمون میں دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ ہو سکے گا[1]

ان آیات میں حضرت عیسٰی کے بارے میں یہ باتیں بتائی گئی ہیں۔ اولاً آپ کو روح القدس کی تائید حاصل تھی، ثانیاً آپ گہوارے اور بڑی عمر میں باتیں کرتے تھے۔ ثالثاً اللہ نے آپ کو کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دی، رابعاً آپ مٹی سے پرندے جیسی شکل بناتے اس میں پھونک مارتے، تو وہ جیتا جاگتا پرندہ ہو جاتا۔ خامساً آپ مادرزاد اندھے اور برص والے کو اچھا کر دیتے تھے۔ سادساً آپ مُردوں کو موت کی حالت سے نکال کر زندگی کی حالت میں لے آتے۔ ان سب پر تشریحی بحث تیسری جلد میں گزر چکی ہے اس لیے ہم یہاں اس کا اعادہ نہیں کرتے ہیں۔ البتہ یہاں ہم اعجاز اور اس کی حیثیت، عقیدہ معجزات کی قرآنی اصطلاح، معجزہ کا سبب، معجزہ کا اہل ایمان پر اثر، سحر اور معجزے میں فرق، ساحر اور پیغمبر میں امتیاز، امکان استبعاد، یقین اور غایت معجزات پر کچھ اجمالی گزارشیں پیش کرتے ہیں۔

کیا معجزہ قرآنی اصطلاح ہے

حافظ ابن تیمیہ نے اپنی متعدد تصانیف میں بہت اصرار کے ساتھ اس پر زور دیا ہے کہ معجزات کا عنوان صحیح قرآن وسنت میں آیات وبراہین ہیں۔ اور یہی عنوان سلف نے اختیار کیا ہے اور معجزے کی صحیح حقیقت سمجھنے کے لیے یہی تعبیر کافی ہے لفظ آیت کا ترجمہ علامت اور نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم واحساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ فی الواقع صرف آیات وعلامات کی شناخت اور یاد ہے دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے ہو صرف آیات وعلامات سے، کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے یہ انسان ہے، یہ درخت ہے۔ ہم پہچانتے ہیں کہ یہ زید ہے یہ عمر ہے یہ میرا عزیز ہے، یہ میرا گھر ہے یہ تمام شناختیں آیات وعلامات کی مدد سے ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی شناخت کے لیے کچھ علامات اور نشانیاں ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح نبوت کے ساتھ بھی کچھ خاص نشانیاں ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

باسانی ان کی نبوت و رسالت کا یقین ہو سکتا ہے۔ ان ہی کا نام آیات نبوت ہے اور چونکہ یہ آیات ان کے فرستادہ الٰہی ہونے کا بیّن ثبوت ہوتی ہیں اس لیے قرآن نے ان کو برہان کے نام سے پکارا ہے۔

علم کلام کی اصطلاح میں ان آیات کا نام معجزات ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں ان کا عنوان علامات نبوت رکھا ہے اور جن مولفین نے اس موضوع پر کام کیا ہے انہوں نے اپنی تصانیف کا نام دلائل نبوت رکھا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ معجزے کے عنوان سے یہاں بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔

بہر حال قرآن کی زبان میں آیت و برہان ہو یا محدثین کی تعبیر میں اس کا عنوان دلائل و علامات ہو اور یا پھر متکلمین کی اصطلاح میں معجزات ہو ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں ہے چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل پڑا ہے اس لیے اسی کو اختیار کرتے ہیں۔

معجزہ کی حقیقت

معجزہ لغۃً لفظ عجز سے بنا ہے جو قدرت کی ضد ہے حرف ہا اس میں یا تو مبالغہ کے لیے ہے اور یا لفظ معجزہ آیت وغیرہ کی صفت ہے۔ یعنی آیت معجزہ ایسی نشانی جو لوگوں کو اس کے معارضہ سے عاجز کرنے والی ہے اور معجزہ میں فعل عجز پیدا کرنے والا اور فی الحقیقت منکروں کو عاجز کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ذریعے صادر ہوتا ہے نبی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

> اور معجزہ کو معجزہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جن کے سامنے وہ پیش کیا جاتا ہے وہ اس کے معارضہ سے عاجز آجاتے ہیں اور حرف ہا اس میں مبالغہ کے لیے ہے یا لفظ معجزہ صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے اور حضور انور کا مشہور معجزہ قرآن ہے۔
>
> (فتح الباری جلد ۶)

قاضی ابوبکر ابن الطیب الباقلانی فرماتے ہیں:

> ہمارے اس کہنے کا مطلب کہ قرآن معجزہ ہے ہمارے اصول پر یہ ہے کہ بندے اس پر قادر نہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معجزہ جو نبی کی صداقت کی دلیل ہوتا ہے اس کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ بندوں کی قدرت کے تحت داخل ہے بلکہ معجزہ کی قدرت پر اللہ تعالیٰ ہی منفرد ہے۔

بالکل اسی قسم کی تشریحات دوسرے علماء نے پیش کی ہیں مثلاً قاضی عیاض نے شفا میں، امام غزالی نے احیاء العلوم میں، امام عبدالوہاب شعرانی نے الیواقیت والجواہر میں شیخ ابن الہمام نے مسامرہ میں اور ان کے علاوہ دوسرے متکلمین نے بھی معجزہ کی یہی تشریح کی ہے۔ مشہور مفسر قرآن علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ معجزہ کے معجزہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں پانچ شرطیں ہوں۔

اوّلاً یہ کہ اس جنس کا ہو جس پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہ ہو۔ ثانیاً یہ کہ وہ خرق عادت ہو لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرا معجزہ یہ ہے کہ رات کے بعد دن آئے گا تو یہ معجزہ نہ ہوگا۔ اگرچہ اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں ہے لیکن یہ بات خارق عادت نہیں ہے۔

ثالثاً مدعی رسالت اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتا ہو کہ اللہ اس کے کہنے پر یہ معجزہ دکھلا دے گا مثلاً وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق کے لیے اس پانی کو تیل بنا دے گا یا جب وہ زمین کو حکم دے گا کہ حرکت میں آجائے تو فوراً ہلنے لگے گی۔

رابعاً یہ کہ وہ معجزہ مدعی نبوت کا مؤید ہو تاکہ وہ اسے اپنی نبوت کی دلیل بنا سکے۔ لہٰذا اگر کوئی جانور اس کے حکم سے بولنے لگے مگر یہ بولے کہ یہ شخص جھوٹا ہے نبی نہیں ہے تو اگرچہ جانور کا بولنا خرق عادت ہے لیکن اس کے دعویٰ کے خلاف ہے۔

خامساً یہ کہ مقابلہ میں کوئی شخص اس جیسا نہ لا سکے اگر کوئی شخص مقابلہ میں اس جیسا کردار پیش کر دے تو اسے معجزہ نہ کہیں گے۔

علامہ شاطبی غرناطی فرماتے ہیں۔

> انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری سے پہلے چونکہ انسان کی نگاہیں اس عالم میں سلسلہ اسباب کی خوگر ہوتی ہیں اور کسی خارجی قوت کے تحت اس سلسلہ اسباب کے محکوم ہونے کو انسان سوچ بھی نہیں سکتا بلکہ وہ اسباب اور مسببات کے درمیان عقلی لزوم سمجھتا ہے۔ اسی لیے انسان خرق عادت کو محال کہتا ہے۔ اگر نبوت آکر اعجازی کارناموں کی نمائش نہ کرتی تو انسان کا علم یہیں تک محدود ہو کر رہ جاتا۔ نبوت نے معجزات پیش کر کے ان اسباب کا راز فاش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان اسباب عادیہ کے درمیان لزوم عقلی نہیں ہے بلکہ یہ صرف اللہ سبحانہ کی شان خالقیت کا کرشمہ ہے اسباب میں تاثیر بھی اسی کی پیدا کردہ ہے اور وہ اس کے سلب کرنے پر بھی قادر ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آگ کا جلانا ایک دائمی تجربہ کے سوا کسی عقلی دلیل کا تقاضا ہے۔ چونکہ اسباب و مسببات کے مابین یہ ارتباط

کسی عقلی دلیل کا تقاضا نہیں ہے اس لیے خرق عادت کو محال رکھنا صحیح نہیں ہے۔
علامہ سید رشید رضا اپنی تفسیر المنار میں رقمطراز ہیں۔

معجزے کی حقیقت کے متعلق سب سے زیادہ مشہور اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عادی نظام کے خلاف صرف اپنی قدرت سے ظاہر فرماتا ہے تاکہ یہ ثابت کر دے کہ نوامیس طبعیہ خود اس کے محکوم ہیں۔ وہ ان کا محکوم نہیں ہے جیسے چاہے وہ ان میں تصرف کر سکتا ہے۔

معجزہ کوئی فن اور آرٹ نہیں ہے

بلا شبہ خدائی کام اور بندوں کے کام میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اتارتا ہے لیکن عاقل کو کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔ انسان جانداروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے مگر ایک مچھلی کی آنکھ ایک مکھی کا پر ایک مچھر کی ٹانگ بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم مل کر بھی نہیں بنا سکتا۔ لاکھوں مجسمے کروڑوں بیل بوٹے دنیا میں کاریگر اور فن کار بناتے ہیں لیکن مچھر کا ایک پر بنانے سے بالکل عاجز ہیں۔
اسی کا نام فعل خداوندی ہے اور جب ایسا فعل ان اسباب کے بغیر جو اس کے وجود و بروز کے لیے ضروری ہیں کسی مدعی نبوت کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے تو اسی کا نام معجزہ ہے اور جب معجزہ کا فعل خداوی ہونا معلوم ہو گیا تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اس میں بھی کسی صانع کی صنعت کا اور کسی فن کار کی فن کاری کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تنجیم، کہانت، مسمریزم، سحر اور شعبدہ کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں ہے کہ تعلیم و تعلم سے حاصل ہو جائے۔ یہ فنون سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے اور نہ نبی کے اختیار کو اس میں دخل ہے، نہ معجزہ ظاہر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ ان کو معلوم ہے کہ جب چاہیں ویسا ہی عمل کر کے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیں بلکہ جس طرح ہم قلم لے کر لکھتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الواقع اس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہی صورت معجزے کی بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ انبیاء جس وقت چاہیں انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دیں۔ بلکہ جس وقت اللہ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے تو جاری ہو سکتی ہیں برخلاف ان فنون کے جو تعلیم و تعلم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان میں جس وقت چاہیں قواعد و ضوابط مقررہ اور خاص خاص اعمال کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کوائف دکھلائے جا سکتے ہیں۔ آج تک مدعیان نبوت و اعجاز کی طرف سے معجزہ کی تعلیم و تعلم کے لیے کوئی درس گاہ وجود میں نہیں آئی۔

اور نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ مقرر ہوا نہ کوئی کتاب تنجیم اور مسمریزم کی طرح معجزات کے فن میں تصنیف ہوئی۔
اس سے پتہ چلا کہ معجزہ خدائی فعل ہے۔ اسی لیے اس جیسے فعل سے پوری دنیا عاجز ہے۔

معجزے میں دعوئ نبوت کی شرط

معجزے میں دعوئ نبوت کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ سب فرقے مانتے ہیں کہ خدا سب سے زیادہ سچا ہے اور جھوٹ کی کمزوری سے اللہ کی ذات پاک ہے۔ جھوٹ کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص خود خلاف واقعہ بات کہے اور کبھی اس طرح کہ جھوٹی بات جو دوسرے نے کہی اس کی تصدیق کرے۔ پھر تصدیق بھی قولی اور عملی دونوں طرح ہوتی ہے اور عملی تصدیق کا وزن کبھی تصدیق قولی سے زیادہ ہوتا ہے جیسے ایک شخص بادشاہ کی مجلس میں کہتا ہے کہ بادشاہ کو میرے ساتھ خاص لگاؤ ہے اور اس کا یہ دعویٰ بادشاہ خود مجلس میں سن رہا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے بادشاہ سے کہتا ہے کہ آپ ذرا کھڑے ہو جائیے اور بادشاہ ازراہ مہربانی اس کے کہنے سے کھڑا ہو جاتا ہے یہ بادشاہ کی عملی تصدیق ہے جو قولی تصدیق سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔ لہٰذا جو نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں میری بات سنو گے تو نجات ہے ورنہ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے اور یہ اللہ کی زمین میں کھلے آسمان کے نیچے کرتا ہے کہ میری پیروی کے بغیر نجات نہیں ہے اور اس کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا جو اس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گی۔ پھر اس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اس کے دعوے کی تصدیق ہو گی۔ فی الواقع معجزہ نبی کے دعویٰ کی تصدیق عملی ہوتی ہے اور اللہ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا لہٰذا نبی کا دعویٰ معجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے اس لیے ہم بلا خوف تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کسی انسان کو یہ دسترس نہیں کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے ایسے خوارق دکھلائے کہ دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز ٹھہرے۔

قرآن میں سنت اللہ کا مفہوم

وہ لوگ جو خرق عادت اور خلاف اسباب و علل کے محال ہونے پر قرآن عزیز کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں سنت الٰہی کے تبدیل نہ کرنے کا ذکر ہے۔ وہ فی الواقع دانستہ یا نادانستہ

مفہوم قرآن کی تجدید کے مجرم ہیں۔ قرآن میں سنت الٰہی کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن میں استعمال ہوا ہے، خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح و کامیابی عطا فرماتا ہے۔ گنہ گار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتی ہیں۔ اور پند و موعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر عذاب نازل کرتا ہے وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلے کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گڑگڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک اور برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ لفظ سنت کی طرح فطرت کے ساتھ ان لوگوں کا برتاؤ یہی ہے۔ قرآن میں ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ۔ اعجاز کے محال ہونے پر اس آیت کو پیش کرنا قرآن کی کھلی معنوی تحریف ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں فطرۃ اللہ سے توحید مراد ہے جسے قرآن دین فطری سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کی اس اصطلاح کی تفسیر خود زبان نبوت نے بھی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

> کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں جس طرح ہر جانور صحیح و سالم بچہ پیدا کرتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ۔ (صحیح بخاری)

بہر حال سنت اللہ اور فطرۃ اللہ کو آڑ بنا کر معجزات کا انکار کرنا قرآن کی نبوت کی اور اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

عقیدہ معجزہ کی قرآنی اصلاح

عام لوگوں میں انبیاء کی نسبت یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ چنانچہ موجودہ انجیلوں کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جیسے چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت

اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے ان آیات میں نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے باذنی کا اضافہ کر کے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ صاف اور کھلے طور پر یہ ضابطہ بتایا ہے۔

ما کان لرسول ان یاتی باٰیۃ الا باذن اللہ

کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ لائے۔

انجیل میں حضرت عیسٰی کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجے میں بیان ہوتے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسٰی کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کر دی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے لیکن قرآن عزیز نے حضرت عیسٰی کے تمام معجزات کو بیان کر دیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس عقیدہ باطلہ کو بھی رد کرتا گیا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا۔ حضرت عیسٰی کے اختیار سے نہیں۔ قرآن کی اس آیت کو بار بار پڑھیے اور غور فرمایئے کہ قرآن کی راہ کیا ہے۔ قرآن کی اسی تعلیم کا اثر ہے کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں کبھی مشتبہ نہیں ہوئیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور تمام دنیا میں توحید کامل کی علمبرداری صرف اسلام کے سپرد ہوئی۔ اس کے لیے معالم القرآن کی تیسری جلد کا بھی مطالعہ فرمایئے۔ معجزات پر اصولی بحث کے لیے تیرہویں جلد کا انتظار فرمایئے۔

یہودی سازش اور اللہ کا تحفظ

۲۰۹۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب میں نے تم سے بنی اسرائیل کو ہٹا دیا اس وقت جبکہ تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر پہنچے تھے انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ نشانیاں جادو کے سوا کچھ نہیں یعنی معجزات اور فوق العادت تصرفات کو جادو کہنے لگے اور انجام کار حضرت مسیح کے قتل کے درپے ہوئے۔ حق تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے حضرت مسیح کو آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ اس طرح یہود کو ان کے ناپاک مقصد میں کامیاب ہونے سے روک دیا گیا۔[1] اس آیت میں بنی اسرائیل کی ان سازشوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے سیدنا مسیح کے قتل اور سولی کے لیے کیں۔ یہ آیت صراحۃً رفع عیسٰی کو بتا رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہود کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت عیسٰی سے روکنے کو حضرت عیسٰی پر اپنا انعام بتا رہا ہے اور اس کو حضرت کے معجزات میں شمار کر رہا ہے معاذ اللہ اگر حضرت عیسٰی یہودی سازش کا شکار ہو کر تختہ دار پر لٹک جائیں تو اس صورت میں نہ یہ کوئی اعجاز ہو گا اور نہ امتنان یعنی اگر یہودی سازش کو ناکام کر کے حضرت عیسٰی کو اللہ سبحانہ، نے صلیب اور قتل سے حفاظت نہ کی ہوتی تو اللہ روزِ قیامت اس کا احسان نہ جتاتا کیونکہ اس سے خدا کا کذب لازم آتا ہے تعالی اللہ عما یقول الظالمون۔ اصل ارشاد میں کففت آیا ہے یعنی میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روک دیا۔ قرآن میں اسی قسم کی تعبیر اہل ایمان کے لیے آئی ہے۔

اذ ھمّ قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم

جب کافروں نے تمہاری طرف دست درازی کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔

اس آیت میں اس یہودی سازش کی طرف اشارہ ہے جو حضور انور کے خلاف انہوں نے کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بتایا ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے حضور انور اور آپ کے خاص خاص صحابہ کرام کو کھانے کی دعوت پر بلایا اور پوشیدہ طور پر یہ سازش کی تھی کہ اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے لیکن عین وقت پر اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا آپ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا۔ ٹھیک اسی طرح یہودیوں نے حضرت کو مارنے کی سازش کی اور اللہ تعالیٰ نے یہود کو حضرت سے روک دیا۔ دونوں معجزے ہیں۔ ایک محمد رسول اللہ کا اور دوسرے عیسٰی رسول اللہ کا دونوں کی روح ایک ہے اور دونوں کا انداز بیان ایک ہے، حضرت عیسٰی کو خطاب کر کے فرمایا یا عیسٰی ابن مریم اذکر نعمتی علیک اور اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا یا ایھا الذین آمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم حضرت کو فرمایا کففت عنک بنی اسرائیل اور اہل ایمان سے کہا اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم۔ جیسے اس واقعہ میں حضور انور کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ ٹھیک اسی طرح حضرت مسیح کو بھی یہودیوں کی جانب سے کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

یہاں حضرت عیسٰی پر امتنان کے موقع پر اس فقرے میں بہت گہری معنوی بلاغت ہے۔ اول نجات کی تعبیر کو چھوڑ کر کف کی تعبیر اختیار کی۔ یعنی یہ نہیں فرمایا اذ نجیتک من بنی اسرائیل ثانیاً کففت کا مفعول بنی اسرائیل کو بنایا یہ نہیں فرمایا کففتک عن بنی اسرائیل ہٹا دیا میں نے تجھے بنی اسرائیل سے بلکہ فرمایا کففت بنی اسرائیل عنک میں نے بنی اسرائیل کو تیرے سے ہٹا دیا۔ کیونکہ حضرت عیسٰی کو نقصان پہنچانا یہودی چاہتے تھے اس لیے ان ہی کو ہٹا دینے کا ذکر مناسب تھا۔ اس طرح یہ

آیت قرآن کی دوسری آیت کی تفسیر ہے جو اسی موضوع پر جلد سوم میں گزر چکی ہے یعنی و مطھرك من الذین کفروا۔ اس میں بھی تطہیر سے مراد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ یہودیوں کے ہاتھ سے پاک رہیں گے۔ تمام شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں یہی بات لکھی ہے کہ اللہ سبحانہ' نے حضرت عیسیٰ کو یہود کے ہاتھوں میں گرفتاری سے محفوظ رکھا ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان اندلسی، الوسی بغدادی، رازی، قرطبی اور حال کے مفسرین میں سے سید رشید رضا، المراغی، اور سید قطب نے یہی بات لکھی ہے۔ الغرض یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی طرف یہاں قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ کے مارنے کی بار بار کوشش کی اور ہر دفعہ اس لیے ناکام رہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو حضرت عیسیٰ سے ہٹائے رکھا۔ انجیل میں بھی ایسی تصریحات موجود ہیں۔

ساحر اور پیغمبر میں فرق و امتیاز

آخر میں فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ کے ان اعجازی کارناموں کو سحر اور جادو کہا ہے۔ حالانکہ سحر و شعبدہ میں صرف دل لگی کے وقتی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد، تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل کے اسباب و وسائل ہوتے ہیں۔ ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے لیکن پیغمبر کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح، قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ پیغمبر بشیر نذیر، ہادی اور مزکی ہوتا ہے، ساحر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشہ گری کے سوا کوئی اور بات اس کے اندر نہیں ہوتی۔

ساحر صرف کچھ انسانوں میں تصرف کر سکتا ہے چاہے وہ نظر بندی کی حد تک ہو یا اس سے زیادہ بیماری اور ہلاک کرنے کی حد تک بھی ہو۔ پھر ساحر کی زندگی ہمیشہ ایک پست زندگی ہوتی ہے۔ اس کا نصب العین صرف معاشی مسئلہ ہوتا ہے، آخرت کی لازوال زندگی ساحر کے دائرۂ فکر میں بھی نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے عملیات میں ہمیشہ ارواح خبیثہ اور شیاطین کا آسرا تلاش کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انبیا کا مطالعہ کرو تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کی تمامتر زندگی تقویٰ طہارت، عفت و پاکیزگی اور اخلاق و مروت کا مرقع ہوتی ہے۔ ان کا نصب العین آخرت کی فوز و فلاح اور انسانی زندگی کی آراستگی ہوتا ہے۔ ان کے اعجازی کارناموں کا جو بھی مقابلہ کرتا ہے وہ شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ ساحر سحر سے حواس کو معطل کرتا ہے اور نبوت اعجاز سے معطل شدہ حواس کو بیدار کرتی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ نبی اور ساحر میں

زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ ان میں کوئی وجہ مشترک ہی نہیں ہے۔ ان دونوں میں خبیر، مخبر اور غایت ہر لحاظ سے فرق ہے۔ نبی کو خبر دینے والی اللہ کی ذات ہوتی ہے اور ساحر کو شیطان۔ نبی کی وحی سرتاسر ہدایت ہوتی ہے اور شیطان کی کارفرمائی سراپا ضلالت۔ نبی کی بات میں صداقت اور حقیقت ہی حقیقت ہوتی ہے اور ساحر کا کلام بیشتر جھوٹ کا پشتارہ اور بے معنی باتوں کی ملمع کاری اور صرف خیال ہی خیال ہوتا ہے۔

بہرحال یہ تمام باتیں روزِ قیامت حضرت عیسٰی کو مخاطب اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا حضرت عیسٰی کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ پر جو بھی انعام ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے جو معجزے بھی دکھائے ہیں سب اللہ کے اذن اور حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے حضرت عیسٰی کو جن خطرات میں ڈالا ہے ان سے اللہ تعالیٰ ہی نے محفوظ رکھا۔ حضرت عیسٰی اللہ کی عنایات سے صاحبِ کمال ہیں خالقِ کمال نہیں۔ خالقِ کمال صرف اللہ کی ذات ہے۔ عبادت صاحبِ کمال کی نہیں بلکہ خالقِ کمال کی کی جاتی ہے۔ پھر سب کچھ اللہ نے کیا اور اس کے سب سے بڑے گواہ خود حضرت عیسٰی ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ انہوں نے کس کے کہنے سے ان کو معبود بنایا تھا۔ یہاں باذنی کی تکرار اسی نکتہ کو سمجھانے کے لیے نہایت بلیغ ہے۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّنَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا
وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ۝ إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ
مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ
اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَ
تَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ
الشَّاهِدِينَ ۝ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا
مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ ۖ
وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا
عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا
مِنَ الْعَالَمِينَ ۝

اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے
رسول پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور

خدایا تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں[۲۱۰]۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جب حواریوں نے
کہا تھا کہ اے عیسٰی ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے
کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے۔ عیسٰی نے کہا کہ خدا سے ڈرو
اگر تم مومن ہو[۲۱۱]۔ انہوں نے کہا کہ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان
سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں پتہ لگ جائے
کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں[۲۱۲]۔
اس پر عیسٰی ابن مریم نے دعا کی خدایا ہمارے رب ہم پر آسمان
سے ایک خوان روانہ کر دے کہ اس کا آنا ہمارے اگلوں اور پچھلوں
کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور
دے تو ہم کو تو بہترین دینے والا ہے[۲۱۳]۔ اللہ نے فرمایا میں تمہارے
لیے خوان روانہ کروں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد انکار کرے
گا اسے عذاب دوں گا۔ ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی کو بھی

ویسا عذاب نہیں دوں گا۔ ۲۱۴

نزول مائدہ کے بارے میں درخواست

چونکہ حواریوں کا ذکر آگیا تھا اس لیے بطور جملہ معترضہ کے یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح سے براہ راست جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ حضرت مسیح کو ایک انسان اور محض خدا کا بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریک خدا ہونے کا تصور نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیح نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندہ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

نبوت کی زندگی علم و عمل کا مجموعہ ہوتی ہے اور اس کے تمام ارشادات و تعلیمات سے صرف انہی دونوں کی ترقی اور تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے نبوت کے بعض معجزات کا اثر صرف علم و یقین پر پڑتا ہے۔ اس سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، جیسے ہاتھ کا چمک اٹھنا، چاند کا شق ہونا، لاٹھی کا سانپ بن جانا، مادرزاد اندھے کا بینا ہو جانا۔ برص کے بیمار کا تندرست ہو جانا، مردوں کا زندہ ہو جانا، یہ اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں لیکن ان کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے نے انکار کیا۔ نبوت کے کچھ معجزے ایسے ہوتے ہیں جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنی اسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا لیکن اس کے ذریعے سے پانی کا جو چشمہ اُبلا وہ ان کے لیے حیات بخش ثابت ہوا۔ پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان سے علم و یقین کو ترقی ہوتی ہے اور دوسرے قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصرت الٰہی کہا ہے۔ پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں لیکن تائید اور نصرت الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔

آغاز نبوت میں چونکہ انبیاء صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں اور کفار کی طرف سے انہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے اور انہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے۔ اس لیے اول انبیاء سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے جن کا اثر علم و یقین پر پڑتا ہے۔ اس کے بعد انبیاء کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہوتا ہے جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے

یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن خلوص نیت شدت ایمان کی بنا پر کسی معجزے کا خواستگار نہیں ہوتا۔ تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے اور ہر موقع پر اس کی حفاظت اور تائید کرتی ہے۔ عام معجزات اور نصرت الٰہی میں یہ فرق ہے کہ جو معجزات بطور حجت و برہان پیش کیے جاتے ہیں وہ صرف انبیاءؑ کی تنہا روحانی طاقت کا فیضان ہوتے ہیں۔ یعنی ان کا یہ فیضان سبب ہوتا ہے ارادہ الٰہی کے ظہور کا لیکن نصرت الٰہی میں پیغمبر کی روحانی طاقت کے ساتھ مومنین کے کمال ایمان، شدت یقین، تزکیۂ نفس اور استعداد قلب کی شرکت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں حواریین مسیح نے جب فاقہ کی حالت میں نزول مائدہ کی درخواست کی تو انہوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی۔

۱۱۰ - اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور خدایا تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں - یعنی میرے اس انعام کو بھی یاد کرو کہ جب بنی اسرائیل کی برائے عامہ تمہاری تکذیب کر رہی تھی تو میں نے حواریین کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ تجھ پر ایمان لائیں اور اس ماحول میں تیرے مویدو ناصر بن کر کھڑے ہوں - ایمان کو دل میں ڈالنے کا خصوصی طور پر یہ جتانے کے لیے تذکرہ کیا کہ حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل و توفیق کا نتیجہ تھا ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اس آبادی میں ایک تصدیق کرنے والا بھی اپنے بل بوتے پر پیدا کر لیتا۔

اصل ارشاد میں اوحیت آیا ہے - وحی کا لفظ یہاں اصطلاحی معنے میں نہیں ہے بلکہ لغوی معنے میں ہے یعنی دل میں کوئی ارادہ ڈالنا، حواری پر کچھ اجمالی بحث معالم القرآن کی تیسری جلد میں پڑھ چکے ہو۔ وہاں یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہی حواریین ہیں جو پوری قوم کے اندر سے حضرت عیسٰی پر ایمان لائے تھے۔ انہوں نے دعوت کے کام میں آپ کی مدد کی اور ان ہی کو انتخاب کے خلیفہ کی حیثیت حاصل ہوئی قرآن نے ان کا چہرہ تیسرے پارے میں اس پاکیں اور اٹھائیسویں پارے میں پیش کیا ہے۔ قرآن نے جس انداز میں ان بزرگوں کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ اناجیل میں اسی قدر ان کو غلط اور بھونڈے انداز میں روشناس کرایا گیا ہے۔ آئیے یہاں دونوں کا تقابلی مطالعہ کر لیجئے۔

حواریین مسیح کا قرآن و اناجیل میں چہرہ

قرآن عزیز نے عیسٰی کے حواریوں کے مناقب بیان کیے۔ سورۃ آل عمران میں پڑھ چکے ہو کہ حضرت مسیح نے جب دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارا تو ان ہی حواریین نے نحن انصار اللہ کا نعرہ بلند کیا اور یہی

وہ پاک ہستیاں ہیں کہ جب اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کونوا انصار اللہ کی ترغیب دی تو تذکیر بایام اللہ کے پیش نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرت حق کے لیے آمادہ کیا۔
مگر اس کے برعکس اناجیل کا حال یہ ہے کہ ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہیں۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مشہور و معتمد حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت مسیح کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے تھے اس طرح مذکور ہے۔

> یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دے گا۔ شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا کہ اے خداوند وہ کون ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے۔ پھر اس نے نوالہ ڈبویا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہودا کو دیا۔ اس نوالہ کے بعد اس میں شیطان سما گیا۔ باب ۱۳۔ آیت ۲۱-۲۷۔

اور انجیل متی میں اس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو بقول اناجیل ساری عمر حضرت مسیح کا پیارا اور معتمد رہا لکھا ہے کہ:

> شمعون پطرس نے اس سے کہا اے خداوند تو کہاں جاتا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آسکتا، مگر بعد میں میرے پیچھے آئے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آسکتا میں تو تیرے لیے اپنی جان دے دوں گا۔ یسوع نے جواب دیا کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا۔ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔

اور اسی متی انجیل میں تمام شاگردوں حواریوں کی بزدلی اور حضرت مسیح کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

> اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہ تو حواریوں کے بارے میں اناجیل کا بیان ہے مگر قرآن کی شہادت یہ ہے من انصاری الی اللہ کہ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو دین حق کی نصرت کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فدا کارانہ جذبے کے ساتھ یہ جواب دیا کہ نحن انصار اللہ اور پھر حضرت مسیح کے سامنے اپنے استقامت دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا۔

انجیل و قرآن کے اس تقابلی مطالعہ کو دیکھ کر ہر ایک انصاف پسند یہ گواہی دے گا کہ قرآن کی راہ حق و صواب کی راہ ہے اور انجیل کی راہ مسیح کے صلب اور تثلیث کے گھروندے کو قائم کرنے کی ایک ناروا کوشش ہے اور اس آیت نے یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ حواریین نے جس دین کو قبول کیا تھا وہ مجوسیت اور نصرانیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

خوانِ نعمت کی فرمائش

۱۱۲ ۔ یہ بھی یاد رکھو کہ جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے عیسٰی ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے عیسٰی نے کہا کہ خدا سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ "کر سکتا ہے" اس لیے کہا کہ آپ کی رعایت اور دعا سے ہمارے لیے بطور خرق عادت نہ معلوم ایسا کرے یا نہ کرے۔ آسمان کی طرف سے بے محنت روزی پہنچ جایا کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ خوان جنت ہی کا ہو۔ حضرت عیسٰی نے فرمایا کہ اتقوا اللہ یعنی ایماندار بندے کو لائق نہیں ہے کہ ایسی غیر معمولی فرمائشیں کرکے خدا کو آزمائے خواہ اس کی طرف سے کتنی مہربانی کا اظہار ہو۔ روزی ان ہی ذرائع سے طلب کرنی چاہیے جو قدرت نے اس کی تحصیل کے لیے مقرر فرما دیے ہیں۔ بندہ جب خدا سے ڈر کر تقویٰ اختیار کرے تو اسی پر ایمان و اعتماد رکھے تو حق تعالیٰ ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب[1]

آیت میں تین باتیں تشریح طلب ہیں۔ اول یہ کہ حواریین نے حضرت مسیح کو یا عیسٰی ابن مریم سے خطاب کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مائدہ کے اتارنے کی درخواست حواریوں نے حضرت مسیح سے نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ ھل یستطیع ربک، تیسرے یہ کہ حضرت مسیح نے ان کی اس قسم کی درخواست کو خلافِ ادب قرار دیا ہے۔

یا عیسٰی ابن مریم کہہ کر حواریین کا حضرت مسیح کو مخاطب کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ حضرت مسیح کی الوہیت کا کوئی تصور حواریین کے ذہن میں نہ تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو حضرت عیسٰی اور تمام کائنات کا رب مانتے تھے۔ ان کے یہاں حلول اور تثلیث کا کوئی تصور نہ تھا۔ انجیل میں حضرت مسیح کے لیے حواری ربی اور خداوند کے الفاظ ضرور بولتے ہیں لیکن یہ استاد کے معنے میں ہیں انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مگر تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو، کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ۔ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔ متی ۲۳ - ۸ تا ۱۰ -

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواری حضرت مسیح کو ربی یا خداوند کہتے تھے وہ استاد اور ہادی کے معنے میں کہتے تھے۔ معبود اور الٰہ کے معنے میں نہیں لہٰذا اس لفظ سے تو اس پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حضرت مسیح کو خدا سمجھتے تھے اور اس ایک لفظ کے سوا کوئی ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے عقیدہ تثلیث یا حلول کا کوئی اشارہ ملتا ہو۔ اس کے برعکس ایسی واضح عبارتیں ضرور ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح حواریوں کے نزدیک ایک پیغمبر تھے اور بس، حضرت پطرس حواریوں میں بلند ترین مقام کے حامل ہیں وہ ایک بار یہودیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں،

اے اسرائیلیو! یہ باتیں سنو کہ یسوع ناصری ایک شخص تھا جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں اور عجیب کاموں اور نشانوں سے ثابت ہوا جو خدا نے اس کی معرفت تم میں دکھائے چنانچہ تم آپ ہی جانتے ہو۔"

(اعمال ۲، ۲۲)

اور آگے ایک موقع پر فرماتے ہیں؛

ابرہام اور اسحاق اور یعقوب کے خدا یعنی ہمارے باپ دادے کے خدا نے اپنے خادم یسوع کو جلال دیا۔ (اعمال ۳ - ۱۳)

اور کتاب اعمال ہی میں ہے کہ ایک مرتبہ تمام حواریوں نے ایک زبان ہو کر خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہا۔

کیونکہ واقعی تیرے پاک خادم یسوع کے برخلاف جسے تو نے مسح کیا ہیرودیس اور پنطیس، پیلاطس غیر قوموں اور اسرائیلیوں کے ساتھ اسی شہر میں جمع ہوئے۔

(اعمال ۴، ۲۷)

اس کے علاوہ ایک موقع پر برنباس حواری کہتے ہیں۔

دلی ارادے سے خداوند سے لپٹے رہو کیونکہ وہ نیک مرد روح القدس اور ایمان سے معمور تھا۔

(اعمال ۱۱، ۲۳، ۲۴)

اس میں بھی حضرت مسیح کو صرف نیک مرد اور مومن کہا گیا ہے۔

یہ تمام عبارتیں پوری صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہیں کہ حواریین حضرت مسیح کو ایک شخص اور خدا کی طرف سے "پیغمبر" اور اللہ کا خادم اور مسیح سمجھتے تھے۔

دوسری بات کہ حواریوں نے مائدہ کے اتارنے کا مطالبہ حضرت مسیح سے نہیں کیا یہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ حواری حضرت مسیح کو بالذات معجزے دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے مائدہ اتارے جانے کے لیے جو درخواست کی وہ حضرت عیسیٰ سے نہیں کی بلکہ یہ درخواست کی کہ اگر یہ بات آپ کے خدا کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو آپ اللہ سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لیے مائدہ اتار دے۔

اصل ارشاد میں هل يستطيع ربك ان ينزل کے الفاظ آتے ہیں۔ عام شارحین قرآن نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے، یہ تعبیر دعوئ ایمان کے ساتھ عام شارحین قرآن پر گراں ہوتی ہے۔ اس کے انہوں نے متعدد جواب دیے ہیں۔ کچھ نے کہا کہ۔ مطلب یہ ہے کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا خداوند عالم آپ کے طفیل میں آپ کے خادموں کے لیے اپنے عام دستور اور عادت کے خلاف آسمان سے خوان نعمت اتار سکتا ہے۔ ہم تو اس قابل نہیں ہیں کہ ہمارے لیے آسمان سے خوان اتارا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ جیسی برگزیدہ ہستی بارگاہِ خدا میں یہ سوال کرے اور قبول ہو جائے تو آپ کے طفیل ہماری یہ آرزو پوری ہو جائے۔

اس صورت میں عبارت یوں ہو گی هل تستطيع سوال ربك کیا آپ اپنے رب سے سوال کر سکتے ہیں اس کی تائید اس قرأت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت معاذ جیسے علماءِ صحابہ سے منقول ہے یعنی هل تستطيع ربك کیا آپ اپنے رب سے یہ سوال کر سکتے ہیں۔ گویا ان کا سوال خدا کے کر سکنے کا نہیں بلکہ حضرت مسیح کے سوال کر سکنے کا ہے۔

اور کچھ کہتے ہیں کہ حواریین کا سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی حکمت سے متعلق ہے کہ اس قسم کی کھلی ہوئی نشانی دکھانا اس کی حکمت کا تقاضا بھی ہو گا یا نہیں۔ حواریین باایمان لوگ تھے۔ وہ اس حقیقت سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ ان کی یہ درخواست بنی اسرائیل کے خدا کو دیکھنے کے مطالبہ سے مشابہ ہے۔

اور کچھ کا خیال ہے کہ یہاں استطاعۃ اطاعۃ کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کا رب آپ کی یہ بات مانے گا اور آپ کی یہ دعا قبول کرے گا۔ لوگ تو اسے ایک درجہ کا تکلف ہی قرار دیتے

ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں استطاعۃ ایسا ہے جیسے استجابت، اگر اجابت اور استجابت درست ہے تو اطاعۃ اور استطاعۃ میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

تیسری بات آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ حضرت مسیح نے ان کی اس درخواست کو خلاف ادب قرار دیا ہے اور فرمایا اتقوا اللہ ان کنتم مومنین، یعنی تمہارا یہ سوال اوّل تو خلاف ادب ہے۔ اس قسم کی فرمائشیں معاندین کا طریقہ ہے اور پھر اس سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میری نبوت و رسالت میں شک ہے۔ گویا اس سوال سے مترشح ہوتا ہے کہ تم اپنے ایمان کو معجزات و خوارق کے مشاہدے پر موقوف رکھنا چاہتے ہو۔ یہ شک و تردد کی علامت ہے۔ مومن صادق کے شایان شان نہیں ہے کہ اپنے مولیٰ کو آزماتے یا یہ مطلب ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ کام کرے اور محنت کرے اور اپنی معاش کے لیے تگ و دو کرے۔ خوارق کے ذریعے معاش کے مسائل حل کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا ہے۔ یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا۔

نزول مائدہ کے لیے اصرار

۱۱۲۔ انہوں نے کہا کہ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں پتہ لگ جائے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ یعنی آزمانے کو نہیں مانگتے بلکہ برکت کی امید پر مانگتے ہیں کہ غیب سے بے محنت روزی ملتی ہے تاکہ اطمینان قلب اور دلجمعی سے عبادت میں لگے رہیں اور آپ نے جو غیبی خبریں نعمائے جنت وغیرہ کے متعلق دی ہیں، ایک چھوٹا سا نمونہ دیکھ کر ان کا بھی یقین کامل ہو جاتے اور ایک عینی شاہد کے طور پر ہم اس کی گواہی دیں جس سے یہ معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم خدا کے لیے تیس روزے رکھ کر جو کچھ طلب کرو گے وہ دیا جائے گا۔ حواریین نے روزے رکھ لیے اور مائدہ طلب کیا و نعلم ان قد صدقتنا سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم[1]

اس آیت میں حواریین نے اپنی طلب کے تین فائدے بتائے اوّل یہ کہ ضرورت کے وقت میں ہم اسے کھائیں گے اور اس طرح ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو جائیں گے کیونکہ جو رزق آسمان سے آئے گا وہ سراسر بابرکت ہوگا اور اس کے کھانے سے ظاہری اور باطنی شفا اور صحت حاصل ہوگی۔ اور اللہ کی عبادت اور طاعت میں قوت کا ذریعہ بنے گا۔ دنیا کے رزق سے بعض اوقات طبیعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں معصیت کا داعیہ پیدا ہوتا ہے مگر جو رزق آسمان سے نازل ہوگا وہ دل میں اللہ کی طاعت اور بندگی ایسا جوش و ولولہ پیدا کرے گا کہ ہم میں رنگِ ملائکہ پیدا ہو جائے گا۔ دوسرے کہ ہمارے دل مطمئن ہو جائیں یعنی ہم چاہتے ہیں کہ عالمِ غیب کے بارے میں ہم جو کچھ مانتے ہیں اس معجزہ کے مشاہدے سے اس کے بارے میں ہمارے دلوں میں سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہمیں پتہ لگ جائے کہ نتائجِ ایمان کے بارے میں آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ حقیقت اور امرِ واقعہ ہے۔ اگرچہ استدلالی طریقہ پر آپ کی صداقت کا ہمیں پہلے ہی یقین ہے مگر ہم نظریاتی علم کے ساتھ علمِ شہودی سے اپنے ایمان و یقین میں اضافہ چاہتے ہیں، چوتھے یہ کہ ہم بنی اسرائیل کے سامنے گواہی دیں اور آپ کی نبوت و رسالت کو ثابت کر سکیں۔

نزولِ مائدہ کے بارے میں حواریین کی زبان سے مصالح کی یہ فہرست سننے کے بعد حضرت مسیح کا جواب کیا تھا قرآن کہتا ہے۔

نزولِ مائدہ کے لیے حضرت عیسٰی کی دعاء

۲۱۳۔ عیسٰی ابن مریم نے کہا خدایا ہمارے رب ہم پر آسمان سے ایک خوان روانہ کر دے کہ اس کا آنا ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور دے تو ہم کو تو بہترین دینے والا ہے۔ یعنی وہ دن جس میں مائدہ آسمانی نازل ہو ہمارے اگلے اور پچھلوں کے حق میں عید ہو جائے کہ ہمیشہ ہماری قوم اس دن کو بطور یادگار تہوار منایا کرے۔ اس تقریر کے موافق تکون عیدا لاولنا کا اطلاق ایسا ہوا جیسا آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے متعلق بخاری میں یہود کا یہ مقولہ نقل کیا ہے انکم تقرؤن ھذہ الایۃ لو نزلت فینا لاتخذنا ھا عیدا۔ جس طرح آیت کو عید منانے کا مطلب اس کے یوم نزول کو عید بنانا ہے کما ہو مصرح فی الروایات الاخر۔ اسی پر مائدہ کے عید ہونے کو قیاس کر لو۔ کہتے ہیں کہ وہ خوان اترا اتوار کو جو نصاریٰ کے یہاں ہفتہ کی عید تھی جیسے مسلمانوں کے یہاں جمعہ۔ آیۃ منک کا مطلب ہے کہ یہ نزولِ مائدہ تیری قدرت اور میری نبوت اور صداقت کی نشانی ہو۔ آخر میں وارزقنا فرمایا یعنی بدون تعب و کسب کے روزی عطا فرمائے آپ کے یہاں کیا کمی اور کیا مشکل ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی جب حضرت عیسیٰ نے دیکھ لیا کہ حواریوں کی غرض فاسد نہیں ہے تو آپ نے ان کے فرمائشی معجزے کے لیے اللہ کی جناب میں درخواست پیش کی اور دعا کا آغاز اللھم ربنا سے کیا پہلے اسم ذات لیا یعنی اللھم اس کے معنے یا اللہ ہیں۔ اس میں الوہیت قدرت حکمت اور رحمت کے معنے موجود ہیں اور پھر ربنا فرمایا یعنی اے ہمارے رب ہمارے مالک ہمارے مربی اور ہمارے سارے احوال کے نگران اللھم اور ربنا دونوں میں الوہیت اور ربوبیت کا مکرر انتساب حق تعالیٰ کی جانب حضرت مسیح کی زبان سے یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ حضرت مسیح میں الوہیت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس کے بعد درخواست پیش فرمائی کہ انزل علینا مائدۃ من السماء۔ بعد ازیں حضرت عیسیٰ نے اس خوان نعمت کے نزول کے فائدے بتائے۔ پہلا فائدہ یہ کہ ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اس کا نزول خوشی و مسرت کا سامان ہوگا۔ عید کے معنے مسرت و شادمانی کے آتے ہیں اور تہوار کے بھی آتے ہیں۔ علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس دن کو ہم یوم عید منائیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ یہ ایک خدائی نشان ہو جائے میری صداقت کا کہ اس سے اہل ایمان کے ایمانوں میں اضافہ ہو اور منکرین پر حجت قائم ہو جائے۔ آخر میں فرمایا، وارزقنا وانت خیر الرازقین، آپ ہی عطا فرمایئے۔ آپ ہی بہترین رازق ہیں جسے چاہتے ہیں بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

اس دعا کا خاص حسن یہ ہے کہ حواریین نے جس چیز کو اولیت دی تھی۔ حضرت مسیح نے اسے دعا میں آخر میں ذکر کیا۔ حواریین نے نزول مائدہ کے فوائد بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ناکل منہا کہ ہم کھائیں گے یہ خالص دنیوی اور مادی فائدہ ہے۔ حضرت مسیح نے اپنی دعا میں پہلے دینی اور روحانی فوائد کا ذکر فرمایا اور خاتمہ دعا میں وارزقنا فرما کر مادی فائدہ کا ذکر فرمایا۔ حضرت مسیح نے جب یہ دعا فرمائی تو اس کا جواب اللہ پاک نے کیا دیا۔ اسی کا آگے ذکر ہو رہا ہے۔

حضرت مسیح کی دعا کا جواب

۲۱۴۔ اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے خوان اتاروں گا۔ پھر جو شخص اس کے بعد انکار کرے گا اسے عذاب دوں گا ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی کو بھی ایسا عذاب نہیں دوں گا۔ جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہو گی تو اس کی شکر گزاری کی تاکید بھی معمول سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں۔ قرآن عزیز نے اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ البتہ آثار صحابہ و تابعین میں ضرور کچھ تفصیلات موجود ہیں۔ جمہور کی رائے یہی ہے کہ مائدہ نازل ہوا ہے۔ امام رازی اور حافظ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ روح المعانی میں علامہ آلوسی نے اسی کو اپنایا ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس میں کھانا کیا تھا؟ اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا۔ ان میں امام مجاہد اور الحسن البصری ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ھذہ اسانید صحیحۃ الی مجاھد والحسن اور حسن بصری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نزول کو شرط کے ساتھ مشروط کر دیا اس لیے طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کر کے کہ انسان کمزور ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی پاداش میں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے سوال کو واپس لے لیا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مائدہ کے نازل نہ ہونے کے خیال کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ مائدہ کے واقعہ سے خود عیسائی بے خبر ہیں اور ان کی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو یہ ایسا اعجازی شاہکار تھا کہ عیسائی دنیا اس پر جس قدر بھی فخر کرتی کم ہے اور ان کے یہاں جس قدر بھی شہرت ہوتی کم ہے تواتر سے نقل ہو کر یہ واقعہ ان کے یہاں موجود ہوتا اور کم از کم اخبار آحاد کے ذریعے تو ضرور منقول ہوتا۔ اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر مجاہد اور حسن بصری کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں بلکہ نزول مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرمائی ہے۔

> بعض کہتے ہیں کہ وہ خوان اترا، چالیس روز تک، پھر بعضوں نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقیر اور مریض کھائیں محظوظ اور چنگے بھی کھانے لگے، پھر قریب اسی آدمی کے سور اور بندر بن گئے۔ یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا، پیچھے کسی کو نہیں ہوا، اور بعضے کہتے ہیں کہ نہیں اترا، یہ تہدید سُن کر مانگنے والے ڈر گئے، نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دُعا عبث نہیں اور اس کلام میں نقل کرنا بے حکمت نہیں۔ شاید اس دُعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی اُمت میں آسودگی مال ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے یعنی دل کے اطمینان سے عبادت میں نہ لگے بلکہ گناہ میں خرچ کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا "خرق عادت" کی راہ سے نہ چاہے کہ پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ
وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ
اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ وقف النبي صلى الله عليه وسلم
مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿١١٦﴾
مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١١٧﴾ اِنْ
تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿١١٨﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ
لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١٩﴾ لِلّٰهِ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٢٠﴾

اور جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو خدا کے سوا دو معبود بنا لینا[215]، تو وہ جواب میں عرض کریں گے پاک ہے تیری ذات میرے لیے ممکن نہیں کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں ہے، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے ضرور معلوم ہوتا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے مجھے تو آپ کے جی کی بات کا پتہ نہیں ہے تو ہی غیب کی ساری باتوں کا جاننے والا ہے[216]۔ میں نے تو ان سے صرف وہی بات کہی تھی جس کے کہنے کا مجھے آپ نے حکم دیا تھا۔ یعنی یہ کہ اللہ کی بندگی کرو، میرا اور تمہارا پروردگار وہی ہے[217]۔ جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز سے خبردار ہے[218]۔ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر

انہیں بخش دے تو تو سب پر غالب اور اپنے تمام کاموں میں حکمت والا ہے۔[219] اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ سچے انسانوں کو ان کی سچائی کام دے گی، ان کے لیے باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہی بڑی کامیابی ہے۔[220] زمین و آسمان اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔[221]

اللہ سبحانہٗ کا حضرت مسیح سے مخاطبہ

اس سے پہلا رکوع حقیقت میں اس رکوع کی تمہید تھی۔ پچھلے رکوع کی ابتدا میں یوم یجمع اللہ الرسل۔ فرماکر آگاہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تمام مرسلین سے ان کی امتوں کے مواجہہ میں علی رؤس الاشہاد سوال و جواب ہوں گے۔ پھر ان میں سے خاص حضرت مسیح کا ذکر فرمایا جن کو کروڑوں آدمیوں نے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے کہ ان سے بالخصوص اس عقیدہ باطلہ کی نسبت دریافت کیا جائے گا لیکن اول وہ عظیم الشان احسانات اور ممتاز انعامات یاد دلائیں گے جو ان پر اور ان کی والدہ پر فائض ہوتے بعدہٗ ارشاد ہوگا کہ ءانت قلت للناس اتخذونی کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے سوا معبود مانو، حضرت مسیح علیہ السلام اس سوال کا جواب عرض کریں گے جو آگے آتا ہے، آخر میں ارشاد ہوگا ھذا یوم ینفع الصادقین صدقھم، ھذا کا اشارہ اسی یوم کی طرف ہے جو یوم یجمع اللہ الرسل میں مذکور

تھا، بہرحال یہ سب واقعہ روزِ قیامت کا ہے جسے تیقن الوقوع ہونے کی وجہ سے قرآن وحدیث میں بصیغہ ماضی قال تعبیر فرمایا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ سورۃ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر یہ سورت ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوئی ہے۔ اس کی تقریب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اولاً قیامت کے اس موقعہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب انبیا علیہم السلام سے ان کی اُمتوں کے بارے میں سوال ہوگا اور وہ غایت ادب سے لا علم لنا کہہ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ ظاہر ہے کہ انبیا علیہم السلام کا لا علم لنا فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اُمتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا۔ جواب کا اگر یہ مقصد ہو تو یہ صریح جھوٹ ہے اور نبوت کی طرف اس کی نسبت بھی ناممکن ہے سید انور شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

> یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے ظن کے درجہ سے آگے علم تک نہیں پہنچتا۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے نحن نحکم بالظواھر واللہ متولی السرائر ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا ہی کو قابو حاصل ہے۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذاتِ اقدس نے ارشاد فرمایا تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو۔ بعض تم میں سے چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے اگاہ ہو جایا کروں اس لیے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا وہ بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا۔[2]

غرض اس تمہید کے بعد اس مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد ان سے ان کی اُمت کے متعلق سوال کرے گا۔ خلاصہ یہ کہ اللہ نے پہلے اپنی نعمتیں یاد دلائیں جو حضرت مسیح پر ہوئی تھیں، پھر فرمایا کہ باوجود تعلیم کی ان تمام روشنیوں کے تیرے ماننے والے گمراہی میں پڑ گئے تھے اور تجھے اور تیری ماں کو خدا بنا لیا تھا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] عقیدۃ الاسلام

۲۱۵- اور جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسٰی کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو خدا کے سوا معبود بنا لینا۔

اصل ارشاد میں الٰہ آیا ہے۔ الٰہ کے معنے معبود کے آتے ہیں۔ یعنی وہ جس کی عبادت کی جاتی ہے اور من دون اللہ کے معنے خدا کو چھوڑ کر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ یگانہ اللہ کی عبادت چھوڑ کر میری اور میری ماں کی عبادت کرنا اور معبود بنا لینا اور خدا کی عبادت کی یگانگت کو ختم کر دینا۔ تعبیر کا یہ انداز جیسے اس شخص کے لیے بولا جا سکتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر کسی کی عبادت کرتا ہے ایسے ہی اس پر بھی بولا جاتا ہے جو خدا کے ساتھ کسی کی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ شریک کی عبادت بلا شبہ اللہ کی عبادت کے سوا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے خدا کی جگہ یا اس کے بدلے میں حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ کو معبود بنا لیا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم کہہ کر آئے تھے کہ خدا کے ساتھ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا، اور بعض علماء نے من دون اللہ کو حال قرار دیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے عیسٰی تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لینا حالانکہ تم اور تمہاری والدہ اللہ تعالیٰ سے کمتر ہیں اور جو خدا سے کمتر ہو وہ خدا کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اس عبادت کی وجہ خواہ کچھ ہو، یہ اعتقاد ہو کہ یہ معبود خدا کے سوا بالاستقلال نافع اور ضار ہے اور یا یہ اعتقاد ہو کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیار سے اور عالم اسباب سے بالا اللہ کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کی وجہ سے یا بالآخر بندوں اور خدا کے درمیان واسطہ ہونے کی وجہ سے نفع و نقصان کے مالک ہیں۔ حضور انور کی تشریف آوری کے وقت عام مشرکین کا افترا کی پس منظر ہی تھا۔

حضرت مسیح کی عبادت تو معلوم الحال ہے۔ اسی سورت میں اس کی تفصیلات آ چکی ہیں۔ لیکن مریم پرستی میں قسطنطین کے بعد مشرقی اور مغربی کلیساؤں میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ دعائیں اس خدائی کنواری کو مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، نذریں، نیازیں ان کے نام پر کی جاتی ہیں۔ کیتھولک گرجاؤں میں ان کی قد آدم تصویریں لگی ہوئی ہیں جن کے آگے پرستش کی ساری رسمیں پوری ہوتی ہیں۔ پروٹسٹنٹ فرقے نے اسلام سے صدیوں بعد اس کا انکار کیا ہے۔ السید رشید رضا نے تفسیر المنار کی ساتویں جلد میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے عبادت مریم کے موضوع پر مفید بحث فرمائی ہے ۔ اور مولانا مودودی نے اس موضوع پر اچھی داد تحقیق دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور روح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسیح کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی کے آخری دور میں اسکندریہ کے بعض علماء دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے ام اللہ یا مادر خدا کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ الوہیت

مسیح کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا لیکن اول اول چرچ باقاعدہ اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریس کے اس عقیدے پر کہ مسیح کی واحد ذات میں دو مستقل جداگانہ شخصیتیں جمع تھیں۔ مسیحی دنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے مادرِ خدا کا لقب استعمال ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی سے پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ نزول قرآن کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوتے تھے ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے، انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کشا، اور بیکسوں کی پشتیبان تھیں اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ مادرِ خدا کی حمایت اور سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جسٹنین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریم کو سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل ترسیس میدان جنگ میں حضرت مریم سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہرقل نے اپنے جھنڈے پر مادرِ خدا کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریک اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

یہ مکالمہ کب ہوگا؟

اللہ سبحانہٗ یہ بات حضرت عیسیٰ سے کب فرمائے گا۔ علامہ بغوی نے معالم میں بتایا ہے کہ تمام مفسرین قرآن کہتے ہیں کہ یہ بات اللہ سبحانہٗ روز قیامت فرمائے گا۔ علامہ نسفی نے مدارک میں لکھا ہے کہ جمہور مفسرین کی رائے ہے کہ یہ سوال قیامت کے روز ہوگا۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ قتادہ، ابن جریج اور بیشتر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ مخاطبہ روزِ قیامت ہوگا۔ سدی کو چھوڑ کر تمام شارحینِ قرآن کی یہی رائے ہے اور سدی سے متاثر ہو کر ابن جریر کا بھی کچھ جھکاؤ اس طرف ہے کہ یہ خطاب و جواب دنیا میں ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں اس مخاطبہ کو چونکہ بصیغہ ماضی پیش کیا گیا ہے لہٰذا اس لیے یہ آئندہ کی نہیں بلکہ ماضی کی کہانی ہے لیکن حافظ ابن کثیر نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ قرآن میں بیشتر احوالِ قیامت کو بصیغہ ماضی

ہی پیش کیا گیا ہے۔ اسی سے ہمارے زمانہ کے بعض زائغین نے سہارا لے کر وفات مسیح کا دعویٰ کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ مکالمہ اللہ اور حضرت عیسٰی کے درمیان وفات کے بعد عالم برزخ میں پیش آیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں قال کی پیشانی پر اذ لگا ہوا ہے اور عربی میں لفظ اذ ماضی کے لیے آتا ہے نہ کہ مستقبل کے لیے۔ حالانکہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ مغنی میں ہے کہ اذا ماضی کے لیے بھی آتا ہے جیسا کہ اذ کبھی مستقبل کے لیے آجاتا ہے۔ الزمخشری نے یہ شعر پیش کیا ہے:

اذما دخلت على الرسول فقل له
حقاً عليك اذا اطمان المجلس

یہاں صیغہ اس بات کی نشانی ہے کہ اذ ماضی پر آکر مستقبل کے معنے دے رہا ہے۔ قرآن وحدیث اور عربی اشعار میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن میں اذ بمعنے اذا استعمال ہوا ہے اور اذا بمعنی اذ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ نے شہادۃ القرآن کے دوسرے حصہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اور پھر قرآن کا سیاق وسباق یہاں خود گواہ ہے کہ یہ تمام واقعہ ماضی کا نہیں بلکہ قصہ مستقبل یعنی قیامت کا ہے۔ سیاق میں یوم یجمع اللہ الرسل اور سباق میں ھذا یوم ینفع الصادقین صدقھم سے صاف ظاہر ہے۔ خود حضرت قتادہ نے بھی یوم ینفع الصادقین سے اس مکالمہ کے روز قیامت میں ہونے پر استدلال کیا ہے۔ تفسیر درمنثور میں قتادہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ مکالمہ روز قیامت ہوگا جب کہ یوم ینفع الصادقین بزبان حال بول رہا ہے بلکہ ایک مرفوع حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ واقعہ قیامت کا ہے۔

> ابو موسی اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز انبیاء اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا، پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بلایا جائے گا۔ حق تعالیٰ حضرت عیسٰی کو اپنے قریب بلا کر فرمائیں گے کہ تم نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا، عیسٰی علیہ السلام انکار کر دیں گے۔ (ابن کثیر)

درمنثور میں اسی مضمون کی ایک حدیث جابر بن عبداللہ کے حوالہ سے آئی ہے اس میں بھی اس کی تصریح ہے کہ یہ مکالمہ قیامت کے روز ہوگا۔

یہاں قیامت میں ہونے والا یہ واقعہ قرآن میں اس لیے بیان ہو رہا ہے کہ نصاریٰ جنہوں نے دنیا میں حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو معبود بنا رکھا ہے ان کو معلوم ہو جائے کہ اس جرم کی پاداش میں میدان حشر میں ان کی رسوائی کا سامان ہوگا، یہ سوال تو دراصل عیسائیوں سے ہونا چاہیے کہ کیا تمہیں

حضرت مسیح یہ کہہ کر آئے تھے کہ ان کو اور ان کی والدہ کو معبود بنالینا لیکن ان کو ناقابلِ خطاب سمجھ کر حضرت عیسٰی سے سوال ہوگا تاکہ ان کے جواب سے ان کی اُمت پر اتمام حجت کی جائے۔ واللہ اعلم۔

اللہ کی سبوحیت کا لازمی تقاضا

۱۱۶۔ تو وہ جواب میں عرض کریں گے پاک ہے تیری ذات، میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں ہے، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے ضرور معلوم ہوتا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے مجھے تو تیرے جی کی بات کا پتہ نہیں ہے تو ہی غیب کی ساری باتوں کا جاننے والا ہے یعنی میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جس کو آپ پیغمبری کا منصب جلیل عطا فرمائیں اس کی یہ شان نہیں ہے کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے۔ پس آپ کی سبوحیت اور میری عصمت دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات کبھی نہیں کہہ سکتا اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی اگر واقع میں ایسا کہتا تو آپ کے علم میں ضرور موجود ہوتا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے خفیہ یا علانیہ کوئی ایسا حرف منہ سے نہیں نکالا بلکہ میرے دل میں اس طرح کے گندے خیال کا کبھی خطرہ بھی نہیں ہوا۔ آپ سے میرے یا کسی کے دل کے چھپے ہوئے ہواجس و خواطر بھی پوشیدہ نہیں[1]۔ امام رازی رقمطراز ہیں کہ حق تعالیٰ کے انت قلت سوال کا جواب براہِ راست ما قلت دینے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے اسے تمام تر علم الٰہی کے حوالہ کرنا مقام ادب اور عبدیت کے زیادہ مناسب ہے۔ اس موقعہ پر سبحانک اس لیے نہیں لایا گیا کہ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی ذات اس بات سے پاک ہے کہ میں یہ بات کہوں یا میں آپ کے بارے میں یہ کہوں بلکہ اس لیے لایا گیا ہے کہ آپ کی ذات اس سے بالا اور پاک ہے کہ الٰہ اور رب ہونے میں آپ کا کوئی شریک ہو۔ اس طرح حضرت عیسٰی نے ثابت کیا ہے کہ مجھے یقینی اور بدیہی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں اس سے پاک ہے کہ الوہیت میں اس کا کوئی شریک ہو۔ نامناسب اور خلافِ شان باتوں سے اللہ کی تنزیہہ کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ کلمہ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ حضرت عیسٰی کا مطلب یہ ہے کہ تیری شان اس سے کہیں ارفع ہے کہ الوہیت میں تیرا کوئی شریک ہو۔ اور جب تیری شان اس سے بالا و بالاتر ہے تو پھر میری شان یہ کب ہو سکتی ہے کہ آپ کا رسول ہو کر ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں، اس طرح نفی شان سے کلام میں زیادہ بلاغت آگئی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

کیونکہ نفی شان کے لیے نفی فعل لازم ہے۔ یعنی نہ تو آپ کی شان اس کی مقتضی ہے اور نہ میرا منصب یہ چاہتا ہے کہ ایسی باطل اور بے حقیقت بات میں آپ کے بارے میں کہوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ بات میں نے کہی ہوتی تو آپ کے علم محیط میں ضرور ہوتی کیونکہ آپ کے علم محیط سے کچھ بھی باہر نہیں، آپ تو میرے جی کی بات جانتے ہیں میری تو آپ کے علم ذاتی تک رسائی نہیں ہے۔ آپ تو علوم غیبیہ میں یگانہ ہیں۔ آپ کا علم ماضی، حال اور مستقبل کو محیط ہے، آپ کا علم ذاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض میں نے ایسی کوئی بات کہی ہوتی تو وہ ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی اور جب تیرے علم میں نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی میرے ناقص محدود علم اور تیرے کامل اور غیر محدود علم کا مقابلہ ہی کیا؟

حضرت مسیح کی دعوت توحید

۱۱۷۔ میں نے ان سے صرف وہی بات کہی تھی جس کے کہنے کا مجھے آپ نے حکم دیا تھا یعنی یہ کہ اللہ کی بندگی کرو، میرا اور تمہارا پروردگار وہی ہے۔ میں نے آپ کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ اپنی الوہیت کی تعلیم تو کیسے دیتا۔ اس کے بالمقابل میں نے ان کو صرف تیری بندگی کی طرف بلایا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا رب وہ ہی ایک خدا ہے جو تنہا عبادت کے لائق ہے۔ چنانچہ آج بھی بائیبل میں صریح نصوص اس مضمون کی بکثرت موجود ہیں[1]

اگرچہ موجودہ اناجیل نے حضرت عیسٰی کی دعوت توحید کو اس وضاحت کے ساتھ پیش نہیں کیا جس طرح قرآن نے بیان کی ہے تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں یہ بات ان کے اندر بھی ملتی ہے کہ صرف اللہ سے عابدانہ تعلقات رکھنے چاہئیں، چنانچہ انجیل متی باب ۴ آیت نمبر ۱۰، ۱۱ میں ہے۔

> یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو، کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ اور صرف اسی کی عبادت کر تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا اور دیکھو فرشتے آ کر اس کی خدمت کرنے لگے۔

اور انجیل لوقا باب ۴ آیت ۸ میں ہے:

> یسوع نے جواب میں اس سے کہا لکھا ہے تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت مسیح اس کے بھی قائل تھے کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت کی جائے جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوینی کی طاعت ہوتی ہے۔ انجیل متی باب ۶ آیت ۱۰ میں ہے،

تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو خدا یا خدا کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اسی حیثیت سے وہ لوگوں کو اپنی طاعت کی دعوت دیتے تھے ان کے ایک سے زیادہ ارشادات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے دعوت کو شروع کیا تو ان کی مخالفت خود اپنوں نے کی۔ اس پر متی، لوقا اور مرقس تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا۔

"نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا"

اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انہوں نے جواب دیا۔

ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔

اب اور رب کا تقابلی مطالعہ

انجیلوں میں میرا باپ اور تمہارا باپ کی جو تعبیر آئی ہے۔ یہاں قرآن میں ربی وربکم سے اس کی تصحیح فرماتی ہے کہ اصل حضرت مسیح نے جو بات فرمائی تھی وہ یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لیکن نصاریٰ نے متشابہات کی پیروی کی اور آپ کی واضح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ عبرانی میں اب کا لفظ باپ اور رب کے معنے میں اور ابن کا لفظ بیٹے اور غلام کے معنے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں بولا جاتا ہو تو سیاق و سباق ہی بتاتا ہے کہ یہ لفظ کس مفہوم میں ہے۔ قرآن نے انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہا۔ کیونکہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے یہ تعبیر کوئی بلند تر تعبیر نہیں ہے۔ وہ خدا کو اب باپ کے بجائے رب کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اب اور رب دونوں میں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل قرآن کے مطمح نظر سے کس قدر پست ہے۔ اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے۔ پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود حصہ تک قائم رہتا ہے۔ اسی طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں ایک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے

مگر یہ تعلق حددرجہ ناقص محدود اور آنی ہوتا ہے بیٹے کے وجود قیام و بقاء ضروریات زندگی، سامان حیات، نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے مگر ذرا غور کر و کہ کیا عبد و معبود، خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے۔ اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے کیا بندہ اپنے خدا سے ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے کیا یہ تعلق باپ بیٹے کے تعلق کی طرح محدود ہو سکتا ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کیلئے بھی منقطع نہیں ہو سکتا۔

بہرحال حضرت عیسٰی بتائیں گے کہ میں تو ان کو یہ کہہ کر آیا تھا اعبدو اللّٰہ ربی و ربکم۔ اللہ اکبر اس جواب میں کس قدر حسن ادب ہے اور آپ کی کمال عبدیت اور انتہائے عبودیت کا یہ جواب کس قدر بلیغ شاہکار ہے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کو وہی کچھ حکم دے کر آیا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا بلکہ فرمایا میں تو وہی کچھ کہہ کر آیا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا اور اس سے زیادہ لطیف بات یہ ہے کہ پیام توحید کو بھی اپنی جانب منسوب نہیں فرماتے کہ میں انہیں یہ پیام دے کر آیا تھا بلکہ فرما رہے ہیں کہ جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا۔

آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر

۱۱۸۔ جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا، اور تو ہر چیز سے خبردار ہے۔ نہ صرف یہ کہ میں نے مخلوق خدا کو تیری توحید اور عبودیت کی دعوت دی۔ بلکہ جب تک ان کے اندر قیام پذیر رہا برابر ان کے احوال کی نگرانی کرتا رہا۔ کوئی غلط عقیدہ یا بے موقع خیال قائم نہ کر لیں البتہ ان میں قیام کرنے کی جو مدت آپ کے علم میں مقدر تھی جب وہ پوری کر کے آپ نے مجھ کو ان میں سے اٹھا لیا، کما یظھر من مادۃ التوفی ومقابلہ تادمت فیھم، تو پھر صرف آپ ہی ان کے احوال کے نگران اور خبردار ہو سکتے تھے میں اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کر سکتا۔

تنبیہہ:۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء کی بحث آل عمران کی آیت انی متوفیک ورافعک کے فائدے میں ملاحظہ کیجئے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے یہاں فلما توفیتنی۔ کا جو ترجمہ تو نے مجھے اٹھا لیا ہے کیا ہے یہ باعتبار محاورہ موت اور رفع الی السماء دونوں پر صادق آسکتا ہے گویا متنبہ کر دیا کہ نہ لفظ توفی کے لیے موت لازم ہے اور نہ خاص توفی بصورت موت کو مضمون زیر بحث میں کسی قسم کا کوئی دخل ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت قیامت کے دن اسی طرح

کہوں گا جس طرح بندہ صالح عیسٰی علیہ السلام نے کہا

کنت علیھم شھیدا مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت .... الخ

اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضورؐ کی اور حضرت مسیح کی توفی بھی بہمہ وجوہ یکساں اور ہم رنگ ہونی چاہیے۔ عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مشرکین مکہ ایک درخت (ذات انماط) پر ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے لیے بھی ذات انماط مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہاں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

ھذا کما قال قوم موسٰی اجعل لنا الٰھا کما لھم اٰلھۃ

یہ تو ایسا ہوا جیسے موسٰی کی قوم نے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے بھی ایسا معبود تجویز کر دو جیسا کہ ان بت پرستوں کا ہے۔

کیا کوئی مسلمان اس تشبیہ کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہ نے معاذ اللہ بت پرستی کی درخواست کی تھی۔ اس طرح کی تشبیہات سے نصوص محکمہ اور اجماع اُمت کے مخالف عقائد پر تنک کرنا صرف اسی جماعت کا حصہ ہو سکتا ہے جن کی نسبت یہ ارشاد فرمایا:

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ۔

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں اس غرض سے کہ فتنہ بپا کریں اور حقیقت معلوم کریں[1]

حیات و رفع مسیح علیہ السلام کے موضوع پر معلومات کے لیے معالم القرآن کی جلد سوم اور جلد ششم کا مطالعہ فرمائیے۔ یہاں صرف قرآن کے اعجاز بلاغت اور اسلوب بیان کی لطافت سے استفادے کے پیش نظر صرف اتنی بات گوش گزار فرمالیجئے کہ اس مقام پر قرآن نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قیام زمینی مادمت فیہم اور کائنات ارضی سے انقطاع تعلقات کو توفیتنی سے کیوں تعبیر فرمایا؟

جلد سوم میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ بتایا جاچکا ہے کہ توفی کے حقیقی معنے لے لینے اور قبضہ کر لینے کے ہیں اور یہ لفظ موت کے معنے میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ کنایہ میں حقیقی معنے برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنے سے جدا ہو کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لفظ غیر موضوع لہ میں استعمال ہوں گے لہٰذا اگر حضرت عیسیٰ کے بارے میں قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ ان کی موت آچکی ہے اور مخاطبہ و مکالمہ کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت کی کہانی ہے نہ کہ روز قیامت کی تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقعہ پر حیات اور موت جیسے متضاد الفاظ استعمال ہوتے تاکہ یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے قریب ہے اور پھر لفظ موت کی صراحت کا تقاضا تھا کہ اس کے مقابلے میں لفظ حیات لولا جاتے مگر قرآن نے موت و حیات کی صاف اور واضح تعبیر کو چھوڑ کر مادمت فیہم کو حیات کی اور توفیتنی کو موت کی جگہ استعمال کیا ہے۔ سوچئے کہ ماحییت فلما امتنی کو چھوڑ کر مادمت فیہم فلما توفیتنی کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بلیغانہ نکتہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے یہاں اپنا اعجازی انداز اختیار کیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح کی زندگی رفع نزول اور موت کے سارے مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے وہ اگر یہ انداز بیان اختیار کرنا ماحییت فلما امتنی جب تک میں زندہ رہا پھر جب تو نے مجھے ماردیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں، ایک زندگی دوسرے موت، ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص حالت پیش نہیں آئی ہے لیکن چونکہ یہ بات خلاف واقعہ تھی اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل اور بھی پیش آچکے ہیں۔ ایک ملاء اعلیٰ کی طرف بقید حیات رفع اور دوسرے کائنات ارضی میں دوبارہ تشریف آوری اور نزول اس لیے ضروری تھا کہ حیات و موت کی جگہ ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جن کی آغوش میں یہ سارے مراحل سما سکیں اور پھر جب کہ قرآن متعدد مقامات پر ان مراحل کی تفصیل بھی بتا چکا ہے تو اب یہاں اعجاز بلاغت کا تقاضا یہی ہے کہ ان سب مراحل کو ایجاز و اختصار سے پیش کیا جائے۔ اسی لیے قرآن نے یہاں ماحییت کی جگہ مادمت فیہم استعمال کیا کہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہے اس حصہ پر بھی جو ابتداء زندگی سے شروع ہو کر رفع الی السماء پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو نزول ارضی سے شروع ہو کر موت پر ختم ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے فلما امتنی کا انداز چھوڑ کر توفیتنی کی تعبیر اس لیے اختیار کی کہ یہ جملہ بھی پہلے جملے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنی آغوش میں لے لے اس مرحلہ کو بھی جو رفع الی السماء کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد موت کی صورت میں واقع ہوا۔ کیونکہ موت سے تو صرف ایک حالت پر روشنی پڑتی تھی مگر توفی میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود ہیں۔ حقیقی معنے کے لحاظ سے صرف اخذ و تناول اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ موت کے معنے بھی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ خدایا جو وقت میں نے ان کے درمیان گزارا اس کے لیے تو بے شک میں شاہد ہوں لیکن توفی کے وقت میں ان کا فقط تو ہی نگہبان رہا۔ باقی تیری شہادت تو ہر حال ہر وقت ہر شئے پر حاوی ہے۔

حضرت مسیح کی جناب الٰہی میں استدعا

۲۱۹۔ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو سب پر غالب ہے اور اپنے سارے کاموں میں حکمت والا ہے۔ یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بے جا سختی نہیں کر سکتا اس لیے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل و حکمت پر مبنی ہوگا اور فرض کیجئے کہ معاف کر دیں تو یہ معافی بھی ازراہ عجز و سفہ نہ ہوگی چونکہ آپ عزیز ہیں اور زبردست و غالب ہیں اس لیے کوئی مجرم آپ کے قبضہ و قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا کہ آپ اس پر قابو نہ پا سکیں اور چونکہ حکیم حکمت والے ہیں اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یوں ہی بے موقع چھوڑ دیں۔ بہر حال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا۔ جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعا رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی اس لیے حضرت مسیح نے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا رب انھن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی و من عصانی فانک غفور رحیم اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان لوگوں میں میرا تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو غفور رحیم ہے یعنی ایسا موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو توبہ اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف کر دے[1]

واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو روز قیامت ہوگی جہاں کافروں اور منکروں کے لیے شفاعت کا کوئی موقعہ و محل نہ ہوگا اس انداز تعبیر کا مقصد معاملہ کو بالکل اللہ کے سپرد کرنا ہے۔ امام رازی کی یہ رائے بالکل درست ہے۔

> اس تعبیر سے مقصود سارے معاملہ کی اللہ کی طرف تفویض ہے اور اس موضوع پر کوئی تعرض نہ کرنا ہے۔

اور حافظ ابن کثیر کا یہ کہنا بھی بالکل برمحل ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کا مقصود یہ ہے کہ خدایا یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لوگ کافر و مشرک ہیں اور میں ان سے بالکل بری اور بیزار ہوں۔ یعنی آپ مالک مطلق اور عزیز مطلق ہیں۔ ان کے بارے میں جو چاہیں حکم صادر فرمالیں، مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ ان کے حق میں جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ مالکانہ حاکمانہ ہوگا۔ میں اس فیصلہ میں کیا دم مار سکتا ہوں، آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں، یہ فقرہ اگر یوں ہوتا،

ان تغفر لهم فانهم عبادك وان تعذبهم فانك الخ

تو واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے سفارش بن جاتا۔ اور سب جانتے ہیں کہ نبوت کسی درجے میں مشرکین کی شفاعت نہیں کرتی اس لیے حضرت مسیح نے بات ایسے انداز میں فرمائی ہے کہ بات سچی بھی ہو دربار الٰہی کے شایان شان بھی ہو، درد مندانہ بھی ہو اور ان پر اس سے محرفین دین اور مشرکین کی سفارش کی کوئی دمڑی بھی نہ آتے۔ بہرحال اس دعا سے مقصود کفار کے حق میں سفارش نہیں بلکہ منشا تفویض و تسلیم ہے کہ آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں۔

احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں سے آیت رب انهن اضللن تلاوت فرمائی اور پھر حضرت عیسٰی کی یہ دعا پڑھی ان تعذبهم فانهم عبادك بعد ازیں بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور دعا میں اللهم امتی اللهم امتی اے اللہ میری امت کہتے رہے اور روتے اللہ سبحانہ نے حضرت جبریل سے کہا کہ حضور کے پاس جا اور دریافت کر کہ رونے کا سبب کیا ہے؟ جبریل حضور اقدس کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا، اللہ سبحانہ نے جبریل سے کہا کہ جا کر حضور اقدس سے کہہ دے کہ ہم تمہیں تمہاری امت کے معاملہ میں ضرور خوش کریں گے اور آپ کو غمگین نہ کریں گے۔

صحیح بخاری میں عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے ہے کہ حضور اقدس فرماتے ہیں کہ روز قیامت میری امت کے کچھ لوگ بلائے جائیں گے ان کو بائیں جانب سے پکڑا ہوگا، میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں بتایا جائے گا آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہ لوگ آپ کے بعد دین میں کیا جرأت طرازیاں کرتے رہے، میں کہوں گا جیسے عبد صالح حضرت عیسٰی نے فرمایا وكنت عليهم شهيدا مادمت فيهم فرمایا پھر کہ وہ ہمیشہ پیچھے پلٹتے رہیں گے۔ بخاری ہی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے میں کہوں گا دوری ہو ان کے لیے اور دھتکار۔

مسند احمد اور نسائی میں حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات یہ آیت ان تعذبهم الخ پڑھنی شروع کی اسی میں رات بیت گئی۔ ابوذر کہتے ہیں اس کے بارے میں، میں نے

دریافت کیا تو آپ نے بتایا، میں نے اللہ سے شفاعت مانگی تھی اللہ نے مجھے عطا کردی، یہ ہر اس شخص کی ہوگی جس کا دامنِ ایمان شرک آلود نہ ہوگا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شفاعت اور ہے تفویض اور ہے۔

اہلِ صداقت کے لیے مقامِ رضا

۱۲۰۔ اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ سچے انسانوں کو ان کی سچائی کام دے گی ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے یہی بڑی کامیابی ہے۔ جو لوگ اعتقاداً اور قولاً و عملاً سچے رہے ہیں جیسے مسیح علیہ السلام ان کی سچائی کا پھل آج حق تعالیٰ کی رضا ہے اور جنت بھی اس لیے مطلوب ہے کہ وہ محلِ رضائے الٰہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو راست بازوں کی فتح مندیوں کا دن ہے بدعہدوں، خائنوں اور جھوٹی آرزوؤں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے آج حسرت و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد و اخلاص و سچائی کے ساتھ پورے کیے ہیں۔ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے یعنی ان کے رب نے ان سے جو کچھ چاہا انہوں نے اس کی رضا کے مطابق وہ پورا کر دکھایا اور انہوں نے اپنے رب سے جو امیدیں کیں ان کی توقعات اور ان کے تصورات سے ہزاروں لاکھوں درجہ زیادہ پوری ہوگئیں فرمایا کہ اصلی بڑی کامیابی یہی ہے۔

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے بندے پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال نعمت عطا فرمائے گا۔ متقیوں کے لیے اللہ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور سب کے بعد روح کی مسرت رکھی لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرمانا ہے۔ سورہ توبہ پارہ دہم، سورہ حدید پارہ ۲۷، سورہ آل عمران پارہ ۳ میں اس کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اہلِ جنت کی صفت ہی جگہ جگہ یہ بتائی ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، ان ہی آیتوں کی تفسیر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

نے یہ بشارت سنائی ہے کہ اللہ سبحانہٗ اہلِ جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں۔ سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں فرمائے گا کہ جنت کی نعمتیں پاکر اب تم خوش ہو گئے، عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں کہیں گے کہ اے پروردگار ان سے بہتر کیا ہے فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی اور خوشنودی تم پر اتار دوں اب اس کے بعد کبھی میں تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

شہنشاہِ مطلق کی عظمت

۲۲۱۔ زمین و آسمان اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ یعنی ہر وفادار اور مجرم کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو ایک شہنشاہ مطلق کی عظمت و جلال کے مناسب ہے[1] یعنی مخلوقات پر حکومت و سلطنت جو کچھ بھی ہے وہ یگانہ خدا کی ہے۔ کسی فرزند خدا یا مظہر خدا کی نہیں۔ اس سے عیسائیوں کے اس عقیدے پر ضرب لگائی ہے کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کے نہیں خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ فرمایا نہیں بلکہ تمام مخلوق پر اللہ کی حکمرانی ہے سزا دینا اور معاف کرنا اللہ کا کام ہے۔ یہاں ما فیھن لا کر اشارہ کر دیا کہ سب کی حیثیت اللہ کے سامنے محکوم و مسخر ہونے کے لحاظ سے ایسی ہے جیسے ان میں جمادات کی طرح نہ کوئی قوت ہے اور نہ بہائم کی طرح عقل ہے۔ اللہ کی قدرت کے سامنے وہ گویا بے قدرت اور اس کے علم کے مقابلہ میں گویا سب لاعلم ہیں۔ قالہٗ الرازی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مَعَالِمُ الْقُرْآن

اَلْاَنْعَامْ

٦

رکوع ٢٠　　　　آیات ١٦٥

الانعام

سورت کا نام

مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت چوپایوں میں جن چوپایوں کو حرام ٹھہرالیا تھا، یا اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی جو قربانیاں پیش کرتے تھے ان کی تردید اس میں بھرپور طریقہ پر کی گئی ہے۔ اسی مناسبت اور تعلق سے اس سورت کا نام الانعام ہو گیا۔

سورت کے نازل ہونے کی تاریخ

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ یہ سورت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں نازل ہوئی ہے۔ عبداللہ ابن عباس سے جس قدر روایات ہیں ان سب میں یہ قدر مشترک ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ بات بھی ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتی ہے کہ ساری سورت کا یکبارگی نزول ہوا ہے۔ محدثین نے یہ بات متعدد صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے بتائی ہے۔ بلکہ یہ بات اس سورت کی خصوصیات میں شمار کی گئی ہے کہ یہ سورت یکبارگی نازل ہوئی، رات کو نازل ہوئی اور جس رات نازل ہوئی اسی رات آپ نے اسے قلم بند کرا دیا۔ مولانا عثمانی اپنے فوائد میں رقمطراز ہیں:

> یہ سورت مکی ہے صرف چند آیات کو بعض علماء نے مستثنیٰ کیا ہے روایات میں ہے کہ پوری سورت بیک وقت بے شمار فرشتوں کے جلو میں نازل ہوئی مگر ابن الصلاح نے اپنے فتویٰ میں ان روایات کی صحت سے انکار کیا ہے جو پوری سورت کے دفعۃً نزول پر دال ہیں۔ واللہ اعلم

اس کے باوجود امام رازی نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ یہ سورت بیک وقت نازل ہوئی ہے۔ الاتقان میں یکبارگی نزول کی بات عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، مجاہد، عطاء اور الدر المنثور میں ان کے علاوہ انس بن مالک، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، اسماء بنت یزید، ابو جحیفہ اور

علی مرتضیٰ کے حوالہ سے بتائی ہے۔ روایات کی کثرت بزبان حال بول رہی ہے کہ بات صحیح ہے۔ ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس میں یہ صراحت ہو کہ سورۃ انعام یکبار نازل نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مثبت روایات کو نافی کے مقابلہ میں اصولاً ترجیح ہونی چاہیے لہٰذا یکبارگی نازل ہونے کی روایت راجح ہے۔

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔

نزول سورت کا پس منظر

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ یہ سورت مکی زندگی کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بات خود بخود صاف ہو جاتی ہے کہ وہ احوال وظروف کیا تھے جن میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اسلام کی عمر بارہ سال ہو چکی تھی۔ قریش کی آتش عداوت بھڑک اٹھی تھی اور ہر سمت جور وستم کا آغاز ہو گیا تھا۔ خصوصاً ان مساکین کو نہایت خوفناک اذیتیں پہنچائی جا رہی تھیں، جو غلام تھے یا جن کا کوئی مددگار نہ تھا، مثلاً حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت خباب، حضرت عثمان کو ان کا چچا صف میں لپیٹ کر لٹکا دیتا اور نیچے سے دھواں چھوڑتا، حضرت مصعب بن عمیر کو ان کی ماں نے گھر سے نکال دیا۔ بعض کو گائے اور اونٹ کے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں چھوڑ دیتے۔ بعض کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں جلتے پتھروں پر گرا دیتے۔

جب قریش کے ظلم وستم کا بادل پیہم برس کر بھی نہ کھلا تو رحمت عالم نے جان نثاران اسلام کو ہدایت فرمائی کہ حبشہ ہجرت کر جائیں جو قریش مکہ کی قدیم تجارت گاہ تھی۔ حبشہ کے ساتھ قریش کے تجارتی روابط پشتوں سے چلے آ رہے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم نے قیصر روم سے تجارت کا پروانہ حاصل کیا تھا تو قیصر نے شاہ حبشہ کے نام ایک سفارشی خط لکھا کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے اپنے ملک میں آنے دے اس وقت سے قریش بڑی تعداد میں حبشہ جاتے تھے۔ اسی زمانے میں قریش نے بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا اور تدبیر یہ سوچی گئی کہ حضور انور کو اور ان کے خاندان کو محصور کر کے ختم کر دیا جائے۔ بنی ہاشم نے محصوری کا یہ زمانہ بڑی تکلیفوں میں بسر کیا۔ محصوری سے نکلنے کے بعد ابو طالب اور حضرت خدیجہ نے چند روز کے تقدم وتاخیر سے وفات پائی۔ یہ سنہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ ابو طالب آنحضور کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ حضرت خدیجہ حضور اقدس کی انتہائی غمخوار اور غمگسار اہلیہ تھیں۔ ان ہمدردوں کی جدائی سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا قلق ہوا کہ اس سال کا نام "عام الحزن" رنج وغم کا سال پڑ گیا۔ اب آپ ہر دنیوی سہارے سے محروم ہو کر شدید مزاحمتوں کے مقابلے میں تبلیغ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ اس

زمانے میں یعنی سنہ ۱۰ھ میں حضور انور موسم حج میں معمول کے مطابق دعوت کے لئے نکلے عقبہ میں پہنچے جو حرا اور منیٰ کے درمیان ہے تو چند افراد نظر آئے، عادت کے مطابق ان کو اسلام کی دعوت دی قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے خزرجی ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا یہی چھ خوش نصیب خزرجی تھے جن کے قبولِ اسلام نے یثرب کے لیے مرکز اسلام بننے کا راستہ ہموار کر دیا۔

سورہ انعام کے مطالب

عرب میں صرف تین قومیں آباد تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرۃ العرب کا اسلام لانا تھا۔ یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ۔ مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا۔ ان کی مذہبی پیشوائی قریش کے ہاتھ میں تھی۔ یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا۔ نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اس لیے الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے دعوتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفارِ مکہ کو پہلے دعوت دی جائے پھر یہود کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا جائے۔ اس کے بعد نصاریٰ کو، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی دعوت دی۔ اس سورت میں چونکہ مخاطب قریش اور کفارِ مکہ ہیں اس لیے ان کے سامنے توحید معاد اور رسالت کے دلائل واضح کرتے ہوئے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ اس سورت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالص توحید کا بیان، صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل ہے۔ شرک کی جو گوناں گوں صورتیں مکہ والوں میں موجود تھیں اور جس طرح سورہ انعام میں ان کا رد کیا گیا، اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔ اشخاص پرستی لوہ آثار پرستی، خدا اور بندوں کے درمیان واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد۔ خوارق کے بارے میں غلط تصورات تحلیل وتحریم کا دائرہ، غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم، صفاتِ الٰہی کی توحید، مخفی قوتوں کا ابطال، اوہام وخرافات کا ابطال، کفارہ وشفاعت کے غلط معنے کی تردید، اجرام سماوی کی قدرت کا انکار، خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں۔

یہ توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد وخیالات کی نفی اور تردید لیکن سورہ انعام میں اس سے اہم اور بالاتر بات یہ ہے کہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری اور اس کے اصول کی تعیین کی گئی ہے۔ شاید اسی لیے علامہ ابو اسحاق اسفرائنی نے سورہ انعام کے بارے میں فرمایا ہے کہ توحید کے تمام قواعد واصول پر یہ سورت مشتمل ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے اس سورت میں توحید اور رسالت معاد کے دلائل قاہرہ بیان فرمائے ہیں اور مشرکین وملحدین اور متبدعین کے مذہب کا

بھرپور ابطال کیا ہے۔

اس سورت میں تمام انسانوں کو قرآن نے اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت وارادہ و قدرت و وسعت سے آگاہ کیا۔ ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرے میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ ہے۔ اس کے مواخذے کا خوف اس کی رحمت کی اُمید ہے۔ اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی طاعت ہر مکلف پر واجب ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے۔ انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ کے لیے رسولوں کو روانہ کرتا رہا ہے۔ وہ اندھیروں کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی اُمید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے۔ اس کی محبت دُنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اس سورت میں توحید کا جو چہرہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصافِ کمال صرف ایک بزرگ اور برتر ہستی کے لیے ہیں۔ جو بالائے عرش سے زیرِ فرش تک ہر ذرے پر حکمران ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرے سے کوئی ذرہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت ہماری تمام محبت ہمارا تمام خوف، ہماری تمام اُمیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے ذریعے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

(۶) سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ (۵۵)　　آیاتہا ۱۶۵　　رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِیْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ
ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ﴿۲﴾ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ
یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾

ستائش کی ہر قسم اس اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا، اس پر بھی منکرین حق دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں[۱]۔ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت مقرر فرما دی اور ایک مقررہ مدت اور بھی ہے جو اس کے علم میں مقرر ہے، تعجب ہے کہ تم شک کر رہے ہو[۲]۔ وہی اللہ ہے

آسمانوں میں بھی، اور زمین میں بھی، وہی تمہاری چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے اور تم جو کچھ کمائی کرتے ہو وہ جانتا ہے۔ ۳

نظامِ تخلیق سے توحید پر استدلال

اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک سمجھتے تھے۔ یہاں قرآن نے اس اللہ سبحانہٗ کا جلوہ نمایاں کیا ہے جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں ہے۔ شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، سورج چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تحمید میں مصروف ہیں سب کمزور ہیں وہ ہی ایک قوت والا ہے سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے۔ سب فانی ہیں۔ اسی ایک کو بقا ہے سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں۔ وہی ایک شہنشاہ ہے۔ غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے موصوف ہے۔ ہر قسم کی خوبیاں اور ہر طرح کے کمالات اس کے لیے ہی ہیں۔ انسان کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک اللہ سبحانہٗ کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اس لیے ساری حمد و ستائش اسی کے لیے ہے۔ انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں اصحابِ کمال کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتیں۔ صاحبِ کمال سے آگے بڑھ کر خالقِ کمال تک نہ پہنچتیں وہ پردوں کے نقش و نگار دیکھ کر بے خود ہو جاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمالِ صنعت پر یہ دلآویز پردے ڈالے ہیں۔ دنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ الحمد للہ اس حقیقت کا اقرار ہے کہ اس کائنات میں تمام جمال و جلال خواہ کسی گوشہ اور کسی صورت میں ہو صرف ایک ذات

حق سبحانہٗ کی صفتوں کا ظہور ہے اور بس۔

۱۔ ستائش کی ہر قسم اس اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا اس پر بھی منکرین حق دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ مجوس دنیا کے لیے دو خالق مانتے ہیں۔ یزداں جو خالق خیر ہے اور اہرمن جو خالق شر ہے۔ اور دونوں کو نور و ظلمت سے منور کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے قائل ہیں۔ آریہ سماج باوجود ادعائے توحید مادہ اور روح کو خدا کی طرح غیر مخلوق اور قدیم کہتے اور خدا کو اپنی صفت تکوین و تخلیق وغیرہ میں ان دونوں کا محتاج بتلاتے ہیں۔ عیسائی دنیا کو باپ بیٹے کا توازن قائم رکھنے کے لیے آخر تین ایک اور ایک تین کا مشہور عقیدہ اختیار کرنا پڑا۔ یہودیوں نے خدا تعالیٰ کے لیے وہ صفات تجویز کیں کہ ایک معمولی انسان بھی نہ صرف اس کا ہمسر بلکہ اس سے بھی برتر ہو سکتا ہے۔ عرب کے مشرکین نے تو خدائی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ شاید ان کے نزدیک پہاڑ کا ہر پتھر نوع انسانی کا معبود بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ غرض آگ پانی، سورج ستارے درخت پتھر حیوان کوئی چیز لوگوں نے نہ چھوڑی جسے خدائی کا کوئی حصہ اور عبادت اور استعانت کے وقت خدا کے برابر نہ بٹھایا ہو۔ حالانکہ وہ ذات پاک جو تمام صفات کمال کی جامع اور ہر قسم کی خوبیوں کا منبع ہونے کی وجہ سے سب تعریفوں اور ہر طرح کی حمد و ثنا کی بلا شرکت غیرے مستحق ہے جس نے آسمان و زمین یعنی کل علویات و سفلیات کو پیدا کیا اور رات دن اندھیرا اجالا، علم و جہل، ہدایت و ضلالت، موت و حیات غرض متقابل کیفیات اور متضاد احوال ظاہر فرمائے اسے اپنے افعال میں نہ کسی حصہ دار یا مددگار کی ضرورت ہو سکتی ہے نہ بیوی اور اولاد کی، نہ اس کی معبودیت اور الوہیت میں کوئی شریک ہو سکتا ہے نہ ربوبیت میں۔ نہ اس کے ارادے پر کوئی غالب آ سکتا ہے اور نہ اس پر کسی کا دباؤ چل سکتا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ ان حقائق کو سمجھنے کے بعد بھی کس طرح لوگ کسی چیز کو خدائی کا مرتبہ دیتے ہیں[۱]

یاد رہے کہ یہاں مخاطب وہ مشرکین ہیں جو اللہ سبحانہٗ کو اس کائنات کا خالق مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ یہ اللہ کے سوا کوئی اور کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب توحید خالقیت کا قائل ہے۔ یہ چونکہ ان کی مانی ہوئی بات ہے اس لیے اس کی مانی ہوئی بات کو توحید

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

عبادت کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے یعنی جب تم مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اور گردش لیل و نہار کا فاعل اللہ ہے تو پھر عبادت میں اللہ کے سوا اوروں سے تعلقات استوار کیوں کرتے ہو ان کے سامنے سجدے ان کے ناموں کی نذریں اور نیازیں کیوں کرتے ہو، ان سے دعائیں کیوں مانگتے ہو اور ان کے سامنے اپنی حاجتیں کیوں پیش کرتے ہو؟

حمد کوئی سی ہو اور کسی قسم کی ہو اللہ کے لیے ہے، حمد کا درجہ لغوی اعتبار سے مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے۔ حمد محمود کی عام اختیاری خوبیوں پر کی جاتی ہے۔ یہ فقرہ الحمد للہ توحید کے سارے انواع و اقسام کے لیے جامع ہے۔ امام رازی نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ خود ستائی بندوں کے حق میں عیب ہے لیکن جس نے حمد الٰہی کے حکم کو اللہ کے حق میں عیب سمجھا اس نے اللہ کو بندوں پر قیاس کر لیا۔ اور معتزلہ کے اکثر خیالات کی بھی بنیادی غلطی یہی ہے۔ امام موصوف ہی نے یہاں یہ ضابطہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح افعال خلق پر افعال حق کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح صفات خلق پر صفات حق کو اور ذات خلق پر ذات حق کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہاں حمد کو پہلے اللہ کے اسم ذاتی اور پھر صفات کے ساتھ متعلق کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حمد کا استحقاق حق تعالیٰ کو بحیثیت ذات بھی ہے اور بحیثیت صفات بھی۔

خلق کے معنے عدم سے وجود میں لانے کے ہیں۔ السماوات والارض یہ دو نام ان چیزوں کے دیے گئے جن کو فلسفہ کی زبان میں جوہر کہتے ہیں اور الظلمات النور ان دو چیزوں کے نام ہیں جن کو فلسفہ میں عرض کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں جوہر ہو یا عرض ہر چیز کا بلا استثنا خالق و فاطر اللہ ہی ہے کوئی چیز اس کے لیے غیر مخلوق نہیں ہے۔

زمین و آسمان کی بناوٹ کے لیے خلق اور ظلمات و نور کے وجود و ظہور کے لیے جعل کا بلیغ تنوع بتا رہا ہے کہ اگرچہ ایک درجہ میں دونوں میں معنوی ہم آہنگی ہے لیکن جعل میں تضمین کے معنے بھی ہوتے ہیں نور و ظلمت ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اس لیے وہ ایک حیثیت میں ایک دوسرے سے پیدا ہو کر آتے ہیں۔ جعل میں بہ نسبت خلق کے زیادہ عموم ہے یہ تکوینی بھی ہوتا ہے اور تشریعی بھی۔

نور کو مفرد اور ظلمات کو جمع لا کر اشارہ کر دیا کہ نور میں وحدت ہی وحدت ہے جبکہ ظلمات میں تعدد ہے۔ نور کے مصادر میں خواہ تعدد ہو لیکن نور میں قوت اور ضعف تو ہو سکتا ہے مگر تعدد نہیں ہو سکتا۔ برخلاف ظلمت کے کہ اس کا آخر کوئی نہیں۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ یہ مانتے ہو کہ آسمانوں، زمین اور ظلمات و نور کا خالق اللہ ہے تو پھر یہ کیسی

عجیب بات ہے کہ یہ کفار دوسروں کو خدا کا ہمسر اور شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہاں ثم اظہارِ تعجب کے لیے ہے یعنی جب ساری چیزوں کا خالق اللہ ہی ہے تو پھر یہ شرک کی گنجائش کہاں سے نکالتے ہو۔

۲۔ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک مدت مقرر فرمادی اور ایک مقررہ مدت اور بھی ہے جو اس کے علم میں معین ہے۔ تعجب ہے کہ تم شک کر رہے ہو۔ اوپر عالم کبیر کا ذکر تھا، یہاں عالم صغیر انسان کی خلقت بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو شروع میں بے جان مٹی سے آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کر کے کس طرح حیات اور کمالاتِ انسانی کا فیضان فرمایا۔ اور آج بھی مٹی سے غذائیں نکلتی ہیں اور غذاؤں سے نطفہ اور نطفہ سے انسان بنتے رہتے ہیں۔ غرض اس طرح تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ پھر ہر شخص کی موت کا وقت مقرر کر دیا جبکہ دوبارہ اسی مٹی سے جا ملتا ہے جس سے پیدا کیا گیا تھا۔ اسی پر قیاس کر سکتے ہو کہ عالم کبیر کی فنا کا بھی ایک وقت مقرر ہے جسے قیامت کبریٰ کہتے ہیں۔ قیامت صغریٰ یعنی شخصی موتیں چونکہ ہمیں پیش آتی رہتی ہیں ان کا علم بھی لوگوں کو ہوتا رہتا ہے لیکن قیامت کبریٰ کی ٹھیک مدت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ تعجب ہے عالم صغیر یعنی انسانوں میں زندگی اور فنا کا سلسلہ دیکھتے ہوئے بھی عالم کبیر کی فنا میں کوئی آدمی تردد کر سکتا ہے [1]

اجل یا اجل مسمّٰی کا لفظ فرد یا اقوام کے تعلق سے مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو اس مدت حیات کے لیے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے دوسرے روز بعث اور قیامت کے لیے استعمال ہوا ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ تیسرے اس مقررہ پیمانے کے لیے استعمال ہوا ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے۔ اس آیت میں اجل کا ذکر دو مرتبہ ہے۔ ایک اجل تو ظاہر ہے کہ وہی ہے جو ہر فرد کی مدت حیات ہے، دوسرے اجل جس کے ساتھ مسمّٰی لگا ہوا ہے اس سے وہ مدتِ مقررہ مراد ہے جو اس عالم کو اٹھائے جانے کے لیے مقرر ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور یہ ایک حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی یارائے انکار نہیں۔ پھر ہر ایک کے لیے اس نے زندگی کی ایک مدت مقرر کی ہے۔ یہ نہیں کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ پھر اس میں شک کی کیا گنجائش ہے کہ جس خدا نے تمہیں مٹی سے بنایا وہ تمہیں دوبارہ اسی مٹی سے اٹھائے گا۔ اس کے لیے اس نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے - یہ ایک واضح حقیقت ہے جس میں کسی بحث وجدال کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم ہر بات میں الجھتے ہو اور بحث وجدال کرتے ہو۔ بتانا یہ ہے کہ وہی خدا جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے دو اجلیں یعنی دو میعادیں ٹھہرا دی ہیں - ایک زندگی و معیشت کی مہلت ہے دوسرے روز قیامت کا مقررہ وقت پہلی میعاد عمل کے لیے ہے دوسری نتائج عمل کے فیصلے کے لیے -حافظ ابن کثیر نے اجلین کی تشریح صحابہ اور تابعین سے یہ نقل کی ہے ۔

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں پہلی اجل سے مراد انسان کی موت ہے اور دوسری اجل سے مراد قیامت ہے - اور یہی تابعین تقریباً دس علمائے تابعین کا مختار ہے اور امام الحسن البصری فرماتے ہیں کہ ثم قضیٰ اجلاً سے پیدائش سے موت تک اور اجل مسمیٰ سے موت سے قیامت تک عرصہ مراد ہے - بالفاظ دیگر پہلی اجل سے انسانی زندگی اور دوسری اجل سے پوری کائنات کی زندگی مراد ہے ۔

اللہ ہی کارفرمائے عالم ہے

۳- وہی اللہ ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، وہی تمہاری چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے اور تم جو کچھ کمائی کرتے ہو وہ جانتا ہے - یعنی تمام آسمانوں ، زمین میں تنہا وہی معبود، مالک بادشاہ، متصرف اور مدبر ہے - اور یہ نام مبارک اللہ بھی صرف اسی کی ذات متعالی الصفات کے لیے مخصوص رہا ہے - پھر اوروں کے لیے استحقاق معبودیت کہاں سے آیا؟ اور جب زمین و آسمان میں اسی کی حکومت ہے اور وہی بلا واسطہ ہر کھلی چھپی چیز اور انسان کے ظاہر و باطن اور چھوٹے بڑے عمل پر مطلع ہے تو عابد کو اپنی عبادت و استعانت وغیرہ میں کسی غیر اللہ کو شریک ٹھہرانے کی ضرورت نہیں رہتی- مشرکین جو ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ کہا کرتے تھے یہ ان کا اور ان کے ہمنواؤں کا جواب ہوا اور پہلے اجل مسمیٰ عندہ سے جو قیامت کی طرف اشارہ کیا تھا - یہاں سلسلہ مجازات پر متنبہ فرمایا کہ زمین و آسمان میں حکومت ہماری ہے اور تمہارے سب کھلے چھپے ، نیک و بد اعمال بھی ہمارے علم میں موجود ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم یوں ہی مہمل چھوڑ دیے جاؤ [1]

دراصل پہلی آیت میں اللہ کی خالقیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا تھا اور درمیان میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی کی تاکید کی خاطر قیامت کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ توحید عبادت اور قیامت میں گہرا لگاؤ ہے کیونکہ عبادت نام ہے عملی زندگی میں اللہ کی مرضی کو اپنانے کا جبکہ قیامت کہتے ہیں اسی عملی زندگی کے ظہور نتائج کو قیامت کو ماننے بغیر عبادت کا سارا انتظام بے کار ہے۔ اب اس آیت میں اللہ کے کائنات میں متصرف ہونے سے توحید عبادت پر استدلال ہو رہا ہے۔ مشرکین کسی کو اس کائنات میں بڑے بڑے کاموں کی تدبیر، اللہ کا شریک نہیں مانتے تھے۔ ان کا شرک یہ تھا کہ کچھ بندوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ علی الاطلاق بادشاہ تو اللہ ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو حاجت روائی کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور ان کی رضا اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے ٹھیک ایسے ہی جیسے ایک بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں کو اطراف مملکت میں روانہ کرتا ہے اور ان کو جزوی معاملات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے اور ان معاملات سے خود بے رُخ ہو جاتا ہے اور لوگوں کے معاملات ان کے سپرد کر دیتا ہے۔ ان ہی کی سفارش قبول کرتا ہے۔ یہاں قرآن اسی مشرکانہ ذہن پر یہ کہہ ضرب کاری لگا رہا ہے وھو اللہ فی السماوات والارض، وہی جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا تاریکی اور روشنی بنانے والا ہے۔ آسمان و زمین میں اللہ ہے وہ تمہارے اقوال میلانات دل کی کیفیات اور اعمال کو جانتا ہے ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے یہ نہیں کہ بڑے بڑے کام وہ کرتا ہے اور کچھ اور بھی کرتے ہیں اور وہی یہ بھی جانتا ہے کہ تم کیا کمائیاں کرتے ہو۔ اس طرح یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے اور بڑے بڑے کام بھی وہ کرتا ہے لیکن کچھ کام اس نے کچھ اچھے بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ ان کا انتظام و انصرام وہ کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ سارے جہاں کا مدبر تو اللہ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو بعض مخصوص علاقوں میں تصرف کرنے کا اختیار عطا فرما دیتا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں یجعلھم مو ثرا متصرفا فی قسط من العالم (بدور بازغہ) پھر آگے لکھتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کا نام لینے والے منافقین کا بھی آج کل یہی عقیدہ ہے۔ (بدور بازغہ)

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ ءَايَةٍ مِّنْ ءَايَٰتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا۟ عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝
فَقَدْ كَذَّبُوا۟ بِٱلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنۢبَٰٓؤُا۟ مَا
كَانُوا۟ بِهِۦ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ أَلَمْ يَرَوْا۟ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم
مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا ٱلسَّمَآءَ
عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا ٱلْأَنْهَٰرَ تَجْرِى مِن تَحْتِهِمْ
فَأَهْلَكْنَٰهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِنۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا ءَاخَرِينَ ۝

اور ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے اس سے وہ بے رخی اختیار کر لیتے ہیں[۴]۔ چنانچہ اس حق کی بھی انہوں نے تکذیب کر دی جو وہ ان کے پاس آیا، جس چیز کا یہ لوگ مذاق اڑاتے رہے ہیں جلد ہی ان کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی[۵]۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے ہیں کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قومیں ہلاک کر دیں جن کو ہم نے

ملک میں ایسا جماؤ دیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا جماؤ نہیں دیا۔ ہم نے
ان پر لگاتار برسنے والی آسمانی برسات بھیج دی اور ان کی آبادیوں
کے نیچے بہتی نہریں بنا دی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے
گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری
قوموں کو پیدا کر دیا[6]۔

تکذیبِ حق کا انجام

دلائل توحید بیان فرمانے کے بعد اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ نبوت کے مخاطبوں میں اس سچائی کو قبول نہ کرنے کا سبب کیا ہے وہ کیوں خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اعراض، تکذیب اور استہزاء کرتے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ کفر کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اعراض، دوسرا درجہ تکذیب اور تیسرا درجہ استہزاء یہ کفر کا آخری درجہ ہے۔ انسان ہمیشہ خدا کی نشانیاں جھٹلاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی سچائی کی جو دعوت نمودار ہوتی ہے منکرینِ حق اس سے منہ موڑ رہے ہیں، تکذیب کر رہے ہیں اور مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اس کے انجام سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔ نبوت کی پیش کردہ آیات اگر وہ تکوینی ہوں، اور یہاں اسی کا احتمال ہے۔ کفار پر نتائج کے لحاظ سے دو قسم کی ہوتی ہیں آیتِ ہدایت اور آیتِ ہلاکت، کفار کو پہلے ہدایت کی نشانیاں دکھاتے ہیں اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک بالآخر وہ وقت آجاتا ہے جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا۔ یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیتِ ہلاکت آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا

سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے اور زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عنایت ہوئے مگر وہ اس لیے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیت ہلاکت ملی۔ حضرت نوح کو آیت طوفان حضرت صالح کو آیت ناقہ، حضرت لوط کو بربادی سدوم کی نشانی، حضرت شعیب کو آیت صاعقہ، حضرت عیسیٰ کو آیت رفع اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت بطشۃ الکبری (بدر) جو دیا گیا وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔ ان میں سے ہر معجزہ اور نشان کے ظہور کے بعد یا خود اسی معجزے اور نشانی کے ذریعے سے معاندین کی ہلاکت استیصال اور بربادی ہوئی۔

۴۔ اور ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے اس سے وہ بے رُخی اختیار کرتے ہیں۔ آیات میں احتمال ہے کہ تکوینی آیات مراد ہوں یا تنزیلی [۱]

آیات کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور مادی، دوسرے باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ مثلاً مُردے کو زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، باطنی و روحانی آیات مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر تعلیم ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے۔ اہل نظر اور حقیقت آشناؤں کے لیے بھی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

سب نے نبوت کی ظاہری و باطنی دو نشانیاں قرار دی ہیں اور شیخ الاسلام نے اسی کو تکوینی اور تنزیلی قرار دیا ہے۔ آیت میں لفظ آیت دو معنی کی گنجائش رکھتا ہے۔ اگر تکوینی آیت مراد ہے تو مطلب یہ ہے کہ جو معجزہ دیکھتے ہیں اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اسے سحر کہہ کر ٹال دیتے ہیں اور اگر تنزیلی آیات مراد ہیں تو مطلب یہ ہے توحید اور قیامت کی ان باتوں سے روگردانی کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ لوگ اعراض کر رہے ہیں۔

نبوت کی راہ سے آمدہ حق کی تکذیب

۵۔ چنانچہ اس حق کی بھی انہوں نے تکذیب کر دی ہے جب وہ ان کے پاس آیا جس چیز کا یہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

لوگ مذاق اڑا رہے ہیں جلد ہی ان کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ حق سے مراد قرآن حکیم ہے جو نشانہائے قدرت سے غفلت برتنے والوں کی بد انجامی اور دنیوی و اخروی سزا کو بیان کرتا ہے اسے سن کر منکرین تکذیب اور استہزار کرتے تھے انہیں جتلا دیا کہ جس بات پر تم ہنستے ہو اور آوازے کستے ہو وہ حقیقت ثابت بن کر عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی۔ آگے ان اقوام کا حوالہ دیا ہے جو آیات اللہ کی تکذیب و استہزار اور بد اعمالیوں کی بدولت ہلاک کی گئیں[1] حق سے اگر مراد قرآن حکیم ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ قرآن کی ایک ایک آیت سے اعراض اور بے رخی پورے قرآن کی تکذیب کا سبب ہو گئی۔ اس صورت میں جس سے اعراض کیا گیا اور جس کی تکذیب کی گئی دونوں ایک ہیں لیکن اگر حق سے مراد دین حق ہو جیسا کہ قرآن میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دین حق لے کر آئے۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله

تو اب مطلب یہ ہو گا کہ قرآن کی آیات سے اعراض اور روگردانی کی وجہ سے انہوں نے اس دین حق کی تکذیب کر دی جو ان کے پاس نبوت لے کر آئی ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ اعراض کا نتیجہ اگر تکذیب ہے تو تکذیب کا نتیجہ لازماً تعذیب ہے ان کل الا کذب الرسل فحق وعید لیکن عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک آیات ہدایت سے۔ قوم کے تمام صالح اجزار اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو ۱۳ برس تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور ان کو آیات ہدایت کے مختلف نمونے دکھائے بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے گزرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا۔ یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفا تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کر دیا جائے۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے فسوف یاتیهم انبؤا ما کانوا به یستهزءون کے ذریعے آخری عذاب کی اطلاع دے دی اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سوف کے ذریعے دی کیونکہ ابھی ذرا دیر ہے لیکن وہ نادان استہزاء کرتے تھے اور چونکہ قریش پر یہ عذاب مختلف صورتوں میں آنے والا تھا۔ قحط کی صورت میں، اقتدار سے محرومی کی صورت میں ذلت و رسوائی قتل و غارت گری کی صورت میں اور قید و بند کی صورت میں اسی کی رعایت سے آیت میں لفظ انباء آیا ہے جو نبأ کی جمع ہے جس کے معنے عظیم خبر کے ہیں۔ گویا اس میں اشارہ ہے ہجرت اور کامیابیوں کی طرف جو ہجرت کے بعد اسلام کو پے درپے حاصل ہونے والی تھیں جس وقت انباء کے ذریعے یہ اشارہ فرمایا گیا تھا اس وقت نہ کفار یہ گمان کر سکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں ان کو پہنچنے والی ہیں اور نہ مسلمانوں ہی کے ذہن میں اس قسم کا کوئی تصور تھا۔

عذاب کے لیے تاریخ کی شہادت

۶۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قومیں ہلاک کر دیں جن کو ہم نے ملک میں ایسا جماؤ دیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا جماؤ نہیں دیا، ہم نے ان پر لگاتار برسنے والی آسمانی برسات بھیج دی۔ اور ان کی آبادیوں کے نیچے بہتی نہریں بنا دی تھیں۔ پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قوموں کو پیدا کیا۔ یعنی عاد و ثمود وغیرہ جن کو تم سے بڑھ کر طاقت اور ساز و سامان دیا گیا تھا۔ بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ سرسبز و شاداب تھے۔ عیش اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ جب انہوں نے بغاوت اور تکذیب پر کمر باندھی اور نشانہائے قدرت کی ہنسی اڑائی تو ہم نے ان کے جرموں کی پاداش میں ایسا پکڑا کہ ان کا نام و نشان مٹ کر رہ گیا۔ پھر ان کے بعد دوسری امتیں پیدا کیں اور منکرین و مکذبین کے ساتھ یہی سلسلہ جاری رہا۔ مجرمین تباہ ہوتے رہے اور دنیا کی آبادی میں کچھ خلل نہیں پڑا۔[1]

پہلے ارشاد ہوا تھا کہ جس چیز کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ عنقریب ان کے سامنے واقعہ اور حقیقت بن کر ظاہر ہو جائے گا۔ اسی دعوے پر یہ تاریخ کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ دعویٰ نہ ہونا چاہیے کہ ان کی طاقت بہت زیادہ ہے ان کو ہلایا نہیں جا سکتا۔ ان سے پہلے ان سے زیادہ طاقتور قومیں گزر چکی ہیں جن کے پاس اقتدار بھی تھا اور رزق و فضل کی بھی فراوانی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔ قرآن سے معلوم ہوتا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ جن گناہوں کی پاداش میں اُمتیں ہلاک ہوتی ہیں وہ دو قسم کے ہیں ۔

ایک اللہ کے رسولوں کی تکذیب اور ان کی دعوت کا انکار، دوسرے عیش و عشرت میں پڑ کر، حق کو پامال کر کے نوائے عامہ کو حقیر و ذلیل کر کے، کمزوروں پر ظلم ڈھا کر، طاقتوروں کو چھوٹ اور بے لگام بنا کر زندگی کو فسق و فجور میں ڈال کر، دولت و مال پر گھمنڈ کر کے اللہ کی نعمتوں کا کفران اور عدل عام اور نفع عوام سے ہٹ کر ناخدا شناسی اور خدا کی بغاوت میں ان کا استعمال، اور ان دونوں کے نتیجہ میں دنیا میں جو عذاب آتا ہے وہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے ۔ ایک آزادی اور اقتدار سے محرومی کی صورت دوسری آفتوں، مصیبتوں خوفناک سیلاب، بازار کی گرانی، باہم آویزش کی صورت میں، تفصیل انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گی۔ یہاں قرآن نے ان دونوں کی طرف مکنٰھم فی الارض اور ارسلنا السماء علیھم مدرارًا" وجعلنا الانھار تجری من تحتھم کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ تمکین فی الارض سے مراد اگر اقتدار و استقلال ہے تو آسمانی برسات نہروں کی روانی سے خوش حالی مراد ہے ۔ آزادی سے محرومی اور بدحالی سے ہم آغوشی دونوں عذاب ہیں۔

آیت میں دیکھنے سے مراد جاننا ہے اور قرن ایک دور کے لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ان معنے میں یہ لفظ جگہ جگہ آیا ہے۔ قوم نوح ایک قرن ہے چاہے ہزار سال ہو۔ قوم عاد ایک قرن ہے۔ قوم ثمود ایک قرن ہے۔ تمکین کا لفظ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لام کے ساتھ اور بغیر لام کے۔ لام کے ساتھ ہو تو اس کے معنے اقتدار کے لیے حالات سازگار بنا دینا اور وسائل فراہم کر دینا اور بغیر لام کے ہو تو اس کے معنے اقتدار سے ہم آغوش کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دعوت کی تکذیب کرنے والوں کو پتہ نہیں ہے کہ ہم نے ان سے پہلے ان قوموں کو ہلاک کر دیا ہے جن کو ہم نے ملک میں اس قدر استقلال اور اقتدار سے ہم آغوش کیا تھا کہ ان تکذیب کرنے والوں کو اس استقلال و اقتدار کے وسائل کی بھی ہوا نہیں لگی تھی اور ہم نے ان کو وہ نعمتیں دے رکھی تھیں کہ بارشوں کی فراوانی اور ان کے ملک میں نہروں کی بہتات سے معاشی اور اقتصادی خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ لیکن ان کا زبردست اقتدار اور بھرپور خوش حالی ان کو ہماری گرفت سے نہ بچا سکی تو تمہاری تو حیثیت ہی کیا ہے کہ نہ تمہارے پاس وہ اقتدار ہے اور نہ وہ خوش حالی ہے ۔

اس تاریخی شہادت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف اوقات میں عذاب آئے اسی طرح جس قوم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ان پر اعراض، تکذیب اور استہزاء کے نتیجے میں عذاب آئے گا۔ قریش کے لیے غزوہ بدر عذاب تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں

کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ حضور انور نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی مگر پھر بھی قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہو گیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی اور طریقہ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشہ کبریٰ ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ یہاں قرآن نے ہجرت سے پہلے ہی ان دونوں کا اعلان سنا دیا ہے۔

آخر میں فرمایا وانشانا من بعدھم قرنا آخرین یعنی اللہ سبحانہ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہ تھا کہ بڑی بڑی جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور قوت و طاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک کر دیا بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی ان کی جگہ دوسری قوموں کو بسا دیا کر دیکھنے والوں کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ کوئی کمی ہوئی ہے۔

قرآن کے اس انداز بیان نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے بتا دیا کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے۔ یعنی جو کچھ گزر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہے اور ماضی کے آئینہ میں مستقبل کا چہرہ دیکھا جاتا ہے۔ مقصد یہ جتانا ہے کہ قریش کو اپنی قوت و شروت پر اہل ایمان کی کمزوری کے مقابلہ میں مغرور نہ ہونا چاہیے اور اس نعرے میں مست نہ ہونا چاہیے کہ نحن اکثر اموالاً و اولاداً" اور تاریخ کے اس تازیانے سے بے خبر نہ رہنا چاہیے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہ کا کیا معاملہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے وہی حال میں ہو سکتا ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ
اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ
لَا يُنْظَرُوْنَ ﴿٨﴾ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا
عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ﴿٩﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ
فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٠﴾ قُلْ
سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾

اے پیغمبر اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی
اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو لیتے پھر بھی جو
حق کا انکار کر چکے ہیں یہی کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے
کہتے ہیں کہ اس نبی پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا، اور اگر

ہم نے کہیں فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملتی اور اگر ہم فرشتہ کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب وہ مبتلا ہیں۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سے پہلے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے پھر جس بات کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی بات نے گھیر لیا ان کو جو ان میں سے مذاق اڑاتے تھے ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو، پھر ان لوگوں کا انجام دیکھو جو جھٹلانے والے تھے[9]۔

نبوت کا عرب جاہلیت سے مقابلہ

عرب قوم ایک امی محض تھی، الوہیت رسالت، کتاب معاد، عبادت۔ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن عزیز نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کا متعدد بار ذکر کیا ہے۔ یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔ صفات الٰہی آثارِ نبوت احوال معاد ان میں سے ہر بات کو سن کو وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے۔ نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں۔ اس منصب پر تو فرشتوں

کو ممتاز ہونا چاہیے۔ نبی کا تخیل اگر کبھی ان کے ذہن میں آتا تھا تو بشریت سے ماورا صورت میں یعنی یہ کہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پہرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دستِ قدرت میں ہوں۔ یہ اور اس قسم کے تصورات ان کا مبلغ علم تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کی جانب سے متعدد شبہات جنم لیتے اور قرآن کو ان کے جواب کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا پڑتا۔ چنانچہ یہاں قرآن اسی سلسلے کے ان کے شبہات کا جواب دے رہا ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ قرآن نبوت اور دعوت اسلام کے بارے میں ان میں اعراض اور تکذیب رونما ہو رہی ہے۔ اب بتارہا ہے کہ اس کے اسباب نبوت اور دعوت اسلام کے بارے میں کچھ شبہات ہیں۔

۷ ۔ اے پیغمبر اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے پھر بھی جو حق کا انکار کر چکے ہیں یہی کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ بعض مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ اگر آپ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب لے آئیں اور اس کے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں جو ہمارے سامنے ہو کر گواہی دیں کہ بے شک یہ خدا کی کتاب ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے اس کا جواب دیا کہ جو لوگ بحالت موجودہ قرآن کو جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر بتلاتے ہیں۔ اگر واقعی ہم ان پر کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی آسمان سے اتار دیں جسے یہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کرلیں کہ کوئی تخیل یا نظر بندی نہیں ہے تب بھی یہی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے جس بدبخت کے حصے میں ہدایت نہیں ہوتی اس کا شبہ کبھی نہیں مٹتا[1] کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنے ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر کر سامنے آئے۔ کبھی وہ کہتے لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ یہ قرآن اس پر یکبارگی کیوں نہیں اتارا گیا اور کبھی کہتے حتی تنزل علینا کتابا نقرأہ ان کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کی طلب میں نہ تھیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جاتے اور ہمیشہ راست باز انسانوں کے مقابلے میں نہ ماننے والوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔ جب کبھی سچائی کی کوئی بات کہی جاتی ہے تو طلب حق رکھنے والی طبیعتیں اور کسی طرف نہیں جاتی ہیں خود اسی بات پر غور کرتی ہیں، اور جب سچائی پالیتی ہیں تو فوراً قبول کر لیتی ہیں لیکن ایک سرکش اور ہٹ دھرم آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ کبھی ماننے والا نہیں۔ پھر کوشش کرتا ہے کہ نہ ماننے کے لیے کوئی بات بنائے وہ طرح طرح کی باتیں ادھر ادھر کی نکالے گا۔ کبھی ایک بات کہے گا کبھی دوسری۔ پہلے کسی ایک بات پر زور دے گا کہ اس کا جواب کیا ہے جب اس کا جواب مل جائے گا تو کوئی دوسری بات نکال لے گا۔ یہاں قرآن نے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ لکھی لکھائی کتاب کیوں نہیں لاتے فرمایا کہ ان کی فرمائش کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سحر کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور تخیل و نظر بندی سے زیادہ اسے وقعت نہیں دیتا۔ سورہ طٰہٰ میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خیال سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے یخیل الیہ من سحرھم انہا تسعی جادوگروں کی لاٹھیاں موسٰی کے خیال میں جادو کے اثر سے دوڑتی معلوم ہونے لگیں۔ لیکن ہمارے کچھ متکلمین کو اصرار ہے کہ سحر بھی خوارق میں سے ہے، معجزے اور سحر میں فرق صرف اشخاص کا ہوتا ہے۔ حق اور باطل ہونے کا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس کے خلاف کھلا چیلنج ہے۔ قرآن نے صاف بتایا ہے کہ سحر تخیل اور نظر بندی کا نام ہے اس میں واقعیت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ سحر سرتاسر کید و فریب ہے، آرٹ اور فن ہے جو دوسرے فنون کی طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ برخلاف خوارق کے کہ وہ کوئی فن نہیں ہے نہ پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے سے حاصل ہوتا ہے۔

فرشتہ کے نزول کی فرمائش

۸۔ اور کہتے ہیں کہ اس نبی پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا اگر ہم نے کہیں فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم فرشتہ کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں۔ یعنی فرشتہ ہمارے روبرو ہو کر ان کے صدق کی گواہی دے دیتا۔ اگر فرشتہ اپنی صورت میں آتے تو یہ لوگ ایک منٹ کے لیے اس کا تحمل نہ کر سکیں اس کے رعب و ہیبت سے دم نکل جاتے۔ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا ظرف ہوتا ہے جو اصلی صورت میں فرشتہ کی رویت کا تحمل کر سکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں دو مرتبہ حضرت جبریل کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا ہے اور کسی نبی کی نسبت ایک مرتبہ بھی دیکھنا ثابت نہیں۔ دوسرے اگر ان لوگوں کی ایسی عظیم الشان خارق عادت فرمائش پوری کر دی

جائے اور اس پر بھی نہ مانے جیسا کہ ان کے معاندانہ احوال واطوار سے ظاہر ہے تو سنۃ اللہ کے مطابق پھر قطعاً مہلت نہ دی جائے گی اور ایسا عذاب آئے گا جو فرمائش کرنے والوں کو بالکل نیست و نابود کردے گا اس لحاظ سے اس طرح کی فرمائشوں کا پورا نہ کرنا بھی عین رحمت سمجھنا چاہیے۔ چونکہ فرشتہ کو اصلی صورت میں پہنچنے کی نفی تو پہلی آیت میں ہو چکی ہے اب دوسرے احتمال کا جواب دیتے ہیں وہ یہ کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں بھیجا جاتے کیونکہ اسی صورت میں مجانست صوری کی بنا پر لوگ اس کے نمونہ اور تعلیم سے متمتع ہو سکتے ہیں لیکن اس تقدیر پر منکرین کے شبہات کا ازالہ نہیں ہو سکتا جو تشکک و شبہات رسول کے بشر ہونے پر کرتے تھے وہ ملک کے بصورت بشر آنے کی صورت میں بھی بدستور کرتے رہیں گے۔[1]

نبوت کے بارے میں مشرکین مکہ کا موقف یہ تھا کہ جب ایک شخص خدا کی جانب سے منصب نبوت پر سرفراز ہو کر آئے تو ضروری ہے کہ اس کے لیے آسمان سے ایک فرشتہ ضرور اترے۔ ان کو اس پر حیرت تھی کہ خدا کسی کو پیغمبر مقرر کرے اور پھر اس طرح بے یار و مددگار ہو۔ کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی ہمرکابی میں ہو جو اس کی حفاظت کرے۔

قرآن نے ان کے اس اعتراض کے یہاں دو جواب دیے ہیں۔

ایک یہ کہ ایمان لانے اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لینے کی جو مہلت تمہیں ملی ہوئی ہے یہ اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردہ غیب میں پوشیدہ ہے۔

غیب کا پردہ چاک ہونے کے بعد مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اس کے بعد تو صرف حساب لینا باقی رہ جائے گا کیونکہ دنیا کی زندگی تمہارے لیے ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں امتحان اس بات کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل و فکر کے صحیح استعمال اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرط لازم ہے اور تمہاری دنیوی زندگی دراصل مہلت امتحان سے اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجہ امتحان نکلنے کا وقت آجائے گا۔ لہٰذا تمہارے مطالبے کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے فرشتے کو اس کی اصلی صورت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں نمایاں کر دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے امتحان کی مدت ختم کرنا نہیں چاہتا[1]

دراصل یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی ساری آزمائش اس بات کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرمانبرداری اختیار کرے۔ صاحب کشف نے الاختیار قاعدۃ التکلیف کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کہ آدمی کو ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنے ہو کر رہ جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر فرمایا ہے لو انزلنا ملکا لقضی الامر اگر ہم کوئی فرشتہ اتار دیتے تو معاملہ کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں گردن جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

اس توجیہ کے اچھوتے ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس میں بوئے اعتزال ہے ان کا کہنا ہے کہ فرشتہ کی اصلی صورت میں الاسلام کے لیے اکراہی صورت ہے اس سے انسان مسلوب الاختیار ہو جاتا ہے۔ صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے اسے تارِ عنکبوت قرار دیا ہے سید رشید رضا نے اس تفریع سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں لیس علی قواعد السنۃ کہا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ شارحین قرآن نے بتایا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ فرمائشی معجزہ دیے جانے کے بعد مہلت نہیں دی جاتی۔ اس طرح ان کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور کچھ علماء نے یہ مطلب بتایا کہ فرشتوں کا مشاہدہ ہی اتنا ہولناک ہے کہ ان کی روحیں پرواز کر جائیں گی۔ علامہ ابوالسعود نے اسے اپنایا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں اصل بات یہ ہے کہ فرشتوں کی آمد کی صورت میں فرمائش کرنے والوں کا ایمان نہ لانا ان کی ہلاکت کا سامان ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ اگر ہم بالفرض فرشتہ ہی روانہ کرتے یعنی بجائے آدمی کے فرشتہ کو رسول بنا کر روانہ کرتے تو ظاہر ہے کہ فرشتہ کو اس کی صورت میں نہیں، بلکہ کسی مرد کی صورت میں روانہ کرتے تاکہ انسان اس سے استفادہ کر سکیں کیونکہ فرشتہ اگر اپنی صورت میں آتا ہے تو لوگ اس سے کمال نورانیت

---

[1] تفہیم القرآن۔

اور کمال جلال و جمال کی وجہ سے استفادہ تو کیا اس کو دیکھنے کی بھی ان میں تاب نہ ہو گی اس لیے لامحالہ اگر فرشتہ کو پیغمبر بنا کر روانہ کرتے تو اسے بھی مرد ہی کی صورت میں روانہ کرتے تاکہ مجانست صوری کی وجہ سے لوگوں کے لیے استفادہ آسان ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے متعلق بھی وہی اشتباہ ہوتا جو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے میں پیش آ رہا ہے یعنی یہ کہ انسان خدا کا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فرشتہ کی شکل و صورت بھی انسان کی ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے تو جب وہ انسان کے روپ میں آتے تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جو اب اٹھا رہے ہیں۔ ما یلبسون سے یہ بات خود بخود معلوم ہو رہی ہے کہ یہ بات نہیں کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح سادہ لوح لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا سکیں۔

دراصل ان شبہات کی اساس یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ ایک انسان خدا کا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام مشرکین کا متفقہ شبہ ہے۔ قرآن نے متقدمین و متاخرین کا یہ نظریہ بتایا ہے کہ بشر رسول نہیں ہوتا۔ یہ اوتار مان سکتے تھے، مظہر خدا اور خدا مان سکتے تھے فرزند اور ظل خدا مان سکتے تھے۔ خدا کی بیٹیوں کے وجود کے قائل ہو سکتے تھے لیکن بشر کی رسالت کو ان کا دماغ کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان کا فکر یہ تھا کہ روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو محض ایک انسان کے ذریعے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ انسانیت سے کوئی بالاتر ہستی ہو۔ اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا۔ چنانچہ سورہ اعراف اور ہود میں آپ پڑھیں گے کہ ہر داعی حق کے منکروں نے یہ بات ضرور کہی ہے ما نراك الا بشراً مثلنا تم تو ہماری طرح بشر ہو، پھر تمہارا یہ دعویٰ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ ہم رسول ہیں۔ مشرکین مکہ کا بھی یہی ذہن تھا۔ اور قرآن کا انکشاف ہے کہ کفار و مشرکین کو ایمان لانے سے ان کا یہی نظریہ مانع رہا کہ بشر کو رسالت کیوں کر مل سکتی ہے ابعث اللہ بشراً رسولا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنایا۔ ان نادانوں نے بشر کو رسول ماننے سے تو انکار کیا لیکن پتھر اور مٹی کے ٹکڑے کو معبود بنانے سے نہ شرمائے۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اقرار ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ ۱۵ پارے میں آئے گی۔ یہاں سرِدست اتنا سمجھ لیجئے کہ فقہائے کرام اور علمائے ملت نے اس کی تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

بشر ہونے کا انکار تو کیا اگر کوئی شخص لاعلمی کا اظہار بھی کرے تب بھی اس کے ایمان کی خیر نہیں ہے کہ اس نے ایک ضروری اور بنیادی عقیدہ کو معلوم نہیں کیا چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے۔

جو شخص یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے یا جن تو وہ شخص کافر ہے۔

یعنی اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اقرار ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں۔

اگر تم یہ دریافت کرو کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر اور عربی ہونے کا علم صحت ایمان کے لیے شرط ہے یا اس کی حیثیت فرض کفایہ ہے تو اس کا جواب حافظ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم عراقی نے یہ دیا ہے کہ یہ بات ایمان کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے اگر ایک شخص کہتا ہے کہ میرا ایمان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالمی رسالت ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آپ بشر تھے یا فرشتہ یا جن یا یہ کہا کہ مجھے پتہ نہیں کہ آپ عربی تھے یا عجمی تو اس شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں رہے کیونکہ یہ شخص قرآن کی تکذیب کرتا ہے۔

آثارِ قدیمہ کا مطالعہ کرو

۹۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سے پہلے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے پھر جس بات کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے گھیر لیا ان کو جو ان میں سے مذاق اڑاتے تھے۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو پھر ان لوگوں کا انجام دیکھو جو جھٹلانے والے تھے۔ معاندین کی فرمائشوں کا جواب دینے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی جاتی ہے کہ ان کے تمسخر اور استہزاء سے دلگیر نہ ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انبیائے سابقین کو بھی ان ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پھر جو ان کے مکذبین اور دشمنوں کا حشر ہوا سب کے سامنے ہے ان کو بھی خدا اسی طرح سزا دے سکتا ہے جو اگلے مجرموں کو دی گئی۔ آگے فرمایا ہے کہ ملک کی سیر و سیاحت اور تباہ شدہ اقوام کے آثار ملاحظہ کرنے کے بعد اگر نظر عبرت سے واقعاتِ ماضیہ کو دیکھو گے تو دنیا کی تکذیب کرنے والی قوموں کا جو انجام دنیا میں ہوا وہ صاف نظر آجائے گا۔ اسی سے قیاس کر لو کہ جب تکذیب کرنے والوں کا یہ حشر ہوا تو استہزاء کرنے والوں کا کیا حشر ہوگا[1] اس سے پہلے فسوف یاتیھم انباء ما کانوا بہ یستھزءون

[1] افادات شیخ الاسلام

میں قریش کو ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ دعوتِ حق کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کا انجام یقینی ہے وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی رسُول آتے رہیں انہوں نے بھی اپنی قوموں کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی، ان کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا جس طرح تمہارا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ بالآخر مذاق کے نتیجے میں عذاب آگیا۔ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کی قبولیت کی اللہ سبحانہٗ کی جانب سے خبر ہے اور آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ قطعاً پریشان نہ ہوں عذاب آرہا ہے۔ اس سے پہلے ترتیب نزول کے اعتبار سے جو سورت نازل ہوتی ہے اس میں مذاق کرنے والوں کی سزا اور ہلاکت کا اشارہ ہے۔ میری مراد سورہ حجر ہے جس میں ارشاد ہے۔

انا کفینٰک المستھزئین

ان ہنسی اڑانے والوں کے لیے ہم تمہاری جانب سے کافی ہیں۔

ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صحنِ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش اِدھر اُدھر بیٹھ کر ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کون مذبح میں جاکر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گئے تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جو اس موقعہ پر موجود تھے کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کر سکتا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جاکر فاطمہ کو اطلاع دی، جو اس زمانے میں بچی تھیں وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپ نے سر اٹھایا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوتے ہیں۔ یہ رؤسائے قریش کی مہلت کا آخری موقع تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بد دُعا کی لیکن پھر بھی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت دیکھئے کہ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ کی طرح پوری قوم کی تباہی اور بربادی کی دُعا نہیں کی بلکہ صرف رؤسائے قریش کے حق میں بد دُعا کی اور ان میں سے سات رئیسوں کے نام لیے اور فرمایا کہ خداوندا قریش کو لے، خداوندا ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ بن محیط، اُمیہ ابن خلف، ولید بن عقبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ۔ یہ بد دُعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ (بخاری و مسلم) اسی دُعا کی قبولیت کی حضور انور کو اس آیت میں خبر دی جا رہی ہے۔ آپ نے اس سے پہلے کہ غزوہ بدر کا واقعہ پیش آئے ہجرت کے بعد ہی ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ استہزاء کرنے والے رؤسائے قریش تھے اور جن کا استہزاء کیا جا رہا تھا وہ خود حضور کی ذات گرامی تھی۔ نبوت ہی کے استہزاء کا نتیجہ عذاب ہے۔ جیسا کہ ضحاک بالذین کی فاء بتا رہی ہے۔ اسی بنا پر ہمارے فقہاءؒ نے نبوت کے استخفاف، توہین کو ناقابل عفو فوجداری جرم قرار دیا ہے۔ خلاصۃ الفتاوی میں ہے۔

محیط میں ہے کہ جس شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا کہا اور آپ کی توہین کی یا دینی امور میں آپ کا عیب نکالا یا آپ کی ذات یا آپ کے ذاتی اوصاف میں کسی صفت میں عیب لگایا۔ عام اس سے کہ بُرا کہنے والا آپ کی اُمت سے ہو یا غیر ہو اور عام اس سے کہ ذمی ہو یا حربی اور برابر ہے کہ آپ کی برائی یا اہانت یا عیب قصداً اس سے سرزد ہوا ہو یا سہواً یا غفلت یا فی الواقع ہو یا دل لگی میں ہو۔ ہر صورت میں یہ دوامی کفر ہے بایں حیثیت کہ اگر وہ توبہ بھی کرے تو اس کی توبہ کبھی قبول نہ ہوگی۔ نہ عنداللہ نہ عندالناس اور شریعت مطہرہ میں اس کا حکم متاخرین مجتہدین کے اتفاق سے اور متقدمین کے نزدیک بھی یہ ہے کہ اس کو یقیناً قتل کیا جائے۔ بادشاہ اور اس کا نائب اس کے قتل میں قطعاً کوئی نرمی اور مداہنت نہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد ہے قل سیروا فی الارض یعنی گزری ہوئی قوموں کے آثار قدیمہ اور ان کے تاریخی واقعات شہادت دیں گے کہ صداقت و حقیقت سے منہ موڑنے اور باطل پرستی پر اصرار کرنے، اور انبیاءؑ کا مذاق اڑانے کی بدولت کس طرح یہ قومیں عبرتناک انجام سے دوچار ہوئیں۔ بالخصوص خود ملک عرب کے حالات و آثار کا مشاہدہ کرو تو تمہیں اس میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی تباہی کے بہت سے آثار ملیں گے۔ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کا مذاق اڑایا تھا اور اس عذاب کو محض خالی دھمکی سمجھا تھا جس کی رسول نے خبر دی۔ بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اور مذاق اڑانے والوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اپنی قوم کے ان مکذبین سے کہہ دو کہ سفر کرو اور دوران سفر میں ہلاک ہونے والی قوموں کے مکانات دیکھو اور غور کرو کہ وہ زبانِ حال سے بول رہے ہیں کہ ہمارے انجام سے عبرت پکڑو۔

تعبیر میں یہ بلیغ نکتہ قابل غور ہے کہ بجائے عاقبۃ المستہزئین کے عاقبۃ المکذبین فرمایا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مکذبین کو ہلاک کر دیا اگرچہ ہلاکت کا ظاہری

سبب مستہزئین کے مطالبات تھے اور پھر جب ہلاکت مکذب پر آئی ہے تو استہزاء کرنے والے کیونکر بچ سکتے ہیں۔

یہاں اور دوسرے مقامات پر یہ تعبیری تنوع کہ یہاں ثم انظروا فرمایا جبکہ دوسرے مقامات پر فانظروا ہے قابلِ غور ہے۔ اگرچہ اس تعبیر کی بلاغت پر لکھنے والوں نے بہت کچھ دادِ تحقیق دی ہے مگر ہمیں الانتصاف میں علامہ احمد بن المنیر کی یہ بات بہت پسند آئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جن جگہوں پر فا آئی ہے وہاں سبب کا اظہار مقصود ہے اور جہاں ثم آیا ہے وہاں مطالعہ اور معائنہ کی مقصودیت کو بتانا منظور ہے۔ یہاں مقصود ہی چونکہ ہلاک ہونے والوں کے مکانات اور شہروں کا مطالعہ ہے اس لیے ثم لائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم سفر تو بہت کرتے ہو، اور تمہارا ان امکنہ سے گزر بھی ہوتا ہے۔ لیکن مطالعہ کو مقصد بنا کر ملک کا سفر کرو۔ تاکہ تمہیں اپنے حال کا ماضی سے موازنہ کا موقعہ ملے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ
الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا
فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ
اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٤﴾
قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥﴾
مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ
بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٧﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ
وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿١٨﴾

ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک

کون ہے؟ کہہ دو کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے[10]۔ اس نے مہربانی کو
اپنے اوپر لازم کر لیا ہے[11]۔ قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور
جمع کرے گا یہ ایک بالکل بے اشتباہ حقیقت ہے وہ لوگ
جنہوں نے اپنے تئیں گھاٹے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں
مانتے ہیں[12]۔ اور رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں
جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا
اور جانتا ہے[13]۔ کہہ دو کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو کارساز
بنالوں اس خدا کے علاوہ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا
ہے[14]۔ اور جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ہے[15]۔ تم
کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے سامنے سرنگوں ہونے
والوں میں سب سے پہلے میں اس کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں
اور مجھے کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ

ہوتا[16]۔ کہہ دو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے اگر میں اس کی نافرمانی کروں[17]۔ اس دن جس کے سر سے عذاب ٹل گیا تو اس پر خدا نے رحم کیا اور بڑی سے بڑی کامیابی یہی ہے[18]۔ اور اے انسان اگر خدا تجھے دکھ پہنچائے تو اس کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہے مگر اسی کی ذات اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے تو وہ ہر بات پر قادر ہے[19]۔ اور وہی ہے جو اپنے بندوں پر زور اور غلبہ رکھنے والا ہے وہی صاحبِ حکمت اور بڑا باخبر ہے[20]۔

توحید تکمیلِ مقاصد کے لیے ضروری ہے

اللہ کا اعتقاد مقاصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا مملکت کے وجود کے لیے فوج اور پولیس کا ہونا ضروری ہے لیکن خدا کا اعتقاد و تصور اپنے متضمنات رکھتا ہے جو اس سے جدا نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ الوہیت کا ہر تصور بشرطیکہ وہ شخصی نہ ہو اپنے ساتھ خیر و شر کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار کا ایک متعین نظام پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں خدا کا اعتقاد بے معنے ہے۔ اگر اس کی خوشنودی اور ناخوشی اس کی رحمت اس کے غضب و انتقام کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں جس خدا کی پسند و ناپسند ہوگی جس کی خوشی و ناخوشی کا کوئی اصول و معیار نہ ہو جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو کہ وہ کس قسم کے عمل سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سا عمل اس کے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجاء کے جذبات

کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کا اعتقاد خیر و شر کا ایک مستقل معیار وجود میں لاتا ہے۔ اگر خدا کا اعتقاد مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ اخلاقی اقدار اور معیار خیر و شر ہی ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے جو اس تصور سے متیقن ہوتا ہے ورنہ خدا کا اعتقاد بے معنے ہو کر رہ جائے گا۔ اور اس کی اصلی غرض فوت ہو جائے گی لہٰذا ہم توحید الوہیت کی حدود میں اس نتیجہ پر پہنچنے میں مجبور ہیں کہ مسجد میں عبادت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کی طاعت ہونی چاہیے کیونکہ خدا کی پسند و ناپسندیدگی اور اس کی خوشنودی اور ناخوشی کے اسباب کا علم انسان کو صرف نبوت ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے نبوت کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرت کا معیار متعین کرنا دشوار ہو جائے گا۔ قرآن کے نزدیک رسول کی شخصیت و سیرت ایک نمونہ ہے اور اس کی دعوت ہے کہ شخصیت کا نشو و ارتقاء اسی نمونہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ رسول کی شخصیت مسلمانوں کے لیے ایک عملی نمونہ ہے۔ رہی اجتماعی سیرت تو اس کی تشکیل میں صحابہ کی زندگی اسلامی معاشرے کے لیے بطور ایک معیار موجود ہے۔ شخصی اور اجتماعی سیرت کے ان دونوں نمونوں پر مسلمانوں میں کامل اتفاق ہے۔ ایسا کیوں ہے اس لیے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ ساری بساط حیات اُلٹ جائے گی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی۔ اور آسمان و زمین کے کرتے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلاق عالم اپنی صفت خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہو گا۔ ان آیات میں ان ہی تین مسائل توحید الوہیت، رسالت اور قیامت کو مختلف انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے ان کے شبہات کا جواب دیا ہے اور ان ہی تین کے بارے میں دلائل پیش کیے ہیں اب یہاں ان ہی تین مسائل کے دلائل کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سوال و جواب کا انداز ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ فرمایئے

۱۲۔ ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے کہو وہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔

یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ پہلے حکم ہوا کہ ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کی موجودات کس کی ہیں سائل نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں ٹھہر گیا۔ مخاطب اگرچہ خود قائل ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے لیکن نہ تو وہ غلط جواب دینے کی جرأت رکھتے ہیں اور نہ صحیح جواب دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اگر صحیح جواب دیتے ہیں تو انہیں خوف ہے کہ مخالف اس سے ان کے مشرکانہ عقیدے کے خلاف استدلال کرے گا اس لیے وہ کچھ جواب نہیں دیتے تب حکم ہوتا ہے کہ تم خود ہی کہو کہ سب کچھ اللہ کا ہے [1]

[1] تفہیم القرآن

قرآن میں جہاں سوال کر کے مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع میں مخاطب کے لیے اصل جواب سے یا رائے انکار نہیں ہوتا۔ یعنی جواب اتنا واضح اور صاف ہوتا ہے کہ مخاطب کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اگر مخاطب کا کوئی فکر کوئی عمل اس کے خلاف ہے تو وہ خود اس کے مسلمہ کے خلاف ہے۔ سوال یہ کیا گیا ہے کہ اے میری دعوت سے اعراض کرنے والو اور میری تکذیب کرنے والو بتاؤ کہ عالم بالا اور عالم زیریں میں ان مخلوقات و مصنوعات سے مالکانہ تعلق کس کا ہے۔ یاد رہے کہ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود آسمان و زمین کا خالق اور مالک اللہ ہی کو مانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مسلمات کے مطابق اس کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ یہاں ہر چیز اللہ کی ملک ہے نبوت کا اور مشرکین کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے نبوت ہی کو حکم ہوا ہے کہ تم کہو کہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے۔ اس سوال و جواب کو ایک نئے استدلال کے لیے زمین بنایا گیا ہے۔ استدلال یہ ہے کہ جب تمام مخلوقات کے اللہ کے علاوہ مملوکانہ تعلقات کسی سے نہیں ہیں تو پھر مملوک ہو کر تمہارے عابدانہ تعلقات میں اللہ کے ساتھ اوروں کی حصہ داری کیوں ہے؟ یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ مالکیت کسی اور کی ہو اور عبدیت کسی اور کے لیے ہو۔ ایک انسان غفلت کی سرشاری میں ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے لیکن اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ جو خالق اور مالک ہے وہی معبود ہے۔ اس کے خلاف کہنا اپنی فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ یہاں قل للہ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مخاطبوں میں سوال کے جواب کی ہمت نہ تھی۔ قرآن نے یہاں استدلال کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ اگرچہ امام رازی کی کلامی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا لیکن انسان کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے کر اس کے فطری وجدان سے اپیل کر رہا ہے۔ گویا یہ اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ امام رازی کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے قرآن کا اسلوبِ استدلال ان پر واضح نہ ہو سکا اور وہ دور دراز متکلمانہ بحثوں میں نکل گئے۔

رحمت کی وسعت اور اس کے تقاضے

۱۱۔ اس نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اصل میں کتب علی نفسہ الرحمۃ ہے۔ یہ فقرہ بھی قل ہی کے تحت ہے۔ یعنی یہ بھی فرما دیجیے کہ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس کی رحمت عام ہے۔ یہ تعبیر صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ اللہ کی ذات صفتِ رحمت سے موصوف ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اسلام کا خدا تمام تر رحمت ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ

کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمان و رحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے سب کچھ اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہیں تو کچھ نہیں۔ اسی لیے اس کی رحمت سے نا اُمیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی نہیں مگر اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے گنہ گاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے۔ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے رحمان و رحیم بھی، اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

صحیح بخاری اور ترمذی کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو لوح محفوظ میں یہ لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غصہ سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ تحریر اس کے سامنے عرش پر موجود ہے، کارخانہ عالم تمام کا تمام اسباب و مسببات کا محکوم ہے اس لیے قرآن اور حدیث میں اگر کہیں کتابت کا ذکر آجاتا ہے تو اس کو نہ مجاز و استعارا بنانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی تاویل و تامل کی۔ ہاں اس جسارت اور دلیری کی بھی اجازت نہیں کہ عالمِ غیب کو عالم شہادت پر قیاس کر کے کاغذ قلم دوات کے جو آلات یہاں درکار ہیں وہی عالمِ بالا میں تصور کر لیے جائیں۔

غیب را ابرے و بہائے دیگر است

رحمت کے لکھے جانے کا مطلب یہ ہے کہ نزول قہر کے لیے سبب درکار ہے مگر رحمت کو سبب کا انتظار نہیں اس لیے رحمت ہمیشہ غضب سے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ کتبہ اس لیے عرش پر رکھا گیا ہے کہ اس کے نیچے بسنے والی مخلوق مطمئن رہے کہ اس کے مقدمہ کی سماعت آئین رحمت کے تحت ہو گی۔

قیامت تقاضائے رحمت ہے

۱۲۔ قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا۔ یہ ایک بالکل بے اشتباہ حقیقت ہے وہ لوگ جنہوں نے خود کو گھاٹے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے ہیں۔ یعنی تمام زمین و آسمان میں اس کی حکومت ہے جیسا کہ مشرکین کو بھی اقرار تھا تو مکذبین اور مستہزئین کو فوری سزا سے کہاں پناہ مل سکتی ہے یہ صرف اس کی رحمت عامہ ہے کہ جرائم کو دیکھ کر فوراً سزا جاری نہیں کرتا اور قیامت کے دن بھی جو بلاشبہ آنے والا ہے محض ان ہی بدبختوں کو بے ایمانی کی سزا دے گا جو باختیار خود جان بوجھ کر

اپنے کو نقصان و ہلاکت کے گڑھے میں ڈال چکے ہیں۔[1]

جیسے اس دنیا میں مادی اور معنوی خوبیوں کا ہونا رحمت کا تقاضا ہے ایسے ہی قیامت کا آنا بھی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ یہاں قرآن نے اللہ سبحانہٗ کی توحید و صفات کی طرح آخرت کی زندگی پر رحمت سے استدلال کیا ہے۔ یعنی اگر رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ دنیا میں اس خوبی و کمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس کا فیضان ختم ہو جائے اور خزانہ رحمت میں انسان کی زندگی اور بناؤ کے لیے کچھ باقی نہ رہے۔ اس لیے قیامت کا آنا خدا کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمٰن و رحیم نہیں ہے اس کے نزدیک نعوذ باللہ عدل و ظلم، نیکی و بدی، خیر و شر دونوں یکساں ہیں۔ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں۔ خدا کی شان رحمت کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و مقصد کام کرے اس لیے ضروری ہے کہ ایسا دن آئے جس میں اس کی رحمت کا کامل ظہور ہو۔ اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں وہ اپنے کیفر و کردار تک پہنچیں لیجمعنکم الی یوم القیامۃ ایک تاکیدی جملہ ہے اور عربی اسلوب میں یہ جواب قسم بن کر آتا ہے تعبیر کا یہ زور بتا رہا ہے کہ قرآن کا مخاطب توحید کے بعد جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار کرتا تھا، جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا اور جو اس کی عقل میں کسی طرح نہ سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے جاہلی عرب حیات بعد الموت خدا کے سامنے اپنے اعمال کے مواخذے اور پرسش اور جزا و سزا سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لیے ان کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دار و مدار ہے۔ قرآن نے یہاں قیامت کو نہ ماننے والوں کو خسارے والا کہا ہے وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے کہ جب جزا نہ ہوگی تو گھاٹا ہی گھاٹا ہوگا۔ النفس کا گھاٹا نام ہے فساد فطرت کا اور اللہ کی عطا کردہ ہدایات سے اس زندگی میں فائدہ نہ اٹھانے کا اللہ نے انسان کو اصلی فطرت، عقل سلیم، نعمت نبوت وحی سننے کا موقع اور دوسری نعمتیں دی ہیں وہ ان سب سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی طرف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دلی رجحان ہوتا اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ انبیا کی آخرت پر ایمان کی دعوت صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ طرزِ فکر بھی قابلِ تعریف ہے لیکن یہ نبوت کے طریق کار اور اس کی سیرت سے بالکل مختلف ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ طریقِ نبوت میں آخرت پر ایمان ایسا عقیدہ ہے کہ انسان کے احساسات، خیالات، افکار و اعمال پر پوری طرح قابو حاصل کر لیتا ہے اور اصلاحی طریقہ میں صرف اعتراف، اقرار ایک ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نبوت آخرت کا ذکر کرتی ہے تو تڑپ وار فتگی اور لذت کے ساتھ اور اس کی طرف دعوت دیتی ہے تو جوش و قوت کے ساتھ اور دوسرے لوگ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اخلاقی یا معاشرتی ضرورت کی حد تک اور اصلاحی یا اخلاقی تنظیم کے جذبے سے، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

زمان اور زمانیات اللہ کی ملک میں

۱۳۔ اور رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے وہ سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اس سے پہلے قل لمن ما فی ... الخ میں مکان کی تعمیم تھی اور اس آیت میں زمان کی تعمیم ہے۔ یعنی ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور قبضہ و اقتدار ہے۔ ہر وہ چیز جو رات میں یا دن میں آرام سے زندگی بسر کرتی اور کتنے معلوم اور نامعلوم دشمنوں سے مامون و محفوظ رہتی ہے۔ یہ اسی کی رحمت کاملہ کے آثار میں سے ہے قل من یکلؤکم باللیل والنھار من الرحمٰن وہی ہے جو دن کے شور و شغب اور رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور سب کی حوائج و ضروریات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ایسے پروردگار کو چھوڑ کر کسی اور سے مدد طلب کرنا کہاں تک موزوں ہوگا[1]۔

شارحین قرآن کا سکن کی تشریح میں اختلاف ہے۔ کچھ اسے سکنی سے مشتق بتاتے ہیں اور معنے استقرار و حلول کے کرتے ہیں۔ چنانچہ امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ سکون حرکت کی ضد نہیں ہے بلکہ حرکت کو شامل ہے محض استقرار کے معنے میں ہے اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ کل موجودات جن پر دن رات گزرتی ہے وہ سب اسی کی ملک ہے۔ زمانہ اور زمانیات اسی کے احاطہ قدرت میں ہیں۔ امام رازی نے ابو مسلم اصفہانی سے بھی اسی سے ملتی جلتی بات نقل کی ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی آیت میں آسمان وزمین کا ذکر کیا تھا کیونکہ ان کے سوا مکان کوئی نہیں۔ اس آیت میں رات اور دن کا ذکر کیا ہے کیونکہ زمان اس کے سوا کچھ نہیں۔ زمان اور مکان تمام موجودات کے لیے ظرف ہیں۔ آیت میں بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ، مکان اور مکانیات زمان اور زمانیات کا مالک ہے۔

امام رازی نے اس کی جی کھول کر داد دی ہے اور یہ نکتہ آفرینی بھی فرمائی ہے کہ بیان میں آغاز مکان سے اور انجام زمان پر ہوا۔ زمان اور زمانیات کو بعد میں پیش کیا کیونکہ برنسبت زمان کے مکان اقرب الی العقول ہے۔

ظاہر یہی ہے جیسا کہ عام شارحین قرآن کی رائے ہے کہ "ما سکن" بھی قل کے تحت ہے لیکن ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں اسے استیناف بیانی قرار دیا ہے۔ بہرحال گزشتہ آیت میں یہ بتلایا کہ زمین و آسمان یعنی ہر مکان اور مکین اور تمام مکانیات کا وہی مالک ہے اور اس آیت میں یہ بتلایا کہ مکان اور زمان کی طرح لیل و نہار اور تمام اوقات اور تمام زمانیات بھی اسی کی ملک میں اور اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔

اور کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ آیت میں لفظ سکن سکون سے مشتق ہے اور اس کے معنے ساکن ہونے اور بے حرکت ہونے کے ہیں۔ یہ حرکت کا مدِ مقابل ہے اور لیل و نہار کی مناسبت سے سکن کے مقابلہ میں متحرک محذوف مانتے ہیں اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز متحرک ہوتی ہے سب خدا ہی کے قبضہ قدرت اور اسی کے کنٹرول میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لیے یکساں ہیں۔ اور جس طرح اس کی قدرت سب کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

اس کائنات میں ایک ہی کارساز ہے

۱۴۔ کہہ دو کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو کارساز بنا لوں اس خدا کے علاوہ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ آسمان وزمین اور ساری کائنات کو محض اپنے ارادے سے بغیر روح مادہ اور ہیولیٰ کے سہارے نیست سے ہست کرنے والا۔ فاطر کا لفظ ان ساری مشرک اور نیم مشرک قوموں کی تردید کر رہا ہے جو اللہ سبحانہ، کو صرف صانع مانتے ہیں۔ فاطر کے معنے مبدع کے ہیں اور فعل ابتدا کرنے

کے لیے آتا ہے۔ آسمان و زمین کا خصوصیت سے ذکر یہ جتانے کے لیے ہوا ہے کہ کائنات کی عظیم ترین مخلوقات یہی ہیں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی مشرک قوموں نے ان کو دیوتا تسلیم کیا ہے۔

یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب یہ مانتے ہو کہ ساری دنیا کا خالق و مالک اور سارے کارخانہ ہستی کا چلانے والا ایک اللہ ہی ہے تو میرے لیے یہ کیسے روا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار، کارساز بناؤں؟ ولی کے معنے مددگار اور کارساز کے ہیں اور استفہام انکاری ہے۔ یہ اللہ کے علاوہ کسی کو مددگار بنانے کی نفی ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کو مددگار بنانے کی صورت یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد لے۔ یہ گویا توحید اعتقادی کے بعد اتخذ کے ذریعے توحید فعلی کا اعلان ہے۔ شاہ ولی اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ سارے جہان کا مدبر تو اللہ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو بعض مخصوص علاقوں میں تصرف کرنے کا مخصوص اختیار عطا فرما دیتا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا یہی عقیدہ تھا اور

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام لینے والے انتہائی درجہ کے منافقین کا بھی آج کل یہی عقیدہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جملہ مشرکین غیر اللہ کو کارساز اور مددگار سمجھتے تھے مگر ان کو مستقل سمجھ کر ان سے استعانت نہ کرتے تھے بلکہ ان کو عون الٰہی اور امداد الٰہی کا مظہر سمجھ کر استعانت کرتے تھے۔ کیونکہ دنیا میں کسی مشرک نے غیر اللہ کو حقیقی کارساز اور مددگار کبھی نہیں سمجھا۔ یہاں فاطر السماوات والارض فرما کر شرک کے اسی گھروندے پر ضرب کاری لگائی ہے کہ جو ذات آسمان و زمین اور ساری کائنات کو محض اپنے ارادے سے بغیر روح مادہ اور ہیولیٰ کے سہارے نیست سے ہست میں لانے والی ہے میں اسے چھوڑ کر ان کو ولی، کارساز اور مددگار کیسے بنا سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا میرا مددگار اور کارساز کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میں اس کے سوا کسی کو اپنا مددگار نہ بناؤں گا۔

مشرکین پر ایک لطیف تعریض

۱۵۔ جو روزی دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے۔ یعنی کھلاتا ہے کھاتا نہیں ہے۔ کھلانا اشارہ ہے سامان بقا کی طرف یعنی ایجاد و ابقاء دونوں میں، سب اس کے محتاج ہیں۔ اس کو کسی ادنیٰ سی ادنیٰ چیز میں بھی ہماری احتیاج نہیں۔ پھر اس سے علیحدہ ہو کر کسی کو مددگار بنانا انتہائی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا معبود بنا رکھا ہے وہ سب اپنے بندوں کو رزق دینے کے بجائے الٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹ نہیں جما سکتا۔ جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحب قبر کی شان معبودیت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پرستار اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربار خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پجاری اس کا مجسمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اس کی تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوند عالم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کو حیات کے لیے رزق کا سامان اللہ ہی بہم پہنچاتا ہے و لا یطعم اور خود محتاج رزق نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات اپنے بقا کے لیے کسی بھی سہارے سے بے نیاز ہے۔ یہ بھی ضرب ہے عقیدہ شرک پر مشرک قوموں کے عقیدے میں بڑے بڑے دیوتا بھی کھانے پینے کے محتاج ہیں۔ حضرت مسیح کو عیسائی دُنیا نے معبود بنایا تو قرآن نے برملا کہا کہ مسیح اپنے سارے کمالات بشری کے باوجود وہ اور ان کی والدہ دونوں بہر حال قوائے بشری ہی سے مرکب تھے اور کھانے پینے ساری بشری ضرورتوں کے محتاج تھے تو جو ایسے صاحب احتیاج ہوں انہیں خدائی کا مرتبہ دیتے ہوئے شرم نہیں آتی کانا یاکلان الطعام

توحید عملی کا اعلان

۱۶۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے سامنے سرنگوں ہونے والوں میں سب سے پہلے میں اس کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں اور مجھے کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہونا۔ یعنی ایسے پروردگار کے احکام کے سامنے جس کی صفات اوپر مذکور ہوئیں ضروری ہے کہ سب بندے بلا شرکت غیرے گردن پر ڈال دیں اور سب سے پہلے اس اکمل ترین بندے کو انتہائی انقیاد و تسلیم کا حکم ہوا ہے جو تمام دُنیا کے لیے نمونہ طاعت و عبودیت بنا کر روانہ کیا گیا صلی اللہ علیہ وسلم[2] مطلب یہ ہے کہ توحید عبادت کے یہ دلائل سنانے کے بعد اب اعلان کر دیجیے کہ مجھے اسی اللہ کی جانب سے جس کے اوصاف سن چکے ہو یہ حکم ملا ہے کہ میں اسی کا ہو کر رہوں اور اس کے سوا عابدانہ زندگی میں کسی سے تعلقات قائم نہ کروں۔

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

سب سے پہلے اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کرنے والا بنوں۔ اور مجھے یہ حکم بھی ملا ہے کہ ان لوگوں سے الگ رہوں اور اظہار بیزاری کر دوں جو اپنے خیال کے مطابق خدائی میں شریک کرتے ہیں۔ ان مشرکین کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دُنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں یا کسی حیثیت یا کسی صفت میں بھی اللہ کے برابر کہتے ہوں بلکہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تقرب اور تعلق کی وجہ سے ان کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے۔ بس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہے۔

آیت میں اسلام اور شرک کو ایک دوسرے کا مدمقابل بنا کر پیش کیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہاں اسلام سے توحید افعال مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنے زندگی کے سارے گوشوں میں اسلام کو اپنانے اور شرک کرنے والوں سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت کے بارے میں قرآن کا اندازِ بیان متکلمانہ نہیں ہوتا جو منطقی مقدمات اور دلائل سے ترتیب پاتا ہے بلکہ قرآن سیدھے سادے طریق پر انسان کے فطری وجدان و ذوق کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے معنوی محسوسات کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خالق و پروردگار ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اگر وہ انکار کرتا ہے یا پرستش کی گمراہیوں میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس لیے کہ اس کی وجدانی بصیرت پر غفلت طاری ہو گئی۔ پس چاہیے کہ اسے دُور کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقام پر جس قدر مخاطبات ہیں انہیں اسی اصل کی روشنی میں دیکھا جائے۔ کون ہے جس نے یہ تمام کارخانۂ ہستی پیدا کیا؟ کون ہے کہ جس کی رحمت کا فیضان ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ کون ہے جو سب کو رزق دیتا ہے مگر خود کسی کا محتاج نہیں ہے؟ تمہاری فطرت کہہ رہی ہے کہ ایک خالق و صانع ہستی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسی گمراہی ہے کہ اس کی طرف سے گردن پھیرے ہوئے ہو اور اسے چھوڑ کر دوسری ہستیوں کے آگے جھک رہے ہو۔ فرمایا کہ مجھے اسی کے آگے جھک جانے اسی کی بات مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کا حکم ہوا ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں سے علیحدہ رہوں اور بس۔

توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے

۱۷۔ کہہ دو تم مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے اگر میں اس کی نافرمانی کر دوں۔ یہ بات

آپ پر رکھ کر اوروں کو سنائی گئی ہے یعنی بفرض محال اگر خدا کے معصوم اور بے گناہ اور برگزیدہ ترین پیغمبر سے بھی کسی طرح کا عصیان سرزد ہو تو عذابِ الٰہی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر کسی دوسرے کو کب لائق ہے کہ باوجود شرک و کفر اور تکذیبِ انبیاء وغیرہ ہزاروں طرح کے جرائم میں مبتلا ہونے کے عذابِ الٰہی سے بے فکر اور مامون ہو کر بیٹھ رہیں[1] مطلب یہ ہے کہ جب مجھے یہ حکم ملا ہے۔ کہ میں سب سے پہلے اس کے احکام کی فرمانبرداری کرنے والا بنوں تو میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کروں۔ اگر میں بالفرض ایسا کروں تو مجھے بھی اس ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قانونی ذمہ داریوں سے کوئی بالا نہیں ہے اور یہ کبھی ساقط نہیں ہوتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قانونِ الٰہی کی ہمہ گیری سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اس آیت میں بھی ایک نہایت لطیف تعریض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو گناہوں کے پشتارے اٹھائے ہوئے ہو اور عذابِ عظیم کی تیاریاں کر رہے ہو۔ تم تو چیز کیا ہو میں اپنی ذات کی حد تک کہتا ہوں کہ میرے دامن پر گناہ کا کوئی دھبہ نہیں ہے اور منصبِ رسالت پر فائز ہوں۔ اگر بالفرض میرے دامن پر گناہ کی آلودگی ہو تو اللہ کی بارگاہ میں مجھے بھی اپنے تئیں اندیشہ ہے۔ یعنی باوجود معصیت نہ ہونے کے مجھے اللہ کے جلال و عظمت کا اندیشہ ہے یہ مطلب نہیں کہ حضور انور کو اپنے تئیں معصیت کا اندیشہ ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ معصوم ہونے کے باوجود جب میں بے فکر نہیں تو پھر کسی کو کب لائق ہے کہ کفر و شرک اور معصیت سے دامن آلود ہو کر بے فکر ہو جائے۔

بڑی سے بڑی کامیابی

۱۸ ـ اس دن جس کے سر سے عذاب ٹل گیا تو اس پر خدا نے رحم کیا اور بڑی سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ جنت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مدارج کا حاصل کرنا تو بہت اونچا مقام ہے۔ اگر آدمی سے قیامت کے دن کا عذاب ٹل جائے تو یہی بڑی کامیابی سمجھو کما قال عمر رضی اللہ عنہ کفافا لا لی ولا علی[2] مطلب یہ ہے کہ ڈرنے کی اصل چیز خوفناک دن اور اس کا عذاب ہے جو اس سے محفوظ رہا اسی پر درحقیقت اللہ کا رحم ہوا اور چاہنے کی اصل چیز اس دن کی رحمت ہے کیونکہ جو شخص اس رحمت کا سزاوار ہوا وہی فی الواقع کامیابی پانے والا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی ضرورت

---

[1] [2] افاداتِ شیخ الاسلام

اس لیے ہے کہ اللہ کی رحمت اور عذاب اور اس کے جلال و جمال کا ظہور اعلیٰ پیمانے پر ہو سکے۔ ہماری اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ظہور اگرچہ ہے لیکن پورے ظہور کی اس دنیا میں صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ظہور بہت محدود ہے۔ یعنی یہاں اللہ کی جن جمالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے اور جن جلالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے۔ پورے اور کامل ظہور کی ہماری یہ دنیا تاب ہی نہیں لا سکتی۔ بہر حال اس لیے بھی ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلال و جمال کا کامل ظہور ہو سکے۔ دراصل یہ ظہور ہی تو عالم کی تخلیق کا خاص مقصد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ بساط اس لیے بچھائی ہے کہ اس کی صفات کمال کا ظہور ہو۔ بس اگر آخرت کو نہ مانا جائے تو یہ مقصد کہاں پورا ہوگا۔ لہٰذا اس وجہ سے وہاں کے عذاب سے بچ جانا اور رحمت سے ہمدوش ہو جانا بڑی سے بڑی کامیابی ہے اس کے مقابلہ میں جو لوگ اس دنیا کی کامیابیوں کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے آخرت کی فوز مبین کو کھو بیٹھتے ہیں انہیں اپنی بدبختی اور محرومی کا اندازہ کل ہوگا۔

نفع و ضرر صرف اللہ کے اختیار میں ہے

۱۹۔ اور اے انسان اگر خدا ذرا تجھے دکھ پہنچائے تو اس کا ٹالنے والا کوئی نہیں ہے مگر اسی کی ذات اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے تو ہر بات پر قادر ہے۔ آفرینش کا مسئلہ تو پہلے طے ہو چکا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ علاوہ آفرینش کے اور سارے تصرفات و اختیارات بھی ہر وقت کے نفع و ضرر، تکلیف و راحت کے سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں کوئی اس میں اللہ کے ارادے میں حائل نہیں ہو سکتا اور نہ واقعات، کائنات اور حوادث دہر میں کسی کو کوئی دخل و تصرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ اگر وہ کسی کو دکھ میں مبتلا کرے تو کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے اسی طرح اگر وہ کسی کو خیر سے بہرہ مند کرے تو کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ الحاصل جسمانی روحانی ظاہری باطنی جانی و مالی، نفسی یا آفاقی جو بھی تکلیف یا مصیبت انسانوں اور دیگر مخلوق پر آتی ہے اس کو اللہ کے بغیر کوئی دور نہیں کر سکتا اور اسی طرح اگر کوئی نعمت یا فراخی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہو تو اللہ تعالیٰ کے بغیر اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس آیت میں یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ضرر، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے چونکہ مشرکین عموماً اس خیال سے کہ فلاں سے مجھے ضرر پہنچے گا یا نفع اس کو اس عقیدے کے مطابق پکارا کرتے تھے

اس لیے قرآن نے اس کی بھی صاف ممانعت کردی ہے اور بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کے در کے اور اس کے سوا کسی کو پکارنا صحیح نہیں ہے۔ اس کی مزید تشریح تو معالم القرآن کی جلد ۱۱ میں آئے گی یہاں سرِ راہے اسی موضوع پر ایک ارشادِ نبوت گوش گزار فرما لیجئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوار تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے پیارے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پابندی کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا۔ جب بھی سوال کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے لیے دکھ مقدر ہے تو تمام کائنات بھی جمع ہو کر اس کو ٹال نہیں سکتی اور اگر تیرے لیے آرام مقدر ہے تو تمام کائنات اس کو روک نہیں سکتی قلم تقدیر جو کچھ لکھ چکا وہی ہوگا اور تقدیر کے رجسٹر بھی خشک ہو چکے ہیں۔ (ترمذی)

قرآن کی یہ آیت اور یہ حدیث صحیح آفتاب نیم روز کی طرح بتا رہی ہے کہ نافع اور ضار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ یہیں سے صوفیائے کرام نے سب سے زیادہ زور اللہ کی توحید پر دیا ہے۔ فتوح الغیب میں حضرت شیخ اعظم عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں:

جس کسی کو دنیا و آخرت میں عافیت مقصود ہو اسے چاہیے کہ صبر و تسلیم کا خوگر ہو جائے اور مخلوق سے شکوہ و شکایت نہ کرے اور اپنی حاجتوں کو اپنے رب کے حوالے کر دے اور کشائش کی امید صرف اسی سے رکھے اور سب سے ہٹ کر اسی کا ہو رہے۔

اللہ کے سوا کوئی مختارِ کل نہیں

۲۰ - اور وہی ہے جو اپنے بندوں پر زور و غلبہ رکھنے والا ہے وہی صاحبِ حکمت اور باخبر ہے۔ دنیا یا آخرت میں جو تکلیف و راحت خدا کسی کو پہنچانا چاہے نہ کوئی مقابلہ کر کے روک سکتا ہے اور نہ اس کے غلبہ و اقتدار کے پنجے سے نکل کر بھاگ سکتا ہے وہی پوری طرح خبردار ہے کہ کس بندے کے کیا حالات ہیں اور ان حالات کے مناسب کس قسم کی کارروائی مناسب ہوگی[1]

قہر کے معنے امام راغب نے غلبہ اور تذلیل کے لکھے ہیں اور یہ لفظ دونوں معنے میں استعمال ہوتا ہے یہاں معنی حاکمانہ غلبہ کے ہیں۔ پہلے کمالِ قدرت کو بتایا تھا اس آیت میں کمالِ سلطان تسخیر اور کمالِ استعلاء

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو بتایا جا رہا ہے اور دبدبہ بھی کمال حکمت اور علم محیط کے ساتھ۔ معبود ہونے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ سب صرف اسی ذات میں جمع ہیں کمال قدرت کمال علم کمال حکمت اور کمال سلطان اور کمال استعلاً اس کے باوجود ایسی ذات کامل الصفات اور جامع الکمالات کے اگر کوئی کسی مخلوق کو شریک بناتا ہے تو یہ اس کی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

ابن جریر نے وھو القاھر فوق عبادہ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اللہ کی ذات اپنے بندوں پر غلبہ والی، ان کو ذلیل کرنے والی ان سے برتر لہٰذا اللہ اپنے دباؤ کی وجہ سے ان سے بالا ہے اور وہ سب کمتر ہیں۔ وہ بندوں پر برتری، ان پر دباؤ میں اپنی قدرت اور اپنی تدبیر کے ساتھ حکیم ہے۔ سب چیزوں کی مصالح اور ان کی مضار سے باخبر ہے۔ اس پر کسی چیز کا آغاز و انجام پوشیدہ نہیں ہے۔ نہ اس کی تدبیر میں خلل ہوتا ہے اور نہ اس کی حکمت میں کوئی رخنہ ہوتا ہے۔

عام شارحین قرآن نے فوق عبادہ میں فوقیت سے فوقیت قہر اور غلبہ مراد لیا ہے۔ زمخشری نے اس کی تصریح کی ہے۔ بیضاوی نے بھی اسے اپنایا اور امام رازی نے اس کے دلائل فراہم کیے ہیں۔ قرآن کی دوسری آیت زمخشری کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً قرآن نے فرعون کا مقولہ نقل کیا وانا فوقھم قاھرون ظاہر ہے کہ یہاں فوقیت سے فوقیت مکان نہیں بلکہ فوقیت شان و مرتبہ مراد ہے لیکن بہرحال دونوں میں فرق ہے۔ اللہ کی فوقیت اس کی شان کے مطابق ہے۔ وہ اپنے سارے شئون میں مخلوق سے بالا ہے۔ لیس کمثلہ شیئ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی شان یہ ہے کہ تمام جہان اور تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۙ
وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ
لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا
هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۘ﴿۱۹﴾ اَلَّذِیْنَ وقف لازم بہ خلاف
اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی
اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲ وقف لازم

ان سے کہو کہ کس کی گواہی سب سے بڑی ہے؟ کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے[۲۱]۔ اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں کیا واقعی تم لوگ گواہی دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں، کہو میں تو اس کی شہادت ہرگز

نہیں دے سکتا اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں
تم مبتلا ہو[۲۲]۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے
ہیں جیسے ان کو اپنی اولاد کے پہچاننے میں اشتباہ نہیں
ہوتا ہاں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں رکھا ہے وہ اسے
نہیں مانتے ہیں[۲۳]۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا
جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اللہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً ایسے
ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے[۲۴]۔

توحید پر سب سے بڑی شہادت

اس آیت میں توحید کے تمام دلائل کو خدا کی عظیم شہادت پر ختم کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ توحید پر سب سے بڑی شہادت اللہ سبحانہٗ کی ہے۔ اللہ کی یہ شہادت تین طرح کی ہے آفاقی، انفسی اور تنزیلی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے اس کائنات کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے اور جو ذات گرامی تمام کائنات کی پرورش کر رہی ہے اور جس کی پروردگاری کا اعتراف ہر انسان کرتا ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے۔

نظام عالم کی وحدت خود توحید کے ثبوت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ سورج چاند اور ستاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی اور گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ

نظام اور بندھے اصول کے تحت ہیں جن میں کبھی اور کہیں سرمو فرق نہیں آتا۔ ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت ہے اور وہ سب کسی ایک کے اشارے پر چل رہے ہیں اور زبانِ حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ ایک اللہ ہی عبادت کے لائق ہے ولہ اسلم من فی السماوات والارض اور کل لہ قانتون قرآن میں اسی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے وہ خود توحید کی شہادت دے رہی ہے۔ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا۔ جس میں سامانِ تمدن اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر اللہ سبحانہٗ کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی۔ ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں غرض جماعت انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ زمانہ کی کوئی کروٹ اس تخیل سے خالی نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے۔ یہ بھی اللہ کی شہادت ہے۔

تیسری اللہ کی شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ نے اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوامر ونواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول روانہ کیے اور ان سب پر اپنی توحید کی شہادت دی اور ان رسولوں کے ذریعے یہ شہادت اپنی اپنی امت کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے دلائل نبوت اور براہینِ رسالت خدا کی شہادت ہیں۔ اللہ دعوتِ حق کو کامیاب کر کے اور معاندوں اور منکروں کو ناکامیاب کر کے سچائی کے حق میں اپنی گواہی کا اعلان کرتا ہے۔

۲۱۔ ان سے کہو کہ کس کی شہادت سب سے بڑی ہے؟ جواب دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔ جب یہ فرمایا کہ خدا ہی سب کے ضرر اور نفع کا مالک ہے تمام بندوں پر قاہر اور غالب اور رتی رتی سے خبردار ہے تو اس کی شہادت سے زبردست اور بے لوث شہادت کس کی ہو سکتی ہے۔ پس میں بھی اپنے اور تمہارے درمیان اسی کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ میں نے دعویٰ رسالت کر کے جو کچھ اس کے پیغامات تم کو پہنچائے اور جو کچھ تم نے اس کے جواب میں میرے ساتھ اور خود پیغام ربانی کے ساتھ

برا ذکیا وہ سب باتیں اس کے سامنے ہیں وہ خود اپنے علم محیط کے موافق میرا اور تمہارا فیصلہ کرے گا[1]۔ یعنی اس بات پر اللہ گواہ ہے کہ میں توحید کا جو پیغام پہنچا رہا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں گویا خدا کی اس سنت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کبھی اس کی طرف سے کوئی داعی حق آتا ہے اور لوگ عناد و شرارت سے اسے جھٹلاتے اور اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو حق و باطل میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بالآخر حق ہی کامیاب ہوتا ہے اور باطل پرست ناکام ہوتے ہیں یہی اللہ کی گواہی ہے جو اس معاملہ کا فیصلہ کر دیتی ہے[2]۔

ہم آیت کے افتتاحیہ میں بتا چکے ہیں کہ خدا کی شہادت کسی ایک پہلو سے نہیں بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی نازل کی ہوئی آیات قرآنی اس بات کی منادی کر رہی ہیں کہ اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ شہادت دے رہی ہے اور انسانی فطرت میں اس کی ودیعت کی ہوئی وجدانی اور عقلی آیات اس پر گواہ ہیں۔

شرک کی ہر قسم سے بیزاری کا اعلان

۲۲ - اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں۔ کیا واقعی تم لوگ گواہی دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں کہہ دو میں تو اس کی شہادت نہیں دے سکتا اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔ یعنی اگر سمجھو تو میرے صدق پر خدا کی یقینی اور کھلی شہادت یہ قرآن موجود ہے جو اپنے کلام الٰہی ہونے پر خود ہی اپنی دلیل ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

میرا کام یہ ہے کہ تم کو اور ہر اس شخص کو جسے یہ کلام پہنچے خدائی پیغام سے خبردار کر دوں جس میں توحید و معاد وغیرہ تمام اصول دین کی ہدایت کی گئی ہے کیا اس قدر اتمام حجت ہو چکنے اور ایسا قطعی اور صریح پیغام توحید سننے کے بعد بھی تم یہی کہتے رہو گے کہ خدا کے سوا اور بھی معبود ہیں، تم کو اختیار ہے کہ جو چاہے کہو۔ میں کبھی ایسا حرف زبان پر نہیں لا سکتا بلکہ صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ لائق عبادت صرف وہی ایک خدا ہے۔ باقی جو کچھ تم شرک کرتے ہو میں اس سے قطعاً بیزار ہوں اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں[3]۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن [3] افادات شیخ القرآن

مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں۔ اس معاملے میں فیصلہ کن گواہی خود خدا ہی کی ہے اور اس نزاع کے فیصلے کے لیے اپنے اور تمہارے درمیان خدا ہی کو گواہ مانتا ہوں۔ اس نے میرے اوپر یہ قرآن اسی گواہی کے لیے نازل کیا ہے کہ میں تم کو خبردار کردوں کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور جن جن کو یہ پیغام پہنچے وہ بھی خبردار کردیں کہ وہ وحدہ لاشریک ہے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر تم مدعی ہو کہ دوسرے معبود خدا کے شریک ہیں تو میں اس بے دلیل گواہی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ کسی چیز کی شہادت دینے کے لیے محض قیاس یا گمان کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علم ہونا ضروری ہے جس کی بنا پر آدمی یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ ایسا ہے۔ بس سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تمہیں یہ علم ہے کہ اس جہان ہست و بود میں خدا کے سوا اور بھی کوئی کارفرما حاکم ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو۔ اگر تم علم کے بغیر جھوٹی شہادت دینا چاہتے ہو تو دو میں تو ایسی شہادت نہیں دے سکتا۔ مجھے تو خدا کا یہی حکم ہوا ہے کہ میں اعلان کردوں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک کہتے ہو۔

اس ارشاد میں لانذرکم بہ و من بلغ خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ ہماری رائے میں من بلغ بطور عطف ضمیر سے پیوند رکھتا ہے یعنی اس کا معطوف علیہ انذرکم میں ضمیر منصوب ہے۔ اس سے علمائے دین کی زندگی میں کچھ اہم باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔

اولاً یہ کہ من بلغ نے بتلا دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام جن و انس اور مشرق و مغرب کے لیے ہے[1]

ثانیاً قاضی بیضاوی نے اس سے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ آیت یہ رہنما اصول بتاتی ہے کہ قرآن کے احکام نزول کے وقت اور نزول کے بعد سارے موجودین کے لیے ہیں یعنی یہ کہ قرآن کا دائرہ صرف اس کے براہ راست مخاطبین اولین تک محدود نہیں ہے اور یہ بھی کہ جسے قرآن نہیں پہنچے گا اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی دعوت کی اساس قرآن ہے جسے قرآن نہیں پہنچا اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اسلام کی دعوت پہنچ گئی ہے۔

مفسرین سلف سے اس آیت کی تشریح میں جو بیانات آتے ہیں ان سے بھی قاضی صاحب کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور انور کا ارشاد ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جسے قرآن پہنچا ہے اسے گویا میں نے ہی دعوت بالمشافہ دی ہے اور اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی وا وحی الی ھذا القرآن لانذرکم

وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن باللفظ متواتر ہے۔ حضور انور کے بعد جسے قرآن پہنچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود دہان نبوت سے سن رہا ہے کیونکہ اس میں کمی اور بیشی نہیں ہے۔ مشہور مفسر قرآن محمد بن کعب القرطبی نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا ہے کہ جسے قرآن پہنچا گویا اس نے خود حضور انور کی زیارت کی ہے۔ حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں کچھ قیدی لائے گئے، آپ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تمہیں دعوت اسلام ملی ہے انہوں نے بتایا کہ نہیں۔ آپ نے ان کو رہا کر دیا اور یہی آیت تلاوت فرمائی۔

ثالثاً، اس آیت میں توحید الاہیت کے اعلان کے ساتھ شرک سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے کیونکہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اسی لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا ضرور اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدہ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ توحید کے مخالف نظریہ شرک کو سمجھ لیا جائے اور یہ معلوم کر لیا جائے کہ مشرکین عرب کی شرک کی حقیقت کیا ہے۔

مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت

مشرکین عرب کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں یا کسی حیثیت یا کسی صفت میں اللہ کے برابر کہتے ہوں بلکہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق رازق، مالک مدبر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں۔ اور یہ چاہیں تو بناؤ بگاڑ سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے یعنی سجدہ اور طواف جیسے اعمال کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے پس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہے اور اسی وجہ سے قرآن میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہے یہاں انني بریٔ مما تشرکون میں مشرکین عرب کے جس شرک سے برأت کا اعلان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے

تھے کہ اگرچہ یہ اللہ کی مخلوق اور مملوک ہیں لیکن خدا کے ساتھ ان کا ایسا تعلق اور اس کے کارخانے میں ان کا ایسا عمل دخل ہے کہ یہ ہماری تکلیفیں دور کر سکتے ہیں اور دولت عزت اور اولاد جیسی چیزیں ہمیں دے سکتے ہیں اور اسی عقیدے کی بنا پر وہ اپنی حاجتیں ان سے مانگتے تھے دعائیں کرتے تھے اور انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ یعنی جس طرح خدا کو راضی کرنے کے لیے اور اپنی عاجزی اس کے سامنے ظاہر کرنے کے لیے اس کی عبادت اور پرستش کی جاتی ہے اسی طرح وہ اپنے ان معبودوں کی بھی عبادت کرتے تھے۔

قرآن عزیز نے ان کے اسی عقیدے کو شرک قرار دیا اور عبادت و استعانت کے ان کے اس عمل کو بھی اور ان کو دعوت دی کہ اللہ کے سوا کسی کو نفع و ضرر کا مالک و مختار نہ سمجھیں اور عبادت و استعانت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اہل کتاب کی گواہی

۲۳۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنی اولاد کے پہچاننے میں اشتباہ نہیں ہوتا ہاں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں رکھا ہے وہ اسے نہیں مانتے ہیں۔ یعنی اس کے علاوہ کہ میری صداقت کا خدا گواہ ہے۔ در قرآن کریم اس کی ناطق اور ناقابل تردید شہادت دے رہا ہے۔ وہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی جن کی طرف کتب سماویہ کا عالم سمجھ کر تم میرے معاملہ میں رجوع کرتے ہو اپنے دلوں میں پورا یقین رکھتے ہیں کہ بلا شبہ وہی نبی آخرالزمان ہوں جس کی شہادت انبیائے سابقین دیتے آتے ہیں۔ ان کو جس طرح بہت سے بچوں میں اپنی اولاد کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوتی ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کے معلوم کرنے میں بھی کوئی شبہ اور دھوکہ نہیں ہوتا۔ البتہ حسد کبر اور تقلید آباء اور حب جاہ و مال وغیرہ اجازت نہیں دیتے کہ مشرف بایمان ہو کر اپنی جانوں کو نقصان دائمی اور ہلاکت ابدی سے بچائیں[1]

مطلب یہ ہے کہ کتب آسمانی کا علم رکھنے والے بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ معبود ایک ہی ہے اور پرستش و بندگی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ قرآن کی گواہی کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کوئی غیر معروف گواہی نہیں ہے بلکہ جانی پہچانی ہوئی گواہی ہے اس کا ذکر پچھلے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی وہ اس پیغمبر کو یا اس کتاب کو یا اس کی دعوتِ توحید کو خوب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ یعرفونہ، کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر پہلے آیا ہے اور یا حضور انور کی ذات گرامی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں اس لیے نبی اور قرآن لازم وملزوم ہیں۔ جس طرح ایک مجبور باپ کو اپنے موعود بیٹے کا انتظار ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کو نبی اور قرآن کا انتظار تھا۔ اس پر ایمان لانے سے تو محروم صرف وہ رہیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ ورنہ جو شخص کتاب الٰہی کا علم رکھتا ہو اور نبوت سے علمی رابطہ ہو وہ الوہیت کے متعلق بلا کسی شک وشبہ کے یہ جانتا ہے کہ یہ نبوت کی دعوت ہے اور یہی امرِ حق ہے کہ بندگی اور پرستش کے لائق صرف اللہ ہے۔

شرک کا مدعی سب سے بڑا ظالم ہے

۲۴۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگاتے یا اللہ کی آیات کو جھٹلاتے یقیناً ایسے لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ یعنی نبی نہ ہو اور خدا پر افترا کر کے دعویٰ نبوت کر بیٹھے یا سچے نبی سے جس کی صداقت کے دلائل واضح موجود ہوں۔ خدائی پیام سن کر تکذیب پر کمر بستہ ہو جاتے ان دونوں سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور سنت اللہ یہ ہے کہ ظالم کو کامیابی اور بھلائی نصیب نہیں ہوتی۔ پس اگر فرض کرو معاذ اللہ میں مفتری ہوں تو ہرگز کامیاب نہ ہوں گا اور تم مکذب ہو جیسا کہ دلائل سے ظاہر ہے تو تمہاری خیریت نہیں لہٰذا حالات پر غور کر کے اور انجام سوچ کر عاقبت کی فکر کرو اور اس دن سے ڈرو جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ابن کثیر نے آیت کے معنے یہی بتاتے ہیں۔ اور بعض مفسرین نے افترا علی اللہ سے مشرکین کا شرک مراد لیا ہے جیسا کہ آگے وضل عنہم ما کانوا یفترون میں اشارہ ہے۔[1]

من اظلم کے من موصول سے کنایہ تین طرف ہو سکتا ہے۔ نبی کی طرف جیسا کہ ابن کثیر نے اختیار کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس پیغمبر سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ کا افترا کرے دوسرا مشرکین کی طرف، مطلب یہ ہے کہ اس مشرک سے زیادہ ظالم کون ہے جو یہ افترا کرے کہ خدا کے ساتھ دوسری بہت سی ہستیاں بھی عبادت میں شریک ہیں اور خدائی صفات سے متصف ہیں۔ دانائے غیب ہیں مختارِ کل ہیں، حاضر وناظر ہیں، حاجت روا اور مشکل کشا ہیں، خداوندانہ اختیارات رکھتی ہیں اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے آگے عبدیت اختیار کرے۔ تیسرا اہل کتاب کی طرف، مطلب یہ ہے کہ ان اہل کتاب سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو کتاب الہٰی میں تحریف کرکے افتراء پردازی کر رہے ہیں۔

اگرچہ تینوں مطالب کی گنجائش ہے مگر ہماری رائے میں سیاق و سباق کے پیش نظر دوسرا مطلب تو ان کا منطوق ہے۔ پہلا اور تیسرا منطوق نہیں بلکہ مدلول ہے۔ فرمایا ہے کہ جب خدا کی گواہی یہ ہے کہ عبادت کے لائق صرف وہی ہے اس کے سوا پرستش و بندگی میں کسی کی حصہ داری نہیں ہے تو ان سے بڑھ کر بدقسمت، ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کے خلاف خدا پر یہ جھوٹ باندھیں کہ اس نے فلاں فلاں کو اپنا شریک بنالیا ہے یا اس کی آیات کی تکذیب کریں جبکہ وہ توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ان کے پاس آگئی ہے ایسے ظالم کبھی فلاح پانے والے نہیں ہیں۔

تکذیب آیات یہ کہ جن باتوں کا اقرار و اثبات واجب ہے ان سے انکار کرنے لگے یا یہ مطلب ہے کہ قرآن کی آیات کی تکذیب کرے یا جیسا کہ سید رشید رضا نے لکھا ہے کہ آیات سے مراد آیات کونیہ ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہمارے خیال میں آیات سے مراد سب قسم کی نشانیاں ہیں۔ آیات کونیہ بھی اور وہ بھی جو نبوت کی سیرت میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ بھی جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ موجودات عالم میں صرف ایک خدا ہے باقی سب بندے ہیں۔ اب جو شخص ان سب نشانیوں کے مقابلہ میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر، کسی علم کسی مشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر مجرد قیاس و گمان یا تقلید آبائی کی بنا پر دوسروں کو الوہیت کی صفات سے متصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھہراتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا وہ حقیقتہً وحدانیت پر ظلم کر رہا ہے اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے اور کائنات کی ہر اس چیز پر ظلم کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ اس غلط نظریہ کی بنا پر کوئی معاملہ کرتا ہے[1]

---

[1] تفہیم القرآن

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ
شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ
إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾ انظُرْ كَيْفَ
كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر کہیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے[25]۔ پھر ان کے پاس کوئی فریب اس کے سوا نہ ہو گا کہ وہ کہیں گے اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے[26]۔ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولیں گے اور ان کی ساری افترا پردازیاں کھوئی جائیں گی[27]۔

میدانِ حشر میں شرک کی رسوائی

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات

یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ دیگر کتب سماویہ میں عموماً اور قرآن عزیز میں خصوصاً شرک کی تردید پر جتنا زور دیا ہے اتنا زور کسی اور مسئلہ پر نہیں دیا۔ اور حضرت آدم سے لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام کا اولین سبق اور درس ہی یہ تھا۔ مالکم من الٰہ غیرہٗ توحید کامل کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی صفات میں اور صفات کے لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے پیدا کرنا، زندہ رکھنا، مارنا، عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہونا، دور نزدیک سے یکساں تعلق رکھنا اور کائنات میں تدبیر و تصرف کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام صفات بحیثیت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب والے اوتاروں، دیلیوں، شہیدوں اور نبیوں میں یہ اوصاف مانتے تھے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانے میں کاہنوں کا کام ہی یہ تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ حالانکہ جنات اور اسی طرح احبار و رہبان کی پرستش کرنے والوں کا قرآن نے بصراحت ذکر کیا ہے اور یہی ان کی توحید کا نقص ہے۔ اسلام نے توحید کے کمال کے لیے توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات توحید فی العبادت اور توحید فی التصرف وغیرہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خدا کے اعتراف و اقرار کا دل پر جو روحانی اور اخلاقی اثر پڑتا ہے وہ توحید کامل کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اطاعت انقیاد خشوع توکل اور اخلاص کی حالت صرف اسی وقت دل پر طاری ہو سکتی ہے جب یہ یقین کامل ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں، تمام امیدوں، تمام اغراض و مقاصد اور تمام خواہشوں کا صرف ایک ہی مرکز و محور ہے۔

بہر حال شرک چاہے جس قسم کا ہو اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہتا۔ اور جہاں توحید نہ ہو ممکن نہیں کہ وہاں ایمان موجود ہو اور جہاں ایمان موجود نہ ہو وہاں اسلام کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے قرآن نے یہاں مشرک کو اظلم اور دوسرے مقام پر اس کے کردار کو ظلم عظیم قرار دیا ہے اور اسی لیے شرک ناقابل معافی جرم ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ اس آیت میں میدان حشر میں مشرکین کی بے بسی اور بے کسی کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

۲۵۔ اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر کہیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گردانتے تھے۔ یعنی جن کی نسبت تم کو دعویٰ تھا کہ وہ خدائی کے حصہ دار اور شدائد میں تمہارے شفیع و مددگار ہیں۔ آج ایسی سخت مصیبت کے وقت کہاں چلے گئے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب شفاعت کے وہ غلط معنے تھے جو عربوں اور عیسائیوں میں راسخ تھے۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنے سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا کہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور ان شرکا کو شفعا کہتے تھے ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللّٰہ

بت پرست عربوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدے کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا۔ اسی کی تردید ہو رہی ہے اور انداز کلام طنزیہ ہے لفظ جمیعًا سے مراد ساری مخلوقات یا کفار اور ان کے معبود ہیں یا پھر انسان اور جن ہیں۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ مراد کفر کے سارے طبقات ہوں پھر ان میں سے بڑے ظالموں سے دریافت کیا جائے گا کہ وہ شرکا۔ کہاں ہیں جن کے بارے میں تم دنیا میں اللہ کے شریک ہونے کا نعرہ لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شفعاء ہیں جیسا کہ اسی پارے میں آرہا ہے۔

وما نرٰی معکم شفعاءکم الذین زعمتم انھم فیکم شرکاء
اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو جن کے متعلق تمہارا خیال تھا کہ تمہارے کام بنانے میں وہ شریک ہیں۔

قیامت کی ہولناکی اور مشرک کی بدحواسی

۲۶ ـ پھر ان کے پاس کوئی فریب اس کے سوا نہ ہوگا کہ وہ کہیں گے اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔ یعنی بجز انکارِ واقعات کے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گی۔ باطل معبودین کی جس عقیدت و محبت میں مفتون ہو رہے تھے اس کی حقیقت صرف اتنی رہ جائے گی کہ ساری عمر کے عقیدے اور تعلق سے بھی انکار کر بیٹھیں گے[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت میں لفظ فتنہ آیا ہے۔ فتنہ عربی میں متعدد معانی میں آتا ہے اس لیے شارحین قرآن نے اس کی تشریح اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ فتنہ کے معنے امتحان کے ہیں اور مراد ان کا کفر و شرک ہے اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھ کر ان پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ ان کے کفر و شرک کا انجام یہ ہوگا کہ اس بدحواسی میں پکار اٹھیں گے کہ بخدا ہم مشرک نہ تھے۔

فتنہ کے معنے گمراہی کے ہیں اور یہاں اس سے مشرکین کا جواب مراد ہے۔ چونکہ مشرکین کا جواب صریح جھوٹ ہوگا اس لیے اسے فتنہ سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا جواب یہ ہوگا کہ بخدا ہم مشرک نہ تھے۔

امام زجاج کہتے ہیں کہ فتنہ کے اصل معنے کسی پر شیفتہ اور فریفتہ ہونے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرک جو اپنے بتوں پر اس قدر شیفتہ اور فریفتہ ہیں اس کی حقیقت روز قیامت اس وقت کھل کر سامنے آجائے گی جبکہ قیامت کی ہولناکی میں عشق کی ساری جھکڑی ہوا ہوکر رہ جائے گی اور وہ ان سے اظہار بیزاری کریں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی پر عاشق ہو پھر جب عاشق کو راہِ عشق میں کوئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے تو اس سے بیزار ہوجائے اس پر وہ محبوب یا کوئی دوسرا شخص اس سے کہے کہ بس تیرا عشق سارا یہی ہے کہ بیزاری ظاہر کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر فتنہ آزمائش کے معنے میں ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جس فتنہ شرک اور جن موہوم آرزوؤں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کا پردہ چاک ہوجائے گا اور ان کو پتہ لگ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ اس وقت ان کے بس میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ جس طرح آج اس دنیا میں خدا پر جھوٹ بول کر اپنی دینی زندگی کا گھروندا بنا رہے ہیں اس طرح اپنے اوپر بھی ماکنا مشرکین کہہ کر جھوٹ بولیں۔ اور اگر لفظ فتنہ کو ظلم و تشدد سے دین سے پھرنے کے معنے میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آج جس فتنے میں یہ کمزور مسلمانوں کو بجرم انکار شرک میں مبتلا کر رہے ہیں کل اسی فتنہ میں یہ کہہ کر خود مبتلا ہوں گے کہ ماکنا مشرکین، گویا آج جس شرک کی حمایت میں وہ مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہی اس سے بیزار ہوجائیں گے اور جھوٹ بولیں گے۔

مشرکین کا جھوٹ دنیا و آخرت میں

۲۷۔ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولیں گے اور ان کی ساری افترا پردازیاں کھوئی جائیں گی

یعنی اس صریح جھوٹ سے مشرکین کی انتہائی بدحواسی اور شرک کی غایت بے چارگی اور درماندگی کا اظہار ہوگا، کاش مشرکین اس رسوا کن انجام کو دنیا ہی میں سمجھ لیں[1] مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر جھوٹی گواہی دی یعنی دنیا میں جس شرک کی حمایت میں لڑتے رہے۔ آخرت میں پہلے ہی قدم پر قسم کھا کر اس کا انکار کر گئے۔ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں یہ خدا کے خلاف جھوٹی گواہی دیتے رہے ہیں۔ شارحین قرآن نے تو یہی لکھا ہے کہ آیت میں انظر سے حضور انور کو خطاب ہے لیکن ہر ایک مراد ہے اور تصویر حال کے لیے ہے تاکہ مستقبل میں ہونے والے واقعات ہر شخص چشم تصور سے دیکھ سکے مطلب یہ ہے کہ دیکھئے کہ ان لوگوں نے خود اپنے خلاف ہی اپنا ووٹ ڈال دیا اور قسم کھا کر شرک کا انکار کر دیا۔

ضل عنھم ما کانوا یفترون کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جھوٹ بول کر جن کو شریک اور شفعاء کا درجہ دے رکھا تھا اور جن سے ساری امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ سب ہوا ہو گئیں اور ان میں سے کوئی امید بھی بر نہ آئی۔ گویا دنیا میں ان دیوتاؤں کو اللہ کا شریک ٹھہرانا یا ان شرکاء کو شفیع بنانا ایک افترا تھا آج حقیقت سامنے آکر اس کی قلعی کھل گئی۔ اور بعض شارحین قرآن کا خیال ہے کہ افترا سے مشرکین کی اپنی عبادات کے بارے میں وہ تاویلات ہیں جو دنیا میں کرتے تھے کہ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی، ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔

آیت کی بعض مہمات کی تشریح ابھی باقی ہے۔

الف: یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ میدان قیامت کے ہولناک مناظر اور رب الارباب کی قدرت کاملہ دیکھ کر ان کو یہ جرأت کیسے ہوگی کہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں جھوٹ بولیں۔ عام شارحین قرآن نے اس کے جواب میں بتایا ہے کہ ان کا یہ جواب عقل و ہوش اور انجام بینی کے تقاضوں کے تحت نہیں ہے بلکہ بست کی بہتات اور بوکھلاہٹ کے نتیجے میں ہے۔ بوکھلاہٹ کا جب آدمی شکار ہوتا ہے تو آدمی کے جو کچھ منہ میں آتا ہے کہتا ہے۔ آیت قرآنی کا مقصود بھی میدان قیامت کی ہولناکیوں میں ان کی پریشانی، بے بسی، بے کسی کی تصویر پیش کرنا ہے۔ یعنی ان سے جب یہ سوال ہوگا کہ این شرکاءکم الذین کنتم تزعمون تو وہ اس قدر پریشان ہوں گے کہ ہوش باختہ ہو کر کہیں گے ما کنا مشرکین۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ میدان محشر کا ایک ہی حال نہ ہوگا بلکہ وہاں مختلف مراحل اور مناظر ہوں گے ایک مرحلہ میں اگر وہ شرک کا انکار کریں گے تو دوسرے مرحلہ پر وہ شرکاء کو پکاریں گے یعنی اس روز

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مشرکین کو جس حیرانی اور پریشانی سے سابقہ پیش آئے گا وہ ایسی ہوگی کہ اس میں ان کو سمات کی کوئی راہ سجھائی نہ دے گی اس لیے جس مرحلے میں جو بات بنتی نظر آئے وہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہاں بات کو قسم کے انداز میں پیش کرنا ان کی حیرت کو ظاہر کر رہا ہے۔

البحر المحیط میں ابوحیان اندلسی اور تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے کچھ کے حوالہ سے یہ نکتہ خوب پیش فرمایا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے شرک کا انکار کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو کھلے طور پر کسی کو خدا نہ کہتے تھے مگر ان کا عمل یہ تھا کہ خدائی کے سارے اختیارات مخلوقات میں بانٹ رکھے تھے کسی کو بارش برسانے کے کام پر کسی کو اولاد دینے کے کام پر کسی کو پیداوار پر کسی کو ملازمت دینے کے کام پر سمجھتے تھے اور انہی سے حاجتیں مانگتے، انہی کے نام کی نذر نیاز دیتے۔ ان ہی سے روزی، تندرستی، اولاد اور ساری مرادیں مانگتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مشرک نہ سمجھتے تھے اس لیے میدان حشر میں بھی قسم کھا کر یہی کہیں گے کہ ہم تو مشرک نہ تھے۔

ب: یہاں یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کچھ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ کفار سے کلام ہی نہ فرمائے گا اور یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفار سے کلام ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ جس آیت میں مخاطبہ اور کلام کی نفی ہے وہ بطور اعزاز و اکرام ہے۔ زجر و توبیخ اور ملامت پر مبنی خطاب کی نفی نہیں ہے۔ اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس کلام کی نفی کی گئی ہے وہ بلا واسطہ ہے اور اس آیت میں جو خطاب مذکور ہے وہ بواسطہ ملائکہ ہے۔

ج: یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ جس وقت مشرکین سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارے شرکا کہاں ہیں؟ وہاں ان کے معبودوں میں سے کوئی نہ ہوگا۔ حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ ان معبودوں کے ہونے کا ذکر ہے مثلاً احشروا الذین ظلموا وازواجھم وما کانوا یعبدون۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں عابدوں اور ان کے معبودوں کا اجتماع ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے غائب ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ شریک اور شفیع کی حیثیت سے غائب ہوں گے کہ ان لوگوں کو کوئی نفع نہ پہنچا سکیں گے ویسے حاضر ہوں گے اس طرح دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ رہا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں یہ سب ایک جگہ جمع کر دیے جائیں پھر متفرق ہو جائیں اور یہ سوال تفریق کے بعد کیا جائے۔

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن
يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ
حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ
هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ
عَنْهُ ۖ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾

اور ان میں سے ایسے ہیں جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے کہ اس کو نہ سن سکیں[۲۸]۔ اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ایمان نہ لائیں گے[۲۹]۔ یہاں تک کہ یہ جب تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا افسانہ ہے[۳۰] اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے

ہیں، اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔ [۳۱]

قوموں کے عروج وزوال کا قانون

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعہ کے طور پر کوئی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں اصلی دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی زندگی اخلاقی فضائل سے تہی دامن ہو جاتی ہے تو اللہ کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ لے آتا ہے پھر اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اقتدار پاکر کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کا رویہ بھی بگڑ جاتا ہے تو پھر اس کو بھی فنا کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا ہے۔ عروج وزوال کے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر قرآن نے عربوں کے سامنے خود ان کے ملک اور ان کے گردوپیش کی تاریخ رکھی کہ عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون کے فنا ہونے کے واقعات اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ عروج وزوال کے اس خدائی قانون کے تحت ظہور میں آئے ہیں جو قوموں کی زندگی اور موت کے لیے خدا نے مقرر کیے ہیں۔ یہ قومیں اخلاقی اور روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے روحانی و اخلاقی حکماء روانہ کیے یعنی انبیاء ان انبیاء نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں لیکن ان قوموں نے ان کی باتوں کو درخور اعتناء نہ تصور کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آچکا ہے اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے۔ جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئی ہیں۔ ان آیات میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کا اسی پیمانے سے جائزہ لیا ہے۔

۲۸۔ اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بغرض اعتراض و عیب جوئی قرآن اور حضور کی باتوں کی طرف کان لگاتے تھے۔ ہدایت سے منتفع ہونا اور حق کو قبول کرنا مقصود نہ تھا۔ نصیحت و ہدایت سے ممتد اعراض اور کانشنس کی مسلسل تعطیل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قبول حق کے وسائل، قوی انجام کار ماؤف ہو کر رہ گئے۔ حق کے سمجھنے سے ان کے دل محروم کر دیے گئے۔ پیغام ہدایت کا سننا کانوں کو بھاری معلوم ہونے لگا۔ آنکھیں نظر عبرت

سے ایسی خالی ہو گئیں کہ ہر قسم کے نشانات دیکھ کر بھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوئی اور لطف یہ ہے کہ اس حالت موت پر قانع و مسرور بھی ہیں بلکہ فخر کے لہجے میں اس کا اعلان کرتے ہیں۔ سورہ حم میں ہے،

فاعرض اکثرهم فهم لا یسمعون وقالوا قلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه وفی آذاننا وقر ومن بیننا وبینك حجاب فاعمل اننا عاملون۔

پس ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی، بس وہ سنتے نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہے تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سماع آیات سے منتفع نہ ہونا اور دلوں پر پردہ پڑ جانا خود ان کے اعراض کا نتیجہ تھا اور یہ اعراض ہی اس کیفیت کے حدوث کا سبب ہوا ہے۔

اذا تتلی علیه ولی مستکبرا کان لم یسمعها کان فی اذنیه وقرا

جب اس کے سامنے آیات الٰہی تلاوت کی جاتی ہیں پھر پورے استکبار کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں ہے گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔

اسباب پر مسببات کا مرتب کرنا چونکہ خالق جل وعلا کے سوا کسی کا کام نہیں ہے اس لیے آیت حاضرہ "وجعلنا علی قلوبهم اکنة" میں پردہ ڈالنے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کر دی گئی۔[1] یہ مطلب یہ ہے کہ قانون فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں وہ سب حقیقت میں اللہ کے اذن اور ارادے کے تحت ہی رونما ہوتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرین سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہ سننا اور داعی حق کی کسی بات کا دل میں نہ اترنا ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب اور جمود کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قانون فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اتر آتا ہے اور بے تعصبی کے ساتھ صداقت پسند انسان کا سا رویہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کے دل کے دروازے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہر اس صداقت کے لیے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ اس بات کو جب ہم بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں۔ اور اسی بات کو جب اللہ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیے ہیں کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ حقیقت واقعہ کا اظہار کرتا ہے[1]

یہاں جس حجاب اور جس بہرے پن کا ذکر ہے وہ مادی نہیں بلکہ معنوی اور روحانی ہے جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے کی اس صلاحیت سے محروم کرتا ہے جو انسانیت کا اصلی خاصہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان چوپائے بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ محرومی اس کی اپنی شامتِ اعمال کے نتیجہ میں مسلط ہوتی ہے۔ یہ انسانی گمراہی کی انتہائی حالت ہے۔ ضد اور تعصب میں اگر وہ ایسا اندھا بہرہ بن جاتا ہے کہ نہ کسی بات کی حقیقت کو سمجھتا ہے نہ سمجھنے پر آمادہ ہوتا ہے یہ گویا ان کے کمال جہل کے لیے ایک بلیغ تمثیل ہے۔

معاندین کو معجزے سے بھی تسلی نہیں ہوتی

۲۹ - اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ایمان نہ لائیں گے یعنی ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوئے آخر یہ ساری کائنات آسمان، زمین، سورج چاند۔ دریا پہاڑ، ابر ہوا، رات دن کیا ہیں۔ کیا یہ عجائبات نہیں ہیں۔ ساری کائنات عجائبات کا گھر ہے لیکن جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں ان کا کیا علاج، جس طرح ان سارے عجائب سے ان کی آنکھیں بند ہیں اگر ان کو اور عجائب دکھا دیے جائیں پھر بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے رہیں گے۔ نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر چیز کے اندر خبث اور بدی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تعینات کو باڑ نہیں کر سکتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخرالعلی

---

[1] تفہیم القرآن

کے طور پر دہ نبوت سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور چونکہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسے عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ کبھی کوئی معجزہ پیش نہیں کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی۔ لیکن قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادت بھی پیش کر دیتی ہے تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح، ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خارق عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ یہ سحر اور جادو ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے ساری آیات بھی رکھ دی جائیں یہ اپنی ہٹ اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لائیں گے۔

حق پر پرانا ہونے کی پھبتی

۳۰۔ یہاں تک کہ یہ جب تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا افسانہ ہے۔ جس طرح ہم دوسرے قصے سنتے ہیں اسی طرح قرآن میں قوم عاد اور ثمود کے قصے ہیں یہ کوئی اعجاز نہیں ہے نہ دلیل نبوت ہے تمام اس قسم کی باتیں اور قصے بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ عرب میں یہودیوں اور عیسائیوں کی جماعتیں عرصہ سے موجود تھیں وہ تورات کے قصص و ایام سناتے تھے جب قرآن نازل ہوا اور اس میں بھی پچھلی قوموں اور رسولوں کی سرگزشتیں آنے لگیں تو مشرکین عرب کہنے لگے کہ یہ تو وہی پچھلی قوموں کی پرانی داستان ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نادان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص ان کو حق کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی امر حق کو پیش کرتے آتے ہیں اور آئندہ بھی جو اس منبع علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دہرائے گا البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم ہو کر ازلی و ابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کے اپج سے کچھ نظریات گھڑ کر انہیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرہ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو

ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو[1]

حق سے فرار اور راہِ حق میں رکاوٹ

۱۳۱ - اور یہ اس سے دوسروں کو روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔ یعنی ان میں نہ فہم رہا نہ انصاف، ایمان لانا اور ہدایت ربانی سے منتفع ہونا تو کجا، ان کی غرض تو حضور کی خدمت میں آنے سے صرف مجادلہ جھگڑا کرنا اور پھبتیاں کسنا ہے چنانچہ قرآنی حقائق اور بیانات کو معاذاللہ اساطیر الاولین کہتے ہیں۔ پھر اس تکذیب اور جدل و تمسخر پر اکتفا نہیں کرتے، کوشش یہ ہے کہ دوسروں کی طرف بھی اپنی بیماری کا تعدیہ کریں۔ چنانچہ لوگوں کو حق سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر دوسرے قبول حق سے نفور اور بیزار ہو جائیں مگر ان تمام ناپاک کوششوں سے نہ بحمداللہ دین حق کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے وہ تو غالب ہو کر رہے گا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ ان کی عصمت و رفعت کا تکفل خود خدا فرما چکا ہے۔ ہاں یہ احمق اپنے لیے ہلاکت ابدی کا سامان کر رہے ہیں اور سمجھتے بھی نہیں ہیں کہ اپنے ہاتھ سے خود اپنے پیر دل پر کلہاڑی مار رہے ہیں[2]

مطلب یہ ہے کہ قرآن عزیز سے دوسروں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں۔ علامہ مہائمی نے بتایا ہے کہ وہ قرآن کے سننے سے کیوں روکتے ہیں۔ کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ قرآنی انداز کی حلاوت ان کے نظم و نثر سے زیادہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اسے سننے کے ساتھ ہی اس کی شان اعجاز گھر کر جاتی ہے۔ بس اسی تاثیر کے اندیشے سے وہ لوگوں کو قرآن سننے نہیں دیتے، اسے پڑھنے نہیں دیتے ایسا نہ ہو کہ لوگ اثر لے لیں اور ان کی اغراض فاسدہ تار تار ہو کر رہ جائیں۔ یہ گویا قرآن کے سامنے ان کی عجز و بے چارگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عامی تو عامی عرب کے مشہور زبان آور شاعروں نے قرآن عزیز کے سامنے سر نیاز خم کیا ہے۔ لبید عرب کے مشہور شاعر تھے اسلام کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ان سے چند اشعار کی درخواست کی تو انہوں نے جواب دیا کہ جب خدا نے مجھے سورہ بقرہ اور آل عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں ہے۔ (الاستیعاب) انیس قبیلہ غفار کے شاعر تھے انہوں نے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آتے اور حضور انور

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سن کر واپس گئے۔ ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیا پایا انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں، کاہن ہیں۔ ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ ان کی بولی نہیں۔ ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھا ہے وہ شعر بھی نہیں۔ خدا کی قسم محمدؐ سچے ہیں اور قریش جھوٹے ہیں۔ ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحب اثر تھا۔ وہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنائیے۔ آپ نے چند آیتیں پڑھیں اس نے مکرر کی درخواست کی، آخر بے خود ہو کر بولا خدا کی قسم اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

اس قسم کے بہت سے واقعات محدثین اور سیرت نگاروں نے لکھے ہیں کہ لوگ کیوں کر قرآن مجید کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا دل ایک سورت کی چند آیتیں پڑھ کر اور سن کر موم ہو گیا۔ حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے انہوں نے حضور انور سے سورہ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو ان کا دل دھڑکنے لگا۔ حضرت عثمان بن مظعون نے چند آیات سن لیں تو فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ حضرت طفیل بن عمر والدوسی کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن حکیم کی چند آیات پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے۔

بہرحال کلام کی یہ شیرینی یہ نمکینی یہ تاثیر جو دوست اور دشمن، موافق اور مخالف، شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہیں۔ اسی سے ڈر کر وہ کسی کو قرآن سننے نہ دیتے تھے اور خود بھی اس سے دور ہی دور رہتے تھے اس کا منشا ان کے دلوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناکام کرنا تھا۔ قرآن نے ان کے اسی منشا پر یہاں یہ کہہ کر ان یھلکون الا انفسھم ضرب لگائی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں قطعاً کامیاب نہ ہوں گے بلکہ خود ان کی ہلاکت اور تباہی مقدر ہو چکی ہے اور مزہ یہ ہے کہ ان کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ
بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا
يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾

اور اے انسان تو تعجب کرے گا اگر ان کو اس حالت میں دیکھے جب یہ آتش دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے اس وقت کہیں گے اے کاش ایسا ہو کہ ہمیں پھر دُنیا میں لوٹا دیا جائے اور اپنے پروردگار کی آیتیں نہ جھٹلائیں اور ان میں سے ہو جائیں جو ایمان والے ہیں[۳۲]۔ بلکہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے اس کا بدلہ ان پر نمودار ہو گیا[۳۳]۔ اور اگر یہ دُنیا کی طرف لوٹا دیے جائیں تو پھر اسی بات میں پڑ جائیں گے جس سے انہیں روکا گیا ہے اور بلاشبہ یہ جھوٹے ہیں[۳۴]۔

آخرت میں نبوت کی اپوزیشن کا انجام

زیر تشریح آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والوں کا انجام بیان ہو رہا ہے پہلے فرمایا تھا کہ یہ

مکذبین تمہاری باتیں اور تمہارا پیش کردہ قرآن سنتے تو ہیں لیکن سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے نہیں بلکہ بحث و جدال کے لیے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس کو بہانہ بنا کر تم سے کٹ حجتی کر سکیں۔ ان کے دلوں، ان کے کانوں پر، ان کی بداعمالیوں کے سبب سے مہر ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اب یہ اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نہ خیال کرو کہ ان کی طلب کے موافق اگر ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو اس کو مان لیں گے اور پھر اس قرآن پر ایمان لے آئیں گے۔ نہیں اگر دنیا جہان کے معجزے بھی دیکھ لیں گے جب بھی یہ اسی طرح کٹ حجتیاں کریں گے کیونکہ ان کے انکار و تکذیب کی علت اب بھی موجود ہے۔ ان میں بات کو سننے اور سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روک رہے ہیں اور خود بھی اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں۔ لیکن اطمینان رکھو نہ یہ خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ تمہارا بلکہ یہ اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں لیکن چونکہ ابھی وہ انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اس لیے ان کو احساس نہیں ہے۔ اگر تم ان کو اس وقت دیکھو جب یہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹائے جائیں کہ قرآن کی تصدیق کریں اور اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور اہلِ ایمان سے بنیں فرمایا کہ وہ اپنے اس اعتراف میں جھوٹے ہیں۔ یعنی وہ انکار و سرکشی میں اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ سارے پردے ہٹا دیے جائیں پھر بھی ان کے دل کے دروازے قبولِ حق کے لیے نہ کھلیں گے۔ کیونکہ ان کی تکذیب کی علت یہ نہیں ہے کہ حق ان کے سامنے واضح نہیں ہوا ہے بلکہ حبِ دنیا غرور اور حسد کے حجابات نے ان کی عقلوں کو اندھا کر دیا ہے۔

۳۲۔ اور اے انسان تو تعجب کرے گا اگر ان کو اس حالت میں دیکھے جب یہ آتشِ دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے اس وقت کہہ رہے ہوں گے اے کاش ہمیں لوٹا دیا جائے اور ہم اپنے پروردگار کی آیتیں نہ جھٹلائیں اور ان میں سے ہو جائیں جو ایمان والے ہیں۔ یعنی آیات اللہ کی تکذیب و استہزاء وغیرہ ساری خفقان اس وقت تک ہے جب تک خدائی سزا کا ہولناک و ہوش ربا منظر سامنے نہیں۔ جس وقت دوزخ کی ذرا سی جھلک بھی ہوگی تو ساری شیخی کرکری ہو جائے گی اور بہ ہزار تمنا یہ درخواست کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں اور پکے ایماندار بن کر رہیں الان ندمت وما ینفع الندم [1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں یعنی ان کو دوزخ کے کنارے پر پہنچ کر حکم ہوگا کہ ان کو ٹھہرا دو، کافروں کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کچھ توقع ہو جائے گی کہ شاید ہم کو پھر دنیا میں واپس کیا جائے تو اب کی بار کفر نہ کریں۔ ایمان سے آویں سو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس واسطے ان کو نہیں ٹھہرایا بلکہ اس طریقہ سے ان سے اقرار کروایا ہے کہ ہم نے کفر کیا تھا پہلے انکار کرتے تھے کہ ہم نے شرک نہیں کیا۔ اب ان کو روا نہ کرنا بے کار ہے۔

ان کی جرائم کی دستاویز تو طویل ہے۔ مشرکانہ زندگی۔ نبوت کی تکذیب، آیاتِ الٰہی کی تکذیب واستہزا اور ان سے اعراض، لیکن ان سارے جرائم میں نمایاں حیثیت شرک اور تکذیب نبوت کی ہے یعنی شرک کفر ان ہی دو جرموں کی اس آیت میں سزا بیان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ آخرت میں شرک و کفر کی بخشش نہیں ہے۔ کیونکہ کفر و شرک کی موجودگی میں ایمان کالعدم ہو جاتا ہے۔ ایمان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں ہماری محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہے اس لیے شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستان پارینہ قرار دے رہے ہیں لیکن حسرت کریں گے کہ کاش ہم پھر دنیا میں آئیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور ان کی تکذیب نہ کریں لیکن ان کا یہ کہنا فی الواقع عقل و فکر کے کسی صحیح فیصلے اور کسی حقیقی تبدیلی رائے کا نتیجہ نہ ہوگا بلکہ محض مشاہدہ حق کا نتیجہ ہوگا جس کے بعد ظاہر ہے کہ کٹے سے کٹا کافر بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مشاہدہ کا ماننا معتبر نہیں ہے ایمان تو صرف غیب کو ماننے کا نام ہے اگر نکلتے ہوئے سورج کو دیکھ کر آپ کہیں امنت بالشمس تو یہ ایمان نہیں ہے اس لیے کہ مشاہدہ ہے۔

مجازات و مکافات کا منظر

۲۳ ۔ بلکہ جو کچھ چھپایا کرتے تھے اس کا بدلہ ان پر ظاہر ہو گیا۔ یعنی اب بھی دنیا میں واپس جانے کی تمنا عزم صحیح اور ایمانی رغبت و شوق سے نہیں بلکہ جب مجازات و مکافات عمل کا وہ منظر سامنے آگیا جسے باوجود وضوحِ ادلہ انکار کے پردے میں چھپایا کرتے تھے۔ عذابِ الٰہی کو آنکھوں سے دیکھ لیا تمام اعمال شنیعہ کا جو چھپ چھپ کے کیے جاتے تھے راز فاش ہو گیا۔ ابھی ابھی جو واللہ ربنا ما کنا مشرکین کہہ چکے تھے اس جھوٹ کی بھی قلعی کھل گئی۔ غرض کہ بدی کے جو اثرات مخفی اور غیر مرئی طور پر اندر ہی اندر ان نالائقوں کے دلوں میں پرورش پا رہے تھے وہ دردناک عذاب کی

صورت میں ممثل ہو کر سامنے آ گئے تو محض جان بچانے کے لیے دوبارہ دُنیا میں واپس کیے جانے کی تمنا کرنے لگے[1]

مطلب یہ ہے کہ صورت معاملہ وہ نہیں جو دُنیا میں واپسی اور ایمان کی تمنا کی صورت میں یہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ چھپاتے تھے وہ سب کچھ آج چونکہ طشت از بام ہو گیا ہے اس لیے وہ ایسا کہہ رہے ہیں۔

دنیا کی زندگی میں وہ کیا کچھ چھپاتے تھے؟ اسے قرآن نے بیان نہیں کیا اس لیے شارحین قرآن نے اپنے ذوق کے مطابق اس کی نشاندہی کی ہے۔ پہلی رائے تو وہی ہے جو مولانا عثمانی نے اختیار کی ہے یعنی وہ تمام اعمال شنیعہ جو چھپ چھپ کر کرتے تھے وہاں ظاہر ہو جائیں گے دوسری یہ کہ ان کے وہ اعمال نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے جن پر وہ دُنیا کی زندگی میں اتراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو ان کے سامنے خاکستر بنا دیں گے، تیسرے یہ کہ ان کا وہ کفر و شرک جسے میدان حشر میں دوزخ پر پہنچنے سے پہلے چھپا رہے تھے وہ ظاہر ہو جائے گا، چوتھے یہ کہ نبوت سے عناد کی وجہ سے حق و ایمان کو کفر و تکذیب کو ظاہر کر کے چھپائے ہوتے تھے وہ نمایاں ہو کر سامنے آجائے گا، پانچویں یہ کہ ان کے زعماء نبوت کے پیش کردہ حق کو اپنے معتقدین سے جو دُنیا چھپاتے تھے اس کی نمائش ہو جائے گی اور ان کے متبعین کو پتہ لگ جائے گا جیسے اہل کتاب کے علماء عوام اہل کتاب سے حضور انور کے اوصاف اور بشارات کو چھپائے ہوتے تھے۔ چھٹے یہ کہ منافقین دُنیا میں جو کفر چھپائے ہوتے تھے، وہ کھل کر سامنے آجائے گا، ساتویں یہ کہ عذاب اور بعث و نشر جس پر وہ لوگ کفر و تکذیب کے پردے ڈالے ہوتے تھے وہ ظاہر ہو جائے گا۔ آٹھویں یہ کہ کفر اور تکذیب کا وہ وبال آخرت میں ظاہر ہو جائے گا جو دُنیا میں ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تمناؤں سے حقائق تبدیل نہ ہوں گے بلکہ ان کے لیے وہ کچھ ظاہر ہو کر سامنے آجاتے جسے وہ دُنیا میں چھپاتے تھے اور جس کے ظہور کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

کفر و تکذیب ان کی طبیعت ہے

۳۴ - اور اگر یہ دُنیا کی طرف لوٹا دیے جائیں تو پھر اسی بات میں پڑ جائیں گے جس سے انہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

روکا گیا ہے اور بلاشبہ یہ جھوٹے ہیں۔ یعنی اب بھی جھوٹ کہتے ہیں کہ ہم دُنیا میں واپس ہو کر پکے ایماندار بن جائیں گے اور ہرگز آیات اللہ کی تکذیب نہ کریں گے۔ یہ اشقیا اگر دُنیا میں واپس کر دیے جائیں تو بدی اور شرارت کی جو قوتیں ان میں رکھی ہیں پھر ان ہی کے کام میں لائیں گے اور جس مصیبت سے گھبرا کر واپس جانے کی تمنا کر رہے ہیں اسے خواب و خیال کی طرح فراموش کر دیں گے جیسا کہ بسا اوقات دُنیوی مصائب و مہالک میں پھنس کر آدمی انابت و توبہ اختیار کر لیتا ہے پھر جہاں چند روز گزرے کچھ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس وقت کیا عہد و پیمان کیے تھے کان لم یدعنا الی ضرّ مسّہ[1]

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب قیامت میں اپنی آنکھوں سے امور واقعیہ کا معائنہ کر لیا تو پھر دُنیا میں آنے کے بعد کفر اور تکذیب کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ تکذیب تو زبان کا فعل ہے یقین قلب کے ساتھ تکذیب لسانی کا جمع ہونا ممکن ہے اور تکذیب لسانی بھی کفر ہے، رہا دل سے یقین ہونا وہ بوجہ معائنہ کے اضطراراً ہوگا جو شرعاً معتبر نہیں اور جو شرعاً مطلوب ہے اس کا حاصل تسلیم و انقیاد اختیاری ہے، لہٰذا تصدیق اضطراری کے ساتھ عدم تصدیق اختیاری کا جمع ہونا بھی ممکن ہے جیسا کہ بعض ضدی لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ دل میں جانتے ہیں مگر مانتے نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ تمنا ہوتی ہے غیر حاصل کی اور ایمان و عدم تکذیب تمنا کے وقت ان کو حاصل ہے پھر تمنا کے کیا معنے جواب یہ ہے کہ تمنا دُنیا میں ایمان اور عدم تکذیب کی کی جا رہی ہے کیونکہ نجات میں سود مند یہی ہے اور یہ وہاں موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مفید نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ تمنا نہیں ہے[2]

بہرحال اللہ سبحانہٗ نے ان کی اس تمنا کا پول اس طرح کھول دیا کہ یہ لوگ جیسے ہمیشہ سے جھوٹ کے عادی تھے وہ اپنے اس قول اور تمنا میں بھی جھوٹے ہیں اور بات اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ نبوت کے ذریعے جو حقائق ان کے سامنے لائے گئے تھے یہ لوگ ان کے جاننے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے یا دُنیا کی طمع خام کی وجہ سے ان حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج وہ سب ایک ایک کر کے ظاہر ہو گئے۔ اللہ سبحانہٗ کی قدرت کاملہ کے مظاہر آنکھوں سے دیکھے انبیا کی صداقت کا مشاہدہ کیا۔ دوبارہ زندہ ہونے کا مسئلہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ جزا و سزا کا مظاہرہ دیکھا اور دوزخ کا مشاہدہ کیا اب ان کے پاس کوئی حجتِ مخالفت نہ رہی اس لیے یوں کہنے لگے کہ کاش ہم پھر دُنیا میں

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن۔

واپس ہوتے تو مومن بن جاتے۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ اب یہ ایسا کہہ رہے ہیں لیکن بالفرض ان کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تو وہ پھر اپنے قول و قرار کو بھول جائیں گے وہ وہی سب کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے[1]۔

اس ارشاد و لو ردوا لعادوا میں ہماری ایک اہم اصولی حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ اگر بالفرض ان کو دوبارہ دنیا میں روانہ کر دیا جائے تو پھر وہی کفر، شرک، نفاق، مکر و فریب اور معاصی کا ارتکاب کریں گے کیونکہ یہ اعمال ان کی طبیعت کا تقاضا بن چکے ہیں اور جب تک علت موجود ہے معلول یقیناً موجود ہے۔ اگر ان کو دنیا میں روانہ بھی کر دیا جائے تو ان کے یہ ملکات، یہ اخلاق ظاہر ہو کر رہیں گے۔ دوزخ کے کنارے پر کھڑے ہو کر نبوت کی صداقت کو ماننا بالکل ایسا ہے جیسا شرابی، جوئے باز پھنس کر شراب اور جوئے کی برائی کو مانتا ہے لیکن مصیبت ٹلنے پر پھر اس کا انکار ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بلاؤں اور مصائب کا جھکڑ انسان کو سب کچھ بھلا دیتا ہے لیکن جن اخلاق کا انسان ابتداء ہی سے خوگر ہوتا ہے وہ بہرحال عود کرتی ہے۔ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مصائب کے ہجوم میں وقتی طور پر دب تو سکتے ہیں مگر ختم نہیں ہو سکتے تقویٰ و فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس، اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، شرک و کفر کی علت طبیعت کی غلط افتاد اور اس کا ناروا تقاضا ہے اور جب تک علت موجود ہے معلول یقیناً ظاہر ہوگا۔ ان میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی اور مادی اشیا میں ہوتا ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ اگر یہ واپس بھی ہو جائیں پھر بھی یہ ان ہی افعال شنیعہ کا ارتکاب کریں گے جو ان کی طبیعت کا تقاضا بن چکے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ انھم لکاذبون وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یعنی ایمان لانے کے وعدے میں وہ جھوٹے ہیں اور یہ مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں جھوٹ ان کی طبیعت ہے۔ علامہ آلوسی نے دنیا میں آکر اسی کردار کو اپنانے کی وجہ ان کے طبیعت کی خباثت ان کی جبلی نجاست اور ان کی استعداد کی بدی بتا کر شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

٭٭٭

---

[1] معارف م ش۔

وَقَالُوٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٢٩﴾ وَ
لَوْ تَرَىٰٓ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا
ع ١٠ بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾
قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ
أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٣١﴾ وَمَا الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ
يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٣٢﴾

اور کہتے ہیں کہ ہماری دُنیا کی زندگی ہی بس زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد پھر نہیں زندہ کیے جائیں گے۔[35] اور اے کاش تم ان کو اس وقت دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں

پیش ہوں گے اور وہ فرمائے گا کیا یہ دوبارہ زندہ ہونا برحق نہیں ہے تو وہ کہیں گے کیوں نہیں پروردگار کی قسم بالکل حق ہے خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو[۳۶]۔ بلاشبہ جن لوگوں نے مرنے کے بعد خدا کی ملاقات ہونے کو جھٹلایا وہ گھاٹے میں آگئے یہاں تک کہ جب ان پر ناگہاں قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم نے اس بارے میں کی اور وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے دیکھو جو بوجھ یہ اٹھا رہے ہیں بہت ہی برا ہے[۳۷]۔ اور دنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور بلاشبہ آخرت کا گھرانہ ہی اہلِ تقویٰ کے لیے بہترین ہے کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو[۳۸]۔

استحضار فکر آخرت

ابھی پڑھ چکے ہو کہ خدا کی صفت رحمت کے واضح تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک یوم جزا ہو تاکہ ان بندگان حق کی سعی و جہد کا جنہوں نے اپنی خواہشوں پر محض رضائے الٰہی کے لیے بہت سی

پابندیاں برداشت کیں اور جو دنیا میں محض خدا کی خاطر مصائب و آلام کا شکار ہوتے خالق کی طرف سے اعتراف کیا جائے اور انہیں اللہ کی رحمانیت اپنی آغوش شفقت میں لے کر اس طرح ان پر سے دنیوی رنج و غم کو جھاڑ دے جس طرح ایک شفیق ماں اپنے فرمانبردار لاڈلے بچہ کی بلائیں لے کر اس کو دلشاد کرتی ہے جبکہ وہ اس کے حکم کے بموجب کسی کٹھن مہم میں اپنے پسینے بہا کر واپس آیا ہو، بس اس کی رحمت گواہ ہے اس بات پر ایک یوم جزا آئے گا کتب علی نفسہ الرحمۃ انہ لیجمعنکم الی یوم القیامۃ میں اسی گواہی کا ذکر ہوا ہے۔ اب یہاں واو عطف کے ذریعے اسی کے متعلق قرآن اپنے مخاطبوں کا نظریہ بیان کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ توحید کے بعد ان کو جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہ آتا تھا وہ بھی قیامت کا مسئلہ ہے۔ وہ حیات بعد الموت خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذے اور پرسش اور جزا و سزا سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لیے ان کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دارومدار ہے۔ خباب بن الارت نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں۔ یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے۔ وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتے جب تک تم محمد کا انکار نہ کر دو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔ اس نے کہا کیا مر کر پھر جینا ہے۔ خباب نے کہا بے شک، اس نے مذاق سے کہا تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سر و سامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارے میں اہل عرب کا کفر کس قدر شدید تھا اس لیے قرآن عزیز نے اس مسئلہ کو ان کے سامنے پوری قوت سے پیش کیا ہے۔ اسی مقام کا ذرا بغور مطالعہ فرمائیے کیسی پرشوکت تعبیر میں موثر طریق کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس میں ہیبت الٰہی، ہنگامہ قیامت کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ سننے والا سر تا پا اثر پذیر ہو جائے۔ ارشاد ہے۔

۳۵۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری دنیا کی زندگی بس زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد پھر نہیں زندہ کیے جائیں گے۔ یعنی خوب مزے اڑالو۔ دنیوی عیش کو فکر آخرت سے منغص نہ کرو یہی حال آج کل یورپ کے مادہ پرستوں کا ہے[1]

فی الواقع مادہ پرستی جہاں رونما ہوتی ہے اس کا نتیجہ خدا پرستی اور فکر آخرت سے گریز ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جیسے دنیا کے سوا کوئی چیز نہیں ایسے ہی دنیا سے باہر بھی کچھ نہیں حتیٰ کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انسان بھی صرف برقیہ اور سالمہ ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ اسے صرف اس دُنیا کی ضرورت ہے اور اس دُنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے۔ مادیت اور انکار آخرت لازم و ملزوم ہیں بلکہ یوں کہو کہ دُنیا میں بے دینی اور بد دینی ان سے ہی پروان چڑھتی ہے۔ یورپ کو دیکھو کہ مادیت کے سیلاب کے سامنے مذہب ٹھہر نہ سکا اور مسیحیت اس کے دھارے کی نذر ہو کر رہ گئی اور اس کی جگہ مادہ پرستی نے لے لی۔ مصنفین، اہل قلم اور اہل دماغ گروہوں نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زور خطابت سے فکر آخرت اور خدا پرستی کے خلاف دُنیا میں ایک عام بغاوت کر دی۔ انہوں نے دُنیا پرستی کو نہایت دلفریب بنا کر پیش کیا۔ جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا۔ انہیں زندگی سے بھرپور تمتع، مطالبات نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و ہوا کی اس زندگی کی اہمیت جتانے کے لیے بڑے غلو سے کام لیا گیا۔ نقد لذت، ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا آخرت کی ہر چیز کا ابطال کر دیا گیا۔ یورپ کا موجودہ مذہب آخرت سے بیگانہ صرف مادہ پرستی ہے۔ اس کے متعلق ایک مفکر نے اپنا تاثر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

اس میں شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرنے والا ماہر یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش اور اس کی منزل صرف یہی ہے کہ وہ اس زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان، پُر راحت اور عام محاورے کے مطابق قدرت سے آزاد بنا سکے۔ اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے، کیمیادی دارالصنائع، ناچ گھر، بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بینکوں کے افسر، انجینئر، اداکار، بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ لذت اور طاقت کی اس ہوس اور چھوڑ پن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل کھڑے ہیں تاکہ جب کبھی ان کے مصالح میں تصادم ہو تو بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کو تباہ کر دیں اور جہاں تک تمدن کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا گروہ جنم لے چکا ہے جن کے نزدیک نیکی اور اخلاق کا اصلی پیمانہ صرف ذاتی مفاد ہے اور ان کے ہاں

بھلائی اور برائی کو جانچنے کا اصل معیار صرف مادی کامیابی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا، اسلامی افکار سے متاثر ہے اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آرا پیش کرتے ہیں۔ ان سے آخرت بیزار رجحان کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ پروفیسر جوڈ کہتے ہیں :

صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے۔ حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکات عمل سے زیادہ بڑھ کر کار فرما رہی ہے کیونکہ دولت حصول ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و شان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، سیاسیات ادب، سنیما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال سامعین کو بھی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو۔

بہرحال جیسے آج کا یورپ فکر آخرت سے بیگانہ اور خداشناسی سے بیزار اپنی پوری زندگی کو مادیت پرستی کے لیے وقف کیے ہوئے ہے ٹھیک اسی طرح عرب کے باشندے انکارِ آخرت کو اپنا کر فکرِ آخرت سے بیگانہ اور خداشناسی سے دُور ہو چکے تھے۔

خدا کی بارگاہ میں پیشی

۳۶۔ اور اے کاش تم ان کو اس وقت دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے اور وہ فرمائے گا کہ کیا یہ دوبارہ زندہ ہونا برحق نہیں ہے تو وہ کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پروردگار کی قسم بالکل حق ہے خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔ یعنی جب حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے گی اور بعث بعد الموت وغیرہ کے اقرار سے چارہ نہ رہے کا تب کہا جائے گا کہ انکارِ حقیقت اور کفر بالمعاد کا مزہ چکھو[1] اللہ کے حضور میں پیش ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کو فرشتے اللہ کے حضور میں پیش کریں گے اور فیصلہ ہونے تک فرشتے ان کو روکے رکھیں گے۔ اسی وجہ سے یہاں قفوا کے ساتھ علیٰ استعمال ہوا ہے ورنہ یہاں علیٰ بلندی اور برتری کے معنے میں نہیں ہے۔ اور فرشتے ان کو اللہ کے حکم سے ٹھہرائیں گے۔ قرآن میں ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وقفوھم انھم مسئولون۔ اب وقفوا علیٰ ربھم کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم پر روکے جائیں گے اور یا مطلب یہ ہے کہ ان کا معاملہ صرف اللہ پر موقوف ہوگا۔ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہ ہوگا۔ یہ فرمانے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر کیا ہوگا بتایا کہ پھر یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ، فرمائے گا بتاؤ کیا قیامت کا برپا ہونا امر واقعہ نہیں ہے ؟ ان کا جواب یہ ہوگا ؛ ہاں بلاشبہ یہ امر واقعہ ہے۔ قیامت کے ہونے کا اقرار بھی کریں گے اور قسم کے ساتھ کریں گے۔ اس طرح وہ اپنے خلاف گواہی کہیں گے۔ ایک تو اس انداز تعبیر کا حاصل یہی ہے کہ منکرین قیامت روز قیامت قیامت کا اقرار کریں گے اور دوسرے اس تعبیر کے ذریعے قیامت بپا ہونے کی اہمیت بتانی مقصود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دین حق کی اطاعت اور اقامت کے زاویہ نظر سے اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لحاظ سے قیامت کا مسئلہ توحید کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی جبلت میں جو عجلت پسندی، حاضر طلبی اور عاجلہ پرستی رکھی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ محاسبہ اعمال کا اندیشہ نہ ہونے کے باوجود وہ نیکی اور حق پرستی کی سنگلاخ وادی کو قطع کرنے پر تیار ہوگا۔ اس کو خدا کی ذات اس کی یکتائی کا لاکھ یقین بھی مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری انجام وہی ہے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور اس کی تمام حرکات کا تماشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے والا ہے تو نرا نادان ہوگا اگر اس نے " بعیش کوش " کے فتویٰ پر عمل نہیں کیا اور دنیا اس کی بدقسمتی کا ماتم ہی کرے گی اگر اس نے جی کھول کر داد نفسانیت نہ دی بخلاف اس کے کہ اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب کا یے جانے کا پورا یقین ہو تو بہر حال اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں بلکہ بہت ممکن ہے کہ کسی حد میں مشرک ہوتے ہوتے بھی، یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقائد خدا کے ہاں اس کے اعمال کو میزان محاسبہ میں بے وزن بنا دیں۔ لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ایک مشرک کا ایک منکر قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطہ اخلاق کا پابند ہونا زیادہ قرین قیاس ہے اور اس سے نسبتاً اس بات کی زیادہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ہوائے نفس کے ہاتھوں بالکلیہ اپنی زمام کار سونپ دینے سے مجتنب رہے گا۔ اس لیے انسانی اخلاق و کردار پر اپنی تاثیر کے لحاظ سے ایمان بالآخرت کو ایمان باللہ کے برابر اہمیت دینا خلاف واقعہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر پہلے مشرکین کے بارے میں اذ وقفوا علی النار، فرمایا گیا ہے تو یہاں منکرین قیامت کے بارے میں اذ وقفوا علی ربھم فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شدومد سے

قرآن نے توحید پر دلائل دیے ہیں۔ قیامت کے وقوع پر آفاق و انفس کی محکم اور دل نشیں شہادتیں بہم پہنچانے میں اس سے کم زور صرف نہیں کیا۔

یہاں آخر میں فرمایا کہ فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون اس کا مطلب یہی ہے کہ کفر بالمعاد کا مزہ چکھو اور یہاں سباق کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ساری خرابیوں کی جڑ آخرت فراموشی ہے

۳۱۔ بلاشبہ جن لوگوں نے مرنے کے بعد خدا کی ملاقات ہونے کو جھٹلایا وہ گھاٹے میں آ گئے یہاں تک کہ جب ان پر ناگہاں قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم نے دنیوی زندگی میں کی اور وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے دیکھو جو بوجھ یہ اٹھائے ہیں بہت ہی برا ہے۔ انسان کی بڑی شقاوت اور بدبختی یہ ہے کہ لقاء اللہ کا انکار کر دے اور زندگی کے اس بلند مقصد کو جھوٹ سمجھے۔ یہاں تک کہ جب موت یا قیامت سامنے آجائے تب بے فائدہ کف افسوس ملنا رہ جائے کہ ہائے میں نے اپنی دنیوی زندگی میں یوم قیامت کے لیے تیاری کرنے میں کیسی ناقابلِ تلافی کوتاہی کی۔ اس وقت اس افسوس و حسرت سے کچھ نہ ہوگا۔ جرموں اور شرارتوں کے بارگراں کو جس سے اس کی پشت خمیدہ ہوگی یہ ناوقت کا تاسف و تحسر ذرا بھی ہلکا نہ کر سکے گا۔[1]

آیت کا آغاز قد خسر سے فرما کر اشارہ کر دیا کہ آخرت کی تکذیب کرنے والے لوگ ان تمام فائدوں سے محروم رہیں گے جن سے اہلِ ایمان متمتع ہوں گے۔ ان کو روزِ قیامت جو ایمان کے ثمرات ملیں گے ان سے وہ لوگ ہرگز بہرہ یاب نہ ہوں گے جو آخرت کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔ گویا آخرت کی تکذیب خسران کا سبب ہے۔ خسران عرف میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ کاروبار میں آدمی کا لگایا ہوا سارا سرمایہ ڈوب جائے اور بازار میں اس پر دوسروں کے مطالبے اتنے چڑھ جائیں کہ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ یہی استعارہ منکرینِ قیامت کے لیے اللہ نے یہاں استعمال کیا ہے۔ انسان کو زندگی، عمر، عقل، جسم، قوتیں اور قابلیتیں، ذرائع اور مواقع جتنی چیزیں بھی دنیا میں حاصل ہیں ان سب کا مجموعہ دراصل وہ سرمایہ ہے جسے وہ حیاتِ دنیا کے کاروبار میں لگاتا ہے یہ سارا سرمایہ اگر کسی شخص نے اس مفروضہ پر لگا دیا کہ مجھے کسی کو حساب نہیں دینا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے گھاٹے کا سودا کیا اور اپنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سب کچھ گھاٹے میں ڈال دیا اور اس غلط مفروضہ پر اس نے جتنے کام کیے ان سب میں وہ اپنے نفس سے لے کر بہت سے انسانوں، آئندہ نسلوں اور اللہ کی دوسری مخلوق پر عمر بھر ظلم کرتا رہا اس لیے اس پر بے شمار مطالبات چڑھ گئے مگر اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس سے وہ ان مطالبات کو پورا کر سکے۔ اس طرح وہ خود نہیں ڈوبا بلکہ اپنے بال بچوں اور عزیز واقارب اور دوستوں اور ہم قوموں کو بھی اپنی غلط تعلیم و تربیت سے لے ڈوبا۔ ان ہی خساروں کو قرآن نے یہاں حرف تحقیق لگا کر قد خسر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے یہاں تک کہ جب ان پر ناگہاں قیامت آجائے گی۔ اصل میں حتی اذا جاء تہم الساعۃ بغتۃ کے الفاظ ارشاد ہوتے، "یہاں تک"، کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق تکذیب سے ہے یعنی تکذیب کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان پر وہ چیز واقعہ بن کر رونما ہو جائے گی جس کی تکذیب کرتے تھے یعنی قیامت اور دوسرا یہ کہ اس کا تعلق خسران سے ہے یعنی افکار و اعمال اور اخلاق میں گھاٹا اور نقصان اٹھاتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

ساعۃ کے معنی اصل لغت میں مختصر سے مختصر عرصہ کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں جلست الیہ ساعۃ لیکن اصطلاح میں یہ لفظ تین معنے میں بولا جاتا ہے۔ فرد کی دنیوی زندگی کے ختم ہونے پر قوم کی اجتماعی حیات کے خاتمہ پر اور پورے عالم کی تباہی پر، یہاں ساعت سے عام شارحین قرآن کی رائے میں امام راغب کو چھوڑ کر عالم کی بربادی یعنی قیامت کبریٰ مراد ہے۔ امام راغب قیامت صغریٰ مراد لیتے ہیں لیکن جمہور کی رائے میں قیامت کبریٰ مراد ہے۔ یہاں بغتۃ کی تعبیر جمہور کی موید ہے۔ اس آیت کے علاوہ بھی قرآن کی دوسری آیات میں بھی لفظ بغتۃ آیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں قیامت کبریٰ مراد ہے۔

یہاں پہنچ کر مخاطب کے ذہن میں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کا کیا بنے گا، قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ قالوا... وہ کہیں گے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم نے دنیا کی زندگی میں اختیار کیے رکھی ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ یہ اذا کا جواب ہے یعنی جب آئے گی تو یوں کہیں گے اور اس لیے کہیں گے کہ ان کو قیامت کا کوئی انتظار نہ ہوگا۔ اصل میں یاحسرتنا علی ما فرطنا فیھا کے الفاظ آئے ہیں۔ فیھا کی ضمیر کا مرجع ہماری رائے میں حیاتنا الدنیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی پر جو فکر آخرت سے آزاد ہو کر بسر کرتے رہے افسوس، غم اور ندامت ظاہر کریں گے کہ انہوں نے ایمان و عمل صالح کی پلی ہوئی ساری صلاحیتوں میں کوتاہی کی ہے۔

تفریط کے معنے اس کام میں کوتاہی کرنے کے ہیں جس پر انسان جد وجہد کرنے پر قدرت رکھتا ہو، اس پر افسوس ہوگا کہ اس بڑی تکلیف سے بچ جانے کے لیے دنیا کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی اور وقتی

تکلیفوں کو برداشت نہیں کیا اور آج کی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم نے چھوٹی خوشیوں کو قربان نہیں کیا۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ، یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دونوں ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ راحت کے مقابلے میں آئندہ کی راحت کی پروا نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آئند ہو مگر وہ اُدھار ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ نقد کو اُدھار پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی تفریط ہے جس کا ان کی زندگی کے ہر پہلو میں مظاہرہ ہوتا ہے اسی پر وہ روزِ قیامت افسوس کریں گے۔

آخر میں فرمایا ہے وھم یحملون اوزارھم علیٰ ظھورھم وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ اوزار وزر کی جمع ہے اس کے معنے بوجھ کے آتے ہیں۔ بوجھ اُٹھانا یہاں دو معنے میں ہو سکتا ہے ایک مجازی دوسرے حقیقی، اگر یہ مجازی معنے میں ہو تو اپنے اعمال کی ذمہ داری کے لیے یہ استعارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ آخرت میں عذاب و ثواب کی صورت میں جو کچھ ہے وہ انسان کے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور یا بوجھ اٹھانا اپنے حقیقی معنے میں ہے یعنی روزِ قیامت اعمال کو ایک خاص جسمانی شکل دے دی جائے گی۔ اکثر اہلِ السنۃ کا مذہب بھی یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب اس کی شکل ہوگی اور جو اُمور معنوی اور غیر مجسم ہیں وہ اپنی مثالی مناسب شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے۔ مثلاً ترمذی میں حدیث ہے کہ اہلِ تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی ہوگی۔ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کو چیونٹی کی صورت میں نمایاں کیا جائے گا۔

بالکل آخر میں فرمایا الا ساء ما یزرون۔ دیکھو جو بوجھ یہ اٹھاتے ہوتے ہیں بہت بُرا ہے۔ بات کے مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے حرفِ تنبیہہ لگا کر مخاطبوں کو چوکنا کیا ہے اس فقرے کے ذریعے ان کی مذمت میں مبالغہ کیا گیا ہے فرمایا کیا ہی بُرا ہوگا وہ بوجھ جس کو یہ اٹھائے ہوں گے کیونکہ یہ بوجھ اب ان کے سروں سے کبھی اترنے والا نہیں ہے۔

دُنیوی اور اُخروی زندگی کا تقابل

۳۸۔ اور دُنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشہ کے سوا کچھ نہیں ہے اور بلاشبہ آخرت کا گھر انہی اہلِ تقویٰ کے لیے بہترین ہے کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔ کفار تو یہ کہتے تھے کہ دنیوی زندگی

کے سوا کوئی زندگی ہی نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فانی اور کمہ۔ زندگی حیات اُخروی کے مقابلے میں محض ہیچ اور بے حقیقت ہے یہاں کی زندگی کے صرف ان ہی لمحات کو زندگی کہا جا سکتا ہے جو آخرت کی درستی میں خرچ کیے جائیں۔ بقیہ تمام اوقات جو آخرت کی فکر اور تیاری سے خالی ہوں۔ ایک عاقبت اندیش کے نزدیک لہو و لعب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرہیزگار لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصلی گھر آخرت کا گھر اور ان کی حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے[1] جس دُنیا کی زندگی کی اس آیت میں مذمت ہو رہی ہے وہ ہے جو مقصود بالذات ہو جیسی ملحدوں اور مادہ پرستوں کی ہوتی ہے وہی لوگ جن کا قول ابھی اوپر نقل ہو چکا ہے ان ھی الاحیا تنا الدنیا، ورنہ وہ دُنیا جو آخرت کی تیاریوں کے لیے ہوتی ہے وہ قابل مذمت نہیں ہے وہ تو عین مطلوب ہے کیونکہ جیسا کہ امام رازی نے لکھا ہے اس کے بغیر تو آخرت کی سعادتوں کی فراہمی ممکن ہی نہیں یہ تو مزرعۃ الاخرۃ ہے۔ اللہ کی رضا اس کے ثمرات یعنی دائمی عیش و راحت دُنیا میں امن و اطمینان کی حیات طیبہ اور آخرت میں نعمائے جنت حاصل کرنا صرف دُنیا کی زندگی کے ذریعے ہو سکتا ہے نہ اس سے پہلے عالم ارواح میں اس کا حصول ممکن ہے اور نہ اس کے بعد عالم آخرت میں اس کی تحصیل ممکن ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ دُنیا کی زندگی بہت بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے جس میں یہ عظیم الشان سودا خریدا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام اور موت کی دُعا کرنا ممنوع ہے۔

آیت میں دُنیا کی زندگی کو لعب کھیل اور لہو تماشا کہا گیا ہے۔ لعب کھیل کود کا نام ہے بالفاظ دیگر ایسے اعمال و افعال جو اپنے اندر کوئی نتیجہ نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مثلاً مٹی خاک کے جو گھروندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ اس قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی میں ہی کرتا ہے اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک اس میں دُنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی لیکن جب یہ دَور گزر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے۔ شاید اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی۔ ایام طفولیت کے کسی دور کے گزر جانے کے جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں۔ لعب کا دور گزرنے کے بعد لہو کا زمانہ آتا ہے لہو کے معنے غفلت کے ہیں۔ طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب شبابی محرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے۔ وہی جس کا نام جوانی دیوانی رکھا گیا ہے یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے۔ ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں لوگ ان ہی جذبات اور دلولوں میں ڈوب جاتے ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جن کا تقاضا لڑکپن کے دنوں میں زور پکڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دُنیوی زندگی جس کے بارے میں قیامت کے منکرین یہ کہتے ہیں کہ زندگی یہی ہے اس کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، صرف یہی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی زندگی نہ ہو۔ اس کی حیثیت ایک بے نتیجہ کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ دُنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائدار زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل اور سنجیدہ کاروبار کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لیے بھی دی گئی ہے کہ حقیقت کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں پھنس کر لوگ حقیقت نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب و غریب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے اس کی حیثیت میں تھیٹر کے اس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں نہیں ہے جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اسے ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ ڈائریکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے قید کیا جاتا ہے اور اسی کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے ایسے ہی تماشے اس دُنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں حالانکہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام و نشان تک موجود نہیں، کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے حالانکہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رازق بنا ہوا ہے حالانکہ بیچارہ خود اپنے رزق کے لیے کسی اور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزت اور ذلت دینے والا، نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا کہ وہی گرد و پیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے۔ حالانکہ بندگی کی ذلت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا چکر اسے کبریائی کے مقام سے گرا کر انہی لوگوں کے قدموں میں پامال کرا سکتا ہے جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دُنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلا جا رہا ہے موت کی ساعت آتے ہی یک لخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اس عالم میں پہنچ جائے گا جہاں سب کچھ عین مطابق حقیقت ہوگا اور جہاں دُنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ جو میزان حق میں کسی وزن اور کسی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

صاحب درۃ التنزیل نے یہاں قرآن کی تعبیری بوقلمونی پر نکتہ آفرینی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس جگہ لعب و لہو اور سورہ عنکبوت میں لہو و لعب کیوں لایا گیا ہے۔ انشاء اللہ ہم اس موضوع پر سورہ عنکبوت میں بحث کریں گے کیونکہ یہاں لعب و لہو کی تعبیر طبعی اور واقعی ہے اس لیے یہ جگہ اس نکتہ آفرینی کے لیے موزوں نہیں ہے چونکہ لہو و لعب کی تعبیر غیر طبعی ہے اس لیے اس میں نکتہ بلاغت کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی لعب اور لہو ہے اگر اس کے مقابلے میں آخرت نہ ہو۔ یہ پوری دُنیا ایک بے مقصد ڈرامہ بن کر رہ جاتا ہے یعنی اگر نتائج و ثمرات عمل کے لیے کوئی دوسری زندگی نہ ہو تو جو کچھ ہے لہو و لعب سے زیادہ نہیں ہے۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ دُنیا کی زندگی ایسی سریع و فانی ہے جیسے چار گھڑی کا کھیل ہو اور بس اسی لیے فرمایا کہ وللدار الآخرۃ خیر للذین یتقون۔ یعنی جو لوگ متقی ہیں ان کے لیے آخرت ہی کا گھر بہتر ہے۔ اس فقرے کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں ایک یہ پچھلا گھرانہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو متقی ہیں، دوسرے یہ کہ متقی لوگوں کے لیے پچھلا گھرانہ ہی بہتر ہے۔ پہلے ترجمہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مغفرت پر کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم کام تو وہ کرو جو سزا دینے کے لائق ہوں مگر تمہیں آخرت میں جگہ مل جائے اچھی۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل موجود ہے تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری اس زندگی کے بعد کوئی ایسی زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا اور سزا ملے۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ
الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن
قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ
لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِي الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾
وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا
فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٥﴾ إِنَّمَا
يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٣٦﴾

وقف غفران
وقف منزل

ہم کو معلوم ہے کہ ان کافروں کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں
مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم خدائی آیتوں کا
انکار کرتے ہیں[۳۹]۔ اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے
رہے تو وہ تکذیب اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے یہاں تک

کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی اور خدا کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں اور تم کو پیغمبروں کے احوال کی خبریں پہنچ چکی ہیں۔[۳۴] اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں سرنگ ڈھونڈھ نکال لو یا آسمان میں سیڑھی تلاش کر لو، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لے آؤ، اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا لہٰذا تم نادانوں میں نہ ہو۔[۳۵] بات یہ ہے کہ حق کو قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے بھی ہیں اور مُردوں کو تو خدا ہی اٹھائے گا پھر اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔[۳۶]

معاندوں کی حق فراموشیوں پر دل گرفتگی

چونکہ معاندین کو حق و باطل کے تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور یقین کی سعادت سے وہ محروم ہوتے ہیں اس لیے بڑی سے بڑی دعوت و تبلیغ اور اونچی سے اونچی نشانی بھی ان کو شک و شبہ کے گرداب سے ان کو باہر نہیں نکال سکتی۔ وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں کبھی اس کو سحر وجادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں، کبھی فریب اور قوتِ شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نہیں ہوتی۔ حجت کے لیے ایک بار ان کو معجزہ دکھایا جاتا ہے تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوتا۔ پھر معجزہ طلب کرتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس صورتِ حال سے دل گرفتہ ہوتے ہیں اور

آپ کو فرطِ شفقت سے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ رؤسائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ ہونے پائیں۔ اللہ سبحانہٗ یہاں حضور انور سے مخاطب ہوتا ہے کہ معاندوں کی حق فراموشیوں سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ آپ داعیِ حق ہیں اور آپ کو اہلِ ایمان کی مستعدی اور منکروں کی محرومی دونوں دیکھنی پڑیں گی اور آپ کو دونوں باتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ جوشِ دعوت میں چاہتے ہیں کہ یکبارگی سب راہِ حق پر آجائیں لیکن آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی مشیت کا فیصلہ یہی ہے کہ اپنی اپنی حالت، اپنی اپنی استعداد، اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ ہو۔ لہٰذا لوگوں کے انکار و جحود پر ملول نہ ہو اپنے کام میں لگے رہو۔ ان کو فی الواقع آپ سے انکار نہیں ہے بلکہ آپ کی نبوّت سے اس لیے انکار ہے کہ ان کو اولاً خدا پر یقین نہیں ہے۔ یہ ظاہر نبوّت کی نشانیوں کو طلب کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو خدا کی نشانیاں بھی تسلیم نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کی قسمت میں ایمان کی سعادت نہیں۔ ان کے لیے معجزے بھی بیکار ہیں۔ یہ سعادت ان ہی کو ملتی ہے جو حق کے طالب ہیں اور حق کو سنتے ہیں۔ دراصل مخاطبین کے لیے ایمان کی آرزو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی شدید تھی کہ آپ ان میں سے کسی کو بھی ایمان سے محروم دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ فرمایا کہ آپ کا یہ جذبہ خواہ لوگوں کے حق میں شفقت و ہمدردی کی خاطر ہے اس لیے ان کا ایمان نہ لانا آپ پر شاق ہو رہا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ لوگ معجزوں کے بل پر نہیں بلکہ اپنے کان، آنکھ، عقل اور ادراک کو استعمال کریں۔ آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، آپ کی باتیں سنیں، سوچیں اور سمجھیں اور اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان قبول کریں۔ اگر جبر اور زور سے لوگوں کو ایمان کی راہ پر لانا منظور ہوتا تو ہمارے لیے یہ کام مشکل نہ تھا۔ ہم چشم زدن میں سب کو ایمان کی راہ پر چلا دیتے۔

آپ کی صدائے حق کا جواب تو صرف وہ دیں گے جو زندہ ہیں اور جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں ان کو پکارنا بیکار ہے۔ کوئی دعوت، کوئی دلیل، کوئی نشانی، کوئی اعجاز مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ آپ آسمان پر چڑھ جائیں یا زمین میں چلے جائیں یہ لوگ کبھی سچائی قبول نہیں کریں گے۔ یعنی یہاں قوتِ فاعلی میں کوئی کمی نہیں ہے جو کچھ کمی ہے وہ قوتِ قابلی میں ہے۔

۳۹۔ ہم کو معلوم ہے کہ ان کافروں کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ خلائق کے حال پر شفقت و ہمدردی سارے جہان سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالی گئی تھی۔ آپ ان بدبختوں کی تکذیب و اعراض مستقبل کی تباہی اور منتریانہ و ملحدانہ کلمات سے سخت رنج اور صدمہ محسوس فرماتے ہیں۔ ان آیات میں آپ کو تسلی اور ان اشقیاء کو دھمکی دی گئی ہے کہ آپ ان کے اعراض و تکذیب سے اس قدر دلگیر اور بے چین نہ ہوں

یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں فی الحقیقت آپ کو نہیں جھٹلاتے۔ کیونکہ آپ کو تو پہلے سے بالاتفاق صادق و امین سمجھتے تھے بلکہ خدا کی آیات کا جو پیغمبر علیہ السلام کی تصدیق و تائید کے لیے بھیجی گئی ہیں، جان بوجھ کر از راہ ظلم و عناد انکار کر رہے ہیں تو آپ بھی ان ظالموں کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیے وہ خود ان کے ظلم اور آپ کے صبر کا پھل دینے والا ہے۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق کہتے تھے اور آپ کی راستبازی پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ انہوں نے آپ کو اس وقت جھٹلایا جبکہ آپ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دوسرے دور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ دنیا کے کسی معاملہ میں جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انہوں نے جتنی آپ کی تکذیب کی وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا۔ حضرت علی کی روایت ہے کہ ایک بار اس نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے کہا انا لا نکذبك ولكن نكذب ما جئت به۔ ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اسے جھوٹ قرار دیتے ہیں۔ جنگ بدر کے موقعہ پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے دریافت کیا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا نہیں ہے۔ سچ بتاؤ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سچا سمجھتے ہو، یا جھوٹا۔ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک سچا آدمی ہے۔ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مگر جب لوا اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قصی ہی کے حصے میں آجائے گی تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟ اس بنا پر یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے اور جب ہم تحمل و بردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں۔ اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو۔[2]

علامہ ابوالسعود نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ فقرہ کہ یہ لوگ آپ کی نہیں بلکہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت قدر، رفعت شان اور بارگاہ الٰہی میں ایسے قرب منزلت کی غمازی کر رہا ہے جس کا عقل انسانی ادراک بھی نہیں کر سکتی۔ قرآن میں جیسے رسول کی اطاعت کو اللہ کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

طاعت، رسول کی بیعت کو اللہ کی بیعت بتایا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ۔ اسی طرح یہاں اللہ سبحانہٗ نے رسول کی تکذیب کو اللہ کی تکذیب قرار دیا ہے۔ اس سے ایک طرف اگر نبوت کی عظمتِ شان معلوم ہورہی ہے تو دوسری طرف منکرین اور مکذبین کے مجرمانہ کردار کی شناعت کی بڑائی کا بھی پتہ لگ رہا ہے۔ اور پھر آخر میں آیات اللہ کی انکار کے لیے جحود کی تعبیر اختیار کی ہے۔ جحود ایسے انکار کو کہتے ہیں کہ دل تو قائل ہوجاتے مگر زبان ہٹ دھرمی سے انکار کیے جاتے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والوں میں بیشتر لوگ ایسے تھے۔ امام رازی نے اسی لیے حضور انور کو جھوٹا قرار نہ دینے کی جحود کے معنے کی رعایت سے چار صورتیں بتائی ہیں۔ اولاً یہ کہ یہ لوگ آپ کو جلوت میں جھٹلاتے ہیں اور قرآن ونبوت کا انکار کرتے ہیں لیکن خلوت میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ آپ کو کذاب نہیں کہتے بلکہ آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ ثالثاً یہ کہ معجزات کے ظہور کے باوجود لوگوں کا آپ کی تکذیب پر اصرار اللہ کی آیات کی تکذیب ہے۔ رابعاً یہ کہ وہ خصوصی طور پر حضور انور کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ معجزات کو آپ کی صداقت کی دلیل نہیں مانتے اور ہر معجزہ کو سحر کہہ دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ آزمائش

۴۰۔ اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے رہے انہوں نے تکذیب اور ایذارسانی پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی اور خدا کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ اور تم کو پیغمبروں کی باتیں پہنچ چکی ہیں۔ یعنی انبیائے سابقین کے ساتھ بھی جن کے کچھ حالات آپ کو سنائے جاچکے ہیں ان کی قوموں نے تکذیب وایذارسانی کا برتاؤ کیا جس پر خدا کے معصوم پیغمبر نہایت اولوالعزمی سے صبر کرتے رہے حتیٰ کہ حسبِ وعدہ خدا کی مدد پہنچی اور بڑے زبردست متکبرین کے مقابلہ میں ان کو مظفر ومنصور کیا گیا۔ آپ سے جو نصر وظفر کے وعدے کیے گئے ہیں ایک ایک کرکے پورے ہوں گے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر خدا کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ کسی کی طاقت ہے جو خدا کی باتوں کو بدل ڈالے یعنی جو اس نے کہا ہے اُسے واقع نہ ہونے دے۔ مکذبین کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی جنگ حقیقتہً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں بلکہ ربِ محمد سے ہے جس نے ان کو اپنا سفیر اعظم اور معتمد بنا کر کھلے نشانات دے کر روانہ کیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ان خدائی نشانات کی تکذیب ہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کا دلنواز انداز ہے وہ یہ کہ انبیاءؑ کی تاریخ گواہ ہے کہ براہِ راست مدد سے ہمکنار ہونے کے لیے ابتلاء و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس دوران میں ان انبیاءؑ کی قوموں کی طرف سے انبیاء کی برابر تکذیب ہوتی رہی ہے ان کو ہر قسم کی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی تکذیب ہوتی ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ پیشروؤں کو پیش کر کے تسلی دینا تسکین و تسلی کا دلنواز انداز ہے یعنی آپ کو انبیاءؑ کی اقتدا کرنی چاہیے۔ انبیاءؑ سے نصرتِ الٰہی کی تحقیق آپ کو بذریعہ وحی ہو چکی ہے۔ اس لیے آپ بھی صبر کیجئے۔ نصرتِ الٰہی کا آپ تک پہنچنا یقینی ہے۔ اللہ کا قانون یہی ہے۔ اور اللہ کے قانون کو بدل دینے کی کسی میں طاقت نہیں۔ اصل ارشاد میں لا مبدل لکلمات اللہ کے الفاظ ہیں۔ یعنی اللہ نے حق و باطل کی کش مکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا اپنی راستبازی کا، اپنے ایثار اور اپنی فداکاری کا، اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں۔ اور ابتداءً خالص اخلاق فاضلہ و سیرت صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نصرت ٹھیک اس وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی۔

صبر کی جو بات یہاں قرآن نے انبیاءؑ کی مدح میں بتائی ہے ٹھیک یہی بات قرآن نے اہل ایمان کے لیے بطور ہدایت ارشاد فرمائی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ادعائے ایمان کی صداقت اگر معلوم کی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقہ سے اور وہ ہے اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کا جائزہ۔ کسی چھپی ہوئی اور ان دیکھی حقیقت کا وجود آدمی اسی وقت تسلیم کرتا ہے جب اس کے لوازم کا مشاہدہ کرے۔ یہی لوازم اور مقتضیات وہ معیار ہیں جن پر کسی شے کے واقعی وجود کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے اور پھر اس کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ بس کوئی وجہ نہیں کہ حیاتِ انسانی کی سب سے اہم حقیقت یعنی ایمان کو محض اس ہوائی تموج کی بنا پر تسلیم کر لیا جاتا جو امنت باللہ کے الفاظ کہنے سے فضا میں پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو اپنی وفادارانہ بندگی کی سند عطا فرما دیتا جس نے اپنی زبان سے اس کا دعویٰ کر دیا ہو۔ اس نے تو انسان کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ اس کے احساس فرض بندگی کو آزمایا جائے۔

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جائے

مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ اپنی نظیر ہو، اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر ایمان اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اس کی اقامت کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی مشن لے کر اٹھیں، راستہ میں رکاوٹیں کہیں کہیں پیش آئیں گی۔ لیکن نبوت کا مشن تو ایسا ہے جس کی راہ میں دور دور تک پہاڑی چٹانوں، گہرے غاروں اور سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کسی اور شے کا نام لیجیے۔ اگر ایک طرف سے مخالفت کی ہمت شکن صدا بلند ہو گی تو تین طرف سے حوصلہ افزائی ہو گی مگر نبوت کے کام کا نام لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ ہر طرف سے جگر شگاف نعرے بلند ہوتے ہیں، بات صرف اتنی نہیں ہے کہ عام دستور کے مطابق جس طرح اور مقاصد کا حصول کم و بیش کچھ قربانیوں پر موقوف ہے اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہاں عام دستور سے بڑھ کر مشکلیں برداشت کرنی ہوتی ہیں اور محض ان ہی مصائب اور موانع سے سابقہ نہیں ہوتا جو اسباب عام کے تحت پیش آجائیں بلکہ بالقصد اللہ تعالیٰ ایسے حالات سے دوچار کراتا ہے جو ناگوار خاطر ہوں۔ ایسے موانع پیدا کرتا رہتا ہے جن میں جان و مال کا زیاں ہو اور ایسی باتوں کو کانوں میں پہنچنے کا اہتمام کرتا ہے جو جذبات نفس پر شاق ہوں۔ اسی لیے قرآن نے اہل ایمان کو خاص طور پر نماز کے ساتھ صبر کی تلقین کی ہے اور صبر کرنے والوں کو اپنی معیت کی بشارت دی ہے۔

یا ایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین۔

نصرت الٰہی کے ظہور کا قانون

۴۱۔ اور اگر ان کی روگردانی آپ پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہے تو زمین میں سرنگ نکال لو یا آسمان میں سیڑھی تلاش کر لو، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لے آؤ، اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا، لہٰذا تم نادانوں میں سے نہ ہو۔ کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ نبی ہیں تو ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا نشان رہنا چاہیے جسے ہر کوئی دیکھ کر یقین کرے اور ایمان لانے پر مجبور ہو جایا کرے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام دنیا کی ہدایت پر حریص تھے۔ شاید آپ کے دل نے چاہا ہو گا کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جاتے اس لیے حق تعالیٰ نے یہ تلقین فرمائی کہ آپ تکوینیات میں مشیت الٰہی کے تابع رہیں۔ تکوینی مصالح ہرگز اس کو مقتضی نہیں ہیں کہ ساری دنیا کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جاتے ورنہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت تھی کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے توسط کے بغیر اور نشانوں اور معجزات کے

بغیر سب کو شروع ہی سے سیدھی راہ پر جمع کر دیتا مگر جب خدا تعالیٰ کی حکمت ایسے مجبور کن معجزات اور فرمائشی نشانات دکھلانے کو مقتضی نہیں تو مشیت الٰہی کے خلاف کسی کو یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ زمین یا آسمان سے سرنگ یا سیڑھی لگا کر اب فرمائشی اور مجبور کن معجزہ نکال کر دکھا دے۔ خدا تعالیٰ کے قوانین، حکمت و تدبیر کے خلاف کسی چیز کے وقوع کی امید رکھنا نادانوں کا کام ہے [1]

واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدت گزر گئی اور لوگ کسی طرح راستی پر نہ آئے تو آپ کے قلب مبارک میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش خدا کی طرف سے کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے ان لوگوں کا کفر ڈھیلا پڑے اور یہ میری دعوت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ آپ کی اسی خواہش کے اس آیت میں دو جواب دیے گئے ہیں۔ پہلا جواب ان استطعت سے شروع ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ دامانِ صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ جس انداز اور جس طریق سے اب یہ کام ہو رہا ہے اسی پر صبر سے جمے رہو۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا خود ہم نہ لے سکتے تھے مگر ہم جانتے ہیں کہ جس اصلاحی انقلاب اور جس تعمیری کام پر آپ مامور کیے گئے ہیں اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں، تاہم اگر لوگوں کی موجودہ روش اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے تو ہم تو ان کی فرمائشیں بوجہ عدم ضرورت پوری نہیں کریں گے۔ آپ کے بس میں ہو تو پوری کر دیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ میں ان کافروں کے حال پر شفقت اور ان کے اسلام لے آنے کی حرص اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ آپ کے اختیار میں ہو تو آپ ہر فرمائشی معجزہ دکھانے کو تیار ہیں کہ کسی طرح یہ مسلمان ہو جائیں۔ آپ اگر ایسا کر سکتے ہیں تو کر لیں اور کوئی معجزہ لے آئیں لیکن ہم سے امید نہ رکھیں کہ ہم یہ خواہش پوری کریں گے۔ آسمان پر چڑھ جانے اور زمین میں گھس جانے کا ذکر شاید اس لیے کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطبوں نے آسمان پر چڑھ جانے اور زمین سے چشمہ نکالنے کا مطالبہ کیا تھا جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

قالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا

اور — او ترقی فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا

ان ہی دونوں مطالبوں کی رعایت سے ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فرمایا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دوسرا جواب ولو شاء اللہ سے شروع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طرح ایمان والے ہو جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں روانہ کرنے اور نبیوں سے کفار کے مقابلہ میں جدوجہد کرانے اور دعوت حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی نہ تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک تخلیقی اشارے سے انجام پا سکتا تھا لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرنا نہیں چاہتا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکر صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھالیں اور باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعہ سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین اپنے بہتر اصول زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جدوجہد کر کے فطری ارتقا کی راہ سے اقامت دین حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا۔ اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائے گا وہ مدد بھی اسے دیا جائے گا لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے افکار فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکر صالح پھیلا دے اور تمدن فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیت صالحہ تعمیر کر دے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار اخلاقی وجود کی حیثیت سے پیدا کیا ہے اسے تصرف کے اختیارات دیے ہیں۔ طاعت و معصیت کی آزادی بخشی ہے۔ امتحان کی مہلت عطا کی ہے اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلہ کا وقت مقرر کیا ہے۔

قبول حق کا ضابطہ

۴۲۔ بات یہ ہے کہ حق کو قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے بھی ہیں اور مُردوں کو خدا ہی اٹھائے گا پھر اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ یعنی سب سے توقع نہ رکھو کہ مانیں گے جن کے دل کے کان بہرے ہیں وہ سنتے ہی نہیں پھر وہ مانیں کس طرح۔ ہاں یہ کافر جو قلبی و روحانی حیثیت سے مُردوں کی طرح ہیں قیامت میں دیکھ کر یقین کریں گے اور ان چیزوں کو مانیں گے جن کا انکار کرتے تھے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت میں استجابت کے معنے قبول کر لینے کے ہیں اور سماع کے معنے بات کو سمجھنے اور غور کرنے کے ہیں۔ اور موتیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جو عقل و فہم سے بیگانہ اور سماع آیات سے کسی طرح کا فائدہ نہ اٹھائیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی دعوتِ ایمان کو وہ زندے قبول کریں گے جو اس دعوت کو سمجھیں گے لیکن وہ مُردے جو فہم و تدبر سے محروم ہیں وہ ہدایت قبول نہ کریں گے۔

اس آیت نے بتادیا کہ ہدایت کن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو لوگ حق کو سننا، سمجھنا گوارا نہیں کرتے ان کو معجزات سے بھی ہدایت نہیں ہوتی ہے اس کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ طلب موجود ہو معاندین چونکہ عموماً دولت مند اور رؤسا اور مدعیان عقل ہوتے ہیں اس لیے ان کا جذبہ انانیت اور ترفع ان کو داعیانِ حق کے علم کے پیچھے کھڑے ہونے سے باز رکھتا ہے اس لیے نبوت سے ہدایت پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس جذبہ سے پاک ہوں۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ
أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٧﴾ وَمَا مِن
دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ
أَمْثَالُكُم ۚ مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ﴿٣٨﴾
وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ ۗ مَن يَشَإِ اللَّهُ
يُضْلِلْهُ ۚ وَمَن يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٣٩﴾ قُلْ
أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ
اللَّهِ تَدْعُونَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٠﴾ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ
ع ۱۱ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِن شَاءَ وَتَنسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ﴿٤١﴾

اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی
کیوں نہیں اتاری گئی، کہہ دو کہ خدا نشانی اتارنے پر قادر ہے لیکن
اکثر لوگ نہیں جانتے[٤٣]۔ اور زمین پر جو چلنے پھرنے والا جانور یا

دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح اُمتیں
ہیں، ہم نے نہیں چھوڑی ہے لکھنے میں کوئی چیز، پھر سب اپنے
پروردگار کی طرف سمیٹے جائیں گے۔ [۴۴] اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری
آیات کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں ہیں، جس
کو خدا چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھے راستہ پر ڈال دے۔ [۴۵]
کہہ دو لوگو دیکھو اگر آجاوے تم پر اللہ کا عذاب یا آجاوے تم پر قیامت
کیا تم ایسی حالت میں خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر سچے ہو
تو بتاؤ۔ نہیں بلکہ تم اسی کو مصیبت کے وقت پکارتے ہو تو
جس دُکھ کے لیے پکارتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اس کو دُور کر دیتا
ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو اس وقت انہیں بھول جاتے ہو۔ [۴۶]

معجزات کی فرمائش اور قرآن کا جواب

یہ امر واقعہ ہے کہ قرآن کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں ہے وہ ہمیشہ لوگوں کو اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں۔ قرآن دُنیا میں اللہ کے دین کی تکمیل اور گزشتہ

مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لیے آیا ہے۔ ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دیے تھے۔ جن انبیاء اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر ہوئے ان میں الوہیت اور خدائی عنصر تسلیم کیا گیا۔ اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصلی حقیقت جس پر اللہ کے دین کی بنیاد ہے متزلزل ہو گئی۔ اس لیے قرآن نے نہایت وضاحت اور نہایت صفائی کے ساتھ اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید و نبوت کی اصل حقیقت قائم کر دی۔ اس سے پہلی آیت میں سن آئے ہو کہ جب مشرکین نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائشی اور من مانے معجزات صادر کرنے کا مطالبہ کیا تو چونکہ آپ کے دل میں شفقت اور رحمت کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی اس لیے آپ نے بارہا اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ان معجزات کو میرے ہاتھ پر صادر کر دے تو اس سے کیا بعید ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی صداقت پر اور بے شمار معجزات ظاہر کر دیے تھے کسی ایک کی مصلحتیں اور حکمتیں اس کی متقاضی تھیں کہ مشرکین کے ایسے فرمائشی معجزات پورے نہ کیے جائیں اور بتا دیا کہ پیغمبر اس معاملہ میں مختار نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ سبحانہٗ کی طرف سے بطور وعظ اور محبت یہ تنبیہہ نہ آتی اور آپ از خود ہی کفار کا یہ مطالبہ پورا کر دیتے۔ اب یہاں اس آیت میں نبوت کے بارے میں اس غلط تصور کی تردید کی جا رہی ہے کہ نبی براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہے۔ یہاں قرآن نے نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نشانیاں مانگنے والوں کو آفاقی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔

۳۷۔ اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی کہہ دو کہ خدا نشانی اتارنے پر قادر ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری جن کی وہ فرمائش کرتے تھے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ان کے اس قسم کے مطالبات کا ذکر ہے۔

وقالوا لن نومن لك حتى تفجر لنا من الارض ينبوعا ، او تكون لك جنة من نخيل وعنب فتفجر الانهار خلالها تفجيرا او تسقط السماء كما زعمت علينا كسفا او تاتي بالله والملائكة قبيلا او يكون لك بيت من زخرف او ترقى في السماء ولن نومن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا نقراه قل سبحان

رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ○

اور انہوں نے کہا، ہم اس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں جب تک کہ تو اس طرح کی باتیں کر کے نہ دکھائے مثلاً ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے۔ یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے یا جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر گر پڑیں یا اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیا ہو یا ایسا ہو کہ تو آسمان پر چڑھ جاتے اور اگر تو آسمان پر چلا بھی گیا تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں جب تک تو ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر اتار نہ لائے اور ہم خود اسے پڑھ کر جانچ نہ لیں۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دے سبحان اللہ میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک آدمی ہوں خدا کا پیغام لے کر آنے والا اور بس۔

ورنہ ویسے تو آپ پر بے شمار علمی و عملی معجزات و نشانات بارش کی طرح اترتے رہتے تھے۔ ان کے اسی مطالبہ اور فرمائش کے جواب میں فرمایا کہ خدا فرمائشی معجزات دکھلانے سے عاجز نہیں ہے لیکن جن قوانین حکمت و رحمت پر نظام تکوین کی بنیاد ہے تم میں سے اکثر ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں ان قوانین کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فرمائشی معجزات نہ دکھلائے جائیں۔[1]

"نشانی" سے مراد محسوس معجزہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دکھانے سے عاجز ہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے نہیں سمجھتے۔[2] یہ بات کہ اللہ قادر تو ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یہ بظاہر نہایت مجمل جواب ہے لیکن اس اجمال میں معانی کا سمندر پوشیدہ ہے۔ لا یعلمون کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی ظاہر ہونے کے نتائج سے بے خبر ہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشا ہے۔ حالانکہ اگر یہ نشانی ظاہر ہو گئی تو سب کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اور پھر یہ بھی اسی سے پتہ لگ رہا ہے کہ معجزہ کی فرمائش کرنے والے یہ لوگ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیاء اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے بلکہ وہ ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

حجت پوری کردی جائے، جب یہ حجت پوری ہوجاتی ہے تب خدا ان کی پکڑ کرتا ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت کے مخاطب یہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا بے بس ہے حالانکہ اللہ سبحانہ، سرکشوں کو جو ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے وہ رسی خواہ کیسی دراز کردے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی اس کے قابو سے باہر ہوجائے۔ آیت میں نشانی سے تو کوئی نشانی بھی مراد ہوسکتی ہے لیکن قرینہ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ کوئی ایسی نشانی مانگ رہے ہیں جو یہ ثابت کردے کہ اگر انہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آجائے گا۔ ان کو معجزہ عذاب دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جب تک افراد صالحہ الگ نہ ہوجائیں عذاب نہیں آتا۔

نظامِ تکوینی اور قانونِ حیات

۴۴۔ اور زمین پر جو چلنے پھرنے والا جانور یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح اُمتیں ہیں۔ ہم نے نہیں چھوڑی ہے لکھنے میں کوئی چیز، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف سمیٹے جائیں گے۔ ان آیات میں بعض حکمتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جو فرمائشی معجزات دکھلاتے نہ جانے میں ملحوظ ہیں یعنی تمام حیوانات خواہ زمین پر رینگتے ہوں یا ہوا میں اڑتے ہوں وہ بھی انسانوں کی طرح ایک اُمت ہیں۔ ان میں سے ہر نوع کو حق تعالیٰ نے ایک خاص وضع اور فطرت پر پیدا کیا جو ان کے معین خواص وافعال کے دائرے کام کرتی ہیں۔ کوئی جانور اپنے افعال وحرکات کے محدود حلقہ سے جو قدرت نے باعتبار فطرت واستعداد کے اس کے لیے مقرر کردیا ہے۔ ایک قدم باہر نہیں نکال سکتا۔ چنانچہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی حیوان نے اپنی نوع کے محدود دائرہ عمل میں کسی طرح کی ترقی نہیں کی۔ اسی طرح ہر چیز کی فطرت واستعداد کو خیال کر لیجئے۔ حق تعالیٰ کے علم قدیم اور لوح محفوظ میں تمام انواع واجناس کی تدبیر وتربیت کے اصول وفروع منضبط ہیں۔ کوئی چیز نہ اس زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد اس مکمل انضباط وانصرام سے باہر جاسکتی ہے۔ انسان جنس حیوان میں "باختیار اور ترقی کن" حیوان ہے۔ اسی کسب واختیار اور ترقی کن عقل وتمیز کی موجودگی نے اس کے نظامِ تکوینی اور قانونِ حیات کو دوسرے تمام حیوانات سے ایسا اعلیٰ اور ممتاز بنادیا ہے کہ اب اسے حیوان کہتے بھی شرم آتی ہے وہ برخلاف باقی حیوانات کے دیکھنے سننے اور پوچھنے سے نئی نئی معلومات حاصل کرتا ہے اور قوتِ فکریہ سے ان کو ترتیب دے کر حیاتِ جدید کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے۔ وہ نیک وبد میں تمیز کرنے، نافع وضار کے پہچاننے، آغاز وانجام سمجھنے پر قادر اور کسی عمل کے کرنے یا چھوڑنے میں فی الجملہ آزاد ہے۔ اسی لیے اس کو خدا کی جانب سے ایسے نشانات دکھلائے جاتے ہیں جن میں غور وفکر کرنے

کا موقع مل سکے اور فکر وکسب کی فطری آزادی کو سلب کرنے والے نہ ہوں۔ اور اگر وہ خدا کے دیے ہوئے قوائے عقلیہ سے ٹھیک ٹھیک طور پر ان میں غور کرے تو اسے حق و باطل اور نیک و بد کی تمیز کرنے میں کچھ دقت نہ ہو۔ بس ایسے فرمائشی معجزات و نشانات کی درخواست کرنا جو بہمہ وجوہ ایمان لانے پر مجبور کر دیں انسان کی فطری آزادی اور اس کے نظامِ ترکیبی کو تباہ کرنے بلکہ انسان کو عام حیوانات کی صف میں اتار لانے کا مترادف ہے۔ اور اگر فرمائشی نشان بہمہ وجوہ مجبور کن نہ ہوں تو ان کا دکھلانا بیکار ہے کیونکہ ان میں بھی وہی غیر ناشی عن دلیل شکوک و شبہات پیدا کر لیے جائیں گے جو ہزاروں غیر فرمائشی نشانات میں کیے جا چکے ہیں[1]۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ اگر تم نشانی کے خواہاں ہو تو یہ خدا کی پوری کائنات نشانیوں سے بھری ہوئی ہے زمین پر چلنے والا ہر حیوان اور فضائے آسمانی میں اڑنے والا پرندہ خدا کی نشانی ہے۔ غور کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ جیسے تمہارے انفرادی اور اجتماعی وجود کے اندر خدا کی قدرت و حکمت کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں اسی طرح اس کائنات کی دوسری مخلوقات میں بھی اللہ کی وحدانیت قدرت اور حکمت کے دلائل موجود ہیں۔ جس طرح تم ایک نوع ہو اسی طرح یہ بھی الگ الگ انواع رکھتے ہیں۔ جس طرح تم ایک فطرت رکھتے ہو اسی طرح یہ بھی اپنی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں۔ جس طرح تم شعور ادراک اور جذبات رکھتے ہو اسی طرح اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے یہ بھی اپنے اندر شعور ادراک اور جذبات رکھتے ہیں۔ اگر تم نشانیوں کی تلاش میں ہو تو بتلاؤ تمام کائنات خلقت میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا ہے۔ تمام فضائے ہستی جن حیرت انگیز اچنبھوں سے بھری ہوئی ہے ان کے لیے تمہاری بولی میں کون سا نام ہے۔ یہ سب کچھ اس کی ہستی و صفات کی نشانیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ زمین کے تمام جانوروں کو دیکھو جو تمہارے قدموں کے پاس ہیں ہوا کے پرندوں کو دیکھو جو تمہارے چاروں طرف اڑ رہے ہیں کس طرح ہم نے تمہاری ہی طرح ان کی امتیں بھی بنا دی ہیں۔ ہر امت اپنی پیدائش اور معیشت اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے ایک قانونِ حیات رکھتی ہے۔ جو لوگ علم و بصیرت رکھنے والے ہیں انہیں صحیفہ فطرت کی نشانیوں کے بعد اور کسی نشانی کی احتیاج نہیں ہو سکتی۔

اس آیت پر سرسری نگاہ ڈال کر آگے نہ بڑھو بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو اور دیکھو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے وہ بتا رہا ہے کہ لوگو! اگر تمہیں محض نمائش بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبی جس چیز کی دعوت دے رہا ہے وہ امر حق ہے یا نہیں تو آنکھیں کھول کر دیکھو۔ تمہارے گرد و پیش میں ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں ۔ زمین کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اس کی ساخت ٹھیک ٹھیک اس کے مناسب بنائی گئی ہے۔ کس نے اس کی جبلت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی ہیں کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حدود سے وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی اس مقام پر جہاں وہ ہے خبر گیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جا رہی ہے ۔ کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جا رہا ہے۔ کس طرح اسے ایک ضابطہ کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدائش تناسل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے ۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رویہ کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے ۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائب قدرت کے کرشمے دکھا کر تمہارا دل بہلایا جاتا رہے [1]

ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ ہمارے شارحین قرآن نے اسی آیت کی روشنی میں کچھ علمی مسائل بھی حل کیے ہیں۔ مثلاً انسانوں اور دوسرے جانداروں کے بارے میں قرآن نے امثالکم کہہ کر جس مماثلت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کون سی ہے ۔ اور کیا انسانوں کی طرح دوسرے جانداروں کا بھی حشر ہوگا ۔ اور یہ ما فرطنا فی الکتاب میں کتاب سے کیا مراد ہے۔ لوح محفوظ یا قرآن حکیم اور یا ان دونوں کے سوا کچھ اور؟

مماثلت کے موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن قرآن کے اولین شارحین نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مماثلت کا

[1] تفہیم القرآن

مطلب یہ ہے کہ خدا شناسی، توحید اور تسبیح میں انسان اور حیوان ایک جیسی امتیں ہیں۔ اس سے کچھ صوفیا نے یہ نکتہ آفرینی بھی فرمائی ہے کہ سارے جاندار عاقل ہوتے ہیں اور ان پر ذمہ داری کا بوجھ بھی ہے یعنی مکلف بھی ہیں اور ان میں انبیا بھی ہوتے ہیں لیکن محققین کو ان سے اتفاق نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں تخلیق میں مماثلت مراد ہے اور امام مجاہد فرماتے ہیں کہ مماثلت سے ان کی اقسام و انواع مراد ہیں۔ ان انواع و اقسام میں ہر نوع کے اندر اپنے اجتماعی وجود کے بقاء و تحفظ کا سامان موجود ہے اور اپنے نوعی مقصد تخلیق کی تکمیل میں ان کا ہر فرد اپنا حصہ ادا کر رہا ہے۔ ذرا بغور مطالعہ کیجئے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ ان کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے۔ مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے۔ جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے۔ ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی ان تھک سرگرمی ہے۔ رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیا فنی کمال ہے۔ تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصول مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کیسی جان بازی و قربانی ہے۔

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہیں ہے تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ یہ ایک ہی خدائے وحدہ لاشریک کی قدرت و حکمت کی جلوہ گاہ ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ ہماری عقل پکار کر کہہ رہی ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے پھر اسے ماننے اور باور کرنے کے لیے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے۔

بہر حال قرآن نے مماثلت کے اعلان کے ساتھ وجہ مماثلت کو بیان نہیں کیا اور اسی لیے بیان نہیں کیا تاکہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت، اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کا پتہ لے۔

مافرطنا فی الکتاب من شیئ میں الکتاب سے عام شارحین قرآن نے کتاب سے وہ خدائی رجسٹر مراد لیا ہے جس میں سب کچھ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں یہاں الکتاب سے مراد قرآن مجید معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو ہے جو نبوت کی دعوت کی حقانیت کی گواہ ہیں۔ اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی دلائل و براہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ایک ایک دعویٰ کو ناقابل انکار دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور اگر الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہو جیسا کہ عام شارحین قرآن کی رائے ہے تو پھر امام ابن جریر کی تشریح بہت زیادہ دل کو بھاتی ہے۔

اللہ سبحانہ نے اپنے نبی سے فرمایا ہے کہ لوگوں سے کہہ دو کہ تم اللہ کو اپنے کردار سے بے خبر نہ سمجھو اور یہ خیال نہ کرو کہ وہ تمہیں تمہارے اعمال کی سزا نہ دے گا۔ وہ تمہارے اعمال سے بے خبر یا ان کو بغیر جزا کے کیسے چھوڑ سکتا ہے وہ تو روئے زمین پر چلنے والے کسی بھی جاندار کے کام سے بے خبر نہیں ہے اور نہ کسی فضا میں اڑنے والے پرندے سے غافل ہے اس نے ان سب کی اجناس اور اصناف بنائی ہیں۔ جن کے ذریعے ان کو پہچانا جاتا ہے جیسا کہ تمہیں پہچانا جاتا ہے اور اپنے اپنے دائرہ کار میں وہ بھی ایسے تصرفات کرتے ہیں جیسے تم تصرف کرتے ہو۔ ان کے سارے اعمال ام الکتاب میں محفوظ ہیں لہٰذا جو بہائم اور دواب اور پرندوں کے اعمال سے ان کی حرکات اور سکنات سے بے خبر نہیں ہے اور سب کچھ اس کے رجسٹر میں محفوظ ہے وہ تمہارے اعمال سے کیوں کر بے خبر رہ سکتا ہے اور تمہیں تمہارے اعمال کی کیوں کر جزا نہ دے گا اچھے عمل کی اچھی جزا اور برے عمل کی بری جزا دے گا۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے تناسخ پر استدلال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے حیوانات کو امم امثالکم کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مماثلت بالفعل تو موجود نہیں بالقوۃ ضرور ہوگی۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ کچھ انسانی نفوس کا حیوانات میں حلول ہو۔ یہی تناسخ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کا استنباط کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور بقول علامہ روح المعانی علامہ آلوسی اس کی حیثیت مذہب فاسد کے لیے دلیل کاسد سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بلاشبہ قرآن نے امم امثالکم کی تعبیر اختیار کی ہے لیکن صرف اتنی بات سے تناسخ ثابت نہیں ہوتا۔ فلسفیانہ تناسخ کی بنیاد بالقوہ مماثلت پر نہیں ہے بلکہ زندگی کے بار بار اعادہ وگردش پر ہے اور مذہبی تناسخ کی بنیاد یہ ہے کہ جزائے عمل کا سارا معاملہ اسی اعادہ وگردش سے مرتب ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں ان دونوں عقیدوں کے لیے کوئی تصریح نہیں ہے۔

ہدایت ملنے کا ضابطہ

۳۹۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور گونگے بہرے ہیں اندھیروں میں ہیں۔ جس کو خدا چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھے راستہ پر ڈال دے۔ نہ کہنے والے کی سنتے ہیں نہ خود دوسروں سے پوچھتے ہیں اور نہ اندھیرے میں کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ جب سب قوی اپنی بے اعتدالیوں

سے بیمار کر دیے تو حق کو قبول و تصدیق کا کیا ذریعہ ہو۔ اور یہ جو فرمایا خدا جس کو چاہے گمراہ کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گمراہ کرنا اسی کو چاہتا ہے جو خود ذرائع ہدایت اپنے اوپر مسدود کر دیتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ

اور اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کے ذریعے اس کا مرتبہ بلند کر دیتے مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور ہوائے نفس کی پیروی کی[1]

مطلب یہ ہے کہ خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک نادان انسان کو آیات الٰہی کے مطالعہ کی توفیق نہ بخشی جائے اور ایک متعصب غیر حقیقت پسند طالب علم اگر آیات الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت اسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل ہو جائیں اور غلط فہمیوں میں الجھانے والی چیزیں اسے حق سے دور اور دور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالب علم کو علم کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق و انفس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح انہیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانات، نباتات، حیاتیات، ارضیات، فلکیات، عضویات علم التشریح اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تاریخ آثار قدیمہ اور علوم اجتماع کی تحقیق کرتے ہیں اور ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں، مگر چونکہ وہ مطالعہ کا آغاز ہی تعصب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر دنیا اور اس کے فوائد و منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدے کے دوران ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انہیں الٹی دہریت، الحاد، مادہ پرستی اور نیچریت ہی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے[2]

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام ۲ تفہیم القرآن

توحید عبادت کی ایک نفسی دلیل

۴۶ - کہہ دو لوگو دیکھو اگر آجاتے تم پر اللہ کا عذاب یا آجاتے تم پر قیامت، کیا تم ایسی حالت میں خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے۔ اگر سچے ہو تو بتاؤ نہیں بلکہ تم اسی کو مصیبت کے وقت پکارتے ہو، تو جس کو دکھ کے لیے پکارتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اس کو دور کر دیتا ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو اس وقت ان کو بھول جاتے ہو۔ جب اندھے، بہرے، گونگے ہو کر آیات اللہ کو جھٹلایا اور گمراہی کے عمیق غار میں جا پڑے۔ اس پر اگر دنیا میں یا قیامت میں اللہ کا سخت عذاب نازل ہو تو سچ سچ بتاؤ کہ اس وقت خدا کے سوا کسے پکارو گے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں گر جاتے ہو تو مجبور ہو کر اسی خدائے واحد کو پکارتے ہو اور سب شرکا کو بھول جاتے ہو۔

فاذا ركبوا فى الفلك دعوا الله مخلصين له الدين

جب وہ سوار ہوتے ہیں کشتیوں میں تو اس وقت سب سے ہٹ کر اپنے اعتقاد کو خالص کر کے صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔

جس پر اگر خدا چاہتا ہے تو مصیبت کو دور بھی کر دیتا ہے۔ اس سے اندازہ کر لو کہ نزول عذاب یا قیامت کی ہولناکیوں سے بچانے والا اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کس قدر حماقت اور اندھا پن ہے کہ اس خدا کے عظمت و جلال کو فراموش کر کے اس کی نازل کی ہوئی آیات کی تکذیب اور فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے ہو[1]۔

اس سے پہلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی مانگتے ہو۔ اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ اللہ سبحانہ یقیناً نشانیاں دکھانے کی قدرت رکھتا ہے اور اس نے نشانیاں دکھلا بھی دی ہیں۔ اگر تم نشانیوں کی تلاش میں ہو تو بتاؤ کہ تمام کائنات خلقت میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا ہے۔ تمام فضائے ہستی جن حیرت انگیز عجائب سے بھری ہوئی ہے اس کے لیے تمہاری بولی میں کونسا نام ہے۔ یہ کچھ اس کی ہستی و صفات کی نشانیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ زمین کے تمام جانوروں کو دیکھو جو تمہارے قدموں کے پاس ہیں، ہوا کے پرندوں کو دیکھو جو تمہارے ارگرد پرواز کر رہے ہیں۔ جو لوگ علم و بصیرت رکھتے ہیں۔ انہیں صحیفہ فطرت کی ان نشانیوں کے بعد اور کسی نشانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی حاجت نہیں ہو سکتی لیکن جن لوگوں نے خدا کی دی ہوئی بصیرت تاراج کر دی تو ان کے لیے، کوئی نشانی بھی سود مند نہیں۔ اب اس آیت میں ان کو ایک دوسری نشانی کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے جو خود ان کی اپنی ذات میں موجود ہے یہ توحید عبادت کی ایک ناقابل تردید انفسی دلیل ہے۔

اس کا آغاز ارء یتکم سے کیا یہ اسی پارے میں دو جگہ آیا ہے۔ پورے قرآن میں ارأیت تو کئی جگہ آیا ہے لیکن ارأیتکم ان دو جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں آیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ایک جگہ صیغہ واحد کے ساتھ ارأیتک آیا ہے ورنہ عام طور پر ارأیت اور ارأیتم ہی آیا ہے۔ جمہور شارحین قرآن اور علماء ادب اس کا ترجمہ اخبرونی مجھے بتاؤ کرتے ہیں۔ قاضی بیضاوی اسے استفہام اور تعجب کے لیے بتاتے ہیں اور امام راغب اصفہانی اسے تنبیہ کے لیے کہتے ہیں دراصل آگے آنے والی عجیب و غریب بات کے لیے بطور تنبیہ اور تمہید آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ان مکذبین اور منکرین سے کہہ دیجیے کہ تم مجھے اپنی رائے بتاؤ یا اس معاملہ میں اپنی علمی دسترس کے تحت جواب دو کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے جو تم سے پہلی امتوں پر آچکا ہے یا موت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ تمہارا استقبال کرے، اس وقت ایک خدا کے دامن رحمت کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ تمہیں نظر نہیں آتی ہے۔ بڑے پاپی مشرک ایسے موقع پر اپنے معبودوں کو فراموش کر کے یگانہ خدا کو پکارنے لگتے ہیں اور صرف اللہ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ خدا پرستی کی شہادت ہر انسان میں موجود ہے جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے پردے ڈال دیے جائیں مگر پھر بھی کبھی کبھی حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس دلیل کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں چونکہ ایک ہی خدا کی شہادت موجود ہے دوسروں کو الٰہ جو وہ مانتا ہے ان کی کوئی شہادت اس کی فطرت میں موجود نہیں ہے بلکہ وہ محض اس کی خیالی پلاؤ ہوتی ہے۔ اس لیے جب اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آجاتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو انسان اپنے تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے صرف اسی خدا کو پکارتا ہے جس کی شہادت وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اسی قسم کی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ جب مکہ مکرمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوتے تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگ گئے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبشہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا مگر طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب

کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کو پکارنے کا ہے وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں اس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں۔ اور ان کے دل نے گواہی دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو۔ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے۔ اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی کا ایک انقلابی وقت تھا۔ انہوں نے اسی وقت خدا سے عہد کر لیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ اپنی باقی عمر اسلام کی خدمت میں گزار دی۔

قرآن نے سورہ فاتحہ میں عبادت اور استعانت دونوں کو اللہ کے لیے خاص کر لیا۔ ایاك نعبد وایاك نستعین میں غیر اللہ کی عبادت اور غیر اللہ سے استعانت کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا ہے پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا گیا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یہاں اس آیت میں بل ایاہ تدعون میں دعا سے استعانت ہی مراد ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ مشرکین مکہ کے شرک کی انواع و اقسام بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> اقسام شرک میں سے ایک یہ ہے کہ مشرکین اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے مثلاً بیمار کی شفایابی اور فقیر کی غنا وغیرہ، اور ان کے لیے نذریں مانتے تھے اور ان کی وجہ سے اپنی مراد پوری ہونے کی آس رکھتے تھے اور برکت حاصل کرنے کی امید پر ان کے ناموں کا ورد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ واجب کر دیا کہ اپنی نمازوں میں کہا کریں ایاك نعبد وایاك نستعین اور نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا لا تدعوا مع اللہ احدا" تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔ اس آیت میں دعا سے عبادت مراد نہیں جیسا کہ کچھ شارحین قرآن کا خیال ہے بلکہ دعا سے مراد استعانت ہے جیسا کہ قرآن میں ہے بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ بلکہ تم اسی کو پکارو گے سو وہ ہی تمہاری تکلیف دور کرے گا۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۶۲)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ از روئے قرآن جیسے غیر اللہ کی عبادت حرام ہے ایسے ہی غیر اللہ سے دعا اور استعانت کا تعلق بھی ممنوع ہے بلکہ غیر اللہ سے دعا و استعانت کا تعلق ہی مشرکین مکہ کا اصلی شرک تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے مکہ کے مشرکوں کو اس لیے کافر فرمایا کہ انہوں نے ایک سخی آدمی کو

جو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا جس کا نام لات تھا حاجت روائی کا منصب دے رکھا تھا اور تکالیف و مصائب کے مواقع پر وہ اس سے استعانت کرتے تھے۔

(البدور البازغہ)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ارشاد الطالبین میں لکھتے ہیں :

عبادت مر غیر خدا را جائز نیست و نہ مدد خواستن از غیر حق

اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت بھی حرام اور استعانت بھی۔

البدور البازغہ ہی میں شاہ ولی اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ سارے جہان کا مدبر تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو بعض مخصوص علاقوں میں تصرف کرنے کا اختیار عطا فرما دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے مگر ان کو مستقل سمجھ کر استعانت نہ کرتے تھے بلکہ وہ ان کو عون الٰہی اور امداد الٰہی کا مظہر سمجھ کر استعانت کرتے تھے اور یہی شرک ہے کیونکہ دنیا میں کسی مشرک نے غیر اللہ کو حقیقی مستعان نہیں سمجھا با ایں طور کہ اس کو واجب الوجود تسلیم کیا ہو۔ اور قدرت و طاقت کا بالاستقلال منبع اس کو یقین کیا ہو بلکہ مشرکین عطائی اختیارات کے تحت ان سے استعانت کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے الفوز الکبیر میں اس پر تفصیلی اور سیر حاصل بحث کی ہے۔

شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے ان صفات میں سے کوئی چیز ثابت کرے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ مثلاً جہان میں اس ارادے سے تصرف کرنا جس کو کن فیکون کہا جاتا ہے یا علم ذاتی ثابت کیا جائے جو بغیر حواس اور دلیل عقلی اور خواب والہام وغیرہ کے ثابت ہو، یا بیمار کے مرض کو دور کرنے کی صفت ثابت کی جائے یا کسی شخص پر ایسی پھٹکار اور ناراضگی ڈالی جائے کہ اس کی وجہ سے اس پر رزق تنگ ہو جائے یا وہ بیمار ہو جائے یا اس کو شفا ہو جائے یا کسی شخص پر رحمت کی جائے جس کی بنا پر اس پر رزق کی وسعت ہو جائے اور اس کا بدن صحیح ہو جائے اور وہ خوشحال ہو جائے۔ مشرکین کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اجسام و جواہر کے پیدا کرنے اور بڑے بڑے کاموں کی تدبیر میں شریک نہیں ٹھہراتے تھے اور کسی کے لیے یہ قدرت ثابت نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا فیصلہ کر چکتا ہے تو وہ اسے ٹال سکتے ہیں۔ ان کا شرک یہ تھا کہ بعض بندوں کے بارے میں خیال کرتے

تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں اور ان کا یہ خیال بھی تھا کہ علی الاطلاق تو بادشاہ اللہ کی ذات ہے لیکن وہ اپنے کچھ بندوں کو حاجت روائی کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور ان کی رضامندی اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے۔ جس طرح ایک بڑی شان والا بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں کو اطراف مملکت میں بھیجتا ہے اور ان جزدی معاملات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے تاآنکہ بادشاہ سے اس کے خلاف کوئی حکم صادر ہو بادشاہ ان جزدی امور کی تدبیر کی طرف توجہ نہیں کرتا اور ان سب لوگوں کے معاملات ان غلاموں کے سپرد کر دیتا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں ان کی سفارش منظور کرتا ہے جو ان کی خدمت میں رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے تقرب کو ضروری قرار دیتے تھے تاکہ ان کو بادشاہ مطلق کے یہاں آسانی سے قبولیت حاصل ہو اور ان سے تقرب حاصل کرنے والوں کے حق میں ان کے معاملات کے پورا ہونے میں ان کی سفارش قبول ہو۔ اور ان ہی امور کے پیش نظر شرک پسند طبیعتیں ان خاص بندگان خدا کو سجدہ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، ان کے ناموں کی قسمیں کھاتے ہیں اور اہم معاملات میں ان سے کن فیکون کی قدرت کے تحت استعانت کرتے ہیں اور مشرکین پتھر اور پیتل کی مورتیاں بھی بناتے تھے مگر ان مورتیوں کو ان بزرگوں کی توجہ کا قبلہ سمجھتے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ
الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً
فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿٤٤﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٥﴾

اور بلاشبہ ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف انبیاء روانہ کیے پھر ان قوموں کو سختی اور محنت میں گرفتار کیا۔ شاید وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں[۴۲]۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جب ہماری جانب سے ان پر گرفت آئی تو وہ اپنی اپنی بد عملیوں پر ہمارے حضور گڑگڑاتے لیکن ان کے دل

سخت پڑ گئے تھے اور ان کی بدعملیوں کو شیطان نے ان کی نگاہوں میں سجا دیا تھا[۴۸]، پھر جب وہ ان باتوں کو طاق نسیان بنا بیٹھے جن کی ان کو یاد دہانی کرائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے کھول دیے تا آنکہ جب وہ ان نعمتوں پر خوب اترا گئے جو ان کو عطا ہوئی تھیں تو ہم نے اچانک ان کی گرفت کر لی۔ بس وہ ناگہاں ناامید ہو کر رہ گئے[۴۹] لہٰذا ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کار تھے اور ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔[۵۰]

نتائج میں تدریج و امہال

جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آئے۔ مثلاً فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر پانی آگ پر

رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا۔ لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولہے پر رکھو اور وہ فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولے گا لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح یہاں انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں۔ نتائج کا انتظار کیا جائے اس صورت حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی اور عمل حق اور عمل باطل دونوں کے نتائج کے ظہور کے لیے "تاجیل" یعنی ایک معین وقت کا ٹھہراؤ ضروری ہو گیا۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو جائیں گے۔ اپنی مقررہ اجل یعنی مقررہ وقت پر ظاہر ہوں گے۔ اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص مقتضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ظلم و بدعملی میں مبتلا ہوتی ہے اس کے باوجود ہر طرح کی خوش حالیاں اسے ملتی رہتی ہیں تب لوگ دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ظلم و بدعملی کے نتائج کیا ہوتے ؟ لیکن یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ جزائے عمل کا قانون نہیں بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہر چیز کی طرح مفاسد کے نشو و نما اور بلوغ کے لیے بھی مقدار اوقات کا پیمانہ ٹھہرا دیا ہے جب تک وہ وقت نہیں آتا نتائج آشکارا نہیں ہوتے چنانچہ اسی حقیقت کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو قانون امہال سے بھی تعبیر کیا ہے یعنی مہلت اور ڈھیل دینے کا قانون۔

۴۷۔ اور بلاشبہ ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف انبیاء روانہ کیے پھر ان قوموں کو سختی اور محنت میں گرفتار کیا، شاید وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز ظاہر کریں۔ اس سے پہلے نبوت سے لوگوں کے مطالبہ کا ذکر کیا تھا کہ کوئی عذاب کی نشانی ظاہر کرو۔ یہاں تاریخی شہادت لا کر بتایا جا رہا ہے کہ ماضی میں جن لوگوں نے ایمان لانے کی شرط نشانی اور آیت کو مقرر کیا ان کو ایمان کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں اور یقین کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی ان کو شک و شبہ کے گرداب سے باہر نہیں نکال سکتی وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور کبھی اس کو سحر اور جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

کبھی فریب اور قوتِ شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نہیں ہوتی۔ حجت کے لیے ایک دفعہ ان کو معجزہ دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا، پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کی تسلی نہیں ہوگی۔ اس سورت میں ان مراتب کو بیان کیا ہے۔ اب یہاں تاریخ کے حوالہ سے بتایا جارہا ہے کہ آپ سے پہلے بھی ہم نے قوموں میں رسول روانہ کیے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی وطیرہ اختیار کیا۔ معجزات و آیات کی تکذیب کی اور انبیاء کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ ہم نے اولاً ان کی باساء اور ضراء کی حالت پیدا کر کے تربیت کی۔ باساء تنگی کی حالت کو کہتے ہیں۔ جنگ اور فقر کی وجہ سے جو پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اور ضراء کے معنے ہیں اس حالت کے جو قحط، خشک سالی، تکلیف اور بدحالی کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا قانونِ آزمائش ہے۔ یگانوں اور بیگانوں دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ یگانوں میں اس لیے ہوتا ہے کہ پتہ لگ جائے کہ مومن ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان تمام آزمائشوں میں استقامت کا مظاہرہ کیا جائے جو ایمان کی راہ میں مشکلات کی صورت میں پیش آتی ہیں گویا یگانوں میں باساء اور ضراء کی حالت کی نمائش استقامت اور ثابت قدمی دیکھنے کے لیے اور کھرے کو کھوٹے سے ممتاز کرنے کے لیے ہوتی اور بیگانوں میں یہی حالت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں اور بدعملیوں سے باز آجائیں۔ شدائد کے ذریعے تربیت اللہ کی سنت ہے۔ باساء اور ضراء کے ذریعے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کا وہ لوگ شکار ہوتے لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں نہیں کھلیں اور ان میں عجز و نیاز رونما نہیں ہوا۔ آیت کے آخر میں لعلھم یتضرعون، فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان کو باساء اور ضراء میں مبتلا کرنے کا منشا عذاب نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ مصیبت میں طبعاً ہر شخص کو خدا یاد آتا ہے مصیبت میں پڑ کر ان کو بھی خدا یاد آجائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے مقصود ان کی تربیت تھی۔ اور یہ بھی ارشاد کے اندازِ بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کسی قوم پر دفعتہً اور یکبارگی عذاب نازل نہیں فرماتے بلکہ بطورِ تنبیہ کے تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں جن کے ذریعے سعید و نیک بخت لوگ اپنی غفلت سے باز آکر صحیح راستہ پر لگ سکیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو تکلیف اور مصیبت دنیا میں بطورِ سزا کے دی جاتی ہے اس کی صورت اگرچہ سزا کی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ سزا نہیں ہوتی بلکہ غفلت سے چونکانے اور بیدار کرنے کے لیے تربیت ہوتی ہے۔

شیطان کی تزئین اور دلوں کی قساوت

۴۸ - پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جب ہماری جانب سے ان پر گرفت آتی تو وہ اپنی بدعملیوں پر ہمارے حضور گڑگڑاتے لیکن ان کے دل سخت ہو گئے تھے اور ان کی بدعملیوں کو شیطان نے سجا دیا تھا۔ جملہ کے آغاز میں لولا لاکر بتا دیا کہ بجز عناد اور قساوت قلب اور خود بینی کے کوئی چیز ان کو خدا کی جناب میں گڑگڑانے سے مانع نہ تھی۔ اس میں خدا کی جناب میں نہ گڑگڑانے اور عذاب الٰہی کو دیکھ کر توبہ نہ کرنے کے دو سبب بتائے گئے ایک دلوں کی قساوت اور دوسرے شیطان کی تزئین۔ دلوں کی قساوت اور سنگدلی تو یہ ہے جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے کہ کفر اور معاصی پر ڈٹے رہے۔ دل میں قساوت یکبارگی نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز تک گناہوں کی مشق و تمرین سے پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات یا کوئی کام کرتا ہے تو اس کے صاف اور سادہ لوح دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر ہوش میں آکر وہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہ ہی گناہ کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر دیتا ہے اور قلب ہر قسم کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے نبوت کی وعظ و تلقین ہوتی ہے، آیاتِ الٰہی کی تجلی آتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا دل نرم نہیں ہوتا۔ اسی بات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

> بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس نے اپنے کو گناہ سے الگ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہی دل کا وہ زنگ ہے جس کا ذکر اس ارشاد میں ہے بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔
>
> (ترمذی)

اور شیطان کی تزئین یہ ہے کہ گناہوں، خدا کی کھلم کھلا بغاوت اور خالص کافرانہ زندگی کو ان کی نگاہوں میں حسین و خوبصورت بنا کر پیش کرے، ہر نافرمانی کے لیے ایک تاویل اور ہر بغاوت کے لیے نت نئی توجیہات پیش کر کے ان کو خدا کی نافرمانی اور بغاوت پر لگائے۔ اور بتائے کہ اسی میں بقائے دوام ہے گویا خدا کی ہر بغاوت کو شجرۃ الخلد اور ملک لایبلیٰ کی صورت میں

پیش کرے اس کے پیسے آج کی اصطلاحی زبان میں کبھی قومیت کا اور کبھی وطنیت کا لبادہ پہن کر اپنے چاہنے والوں کو گدگداتے ہیں۔ ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت میں قومی ترقی کا راز سمجھاتے ہیں اور جن افکار اعمال اور اخلاق کی وجہ سے جنگ وغیرہ کی سختیاں اور قحط وغیرہ کی مصیبتیں آرہی ہیں۔ ان کو طبعی اور قدرتی نتائج ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حالات کا ناگزیر تقاضا بتاتے ہیں۔ شیطان کا سارا کاروبار اعمال کی تزئین کے بل پر چلتا ہے وہ انسان کو انفرادی و اجتماعی طور پر خدا کی نافرمانی اور کافرانہ زندگی میں ایک سبز باغ دکھاتا ہے۔ کسی کو انفرادی لطف، ولذت اور کامیابیوں کی اُمید کسی کو قومی سربلندی کی توقع کسی کو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو اعمال کے ذریعے صداقت پہنچ جانے کا اطمینان، کسی کو یہ بھروسہ کہ اسلام ایک پرائیویٹ اور نجی چیز ہے۔ اس کا معاشی، سیاسی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور کسی کو یہ تسلی کہ آخرت میں خدا کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور صدقے بچ جائیں گے۔ غرض جو شخص جس قسم کی تزئین سے قابو میں آسکتا ہے اس کے سامنے وہ ہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کسی چیز کو مزین تین طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو فی الواقع حسین ہی پیدا کرنا، جیسے قرآن ہی میں ہے زینا السماء الدنیا دوسرے یہ کہ کسی چیز کو بغیر تخلیق کے مزین کرنا جیسے دلہن کا بناؤ سنگار ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ کسی چیز کو انسانی طبیعت کے لیے حسین بنا دیا جا ہے وہ فی الواقع حسین نہ ہو۔ قرآن میں کہیں تزئین کا فاعل شیطان ہے جیسے اس آیت میں اور کہیں اللہ تعالیٰ ہے جیسے کذالک زینا لکل امۃ عملھم اور اس کا فاعل انسان ہے جیسے زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاءھم اس لیے ضابطہ یہ ہے کہ تزئین اگر پہلے معنے میں ہو تو فاعل اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ تخلیق و ایجاد اسی کا کام ہے اور دوسرے معنے کے لحاظ سے تزئین کا فاعل انسان اور تیسرے معنے کی رو سے تزئین کا فاعل شیطان ہے اور جہاں فاعل موجود نہ ہو مقام کی مناسبت سے فاعل مقرر کیا جائے گا جیسے زین للمسرفین ما کانوا یعملون۔

آزمائشوں کا تنوع

۴۴۔ پھر جب وہ ان باتوں کو طاق نسیان بنا بیٹھے جن کی یاد دھانی کرائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے کھول دیے تا آنکہ جب ان نعمتوں پر اترا گئے جو ان کو عطا

ہوئی تھیں تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا بس وہ نا امید ہو کر رہ گئے۔ گزشتہ آیتوں میں عذاب آنے کا احتمال بیان ہوا تھا لقد ارسلنا الی امم میں واقعات کا حوالہ دیا ہے کہ پہلے زمانے میں اس طرح کے عذاب آچکے ہیں اور یہ بھی یہاں بتا دیا کہ جب مجرم کو ابتداءً ہلکی تنبیہ کی جاتی تو اس کو معاً خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ سخت دلی اور اغوائے شیطانی سے اسے معمولی نہ سمجھے۔ موضح القرآن میں ہے کہ گنہ گار کو اللہ تعالیٰ تھوڑا سا پکڑتا ہے۔ اگر وہ گڑگڑایا اور توبہ کی تو بچ گیا، اور اگر اتنی پکڑ نہ مانی تو پھر بہلا دیا اور وسعتِ عیش کے دروازے کھول دیے۔ جب نعمتوں کی شکر گزاری کی اور انعام و احسان سے متاثر ہونے کے بجائے خوب گناہ میں غرق ہوا تو دفعۃً بے خبری میں پکڑا گیا۔ یہ اشارہ ہے کہ آدمی کو گناہ پر تنبیہ پہنچے تو شتاب توبہ کرے یہ راہ نہ دیکھے کہ اس سے زیادہ سختی آوے تو یقین کر دں ^[1]

پہلے اقوام کے متعلق قانون کا ذکر ہوا ہے اور یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ قوموں اور امتوں کو جو نکانے کے لیے انبیاء روانہ کیے جاتے ہیں تو ابتداءً انکار و سرکشی اختیار کرنے والوں کو باساء اور ضراء میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن جن کے دل سخت اور سینے سیاہ ہوتے ہیں وہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہونے والی ان تنبیہات کو مختلف تاویلیں کر کے سمجھتے ہیں کہ یہ تنبیہات نہیں ہیں بلکہ دنیا کے عام حوادث و واقعات ہیں۔ انسانی اخلاق و کردار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے یہاں قرآن نے بتلایا ہے کہ اس قسم کی تاویلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ قدرت کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے ڈھیل ہی نہیں بلکہ گزشتہ حالات سے بھی زیادہ آسانیوں اور آسائشوں کے ان پر دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور "کل شیئٍ"، یعنی زندگی کی ہر قسم کی چیز دل کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے ابواب اور دروازے ان پر وا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان ساری ترقیوں اور اولوالعزمیوں کے باوجود قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ان کے آخری انجام کا حال ہے لیکن سرکش و طاغی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کا یہ انتقامی برتاؤ جو بظاہر سرفرازیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ان لوگوں کے لیے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے جنہیں انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی گزارنی پڑتی ہے اور

[1] افادات شیخ الاسلام

جو حال قوموں کا ہے۔ افراد کے ساتھ بھی اللہ سبحانہ' کبھی اسی قسم کا سلوک فرماتے ہیں۔ یعنی دیا تو جاتا ہے ان کو بطور سزا لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہ ہی اللہ کے لاڈلے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خدائی نوازشوں کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔

قوموں کی حد تک تو شاید فتحنا علیھم ابواب کل شیئ کا یہ سزائی پیمانہ ایسا نہیں ہے جسے جاننے والے بآسانی نہیں جان سکتے۔ آخر دُنیا میں ایسی قومیں ہیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ خدا اور اس کے رسُول کی تعلیم کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہے اور اسی کے ساتھ ان کی ہر بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو لا رہی ہے جن میں ان کے لیے کسی نہ کسی خیر کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ ان ہی بغاوتوں اور طغیانیوں میں وہ جس قدر سرشاریاں دکھاتے ہیں اسی حد تک ابواب کل شیئ ہر چیز کے دروازے ان پر وا ہوتے جاتے ہیں۔

بہرحال قوموں کی حد تک تو یہ مسئلہ صاف اور واضح ہے۔ البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے۔ لیکن اس میں بھی جو کچھ دشواری ہے وہ دوسروں کے اعتبار سے ہے۔ ان لوگوں کو جو خدا کی گوناگوں نعمتوں سے ہمدوش ہو رہے ہیں ان کو دیکھنا چاہیے کہ خدا اور اس کی مرضیات کے ساتھ ان کی زندگی کا کیا تعلق ہے؟ اگر صورتِ حال یہ ہے کہ جس حد تک اللہ سے اللہ کی مرضیات سے ان کی زندگی میں تصادم پایا جاتا ہے اسی حد تک نعمتوں میں کشادگی ہو رہی ہے۔ تمرد اور سرکشی کے میدانوں میں جتنے رواں دواں ہیں اسی قدر دُنیا اور دُنیا کی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی جا رہی ہیں تو ایسی حالت میں ان کو یقین کر لینا چاہیے کہ بوقلموں نعمتوں کا یہ تاج ان کے سروں پر اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ اندھے ہو کر جئیں اور اندھے ہی ہو کر دُنیا سے کوچ کریں۔ نعمتوں کی یہ فراوانی اس بات کی نشانی ہے کہ اللہ سبحانہ' ان سے انتقام لینا چاہتا ہے اور ایسا انتقام کہ جو نکلنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں۔ ارشادِ نبوت میں اسی کو افراد کی حد تک استدراج کہا گیا ہے۔ مسند امام احمد میں عقبہ بن عامر کے حوالہ سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

> جب تم دیکھو کہ باوجود نافرمانیوں کے کسی پر خدائی انعامات کی بارش ہو رہی ہے سمجھ لو کہ یہ استدراج ہے اور حضور نے قرآن کی یہی آیت فتحنا علیھم ابواب کل شیئ تلاوت فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ قوموں کی حد تک اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب نبوت کی تکذیب کرنے والے خدا کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو خدا ان کی رسی دراز کر دیتا ہے۔ ان کی تمام مطلوبات کے

دروازے ان پر کھول دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں پر مگن ہونے اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ان کے پیمانے کے لبریز ہونے کا ہوتا ہے۔ اس وقت خدا ان کی دفعتہً پکڑ کرتا ہے پھر وہ بالکل مایوس اور ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہاں سے یہ حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ جاہ و ثروت، خوشحالی اور اقبال مندی کو صداقت و حقانیت کی دلیل سمجھ لینا تمام تر حماقت و سفاہت ہے۔ اس کا لازمی تعلق حق و صداقت سے نہیں۔ قرآن کے نقطہ نظر سے یہ تندرست ہونے کی نہیں بلکہ بیمار ہونے کی بھی نشانی ہے اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ نویں پارے کے آغاز میں آرہی ہے۔

ظلم اور ظلم کاروں کا خاتمہ

۵۰۔ لہٰذا ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کار تھے اور ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ ظالموں کا استیصال بھی اس کی ربوبیت عامہ کا اثر اور مجموعہ عالم کے لیے رحمت عظیم ہے اس لیے یہاں حمد و شکر کا اظہار فرمایا[1] اس کی وجہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ جو درخت زہریلا ہو چکا اور اب صرف زہریلا ہی پھل دے رہا ہے اس کا باقی رہنا اس دنیا کی مصلحت کے خلاف ہے جو اس کے رحمان و رحیم خالق و مالک نے اپنی رحمت اور اپنے عدل کے ظہور کے لیے پیدا کی ہے۔ وہ عالم کا پروردگار ہے۔ اس کی شان پروردگاری کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے چمن میں ایسے درخت کو لگا رہنے دے جس کی زہریلی ہوا پورے چمن کی بربادی کا سامان بن جائے۔ اس میں دو باتیں سمجھا دی گئی ہیں ایک یہ کہ ان کی تباہی کا سبب ان کی ظلم کاری ہے دوسرے یہ کہ ظالموں کی تباہی بھی پورے عالم کے لیے ایک نعمت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى
قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ
الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ
اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝
وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ
وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے[51]، تو اس کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں یہ واپس دے سکتا ہے، دیکھو ہم کس طرح گوناگوں طریقوں سے بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ لوگ منہ پھیرے ہوئے ہیں[52]۔

ان سے کہو تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر تم پر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا آشکارا آئے تو ظالموں کے سوا کون ہلاک کیا جائے گا۔[53] اور ہم رسولوں کو صرف اس لیے روانہ کرتے ہیں کہ خوشخبری سنائیں اور آگاہ کریں[54]، پھر جو بھی ایمان لائے اور ٹھیک ہو جائے تو اس کے لیے کوئی اندیشہ نہیں اور نہ وہ غمگین ہوگا اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ان کو بد عملیوں کی وجہ سے ضرور عذاب ہوگا۔[55]

خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس خدا کی توحید کا کامل و مکمل نقشہ پیش کیا اور بتایا کہ آسمان و زمین کا تنہا مالک خدا ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں ہے جس طرح اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات و افعال میں بھی کوئی

شریک نہیں ہے۔ پیدا کرنا، زندہ رکھنا، مارنا، عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہونا۔ دور نزدیک سے یکساں تعلق ہونا اور کائنات میں تدبیر و تصرف کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام صفات ہر حیثیت سے صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات اقدس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب اوتاروں، ولیوں، شہیدوں اور پیغمبروں میں بھی یہ اوصاف مانتے تھے اور اب بھی مانتے ہیں۔ ملائکہ اور جنات اور احبار و رہبان کے پرستاروں کا قرآن نے بصراحت تذکرہ کیا ہے لیکن قرآن نے توحید کامل کے لیے توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات توحید فی الافعال توحید فی التصرف اور توحید فی العبادت کو ایمان قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کی زندگی میں خدا تعالیٰ کے اقرار او رتصدیق کا دل پر جو روحانی اثر پڑتا ہے وہ قرآن کی بتائی ہوئی توحید کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اطاعت و انقیاد، خشوع و انابت توکل و اخلاص کی حالت صرف اس وقت دل میں رونما ہوتی ہے۔ جب یہ یقین کامل ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں اور تمام اُمیدوں کا صرف ایک ہی مرکز ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ جب وہ اپنی مادی ترقیوں میں مگن ہو جاتے ہیں اور ترقی و عروج، ارتقاء و اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر جب ان کو پہنچا دیا جاتا ہے تو ان کی یکبارگی گرفت کرلی جاتی ہے اب بتایا جا رہا ہے کہ علم کے جن ذرائع کو کام میں لاکر وہ نبوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر اللہ ان ذرائع ہی کو تلف کرے نہ دیکھنے کے لیے آنکھ رہے نہ سننے کے لیے کان اور نہ سمجھنے کے لیے عقل و بصیرت تو بتاؤ پھر اللہ کے سوا اور کون ہے جو تمہیں یہ قوتیں عطا کرے۔ یہ بھی توحید کی عقلی دلیل ہے اسی کو قرآن نے ایک جگہ مثبت انداز میں بھی پیش کیا ہے امن یملکؑ السمع والابصار اور اسی کو قرآن نے اللہ کے تعارف میں بھی پیش کیا ہے انشالکم السمع والابصار والافئدۃ یعنی یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے سننے کے لیے کان دیے دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں اور سوچنے کے لیے دل پیدا کیے۔

۵۱۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں سے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے کہ نہ تم سن سکو نہ دیکھ سکو اور نہ دل سے سمجھ سکو[1] ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کانوں کو اللہ کی آیات تنزیلیہ کے سننے آنکھوں کو اس کی آیات تکوینیہ کے دیکھنے میں اور دلوں کو دونوں کے سمجھنے میں لگا کر اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے شکر گزار بندے بنتے اور ہو یہ رہا ہے کہ کانوں کو اللہ کی بغاوتوں پر مشتمل باتوں کے سننے اور آنکھوں کو خدا کے خلاف دیکھنے اور دلوں کو اس کی نافرمانیوں کے متعلق سازشوں کو سوچنے پر لگائے ہوتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر برائی ان کو اچھی نظر آتی ہے اور اللہ کی نافرمانی ان کو بھاتی ہے۔ اخلاق ذمیمہ اور ذائل ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن کر رہ گئے ہیں ان کی حالت اس سنجاست کے کیڑے کی طرح ہوتی ہے جیسے گندگی سے طبعاً رغبت اور خوشبو سے نفرت ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے ان ذرائع علمی سمع بصر عقل کو سلب کر دے کان نہ رہیں اور تم بہرے ہو جاؤ آنکھیں نہ رہیں تم اندھے ہو جاؤ، دل اور عقل نہ رہے اور تم مجنوں ہو جاؤ۔ فہم و شعور کی تمہاری ساری قوتیں اگر سلب ہو جائیں کہ تم کوئی بات نہ سن سکو اور نہ کوئی راستہ دیکھ سکو اور نفع وضرر کے لیے کوئی قوت تمیز نہ رہے۔

کائنات کا مدبر صرف اللہ ہے

۵۲۔ تو اس کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں یہ واپس دے سکتا ہے، دیکھو ہم کس طرح گوناں گوں طریقوں سے بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ لوگ منہ پھیرے ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی توبہ میں دیر نہ کرے جو کان آنکھ دل اس وقت ملے ہیں شاید پھر نہ ملیں اور اس لیے توبہ و استغفار کی توفیق نہ ہو سکے[1] یہ استفہام انکاری ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جو ان کو یہ نعمتیں دلا سکے۔ قرآن کے مخاطبوں کو بھی اس کا اقرار تھا کہ یہ عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ مستحق عبادت تو وہ ذات گرامی ہے جو ان حواس اور قوائے ادراکیہ کے چھیننے پر قادر ہو اور جب تم جانتے اور مانتے ہو کہ اس کے سوا اس پر کوئی قادر نہیں ہے تو بتاؤ ان انداد و اولیا کی تم کیوں عبادت کرتے ہو۔ سچ کو چھوڑ کر جھوٹے اوہام اور محض خیالی اور ہوائی قلعوں میں پناہ لینا عاقل کا نہیں بلکہ غافل کا کام ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اس پر قادر ہے کہ اگر اللہ تم سے ان کو سلب کرے تو واپس دے سکے۔ بلاشبہ اللہ کے سوا کسی کو یہ قدرت نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا ہے کہ ہم کس طرح گوناں گوں طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ یعنی لوگوں کے سامنے توحید کے موضوع پر قسم قسم اور طرح طرح کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دلائل پیش کر رہے ہیں۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کبھی مقدمات عقلیہ پیش کرتے ہیں کبھی ترغیب و ترہیب کا انداز اختیار کرتے ہیں اور کبھی تنبیہہ و تذکیر کا اسلوب لا کر سمجھاتے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ ہم گوناں گوں طریقوں سے اس مسئلہ کو سمجھا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ اس معاملہ میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور سب کچھ جانتے ہوتے اعراض کر رہے ہیں۔

رسولوں کی تکذیب کرنے پر عذاب

۵۳ – ان سے کہو تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر تم پر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا آشکارا آئے تو ظالموں کے سوا کون ہلاک کیا جائے گا۔ اچانک وہ عذاب جس کی کچھ علامات پہلے سے ظاہر نہ ہوں اور جہرۃً سے وہ عذاب مراد ہے جس کی آنے سے پہلے کچھ علامات ظاہر ہونے لگیں[1] اصل ارشاد میں بغتۃ اور جہرۃ آیا ہے۔ بغتۃ کے معنے کسی چیز کے اچانک دفعۃً بالکل بے خبری میں آنے کے ہیں اور جہرۃ کے معنے علانیہ، صاف اور کھلم کھلا ہونے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے دریافت کرو کہ اگر خدا کا عذاب یکبارگی بغیر نوٹس کے اچانک آجائے یا دن دہاڑے اور کھلم کھلا آجائے تو کن پر آئے گا ان ہی ظالموں پر آئے گا جو اپنی بداعمالیوں سے اس کے سزاوار ہیں یا کسی اور پر۔ بلاشبہ اہل ایمان بچ جائیں گے اور ظلم کار ہی اپنی ظلم کاری کی پاداش میں پکڑے جائیں گے۔

کچھ شارحین قرآن نے یہاں عذاب سے عام عذاب مراد لیا ہے جیسے مصائب اور بیماریاں، معاشی پریشانیاں، لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ یہاں وہ عذاب مراد ہے جو انبیاؑ کی تکذیب کرنے والی اُمتوں پر اتمامِ حجت کے بعد آتا ہے اس عذاب کے معاملہ میں سنت اللہ یہی ہے کہ نبی کی تکذیب کرنے والے ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور اہلِ ایمان بچا لیے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر آلوسی نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ لوگوں سے کہو کہ بتاؤ اگر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا ظہور علامات کے بعد آئے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ اسی کی توضیح یہ کہہ کر کی کہ ہونا کیا تھا تم کو ہی اس کے ذریعے ہلاک کیا جائے گا۔ یہ سورت مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریشِ مکہ کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیاتِ ہدایت کے مختلف نمونے دکھاتے اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبر دل کے سامنے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے۔ انہوں نے حق کو قبول کیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفا تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہ رکھتے تھے اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کر دیا جاتے۔ اس آیت میں قریش کو آخری عذاب کی اطلاع دی گئی ہے کہ تمہیں اپنے ظلم کی پاداش میں ضرور ہلاک ہونا ہے۔

نبوت کی غرض و غایت

۵۴ - اور ہم رسولوں کو صرف اس لیے روانہ کرتے ہیں کہ خوشخبری سنائیں اور آگاہ کریں۔ یعنی تم جو عذاب الٰہی سے نڈر اور بے فکر ہو کر بیہودہ فرمائشیں اور دراز کار سوالات کر کے پیغمبر علیہ السلام کو دق کرتے اور ان کی تصدیق کے لیے خود ساختہ معیار تراشتے ہو۔ خوب سمجھ لو کہ پیغمبر دنیا میں اس لیے نہیں بھیجے گئے کہ تمہاری ایسی واہی تباہی فرمائشیں پوری کرتے رہا کریں۔ ان کی بعثت کی غرض صرف تبشیر و انذار اور تبلیغ و ارشاد ہے۔ وہ خدا کی طرف سے اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ فرمانبرداروں کو بشارت سنائیں اور نافرمانوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کریں۔ آگے ہر شخص کی کمائی اس کے ساتھ ہے۔

اس میں نبوت کی آمد کی دو غرضیں بتائی گئی ہیں ایک تبشیر دوسرے انذار۔ تبشیر یہ ہے کہ ان لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی خوشخبری دی جائے جو خدائی دستور حیات کو قبول و اختیار کر لیں۔ اور انذار یہ کہ ان لوگوں کو ڈرایا جائے جو خدائی دستور حیات کے مقابلہ میں انکار و طغیان قائم کریں۔ تبشیر و انذار ہی کی ہم آہنگی کا نام تبلیغ ہے۔ اگرچہ تبلیغ کے لفظی معنے پہنچانے کے ہیں لیکن اللہ کے دین کو اس طرح پہنچانا کہ فضائل کی ترغیب اور رذائل سے ترہیب پر مشتمل ہو دین کی تبلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسروں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں اس کا نام تبشیر ہے اور جس چیز کو ہم بُرا سمجھتے ہیں اس کی برائی کو دوسروں تک پہنچائیں اور ان کو اس سے بچنے کی دعوت دیں اسی کا نام انذار ہے۔ یہاں مبشرین و منذرین کا متعلق محذوف ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ ہم نے رسولوں کو انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے قرآن میں دوسرے مواقع پر اس کی صراحت موجود ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

قرآن کی آیت بتا رہی ہے کہ نبی کا سب سے پہلا کام تبشیر و انذار ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا کی جانب سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آشنا کیا ہے اس سے ہم جنسوں کو باخبر کرنا جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا، اور اس سمجھانے، سچھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا۔ اس اعلان و دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں، ان کو رگ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھاتے اس کو کچل دینا اور مال و منال، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء و رسل کے بشیر اور نذیر ہونے کا مفہوم دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے اس فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلا واسطہ انہی کے فریضہ تبشیر و انذار کا اثر اور نتیجہ ہے۔

انبیاء سے بے نیازی کا انجام

۵۵۔ پھر جو بھی ایمان لائے اور ٹھیک ہو جائے تو اس کے لیے کوئی اندیشہ نہیں اور نہ وہ غمگین ہوگا اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ان کو ان کی بدعملیوں کی وجہ سے ضرور عذاب ہوگا۔ یعنی جس نے انبیاء کی باتوں پر یقین کیا اور اعتقاداً و عملاً اپنی حالت درست کر لی حقیقی امن اور چین اس کو نصیب ہوا اور جس نے خدا کی آیات کو جھٹلا کر ہدایت الٰہی سے روگردانی کی وہ نافرمانی اور بغاوت کی وجہ سے سخت تباہی اور عذاب عظیم کے پیچھے آگیا۔ العیاذ باللہ[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

آیات سے مراد آیات نبوت ہیں۔ یعنی وہ آیات جو انبیاء تبشیر و انذار کے موقعہ پر لوگوں تک پہنچاتے ہیں اس میں احکام اور معجزات دونوں داخل ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں پوری انسانیت کے لیے مدارِ نجات اور مدارِ ہلاکت بتایا گیا ہے۔ اس میں قرآن نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لاکر کھڑا کر دیا اور سب کے سامنے ایک ہی پیمانہ پیش کیا اور بتا دیا کہ انبیاء کی رہنمائی کے بغیر نہ انسانوں کو سعادت مل سکتی ہے نہ نجات مل سکتی ہے۔ وہ علم جس کی روشنی میں انسان اپنے خالق اور اس کائنات کا وجود بخشنے والی ذات اس کی اعلیٰ صفات اور اس کے اور بندوں کے تعلقات کی نوعیت کا علم ہوتا ہے۔ اسی کی روشنی میں انسان کی ابتداء اور اس کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور اس دنیا میں اس کا مقام اور رب کے مقابلے میں انسان کا موقف متعین ہوتا ہے اور اللہ کو راضی کرنے، غصہ دلانے اور آخرت میں انسان کو خوش نصیب و کامران یا ناکام و نامراد بنانے والے امور و اعمال اور انسان کے افکار و اعمال، اخلاق و عادات کے خواص، ان کی جزا و سزا اور انسانوں سے صادر ہونے والے اقوال و اعمال اور اعتقادات کے نتیجے میں ملنے والے ثواب یا عذاب اور طویل مدت تک اثر انداز ہونے والے نتائج کی نشاندہی ہوتی ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو علم النجات کہا جاتا ہے۔ اسی پر انسان کی سعادت و شقاوت کا دارومدار ہے وہ اسی کو دوسروں تک پہنچانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں جو اس کو مانتا ہے اور اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے اس کو قرآن یہ خوشخبری دیتا ہے لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون۔ یعنی خوف و غم دونوں سے محفوظ ہوں گے۔ درحقیقت انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہی چہرہ دوسرے مقام پر اولیاء اللہ کا پیش کیا ہے۔ اس کے مقابلے پر وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی تکذیب کرتے ہیں، کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں ان کو ان کی بدکرداریوں کے نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔ آیت میں عذاب سے دنیوی اور اخروی دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ
اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ ع ۹ ۵ ۱۱
يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا
شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ
حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا
اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ
عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ ع ۵ ۶ ۱۲
الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

اے پیغمبر کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس
خدائی خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں
اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔[57] میں تو صرف اس
وحی کا پیروکار ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے، ان سے پوچھو
کہ کیا بینا اور نابینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا تم غور و
فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔[58] اور اے پیغمبر تم اس وحی کے
ذریعے سے ان لوگوں کو آگاہ کر دو جو اس بات کا اندیشہ رکھتے
ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا اور وہاں
ان کا اللہ کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہ ہوگا شاید وہ
متقی ہو جائیں۔[59] اور اے پیغمبر ان لوگوں کو جو صبح و شام
خدا کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے رہتے ہیں اپنے
پاس سے نہ نکالو ان کے کاموں کی جوابدہی تمہارے

ذمہ نہیں اور نہ تمہاری جوابدہی ان کے ذمہ ہے، پھر بھی اگر ان کو اپنے سے علیحدہ کرو گے تو تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے[۶۰]۔ اور اسی طرح ہم نے بعض انسانوں کو بعض کے لیے پرچہ آزمائش بنایا ہے تاکہ کہنے والے کہہ سکیں۔ کیا یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے انعامات کے لیے ہم میں سے چن لیا ہے، کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے[۶۱]۔ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو ان سے کہو سلام علیکم تمہارے رب نے رحم وکرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے[۶۲]۔ یہ اس کا رحم وکرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی سے کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے[۶۳]۔ اور

اسی طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر پیش کرتے ہیں اور اس لیے
بیان کرتے ہیں تاکہ جرم پیشہ لوگوں کی راہ واضح ہو جائے۔ ۶۴

مقامِ نبوت کی حد بندی

نبی شناسی کے بارے میں انسان کی عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ ہمیشہ ماورائے فطرت عجائب و غرائب کا خواہشمند رہتا ہے اور اس کی عجائب پسند طبیعت اس پر قانع نہیں ہوتی کہ سچائی اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو جائے یہی گمراہی ہے جس نے اہل مذاہب کی راہ کو توہم پرستیوں کی راہ بنا دیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے داعیوں کو انسانیت کی سطح سے بلند کر کے الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا۔ حضرت عیسیٰؑ اور رام چندر کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جابجا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق وضاحت کی ہے محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں ہے اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج امور ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی مخاطبہ الٰہی تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں، جیسا کہ پہلے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں پوری قوت سے بتایا ہے کہ نبی کیا ہے اور کیا نہیں ہے فرمایا کہ نبی وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آتی ہے اور اس وحی کے ذریعے انذار کا کام کرے۔ نبی وہ نہیں ہے جو خزانوں کا مالک ہو۔ غیب دان ہو یا فرشتہ ہو۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا صرف اس لیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لوگوں کا ذہن صاف ہو جائے اور اس کا کوئی موقع باقی نہ رہے کہ وحی کی جگہ علم غیب کا اور عبدیت کی جگہ معبودیت کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا۔ گمراہ قوموں میں نبی کے بارے میں دانائے غیب، حاضر و ناظر، خدا کے بیٹے ہونے، تین میں سے تیسرا ہونے کے تصورات کی بنیاد پر قرآن نے یہاں ضرب کاری لگائی ہے اور اس آیت میں واضح کر دیا کہ حضور انور کا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی آتی ہے اور بس۔ یہی نبوت ہے اسی پر آپ چلتے ہیں

دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلاتے ہیں۔

۵۷۔ اے پیغمبر کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدائی خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اس آیت میں منصب رسالت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو، اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الٰہیہ کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جاتے وہ ضرور ہی کر دکھائے یا تمام معلومات غیبیہ وشہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو وہ بتا دیا کرے یا نوع بشر کے علاوہ وہ کوئی اور نوع ہے جو لوازم وخواص بشریت سے اپنی برأت ونزاہت کا ثبوت پیش کرے۔ جب ان باتوں میں سے وہ کسی بات کا مدعی نہیں ہے تو فرمائشی معجزات اس سے طلب کرنا یا ازراہ تعنت وعناد اس قسم کا سوال کرنا کہ قیامت کب آئے گی یا یہ کہنا کہ یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں خرید وفروخت کے لیے جاتے ہیں اور ان ہی امور کو معیار تصدیق وتکذیب قرار دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے[1]

لوگوں نے جو نبی شناسی کا غلط پیمانہ بنا رکھا تھا کہ جو شخص پیغمبر ہو اسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے۔ اس سے عجائب وغرائب صادر ہونے چاہئیں، مقدورات الٰہیہ کے خزانوں پر اسے دسترس ہونی چاہیے، وہ ایک اشارا کرے اور پہاڑ سونے کا ہو جاتے۔ اسے معلومات غیبیہ ہونی چاہئیں اس پر اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں۔ بالفاظ دیگر وہ نوع انسان سے بالا مخلوق ہو۔ مختار کل ہو اور داناتے غیب ہو۔ اس آیت میں قرآن نے اسی غلط پیمانے کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پر اللہ کی وحی آئے وہ فرشتہ نہیں ہوتا، مختار کل نہیں ہوتا اور داناتے غیب نہیں ہوتا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ لوگو میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں ان میں مختار ہوں جس کو جو چاہوں عطا کروں۔ قرآن نے اس جملے کے ذریعے ان لوگوں کے ذہن کی اصلاح کی جو سمجھتے ہیں کہ

> باپ بیٹے سے محبت رکھتا ہے اور اس نے سب چیزیں اس کے ہاتھ میں دے دی ہیں۔　　　　(یوحنا ۳ - ۳۶)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں قرآن نے اسی ذہنی افتاد کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ نبوت کے بارے میں یہ احمقانہ تصور ہے۔ اس پر تفصیلی بحث تو پارہ نہم میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اگرچہ عیسائی دنیا حضرت عیسٰی کے بارے میں تصور یہ رکھتی ہے کہ حضرت عیسٰی کو اللہ نے مختار کل بنادیا جیساکہ انجیل متی میں ہے کہ

میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا

اور

یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان و زمین کا کل اختیار مجھے دے دیا گیا ہے۔

لیکن قرآن نے مسلمانوں کو نبوت کے بارے میں جو ہدایت کی ہے وہ یہی ہے کہ مالک کل اور مختار کل صرف اللہ کی ذات ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختار کل نہیں ہیں اس معاملہ میں شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر مسلمانوں میں کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ اور صرف تکوینی امور میں نہیں بلکہ اہل السنہ والجماعۃ کے ائمہ نے پوری قوت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ تشریعی امور میں بھی انبیائے کرام کا کسی نوع سے دخل نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اہل تشیع کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے سارے معاملات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کے سپرد کر دیے ہیں۔ چنانچہ شیعہ دوستوں کی مشہور و مستند کتاب اصول کافی میں ہے :

باب التفویض الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والی الائمۃ علیہم السلام فی امر الدین۔

ایک باب قائم کیا ہے اور اس کی تائید کے لیے امام جعفر صادق سے چند حدیثیں پیش کی ہیں، ایک حدیث یہ ہے :

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے معاملات اپنے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ ان کی اطاعت کیسی ہے پھر یہ آیت پڑھی ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا۔

(اصول کافی)

اور ایک دوسری حدیث انہوں نے لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفویض تمام ائمہ کو بھی حاصل تھی چنانچہ اصول کافی ہی میں لکھا ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت میں منفرد رہا، پھر اس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی اور حضرت فاطمہ کو پیدا کیا۔ ایک ہزار سال تک سلسلہ یوں ہی رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو پیدا کیا اور ان کو اشیاء کے پیدا کرتے وقت حاضر کیا اور ان کی فرمانبرداری ان پر فرض کی اور ان تمام اشیاء کو ان کے سپرد کر دیا، لہٰذا وہ جو چاہتے ہیں حلال کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں حرام کرتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ حضور انور، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور دوسرے ائمہ کے بارے میں مختار کل ہونے کا عقیدہ سارے شیعوں کا نہیں ہے بلکہ شیعہ حضرات کا ایک خاص گروہ ہے جس کو المفوضہ کہا جاتا ہے۔ شیخ جیلانی نے غنیۃ الطالبین میں ان کا چہرہ اس طرح پیش کیا ہے۔

ایک فرقہ مفوضہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے معاملات ائمہ کو تفویض کر دیے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، جہان کو پیدا کرنے اور اس کی تدبیر کرنے کی قدرت عطا کر دی ہے۔ (غنیۃ الطالبین ص ۲۲۱)

اور مشہور متکلم علامہ میر سید شریف جرجانی نے اس فرقہ کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

مفوضہ فرقہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا اور دنیا و مافیہا کی پیدائش آپ کے سپرد کر دی چنانچہ اب دنیا و مافیہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی پیدا کیا ہے۔

(شرح مواقف)

لیکن یہ قرآن کی اس قسم کی کھلی تصریحات کے خلاف ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کی رائے عامہ نے کبھی اس خیال کو شرف پذیرائی نہیں دیا۔ قرآن نے اس خیال کی برملا تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مختار کل نہیں ہے۔ احادیث صحیحہ سے بھی یہی ثابت ہے اور یہی تمام صحابہ کرام اور جمہور سلف و خلف کا اسلامی عقیدہ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لا اقول لکم عندی خزائن اللہ کی تشریح اس طرح فرمائی ہے لست املکھا ولا اتصرف فیھا یعنی میں اللہ کے خزانوں کا مالک نہیں ہوں اور نہ ان میں کوئی تصرف کرتا ہوں۔ اور امام بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے ای خزائن رزقہ فاعطیکم ما تریدون کہ میرے پاس اللہ کے رزق کے خزانے نہیں ہیں کہ میں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق دوں اور علامہ خازن بغدادی لباب التاویل میں لکھتے ہیں والمعنی لیس عندی خزائن رزق اللہ فاعطیکم منھا ما تریدون۔ مطلب یہ ہے کہ

میرے پاس اللہ کے رزق کے خزانے نہیں ہیں کہ تم کو تمہاری مرضی کے مطابق دے سکوں۔ اسی طرح دوسرے شارحین قرآن نے بھی اس کا مطلب یہی بتایا ہے اور سب نے اس کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ اللہ کے خزانے میرے سپرد نہیں کیے گئے ہیں کہ میں جیسے چاہوں ان میں تصرف کر دوں۔

حیرت ہے کہ مفتی احمد یار خاں نے اس کا یہ مطلب کیسے سمجھ لیا کہ ہوں تو میں اللہ کے خزانوں کا مالک مگر میں دعویٰ نہیں کرتا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ،

اس میں دعویٰ کی نفی ہے خزانہ پاس ہونے کی نفی نہیں ہے، حضور نے فرمایا ہے اوتیت مفاتیح خزائن الارض ۔

موصوف کی یہ بہت بڑی جسارت ہے کہ وہ لوگوں کو بتارہے ہیں کہ پیغمبر ہے تو مالک خزائن مگر اس کا دعویٰ نہیں کرتا ہے، ان دونوں میں کیا تک ہے۔ حالانکہ جو حدیث پیش کی ہے وہ بھی ایک دعویٰ ہے کہ مجھے روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں۔ قرآن کی آیت اور ارشادِ نبوت اپنے مطلب میں واضح ہیں۔ دراصل ارشادِ نبوت کا مطلب وہ نہیں ہے جو مفتی صاحب سمجھے ہوتے ہیں۔ اس ارشاد کا صحیح مطلب وہی ہے جو شارحینِ حدیث نے بتایا ہے اگر یہی بات ہے جو مفتی صاحب فرمارہے ہیں تو پھر اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن کریم میں آپ سے یہ اعلان کرائے کہ آپ فرمادیں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے نہیں ہیں۔ اور حضور اقدس اس کے مقابلہ میں یہ فرمائیں کہ مجھے زمین کے خزانے دیے گئے ہیں۔ یہ سرتاسر غلط ہے بلکہ حدیث کا صحیح مطلب وہی ہے جو شارحین نے پیش کیا ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خبر دی ہے کہ آپ کی امت زمین کے خزانوں کی مالک ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اور علامہ عزیزی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ

اس میں استعارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہروں کے فتح کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اور دنیا جانتی ہے کہ بذریعہ خواب آپ کو یہ بشارت سنائی گئی تھی، چنانچہ صحیح مسلم میں بینا انا نائم کی صراحت موجود ہے۔

بہر حال حدیث کے منہ میں اپنی کج فکری سے غلط مطلب ڈالنا اور پھر اسے قرآن بتانا قرآن کی ہرگز خدمت نہیں ہے۔

دوسری بات اس آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ لوگو میں غیب دان نہیں ہوں۔ لا اعلم الغیب۔ غیب کا علم وہ ہے جو بغیر کسی ذریعے اور وسیلے کے خود بخود حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف اس کا ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو اور یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اور جس کا اپنا وجود ہی خود بخود نہ ہو اس کے بارے میں یہ سوال کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اس کا علم خود بخود ہو سکتا ہے۔ انبیا کا وجود بھی عطائی ہوتا ہے اس لیے ان کا علم بھی عطائی ہوتا ہے۔ عطائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیب کی معلومات بذریعہ وحی عطا فرماتے ہیں اور جو علم کسی ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وہ علم غیب نہیں بلکہ اطلاع غیب اور اظہار غیب ہے۔ جب یہ حکم دیا گیا کہ تم یہ کہو لا اعلم الغیب میں غیب نہیں جانتا تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ میں ذاتی طور پر نہیں جانتا عطائی طور پر غیب جانتا ہوں۔ جب نبی کی ہر چیز وجود رسالت سب کچھ عطائی ہوتا ہے تو علم بھی عطائی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے وحی کے ذریعے غیب کی اطلاع ہوتی ہے مگر غیب دان نہیں نہ ذاتی طور پر اور نہ عطائی طور پر، اس لیے لا اعلم الغیب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کی نفی قطعاً ثابت ہے اور اس آیت سے نفی علم غیب پر سند لانا منصوص اور ادر بر محل ہے اور علم غیب عطائی ہی کی نفی مراد اور متعین ہے۔ اس میں رتی برابر تسک اور شبہ نہیں، یہ ایک بے غبار حقیقت ہے اور اس نفی کا قرآن حکیم کی کسی آیت سے تعارض نہیں ہے۔

بعض شارحین قرآن نے لا اعلم الغیب کو تواضع پر محمول کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ علامہ آلوسی بغدادی روح المعانی میں رقمطراز ہیں کہ جن لوگوں نے لا اعلم الغیب کو تواضع پر محمول کیا ہے ان کا موقف بے معنے اور بے حقیقت ہے۔ یعنی تواضع کی صورت میں آیت قرآنی میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہے اور اسے عقل بھی قبول نہیں کرتی ہے کہ آپ ہوں تو دانائے غیب اور تواضع کے طور پر فرمائیں کہ میں دانائے غیب نہیں۔ تواضع خلاف واقعہ بات کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ ایسے موقعہ پر تواضع کا پیمانہ یہ ہے کہ میں غیب دان ہوں لیکن یہ میرا کمال نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اور قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہیں دنیا جانتی ہے قرآن میں کھلے طور پر آپ کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ اعلان کر دیں لا اعلم الغیب، یہی اظہار حقیقت ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ کہہ دیجئے لا اقول لکم انی ملک نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں لوگوں کا خیال تھا کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے کیونکہ فرشتہ اللہ کی بڑی مقدس اور نورانی مخلوق ہے لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی اور پیغمبر کے لیے مقدس ہونے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ جن انسانوں کی ہدایت کا اس کو کام کرنا ہے وہ ان کے رجحانات، ان کے مزاج اور

ان کے احساسات اور جذبات سے واقف ہو۔ فرشتے بے شک نورانی ہیں لیکن انسانی جذبات، احساسات اور انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے وہ بے چارے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں بلکہ وہ تو ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوک، پیاس، غصہ، حسد، نفسانی شہوت ان چیزوں کی حقیقت بھی نہیں جانتے۔ یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی زندگی میں بہت سی کیفیتیں ایسی ہیں جو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان ان سے گزرتا ہے۔ بہرحال انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ جو ہدایت کرنے والا ہو وہ انسان کے حالات سے اور اس کے رجحانات سے پوری طرح واقف ہو اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں میں سے روانہ کیے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ نبی ہوتا تو فرشتہ ہے مگر دعویٰ فرشتہ ہونے کا نہیں کرتا جیسے لوگوں نے پہلے دو فقروں کا یہ کہہ کر منہ بگاڑا ہے کہ ہوں تو اللہ کے خزانوں کا مالک مگر دعویٰ نہیں کرتا اور ہوں تو میں غیب دان مگر غیب دانی کا مدعی نہیں بلکہ واضح مطلب یہ ہے کہ میں نہ اللہ کے خزانوں کا مالک ہوں نہ میں غیب دان ہوں اور نہ میں فرشتہ ہوں۔ یہاں معاذ ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر تم کیا ہو، اسی بات کا جواب آگے آرہا ہے۔

نبی صاحبِ وحی ہوتا ہے

۵۸۔ میں تو صرف اس وحی کا پیروکار ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے، ان سے پوچھو کہ بینا اور نابینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں، کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔ یعنی اگرچہ پیغمبر نوعِ بشر سے علیحدہ کوئی نوع نہیں ہے لیکن اس کے اور باقی انسانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ انسانی قوتیں دو قسم کی ہیں علمی اور عملی۔ قوتِ علمیہ کے اعتبار سے نبی اور غیر نبی میں اعمیٰ اور بصیر کا فرق سمجھنا چاہیے۔ نبی کے دل کی آنکھیں ہر وقت مرضیاتِ الٰہی کے لیے کھلی رہتی ہیں جس کے بلاواسطہ مشاہدے سے دوسرے انسان محروم ہیں اور قوتِ عملیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے قول و فعل اور ہر ایک حرکت و سکون میں رضائے الٰہی اور حکمِ خداوندی کے تابع و منقاد ہوتے ہیں۔ وحی سماوی اور احکامِ الٰہیہ کے خلاف نہ کبھی ان کا قدم اٹھ سکتا ہے نہ زبان حرکت کر سکتی ہے۔ ان کی مقدس ہستی اخلاق و اعمال اور کل واقعاتِ زندگی میں تعلیماتِ ربانی اور مرضیاتِ الٰہی کی روشن تصویر ہوتی ہے جسے دیکھ کر غور و فکر کرنے والوں کو ان کی صداقت اور مامور من اللہ ہونے میں ذرہ بھی شبہ نہیں رہ سکتا۔[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ جن حقیقتوں کو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے وہ براہ راست میرے تجربہ میں آئی ہیں۔ مجھے وحی کے ذریعے سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی ہے بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو، تم ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو وہ یا قیاس وگمان پر مبنی ہیں یا محض اندھی تقلید پر لہٰذا میرے اور تمہارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے اور اسی اعتبار سے مجھے تم پر فوقیت ہے نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی خزانے ہیں یا میں عالم الغیب ہوں یا فرشتہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں نبوت کا چہرہ بتانے کیلئے دو باتیں مثبت اور دو باتیں منفی کہی گئی ہیں۔ صفات مثبتہ میں عبدیت کو پیش کیا گیا ہے جس کے لوازم میں امتثال امر اور اتباع وحی ہے دوسرے بشریت جس کے لوازم میں اکل وشرب اور خوف ورجا ہے۔ اسی طرح دو صفات کی نفی ہے خواص الوہیت کی مثلاً اختیار ناطق اور علم محیط اور تنزہ عن البشریہ کی۔ حاصل یہ ہے کہ نبی وہ عبد کامل ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آتی ہے وہ نہیں ہے جو مختار کل اور دانائے غیب ہو اس طرح اس آیت میں نبوت ورسالت کی ساری حقیقت بیان فرما دی ہے اور بتا دیا کہ نبی صاحب وحی ہوتا ہے اور اس کا ہر قدم وحی الٰہی کی روشنی میں اٹھتا ہے اور تمام تر وحی الٰہی کا اتباع کرتا ہے۔ اس طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔ انبیاءؑ دوسرے انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص ولوازم میں ان سے صریحاً الگ بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع فرماتے ہیں۔ اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی۔ تم میں میرے مثل کون ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے۔ اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ وکذالک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم اور اسی طرح سارے انبیاء ہیں ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتے۔ الغرض نبی اور غیر نبی میں وحی کا جو فرق ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ ان میں وحی ورسالت کے تمام

لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق و امتیاز ہے اسی لیے کسی انسان کو صاحبِ وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ماننا پڑے گا۔

اسلام میں نبوت کا اجتہاد

یہاں امام رازی نے یہ بات خبر نہیں کیوں لکھ دی کہ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی کہہ رہا ہے کہ پیغمبر احکام کی حد تک صرف وحی کی پیروکاری کرتا تھا اور اس کو اس آیت کی وجہ سے اجتہاد کی اجازت نہ تھی۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے اور نہ یہ آیت منطوقاً یہ بات بتا رہی ہے کہ حضور انور کو اجتہاد کی اجازت نہ تھی اور آپ ہر حکم وحی کے ذریعے بتاتے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے، اور مکی زندگی میں کوئی اسلام کا نظامِ حیات نہ تھا۔ دعوتِ اسلامی صرف اصول اور کلیاتِ دین تک محدود تھی یعنی توحید، رسالت، جزا و سزا، ترغیب اور ترہیب، اور معلوم ہے کہ ان میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، اجتہاد کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب پورا اسلامی نظام قائم ہوا۔ یعنی مدینہ میں۔ قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہیں آپ پڑھ سکتے ہیں کہ قرآن نے آپ کو یہ کہہ کر اجتہاد کا پروانہ دیا ہے لتحکم بین الناس بما اراک اللہ لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اجتہادِ نبوی کے متعلق دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اجتہادِ نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے۔ مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبر کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور پر شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم منصبِ نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے۔ اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح احکام منصوصہ کی تفصیل کسی کلی کے جزئیات، مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں بیان فرما دیتے تھے۔

دوسری یہ کہ اجتہادِ نبوی دوسرے عام مجتہدین کے اجتہادات کے برعکس خطا و غلطی سے یکسر پاک ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے اپنی رائے نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ارات ہوتی ہے، اسی لیے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔

پیغمبرانہ اجتہاد کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیشِ منظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ اس سے مقصود وہ قوتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خاص سینۂ نبوت میں ودیعت فرماتا ہے اس لیے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظی مشارکت

ہے معنے کی نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ دسویں پارے میں آ رہی ہے۔

دعوت کا میدان

۵۹۔ اور اے پیغمبر تم اس وحی کے ذریعے ان لوگوں کو آگاہ کر دو جو اس بات کا اندیشہ رکھتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا اور وہاں ان کا اللہ کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہ ہوگا شاید وہ متقی ہو جائیں۔ یعنی جو لوگ فرمائشی معجزات دکھلاتے جانے پر اپنے ایمان کو موقوف رکھتے اور ازراہ تعنت و عناد آیات اللہ کی تکذیب پر تلے ہوتے ہیں ان سے قطع نظر کر لیجئے کیونکہ تبلیغ کا فرض ادا ہو چکا اور ان کے راہ راست پر آنے کی کوئی توقع نہیں، اب وحی الٰہی اور قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو متنبہ کرنے کا مزید اہتمام فرمائیے جن کے دلوں میں محشر کا خوف اور عاقبت کی فکر ہے کیونکہ ایسے ہی لوگوں سے امید ہو سکتی ہے کہ نصیحت سے متاثر اور ہدایت قرآنی سے منتفع ہوں[1]

مطلب یہ ہے کہ آپ کے مخاطب اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ ہیں جن کو اپنے اعمال کی بازپرس کی کوئی فکر نہیں ہے اور جو اس امید پر زندگی گزار رہے ہیں کہ دنیا میں جو چاہیں کریں آخرت میں ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی کیونکہ ہمارا نسب فلاں سے ملتا ہے یا ہماری نسبت فلاں سے ہے وہ ہماری مدد کو آجائیں گے اور ہمیں سفارش کر کے بچا لیں گے یا فلاں ہمارے لیے کفارہ بن جائے گا۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو یہ اندیشہ ستاتے ہوتے ہے کہ ہمیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے اور اس اندیشہ کے ساتھ ان کو اس کی بارگاہ میں کسی جھوٹی مدد اور بناوٹی سفارش کا بھی سہارا نہیں۔ قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں مدہوش ہیں ان کی طرف سے آپ اپنی توجہ ہٹا لیجئے۔ اس قسم کے لوگوں پر آپ کی نصیحت کارگر نہ ہوگی۔ ان کی ہدایت میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے بلکہ دوسری قسم یعنی ان لوگوں کی طرف توجہ فرمائیے جن کی ایمانی استعداد ظاہر ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور نبوت کی پکار ان لوگوں کے لیے نافع ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں جو اپنی فطری صلاحیتوں کو سچ کر دیتے ہیں ان کو نہ قرآن سے نفع پہنچتا ہے اور نہ نبوت سے۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اس شفاعت کی نفی نہیں جو مسلمانوں کے نزدیک انبیاء، ملائکہ صالحین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے ثابت ہے کیونکہ یہ شفاعت مستقلاً نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیابتہً ہوگی، دونوں میں فرق ہے کہ آپ اپنا شفیع خود مقرر کریں، دوسرے یہ کہ آپ کا شفیع اللہ سبحانہٗ مقرر کریں۔ پہلی کافرانہ شفاعت ہے اور دوسری اسلامی شفاعت ہے۔

نبوت پر کسی عیب و صواب کی ذمہ داری نہیں

۶۰۔ اور اے پیغمبر ان لوگوں کو جو صبح و شام خدا کو اس کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے رہتے ہیں ان کو اپنے پاس سے نہ نکالو ان کے کاموں کی جوابدہی تمہارے ذمہ نہیں اور نہ تمہاری جوابدہی ان کے ذمہ ہے، اس کے باوجود بھی اگر تم ان کو اپنے سے علیحدہ کردو گے تو تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہوجاؤ گے، یعنی رات دن اس کی عبادت میں حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ جب ان کا ظاہر حال یہ ہے تو اسی کی مناسبت سے ان سے معاملہ کیجئے۔ ان کا باطنی حال کیا ہے یا آخری کیا ہوگا اس کی تفتیش و محاسبہ پر معاملات موقوف نہیں۔ یہ حساب نہ آپ کا ان کے ذمہ ہے نہ ان کا آپ کے۔ لہٰذا اگر بالفرض آپ دولت مندوں کی ہدایت کی طمع میں ان غریب مخلصین کو اپنے پاس سے ہٹا دیں گے تو یہ بات بے انصافی کی ہوگی۔ کافروں میں بعض سرداروں نے حضرت سے کہا کہ تمہاری بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے لیکن تمہارے پاس رذیل لوگ بیٹھتے ہیں، ہم ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ اس پر یہ آیت اتری یعنی خدا کے طالب اگرچہ غریب ہیں لیکن ان کی خاطر ہی مقدم ہے[1]۔

جس واقعہ کی طرف حضرت شاہ صاحب نے اشارہ فرمایا ہے وہ مسند امام احمد میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کے حوالہ سے اس طرح آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت صہیب، حضرت عمار، حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم جیسے دولت ایمان سے مالامال لیکن دولت دنیا سے محروم حضرات تشریف فرما تھے کہ مشرکین کے چند سردار آئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اگر آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے باہر نکال دیں تو ہم آپ کی تقریر سن لیں۔ آپ کے دل میں یہ خیال ہی پیدا ہوا تھا کہ اگر یہ لوگ توحید سن لیں اور میں اپنے رفقا کو اس مصلحت کے لیے مجلس سے اٹھا دوں تو حرج ہی کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو غربا سے وہ محبت ہے جو عموماً سرمایہ داروں سے نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت کی کہ آپ ہرگز ایسا نہ کریں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختار کل نہ تھے ورنہ یہ تنبیہہ نازل نہ ہوتی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی کو چاہیے کہ اپنی قوت اصلاح مستعد طبیعتوں کی تربیت میں صرف کرے، اگرچہ تھوڑے اور کمزور ہوں۔ ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع نہ کرے جن میں قبولیت کی استعداد نہیں اگرچہ بظاہر طاقتور اور بہت سے ہوں۔ گویا بتا دیا کہ جو شامت زدہ لوگ اپنے غرور مال میں مست ہیں تمہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ تمہارے ساتھی بے نوا، غریب اور مفلس ہیں، ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرو اور ان کے ایمان کی فکر میں پڑ کر ان سے غفلت نہ کرو جو اللہ کی آیات پر ایمان لا چکے ہیں اور صبح و شام اللہ کی عبادت میں لگے ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس لیے نہیں ہوئی کہ آپ سے یہ اندیشہ تھا کہ آپ صحابہ کرام کو نظر انداز کر دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے بلکہ اس لیے ہوئی ہے تاکہ اس طرح سرداران قریش کے تمرد و غرور پر ضرب لگائی جائے لیکن مخاطب ان کو نہیں بنایا بلکہ حضور انور کو مخاطب کر کے واضح کر دیا کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو مخاطب بنایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو بکواس کرتے ہیں کرنے دو آپ ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں یدعون ربھم بالغداۃ والعشی میں صبح و شام کے مقررہ حسی اوقات مراد نہیں بلکہ دوام مراد ہے۔ یعنی دن رات اپنے فرائض میں لگے رہتے ہیں جانباز سپاہی کی طرح ہر وقت اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہتے ہیں۔ یہ زمخشری کی نکتہ آفرینی ہے۔ یریدون وجھہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہمہ وقتی دعا، طلبگاری عبادت اور فرائض کی ادائیگی میں تمام تر رضائے الٰہی کو پیش نہاد بنا کر لگے رہتے ہیں۔ یعنی ان کی ساری عابدانہ زندگی کا منتہائے نظر اللہ کی رضامندی اور خوشنودی ہے کیونکہ عبادت اور طاعت کے تصور کے ساتھ اجر کا تصور اسی طرح لازم ہے جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور، اس لیے اگر دین کا بنیادی تصور اور فریضہ اللہ کی عبادت ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس عبادت سے اس کا مقصد اللہ سبحانہ سے اجر کا حصول ہے۔ پھر چونکہ کسی بالاتر ہستی کی خدمت و طاعت کا اجر اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ اس کار خدمت اور عمل طاعت کا پسندیدہ اور قابل قبول پا کر اس سے خوش ہو گئی ہو اس لیے فطری بات ہے کہ طالب اجر کی نظر اجر سے پہلے اپنے مالک کی خوشنودی پر جمی رہے گی، وہ اگر خوش ہو گیا تو گویا اجر حاصل ہی ہو گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر

یہ یریدون وجہہ کا واضح تقاضا یہ ہے کہ عابد کی غرض اپنے مالک کی رضا جوئی ہوتی ہے اور اپنا فریضہ منصبی ادا کرتے ہوئے اس کی نظریں ہر وقت اسی غایت پر جمی رہتی ہیں۔ یہاں قرآن نے صحابہ کی عابدانہ زندگی کے اسی پہلو سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔

آخر میں فرمایا ما علیک من حسابہم من شیء، تو اس کے دو مطلب بتائے گئے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عیب وصواب کا ذمہ دار خود ہی ہے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے کسی شخص کی جوابدہی کے لیے آپ نہ کھڑے ہوں گے اور آپ کی جوابدہی کے لیے ان میں سے کوئی نہ کھڑا ہوگا۔ آپ کے حصہ کی کوئی نیکی یہ آپ سے چھین نہیں سکتے اور اپنے حصہ کی کوئی بدی آپ پر ڈال نہیں سکتے پھر جب یہ محض طلب حق کے داعیہ سے آپ کے پاس آتے ہیں تو آخر آپ کیوں ان کو اپنے سے دور کریں۔ اور علامہ آلوسی نے یہ مطلب بتایا ہے کہ ان کے ایمان وعمل کا حساب آپ سے نہیں لیا جائے گا۔ آپ کا فریضہ رسالت تو صرف یہ ہے کہ ظاہر اعمال کو دیکھیں اور ان کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔ باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد کریں۔ ان کا ظاہر وہ ہے جو ہم نے بتا دیا ہے اس صورت میں ضمیر ھم کا مرجع الذین یدعون ربہم ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم نے ان مشرکین کو دعوت پہنچا دی۔ اب اگر یہ اپنی گمراہی میں پڑے رہے تو اس کے بارے میں خدا کے ہاں آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔ مواخذہ انہیں سے ہوگا۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع مشرکین ہوں گے۔ لیکن بعد میں آنے والے فقرے فتطردھم میں ضمیر کا مرجع پھر الذین یدعون ہوگا۔ اس میں انتشار ضمائر ہے اور یہ شان بلاغت قرآنی کے خلاف ہے۔

امیری اور غریبی دونوں پرچہ امتحان ہیں

۶۱۔ اور اسی طرح ہم نے بعض انسانوں کو بعض کے لیے پرچہ آزمائش بنایا ہے تاکہ کہنے والے کہہ سکیں کیا یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے انعامات کے لیے ہم میں سے چن لیا ہے۔ کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے۔ یعنی دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا لائق ہیں اللہ کے فضل کے اور اللہ ان کے دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق مانتے ہیں [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اپنی ایک سنت، اور اپنا ایک دستور بیان کیا ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی کو جو دولت دی ہے تو اس بنا پر نہیں دی کہ وہ اسی کا حقدار تھا۔ اسی طرح کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسی کا سزاوار تھا بلکہ ایک کو دولت دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان کیا ہے وہ جن کو مال وجاہ دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پاکر اس کے شکر گزار، متواضع اور فرمانبردار بندے بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو دھتکارنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر اور اپنے نان جویں پر قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر پر خوددار رہتے ہیں یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی امتحان میں ہم نے ان کو ڈالا ہے۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تاکہ یہ ہمارے شکر گزار بندے بنیں۔ لیکن ان کی کج فہمی کے باعث ہماری نعمت ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی ساری نعمتوں کے پیدائشی حق دار ہیں۔ اس کج فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی تو کیا اس سے سرفراز کرنے اور اس انعام کی نوازش کرنے کے لیے اللہ سبحانہ کو یہی اراذل اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے ہیں۔ یعنی غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں سب سے پہلے ایمان کیوں ملا ہے۔ اگر یہ چیز کوئی اچھی ہوتی تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔ قرآن نے ان کے اس مردنے جواب میں کہا کہ الیس اللہ باعلم بالشاکرین کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو نہیں جانتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کی نعمت روٹی کپڑا مکان نہیں ہے۔ یہ آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے۔ یہ تو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار رہتے ہیں جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی۔ جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہ باندھی اور جنہوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہ ہونے دیا، دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے لیکن ایمان کی نعمت صرف ان ہی کو ملتی ہے جو خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

اہل ایمان کے لیے رحمت کی بشارت

۶۲۔ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو ان سے سلام علیکم کہو تمہارے پروردگار نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

ان اہلِ ایمان سے اگر بھول چوک بھی ہو جائے تو ان پر سختی نہ کرو بلکہ خدا کی رحمت کا پیام پہنچاؤ اور اس کی مغفرت کی بشارت سے ان کے دلوں کو تسکین دو۔ گویا فرمایا کہ ہمارے یہ بندے جن کو مشرکین غریب ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں جب آپ کے پاس آئیں تو آپ سلامتی اور رحمت کی دُعا کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں، اور ہماری طرف سے ان کو بشارت دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایماندار بندوں کے لیے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے وہ تم کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔ حضرت شیخ الاسلام نے بھی اپنے افادات میں اسی مطلب کو اپنایا ہے فرماتے ہیں :-

مومنین کو کامل سلامتی اور رحمت و مغفرت کی بشارت سنا دیجئے تاکہ ان غریبوں کا دل بڑھے اور دولت مند متکبرین کے طعن و تشنیع اور تحقیر آمیز برتاؤ سے شکستہ خاطر نہ ہوں۔

یہ یاد رہے کہ بندوں کی جانب سے اللہ سبحانہٗ پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں۔ من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، گنہ گاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے۔ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے قاہر ہے جبار ہے اور منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور اور رحمان و رحیم بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ان کو ہماری طرف سے سلام پہنچا دو اور تسلی کا یہ پیغام دو کہ ہمارا بابِ رحمت ہر وقت کھلا ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاء اللہ نویں پارے میں آ رہی ہے ۔

توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے

۶۳ - یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی سے کسی برائی کا ارتکاب کرے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ پیغمبر تبشیر و انذار کے لیے آتے ہیں۔ چنانچہ اس رکوع کے شروع میں و انذر سے شانِ انذار کا استعمال تھا۔ اب مومنین کے حق میں شانِ تبشیر کا اظہار ہے۔ یہ جو فرمایا کہ جو کوئی کرے تم میں سے بُرائی ناواقفیت سے، اس سے شاید یہ غرض ہو کہ مومن جو برائی کرتا ہے خواہ نادانستہ ہو یا جان بوجھ کر ہو وہ فی الحقیقت اس برائی اور گناہ کے انجامِ بد سے ایک حد تک ناواقف اور بے خبر ہی

ہوتا ہے۔ اگر گناہ کے نتائج کا پوری طرح استحضار ہو تو کون شخص ہے جو اس پر اقدام کی جرأت کرے[1]
یہاں ایک جامع قانون بتایا ہے کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب جہالت سے کرے۔ پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اپنے اعمال کو درست کرے تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا ہے۔ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا اور اللہ بہت رحمت کرنے والا ہے کہ صرف معافی پر اکتفاء کرے گا بلکہ مزید انعامات سے بھی نوازے گا۔ یہاں جہل نہیں جہالت کا لفظ بولا گیا۔ جہالت کے معنے عربی میں نہ جاننے کے نہیں آتے بلکہ اس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے ہیں۔ یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے۔

وللحلم خير فاعلمن مغبة
من الجهل الا ان تشمس من ظلم

جہالت جہل کے مقابلہ میں تحمل و بردباری انجام کے لحاظ سے اچھا ہے خوب جان لو ہاں یہ کہ تمہیں ظلم کی وجہ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جاتے۔
معلقات کا مشہور شعر ہے۔

الا لا يجهلن احد علينا
فنجهل فوق جهل الجاهلينا

خبردار کوئی ہمارے خلاف جہالت کا مظاہرہ نہ کرے کیونکہ ہم بھی سب جاہلوں سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے جب بھی کسی سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو جذبات سے مغلوب ہو کر ہی ہوتا ہے۔ اب اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ کرے پھر اس کے بعد توبہ کر کے اصلاح حال کرے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ آیت میں مغفرت و رحمت کا وعدہ بے قید نہیں بلکہ دو شرطوں کے ساتھ مقید ہے ایک توبہ دوسرے اصلاح عمل۔ توبہ کے معنے گناہوں پر ندامت کے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انما التوبة الندم، اصلاح عمل سے مقصود یہ ہے کہ آئندہ اس گناہ کے نہ کرنے کا عزم کرے اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے پامال ہوئے ہوں تا حد اختیار ان کی ادائیگی کرے چاہے وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، نماز نہ پڑھنے کا گناہ کیا ہے تو نماز کی قضا کرے اور اگر چوری کی ہے تو مال مالک کو واپس

[1] افادات شیخ الاسلام

کرے۔ مسند احمد میں حضرت علی کے حوالہ سے ارشاد نبوت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس مومن بندے سے محبت رکھتا ہے جو فتنوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ توبہ کرتا ہے۔

یہاں دو چیزیں ہیں ایک بندے کی فطرت دوسرے بندے کی صفت۔ گناہ اگر فطرت ہو تو توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنی فطرت کی بنا پر طرح طرح کے فتنوں میں گرفتار ہوتا رہتا ہے مگر ہر بار اپنی صفت توبہ و استغفار کو فراموش نہیں کرتا تو وہ ارحم الراحمین کی نظروں میں کیوں پیارا نہ ہو۔ یہاں محبت اس کے تکرار جرم پر نہیں بلکہ ہر بار اس کی صفت توبہ و استغفار پر ہے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار نہیں کیا گیا کہ گنہگار اپنے گناہوں پر اصرار کریں بلکہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو نادم و شرمسار ہیں وہ شکستہ دل نہ ہوں اور اپنی ندامت کی بدولت عصیان کے بعد بھی خدائے تعالیٰ کی مغفرت کی خوشخبری سن لیں۔ ندامت پر خدا تعالیٰ کی مغفرت کی خوشخبری گناہ کی جرأت نہیں پیدا کرتی بلکہ اس کی فطرت سے معصیت کا تخم جڑ سے نکال کر پھینک دیتی ہے اللھم اجعلنی من التوابین آمین

راہ باطل کی توضیح

۶۴۔ اور اسی طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں اور اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ جرم پیشہ لوگوں کی راہ واضح ہو جائے۔ یعنی اس لیے ہم احکام و آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں نیز اس لیے کہ مومنین کے مقابلہ میں مجرمین کا طریقہ بھی واضح ہو جائے[1] دراصل یہاں لتستبین کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ زمخشری نے پوری بات کو اس طرح کھولا ہے کہ:

اس طرح کا اشارا اس پوری تفصیل کی طرف ہے جو گزر چکی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس پیش کردہ تفصیل کی طرح ہم مجرمین کی نقاب کشائی میں بھی بات کھول کر بیان کر رہے ہیں تاکہ پتہ لگ جائے کہ ان مجرمین میں وہ کون ہیں جو قبول حق کی استعداد کھو بیٹھے ہیں اور وہ کون ہیں جن سے قبول کی امید ہے اور وہ کون ہیں جو اسلام میں آ رہے ہیں، مگر اسلامی حدود کی نگہبانی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم ان سب کا چہرہ آپ کے سامنے کھول کر پیش کر رہے ہیں تاکہ آپ ان سے ان کے حالات کے مطابق معاملہ کریں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی تاکہ آپ پر سب کا اندازِ فکر واضح ہو جائے اور کوئی چیز وجہ پریشانی نہ بنے۔
یہ قرآن عزیز کا اعجازی شاہکار ہے۔ بتانا یہ ہے کہ حقائق کو تفصیل سے بیان کرنے کے دو قاعدے ہیں ایک یہ کہ اہلِ نظر علم و حکمت سے مالا مال ہو جائیں اور حق کے بارے میں ان کو دلائل معلوم ہو جائیں تاکہ صحیح معنے میں آیات کی موعظت سے عبرت اندوز ہو سکیں اور دوسرے یہ کہ اہلِ نظر کے سامنے راہِ باطل کھل کر سامنے آجائے تاکہ اہلِ ایمان سے وہ ممتاز ہو جائیں۔ دونوں راہوں میں کسی قسم کا التباس اور اشتباہ نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ راہِ حق کے راہرو کے لیے راہِ باطل سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ راہیں دو ہیں ایک سبیل المومنین دوسرے سبیل المجرمین رہ روِ حق کے لیے ضروری ہے کہ باطل آشنا ہو تاکہ باطل سے اپنا دامن بچا سکے۔ قرآن نے یہاں بیان تو راہِ حق کی ہے لیکن اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اہلِ باطل کی راہ بھی مخاطبوں کے سامنے کھل کر آگئی۔

قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ
لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۵۶
قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِىْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ
الْفٰصِلِيْنَ ۝۵۷ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِىَ
الْاَمْرُ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۵۸

اے پیغمبر ان منکرین سے کہو کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی بندگی کروں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔[۶۵] نیز ان سے کہہ دو کہ میں کبھی تمہاری خواہشوں کے پیمانوں پر نہیں چلوں گا، اگر میں ایسا کروں تو پھر میں راہ حق سے ہٹ جاؤں گا، اور میں ان میں سے نہ رہوں گا جو ہدایت یافتہ ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ میں بلاشبہ اپنے پروردگار کی جانب سے

واضح اور صاف راہ پر ہوں اور تم نے اس کی تکذیب کی ہے ۶۷

میرے پاس وہ کچھ نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو

حکم تو بس اللہ ہی کا ہے وہ ہی حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب سے

بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۶۸ اے پیغمبر کہہ دو کہ جس بات کے لیے

تم جلدی کر رہے ہو اگر وہ میرے اختیار میں ہوتی تو مجھ میں اور

تم میں کب کا فیصلہ ہو گیا ہوتا اور اللہ ظلم کار لوگوں کو خوب جانتا

ہے ۶۹

راہِ نبوت سرتاسر یقین کی راہ ہے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مقصد دنیا کو جنت کی بشارت دینا اور عذاب آخرت سے ڈرانا تھا، آپ مبشر اور نذیر بن کر آئے تھے کہ ساری دنیا کو خوشخبری دیں، آپ مبعوث فرمائے گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ تمام دنیا کو مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہنچا ئیں۔ مذاہب و ادیان کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دے کر اسلام کے انصاف سے متمتع ہونے کا موقع دیں۔ آپ کا کام نیکی کی ترغیب دینا، بدی سے روکنا، صاف و پاک چیزوں کو حلال کرنا گندی و ناپاک چیزوں کو حرام قرار دینا تھا۔ اس معاملہ میں آپ کی راہ وہم و گمان، خیال و قیاس سے بنائی ہوئی نہ تھی بلکہ وحی و نبوت کی بتائی ہوئی تھی۔ نبوت کی راہ دلیل و یقین اور علم و بصیرت کی راہ ہے۔ اور آپ کی نبوت کا انکار کرنے والوں کے شک و گمان

کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس طرح راہیں دو ہیں، ایک شک و گمان کی دوسری یقین و بصیرت کی۔ جو لوگ نبوت سے بیگانہ ہیں ان کے پاس نبوت کے انکار کے لیے کوئی بصیرت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتے ہیں یہی ہے کہ ہمیں خبر نہیں، ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں، ہم محسوسات کے دائرے سے آگے نہیں جا سکتے۔ لیکن پیغمبر اعلان کرتا ہے کہ میں اس بارے میں علم و یقین رکھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔ اس کی جگہ یقین کی جگہ ہے۔ شک و گمان کی اس پر چھائیں بھی نہیں پڑی ہے علم و عمل میں وہ سب سے الگ راہ اختیار کرتا ہے۔ علم کی حد تک اس کا دعویٰ ہوتا ہے انی علی بینۃ من ربی اور عمل کے دائرے میں اس کا اعلان ہوتا ہے لا اتبع اھواءکم یہ گویا مخاطبوں پر طنز ہے کہ علم کی حد تک تمہارا دامن دلیل و یقین اور علم و بصیرت سے خالی ہے اور عملی زندگی تمہاری سرتاسر خواہشات اور چاہتوں کی پیروی ہے۔

اسی بنا پر جب کفار پیغمبر کی صداقت کی نشانی مانگتے ہیں، اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی نشانی تو اس کا علم و عمل ہے اور اہل یقین کے لیے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ اس کی حقانیت نیکوکاروں کو خوشخبری سنانا بدکاروں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا اور اس سے انقلاب انسانی اور نتائج روحانی کا ظہور بجائے خود اس کی صداقت کی کھلی نشانیاں ہیں۔ یعنی خود دعوتِ الٰہی اور پیغامِ ربانی سب سے بڑی بینہ ہے کہ ایک اُمی ہو کر وہ ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کر رہا ہے جس کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہے۔

رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمۃ

۶۵۔ اے پیغمبر ان سے کہو کہ مجھے اس بات سے روکا گیا ہے کہ میں ان کی بندگی کروں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ گزشتہ آیت میں وہ چیزیں بیان ہوئی ہیں جو مومنین سے کہنے کے لائق ہیں اس رکوع میں ان امور کا تذکرہ ہے جو مجرمین اور مکذبین کے حق میں قابلِ خطاب ہیں۔ یعنی آپ فرما دیجئے کہ میرا ضمیر، میری فطرت، میری عقل، میرا نور شہود اور وحی الٰہی جو مجھ پر اترتی ہے یہ سب مجھے اس سے روکتی ہیں کہ میں توحید کامل کے جادے سے ذرا بھی قدم ہٹاؤں خواہ تم کتنے ہی حیلے اور تدبیریں کر دیکھو[1]

آیت میں دُعا سے مراد وہ پکارنا ہے جو دُعا اور استرحام کے قسم کا ہو، اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارنا فی الواقع اس کی عبادت ہے۔ شاید اسی قسم کی آیات سے اشارا پاکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

[1] افادات شیخ الاسلام

نے امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ الدعاء هو العبادة ، دعا ہی عبادت ہے جیسا کہ مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، ادب البخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم میں نعمان بن بشیر اور مسند ابی یعلی میں براء بن عازب کے حوالہ سے آیا ہے الدعاء مخ العبادة دعا مغز عبادت ہے۔ سنن ترمذی میں حضرت انس کے حوالہ سے ایک ضعیف حدیث آئی ہے۔

یہاں الذین تدعون لا کر قرآن نے اشارہ کر دیا کہ جن کو عرب کے مشرک پکارتے تھے اور جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے دعائیں مانگتے تھے صرف پتھر کی مورتیاں نہ تھیں بلکہ مشرکین کی دعائیں ان روحانی ہستیوں سے تھیں جن سے یہ پتھر کے بت منسوب تھے۔ پتھر کے یہ بت اشخاص تھے جن کے یہ بت بنائے گئے تھے وہ شخصیتیں تھیں۔ یہ بت اور مورتیاں کچھ روحانی ہستیوں کی نشانی اور یادگار سمجھے جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔

> مشرکین اس بات میں تو مسلمانوں کے ہم خیال تھے کہ بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی اللہ سبحانہ، کرتا ہے اور کسی کے لیے یہ اختیار نہیں مانتے تھے کہ جب اللہ سبحانہ، کسی کام کا فیصلہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ہٹا سکتے ہیں لیکن باقی تمام معاملات میں وہ مسلمانوں کے ہمنوا نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے کچھ اللہ کے نیکوکار بندے ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے بہت عبادت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو الوہیت کا خلعت عطا کر دیا ہے اس لیے وہ مخلوق کے نیازمندانہ اور عابدانہ اعمال کے مستحق ہو گئے، ایسے ہی جیسے بڑی شان والے بادشاہ کی کوئی غلام خدمت کرے اور وہ اس کی خدمات سے خوش ہو کر حکومت کے کچھ معاملات میں اس کو مختار بنا دیتا ہے۔ ان بزرگوں کا مقام بھی اللہ کے یہاں یہی ہے۔ اس لیے اب اللہ کی کوئی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ذات تو بالا و بالاتر ہے۔ اب تو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی ہی عبادت ضروری ہے۔ یہی ہماری دعائیں سنتے ہیں یہی ہمارے حالات دیکھتے ہیں اور یہی اللہ کی بارگاہ میں سفارشی ہیں۔ اور یہی سارے امور کو انجام دے رہے ہیں، یہی ہمارے مددگار ہیں۔ ان بزرگوں کے ناموں سے مشرکین نے کچھ مورتیاں بنا لی ہیں اور ان مورتیوں کو ان کی عبادت کے لیے حیلہ بنایا۔ بعد میں آنے والے مورتیوں اور ان ہستیوں میں کوئی فرق نہ

کرسکے۔ انہوں نے مورتیوں ہی کو معبود سمجھ لیا۔ قرآن کبھی توان ہستیوں کا ذکر کر کے ان کے شرک کی تردید کرتا ہے اور کبھی مورتیوں کا ذکر کر کے ان کے مشرکانہ اعمال کا رد کرتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

مثلاً مورتیوں اور بتوں کے بارے میں ہے

اتعبدون ما تنحتون

کیا تم پتھر کی ان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو

اور کبھی ان ہستیوں اور شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے جن کی یہ بت نشانی یا جلوہ گاہ تھے۔

ان الذین تعبدون من دون اللہ لا یملکون لکم رزقاً۔

جن ہستیوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں۔

میر سید شریف نے بھی شرح مواقف میں یہی بات لکھی ہے کہ

بت پرست دو واجب الوجود معبودوں کے قائل نہیں ہیں اور وہ نہ بتوں کو صفات الوہیت سے متصف مانتے ہیں۔ وہ ان کو معبود کہتے ہیں لیکن دراصل انہوں نے انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام یا فرشتوں یا ستاروں کی تصویریں اور بت بنا کر ان کی عبادت صرف اس لیے کی ہے کہ وہ اس طریقے سے اللہ سبحانہ تک رسائی حاصل کرلیں۔

اور امام رازی کی عبارت بھی اسی کے قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قدرت علم اور حکمت میں برابر شریک تسلیم کرنے والا آج تک کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا۔

اشخاص اور شخصیتوں کے اس جوہری فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بیگانے تو بیگانے یگانے بھی اسلامی توحید کے بارے میں چند در چند غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے ہیں۔ عطائی اور ذاتی کا سہارا لے کر اللہ کی صفات واجبہ اور لوازم الوہیت کو انبیاء اور اولیاء کے لیے ثابت کرنا اپنا شعار بنالیا اور انبیاء اور اولیاء کو عبادات میں واسطہ بنانے کی فکری کجی میں مبتلا ہو کر مشرکانہ اعمال کا لوگوں کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اور اس کے نتیجے میں جب غیر مسلموں کی جانب سے اسلامی توحید پر اعتراضات ہوتے تو پریشان ہو کر رہ گئے۔

مثلاً صابئین کہتے ہیں کہ فرشتوں اور ستاروں کی عبادت کرنی چاہیے کیونکہ یہ خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جب اہل اسلام توحید کا یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ یگانہ خدا کی عبادت

اور رسُول کی طاعت ہونی چاہیے تو صابئین الزاماً کہتے ہیں کہ خدا اور مخلوق کے درمیان عبادت میں واسطہ تم بھی مانتے ہو، ہم بھی مانتے ہیں، تم رسُول کو واسطہ مانتے ہو، ہم فرشتوں اور ستاروں کو واسطہ مانتے ہیں۔ الشہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں اس کا جواب دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روحانی اعتبار سے بشر ہی کو واسطہ بنانا افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اس تقابل سے پتہ لگتا ہے کہ شہرستانی کو بھی پورے طور پر اسلامی توحید کا علم نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ توحید اسلامی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں واسطہ کسی کو بھی نہیں بنایا جاتا نہ فرشتہ کو نہ انسان کو، رسُول اگر واسطہ ہے تو وہ عبادت میں نہیں بلکہ ہدایت میں ہے۔ رسُول کی مثال نماز میں امام کی ہے جیسے امام نماز عبادت میں واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بھی لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بلا واسطہ عبادت کرتا ہے ایسے ہی نبی عبادت میں نہیں بلکہ ہدایت میں واسطہ وسیلہ اور ذریعہ ہوتا ہے اس کے برعکس صابئین عبادت میں کواکب کو واسطہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں مسلمان انبیاء کو عبادت میں واسطہ نہیں مانتے اس لیے ان کی عبادت نہیں کرتے۔ چونکہ ہدایت میں واسطہ مانتے ہیں اس لیے ان کی رہنمائی میں
ان کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق یگانہ خدا کی عبادت کرتے ہیں، ان سے دعا مانگتے ہیں نہ مدد مانگتے ہیں نہ ان کی دہائی دیتے ہیں نہ ان کو دور دور سے پکارتے ہیں نہ ان کی قسم کھاتے ہیں اور نہ ان کے نام نذریں اور منتیں مانتے ہیں اور نہ ان کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ یہ سب باتیں اسلامی توحید کے لطیف مزاج کے خلاف ہیں۔

شارع حقیقی اللہ سبحانہٗ ہے

۶۶۔ نیز ان سے کہہ دو کہ میں کبھی تمہاری خواہشوں کے پیمانوں پر نہیں چلوں گا، اگر میں ایسا کر دوں تو پھر میں راہِ حق سے ہٹ جاؤں گا اور میں ان میں سے نہ رہوں گا جو ہدایت یافتہ ہیں۔ یعنی میں کبھی تمہاری خواہش اور خوشی کی پیروی نہیں کر سکتا۔ بفرضِ محال اگر پیغمبر کسی معاملہ میں وحی الہٰی کو چھوڑ کر عوام کی خواہشات کا اتباع کرنے لگیں تو خدا نے جنہیں ہادی بنا کر روانہ کیا تھا معاذ اللہ وہ خود ہی بہک گئے، پھر ہدایت کا بیج دُنیا میں کہاں رہ سکتا ہے [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پہلی آیت میں اعلان کیا تھا کہ عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا میں کسی سے وابستہ نہ کروں گا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ طاعت اللہ کے سوا کسی کی نہ کروں گا۔ اللہ کی عبادت میں شرکت اور اللہ کی طاعت میں شرکت قرآن کی نظر میں دونوں کا مقام ایک ہے۔ لیکن دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ عبادت تقاضائے محبوبیت ہے اور طاعت تقاضائے حاکمیت ہے۔ محبوبیت میں نیابت نہیں ہو سکتی جب کہ حاکمیت میں نیابت ہو سکتی ہے۔ سارا قرآن پڑھ جائیے آپ کو یہ کہیں نہ ملے گا اعبدو اللہ و الرسول لیکن یہ آپ کو بار بار ملے گا اطیعوا اللہ و الرسول۔ اس طرح پہلی آیت میں شرک فی العبادۃ سے اور اس آیت میں شرک فی الطاعۃ سے براءت کا اعلان ہوا ہے۔

عام نظر میں شرک فی العبادت جو اہمیت رکھتا ہے شرک فی الطاعۃ نہیں رکھتا۔ لیکن اس پر محققین نے خاص طور پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ بھی ہے۔ سورہ نساء میں زیر آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ میں حضرت شاہ عبدالقادر تحریر فرماتے ہیں:

> اوپر سے ذکر منافقوں کا تھا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوا اور جدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور سورہ انعام میں زیر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔ فرماتے ہیں شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

اسی بنا پر اہل السنۃ والجماعۃ کا حلت و حرمت کے بارے میں تحقیقی مسلک یہ ہے کہ یہ تنہا اللہ تعالیٰ کے اختیار کی چیز ہے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا صرف اسی کا کام ہے اور وہ اس میں منفرد ہے اور یہ خالص اسی کا حق ہے کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں ہے نہ بالذات کسی کو یہ اختیار حاصل ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار تفویض کیا ہے۔ چنانچہ اصول فقہ کی ساری کتابوں میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ رب العالمین۔ یہ عبارت کم و بیش اصول فقہ کی مشہور کتاب مسلم الثبوت، التوضیح والتلویح میں بھی ہے اور اسی مضمون کو ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حکم تشریعی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ باقی حکم رسول، حکم اہل اجماع

اور حکم مجتہد تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کا مظہر ہے حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ

دراصل تحلیل و تحریم اس تکوین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہوتی ہے کہ فلاں شے پر مواخذہ ہوگا یا نہ ہوگا۔ پس یہی تکوین اللہ کی صفات سے ہے۔ باقی تحلیل و تحریم کی نسبت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو یہ اس معنیٰ میں ہے کہ آپ کا ارشاد قطعی نشانی ہے۔ اللہ کے حلال و حرام کرنے کی اور مجتہدین کی طرف تحلیل و تحریم کی نسبت اس معنے میں ہے کہ وہ اس کو نص شارع سے روایت کرتے ہیں یا کلام شارع سے استنباط کر کے بتاتے ہیں۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے عبد ہونے کی حیثیت میں میرے عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا کسی کے ساتھ نہیں ہیں ایسے ہی پوری زندگی میں مطیع و فرمانبرداری اللہ کے سوا کسی کے حکموں کی نہیں کرتا۔ میں جو کچھ اللہ کی جانب سے لے کر آیا ہوں وہ الہدیٰ ہے۔ اس کے مقابلہ میں تم جو کچھ بتا رہے ہو وہ الھوٰی ہے۔ اگر میں الہدیٰ کو چھوڑ کر تمہاری الھوٰی کا پیروکار بن جاؤں تو میں راہ حق سے ہٹ جاؤں گا اور میرا شمار بے ہدایتوں میں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت جو کچھ لے کر آئی ہے وہ الہدیٰ ہے اور اس کے مقابلہ پر جو کچھ ہے وہ الھوٰی ہے۔ یہ بات کہی جارہی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سنائی جارہی ہے مسلمانوں کو۔ اور بتایا جارہا ہے کہ اصل دین اللہ کی عبادت اور طاعت ہے اور تمہاری زندگی کامیاب اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب تم اس اصل پر اس کی بنیادیں استوار کرو۔ اللہ کے سوا کسی کو اپنی حقیقی عقیدتوں، محبتوں، پرستشوں اور عبادتوں کا مرکز نہ بناؤ کسی کو اپنا اصل فرمانروا نہ مانو، کسی کو اپنی زندگی میں شارع و قانون ساز نہ بناؤ، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی بنا پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کرو اور پھر ساری دنیا کو اس کی دعوت دو، تلقین کرو اور اسی مقصد کے لیے اپنی جانیں کھپاؤ۔

نظام اسلام واضح اور صاف ہے

۵۷۔ آپ کہہ دیں کہ میں بلاشبہ اپنے پروردگار کی جانب سے واضح اور صاف راستہ پر ہوں اور تم نے اس کی تکذیب کی ہے یعنی میرے پاس خدا کی صاف اور صریح شہادت اور واضح دلائل پہنچ چکیں جن کے قبول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ تم اس کو جھٹلاتے ہو تو

اس کا انجام سوچ لو۔[1]

اس سے پہلی آیت میں نبوت کا کام یہ بتایا تھا کہ یگانہ خدا کی عبادت اور زندگی کے سارے گوشوں میں اس کی اطاعت۔ اب اس آیت میں واضح کیا جارہا ہے کہ نبوت کا یہ کام کسی انسانی ذہن کے خیال اور قیاس سے تیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کا منبع اللہ کی روشن اور واضح دلیل ہے۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ کی وحی اور نبوت ہے۔ اصل ارشاد میں بینۃ آیا ہے اور بینہ ویسے تو ہر پیغمبر کا وہ معجزہ ہے جسے وہ قوم کے سامنے بطور چیلنج پیش کرتا ہے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حد تک قرآن کو اور حضور انور کی رسالت کو بینہ کہا گیا ہے یعنی ایسی واضح اور صاف بات جو سب کے سامنے کھلی ہو اور سب کے لیے واضح ہو۔ یہاں مراد قرآن ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ انسانی رائے، اور خیال نہیں بلکہ رب العالمین کی وحی ہے اور وحی کی رہنمائی یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کو باطل کی تاریکی سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتی ہے۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی اندھیریوں میں پھنس کر عبادت کی حد تک روحانی معرفت اور طاعت کی حد تک فطری بصیرت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں تو نبوت ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتی ہے۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق، اور ظلمت کی جگہ نور عطا کرتی ہے۔ بتایا یہ جارہا ہے کہ تم تو محض ہوا میں تیر رہے ہو اور اپنی خواہشات کے پیروکار ہو تمہارے پاس اپنے ان فرضی معبودوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنالیا ہے۔ اس کے برعکس میں خدا کی جانب سے ایک حجت، ایک برہان اور ایک قطعی شہادت لے کر آیا ہوں اور اسی کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں خدا نے یہ بینہ مجھ پر اتاری ہے اور تم اس کی تکذیب کر رہے ہو اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھو اور مانو مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ میں تمہیں خدا کی جانب سے کوئی نشانی دکھاؤں تو تم اس کی صداقت کو مانو گے اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

معجزہ اللہ کے اختیار میں ہے

۶۸۔ میرے پاس وہ کچھ نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو حکم تو بس اللہ کا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ یعنی عذابِ الٰہی چنانچہ کفار کہتے ہیں۔

اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم۔

اے اللہ اگر یہی حق ہے جس کی ہم تکذیب کر رہے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر اور کوئی عذاب بھیج دے[1]

مشرکینِ عرب نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں اور ہم آپ کی مخالفت کرتے ہیں تو خدا کے جس فیصلے کا آپ ذکر کرتے ہیں اگر وہ برحق ہونے والا ہے تو کیوں نہیں ہو جاتا جواب میں فرمایا کہ ما عندی ما تستعجلون بہٖ تم جس فیصلے کے لیے جلدی مچا رہے ہو وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معجزات کا ظاہر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہے نبی کا اس میں کچھ بھی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی معجزہ پیغمبر کا ذاتی فعل نہیں ہوتا ہے بلکہ درحقیقت اللہ کا فعل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اپنے اس پیغمبر کی سچائی ظاہر فرماتا ہے۔ ہمارے عقائد کی کتابوں میں معجزے کی تعریف عام طور پر یہ کی گئی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے نبی کی سچائی اور صداقت ظاہر کرنے کے لیے اس نبی کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے۔ لکھا تو سب نے یہی ہے اہل السنۃ کی عقائد کی تمام کتابوں میں یہی بتایا گیا ہے لیکن ہمارے شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے اسے واشگاف لفظوں میں سمجھایا ہے۔ مدارج النبوۃ جلد ثانی صفحہ ۱۱۶ پر رقمطراز ہیں۔

معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کو پیغمبر کے ہاتھ پر وہ ظاہر کرتا ہے برخلاف دیگر افعال کے کہ ان میں کسب بندہ کی طرف سے اور خلق خدا کی جانب سے ہوتا ہے مگر معجزے میں کسب بھی بندے کی جانب سے نہیں ہوتا ہے۔

اور فتوح الغیب کے ترجمہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

معجزہ اور کرامت خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو بندے کے ہاتھ پر اس کی تصدیق و تکریم کے لیے صادر ہوتا ہے۔ معجزہ اور کرامت بندے کا فعل نہیں ہوتا جو اس کے قصد و اختیار سے ظاہر ہو جیسے اس کے دوسرے افعال اختیاریہ ہیں جو اس کے قصد اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں تم جلد بازی مچا رہے ہو۔ مجھ میں اس کے جلد یا بدیر لانے کی قدرت نہیں ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں لا قدرۃ لی، اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں لیس امرہ مفوضا الی۔ یہ معاملہ میرے سپرد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تو اللہ کے حکم سے ہے۔ ان الحکم الا للّٰہ یہاں حکم سے مراد حکومت نہیں ہے کہ اس معنے میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے اس کو ہر جگہ فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ آیت کا سیاق و سباق یہی چاہتا ہے۔ اسی بنا پر آگے فرمایا جا رہا ہے یقص الحق وھو خیر الفاصلین۔ یعنی نفاذ کی قوت اللہ کی ہے وہی اپنی حکمت مطلقہ کے مطابق صحیح اور مناسب وقت پر اپنا ناطق فیصلہ صادر فرمائے گا اور اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے۔ یہ گویا جواب ہے مخالفین کی اس بات کا کہ اگر تم خدا کے بھیجے ہوئے ہو تو خدا کا عذاب ہمارے انکار پر کیوں نہیں آتا۔ فرمایا یہ میرے اختیار کی چیز نہیں بلکہ اللہ کے اختیار کی ہے وہی فیصلہ کرتا ہے۔ کائنات میں حاکمانہ اختیارات اور تصرفات صرف وہی رکھتا ہے مجھے پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے۔ مختار کل اور کائنات میں تصرف کرنے والا بنا کر روانہ نہیں کیا ہے۔

حضور انور اور معجزہ ہلاکت

٥٩ اے پیغمبر کہہ دو کہ جس بات کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو اگر وہ میرے اختیار میں ہوتی تو مجھ میں اور تم میں کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالم کا لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ یعنی جس پر جب چاہے اور جس قسم کا چاہے عذاب بھیجے یا نہ بھیجے ویسے ہی توبہ کی توفیق مرحمت فرمائے یہ سب اللہ کے قبضے میں ہے کسی کا حکم اور زور اس کے سوا نہیں چلتا۔ وہ دلائل و براہین کے ساتھ حق کو بیان کر دیتا ہے۔ پھر جو نہ مانے ان کے متعلق بہترین فیصلہ کرنے والا بھی وہ ہی ہے۔ اگر ان کا فیصلہ کرنا میرے قبضے میں ہوتا اور یہ نزول عذاب کا مطالبہ کرنے کے لیے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تو اب تک کبھی کا جھگڑا ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ تو خدا ہی کے علم محیط، حلم عظیم، حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا پرتو ہے کہ بے شمار مصالح و حکم کی رعایت کرتے ہوئے باوجود پوری طرح جاننے اور قدرت رکھنے کے ظالموں پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ آئندہ آیات میں اس کے علم محیط اور قدرت کاملہ کا ذکر ہے تا ثابت ہو کہ تاخیر عذاب ناواقفیت یا بیچارگی کی وجہ سے نہیں ہے [1] زمخشری نے لکھا ہے کہ مطلب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ ہے کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں فوری طور پر ہلاک کرکے تم سے جلدی چھٹکارا پا لیتا ، لیکن دوسرے علماء کو زمخشری سے اختلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر عذاب کا لانا میرے بس میں ہوتا اور یہ معاملہ میرے سپرد ہوتا تو معاملہ کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا ۔ خدا کی جناب میں تمہاری ان گستاخیوں کو میں کب برداشت کرتا اللہ سے درخواست کرتا کہ وہ تمہیں ہلاک کر دے ۔ ابوالسعود کہتے ہیں کہ حسن ادب کے پیش نظر فعل مجہول لے کر آئے ورنہ اندازِ بیان کا تقاضا تو یہی تھا کہ لقضی اللہ بینی و بینکم اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دیتا ۔

مطلب خواہ کوئی ہو لیکن یہاں حافظ ابن کثیر نے یہ عجیب بات فرمائی ہے کہ اگر اس آیت کا یہی مطلب ہے تو پھر اس آیت اور صحیحین میں آمدہ اس واقعہ میں مفاہمت کیوں کر ہو سکتی ہے ۔

> حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ اُحد کے علاوہ آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا تھا ۔ آپ نے فرمایا وہ دن جب میں نے طائف میں عبد یا لیل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا ۔ میں مغموم واپس آ رہا تھا کہ فرشتہ جبال نظر آیا ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی یہ معجزۂ ہلاکت ظاہر نہ ہو شاید ان کی نسل سے کوئی پرستار توحید پیدا ہو ۔

یہ ارشاد تو کہہ رہا ہے کہ آپ عذاب کے خواہاں نہ تھے اور آیت بتا رہی ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو معاملہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا ۔ حافظ ابن کثیر نے اس کا جواب دیا ہے کہ آیت کا تعلق ان کے مطالبہ عذاب سے ہے لیکن حدیث میں ان کے مطالبہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ ملک الجبال کی درخواست ہے اور دونوں میں فرق ظاہر ہے ۔ یہاں ان کے مطالبے پر ان کے فیصلے کو اللہ کی قدرت اور طاقت کے حوالہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ بات میرے بس کی نہیں بلکہ اللہ کے علم محیط، اس کی حکمت بالغہ سے متعلق ہے وہ جو چاہے جب چاہے اور جیسے چاہے کرتا ہے ۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ
وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا
رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ
بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ
ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَهُوَ
الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا
اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا ہے، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے، کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا اور نہ کوئی تر و خشک ہے،

مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے ۔ اور وہی ہے جو تمہیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت پوری کی جائے پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے ہو ۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر کرتا ہے ۔ تاآنکہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اسے قبضے میں لے لیتے ہیں اور وہ اس کام میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں ۔ پھر تمام بندے اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں جو ان کا مالک حقیقی ہے، یاد رکھو فیصلہ کا پورا اختیار اسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۔

اللہ کا علم محیط اور اختیار ناطق

پیچھے بتایا گیا کہ مکذبین اور منکرین پر عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ یہ اللہ کے اختیار میں

ہے۔ اس نے جو قانون مقرر کر دیا ہے اسی کے مطابق اس کا ظہور ہوگا۔ اب اللہ کے علم کی وسعتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ عذاب میں تاخیر بے خبری اور ناواقفیت کی بنا پر نہیں ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ اس کی علمی وسعتوں اور پہنائیوں کا حال یہ ہے کہ غیب کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔

علم محیط اور اختیار کامل اللہ سبحانہ کی بنیادی صفات میں ایک خاص اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح سارے عقائد کی جان عقیدہ توحید ہے اسی طرح عقیدہ توحید کی جان توحید فی الصفات کا عقیدہ اور یقین ہے۔ توحید فی العبادۃ اسی کا تقاضا اور اسی کے لوازم میں سے ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقیدہ دراصل تمام اعمال کی اساس ہے اور توحید کے باب میں یہی نقطہ کمال ہے۔ اس لیے صرف توحید فی الصفات ساری توحید کی نمائندگی اور قائمقامی کرتی ہے جس نے شعور ویقین کے ساتھ اس کا اقرار کر لیا اس نے فی الواقع اللہ سبحانہ کی توحید کے نقطہ کمال کو پالیا۔ کمال توحید کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات وافعال میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ پیدا کرنا، زندہ رکھنا اور جہان کے اندر تدبیر وتصرف کرنا، مارنا، عالم الغیب ہونا، حاضر و ناظر ہونا اور مختار کل ہونا وغیرہ یہ تمام صفات ہر حیثیت میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب والے اوتاروں، ولیوں، نبیوں اور شہیدوں میں بھی یہ اوصاف ملنتے تھے اور اب بھی مانتے ہیں۔ ملائکہ، جنات اور اسی طرح احبار ورہبان کی پرستش کرنے والوں کا قرآن حکیم نے بصراحت ذکر کیا ہے اور یہی ان کی توحید کا نقص ہے۔ لیکن قرآن نے توحید کا جو کامل ترین تصور پیش کیا ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے۔

۱۔ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی نہیں جو آپ سے آپ موجود ہو بلکہ ہر چیز مخلوق ہے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

۲۔ اللہ سبحانہ کی ذات بنیادی طور پر تمام موجودات سے مختلف ہے اور کسی طرح بھی کوئی اس کے مشابہ نہیں۔

۳۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضاجوئی کی انسان کو فکر ہونی چاہیے۔ یہی اس کے ایمان کا اصل محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۴۔ پیدا کرنا، مارنا، عالم الغیب اور حاضر وناصر ہونا، دور ونزدیک سے یکساں تعلق رکھنا، اور کائنات میں تدبیر وتصرف رکھنا صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

۵۔ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ

مختار کل صرف اللہ ہے۔

۵- اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو، کوئی نہیں جو دانائے غیب اور مختار کل ہو جیسے ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔

یہ توحید فی الصفات کے بنیادی تقاضے ہیں اور ان میں سے ایک کا بھی انکار اور ان میں سے کسی کی شرکت توحید کامل کے دعویٰ کو بے معنی کر دیتا ہے۔ اس آیت میں ان ہی صفات میں سے علم محیط اور اختیار ناطق کو بتایا جا رہا ہے۔

۶- اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا ہے۔ خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا ہے اور نہ کوئی تر و خشک ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے، یعنی لوح محفوظ میں ہے اور لوح محفوظ میں جو چیز ہو گی وہ علم الٰہی میں پہلے ہو گی۔ اس اعتبار سے مضمون آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عالم غیب و شہادت کی کوئی خشک و تر اور چھوٹی بڑی چیز حق تعالیٰ کے علم ازلی محیط سے خارج نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں علیہ ان ظالموں کے ظاہری و باطنی احوال اور ان کی سزا دہی کے مناسب وقت و محل کا پورا پورا علم اسی کو ہے۔

یہ تو ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ علم غیب وہ علم ہے جو وسائل و ذرائع کے بغیر خود بخود حاصل ہو اور ظاہر ہے ایسا علم اس کو ہی ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو۔ وحی کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے جیسے انبیاء کا علم قرآنی اصطلاح میں علم غیب نہیں ہے۔ اسی طرح اسباب و وسائل کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں جیسے محکمہ موسمیات کا علم، دلائل کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے جیسے فلاسفہ و حکماء کا علم، کشف و الہام کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں جیسے اولیاء کا علم روایت کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں ہے جیسے محدثین کا علم، اور اجتہاد کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں ہے جیسے مجتہدین کا علم۔ علم غیب اصل میں وہی ہے جو بغیر ذرائع کے خود بخود ہو۔

علم الٰہی کا جامع تصور

یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن نے بتایا ہے و عندہ مفاتح الغیب اللہ کے

پاس غیب کے مفاتح ہیں۔ علماء نے مفاتح کو مفتح میم کے زیر کے ساتھ اور میم کے زبر کے ساتھ دونوں کی جمع بتایا ہے۔ اگر یہ مِفتح کی جمع ہو تو اس کے معنے چابی ہیں اور اگر مفتح بفتح میم کی جمع ہو تو اس کے معنے خزانے کے ہیں۔ اب مفاتح کے معنے چابیاں اور خزانے ہوں گے۔ کچھ شارحین قرآن نے ترجمہ یوں کیا ہے اسی کے پاس ہیں چابیاں غیب کی اور کچھ نے ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ اسی کے پاس ہیں خزانے غیب کے اور دونوں صحیح ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

مفاتح کو جن علمائے نے مَفتح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کے خزانوں سے کیا ہے اور جن کے نزدیک مِفتح بکسر المیم کی جمع ہے۔ وہ مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کی کنجیاں کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور کنجیاں صرف خدا کے پاس ہیں وہی ان میں سے جس خزانے کو جس وقت اور جس قدر چاہے کسی پر کھول سکتا ہے۔ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس و عقل وغیرہ آلات ادراک کے ذریعے سے علوم غیبیہ تک رسائی پا سکے یا جتنے علوم غیبیہ اس پر منکشف کر دیے گئے ہیں۔ ان میں از خود اضافہ کرے کیونکہ علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں نہیں دی گئی ہیں خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات و واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کر دیا گیا ہو تاہم غیب کے اصول و کلیات کا علم جن کو مفاتح الغیب کہنا چاہیے حق تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص رکھا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علم غیب کا اطلاق دو معنے میں ہوتا ہے ایک علم غیب اجمالی بسیط فعلی ہے جو اللہ کی صفت کمال ہے اور تمام اشیا کے لیے پورے پورے انکشاف کا سرچشمہ ہے اور تمام معلومات الٰہی کی طرف نسبت یکساں ہوتی ہے اور اس کا ہونا حضور معلوم پر موقوف نہیں ہے نہ بنفسہٖ اور نہ بصورتہٖ اسی لیے اس کو علم غیب کہتے ہیں۔ یہ علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کی صفت خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کا حقیقی علم غیب اور صفت ذاتی بھی ہے۔ دوسرے علم غیب تفصیلی انفعالی جو حضور معلوم پر موقوف ہے۔ یہ عند اللہ صور علمیہ کا حضور ہے یعنی تمام معلومات الٰہیہ اپنی صور علمیہ کے ساتھ عند اللہ حاضر ہیں۔ یہ علم اجمالی کے تابع اور بعد ہے۔ یہ من وجہ علم غیب اور من وجہ علم شہادت ہے۔ یعنی یہ دراصل عند اللہ تو علم الشہادۃ ہی ہے لیکن تمام مخلوق کے اعتبار سے علم غیب کہلاتا ہے۔ یہ غیب یعنی صور علمیہ مجہول اور حادث نہیں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت میں داخل ہیں اور تعلق علم بھی حادث ہے۔ بس غیب کا دریافت کرنا یعنی ان صور علمیہ کو ظہور میں لے آنا اور

علم غیب اجمالیہ کا صور علمیہ کے ساتھ تعلق اللہ کے اختیار میں ہے جب چاہے جیسے چاہے کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے عندہ مفاتح الغیب میں اسی کی طرف اشارہ ہے یعنی علم غیب اجمالی بسیط جو صفت کمالیہ ہے بمنزلہ مفتاح ہے۔ صور علمیہ تفصیلی کے لیے جو تمام مخلوق سے غائب ہیں اور جو خزانے ہیں ان صور علمیہ پر اطلاع جس قدر اللہ چاہے اپنے اختیار سے دیتا ہے ورنہ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ جب چاہے خود ہی غیب کی بات معلوم کرے اور ان صور علمیہ پر اطلاع پائے کیونکہ یہ وہی کر سکتا ہے جس کے پاس ان صور علمیہ کی کنجیاں ہوں اور مبدا۔ انکشاف ہو۔

اس فقرے میں مثبت انداز میں حصر کے ساتھ تصویر کا ایک رخ بتایا ہے کہ غیب کے خزانے یا غیب کے خزانوں کی چابیاں اللہ ہی کے پاس ہیں اور دوسرے جملہ میں پھر حصر کے ساتھ منفی انداز میں تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش فرما دیا کہ لا یعلمھا الا ھو اللہ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا ہے اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ دانائے غیب ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے۔ سابقہ اُمتوں میں عیسائی اللہ سبحانہ کی صفت علم ہی میں سب سے زیادہ گمراہی کے شکار ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدے کی بنیاد اسی صفت پر رکھی ہے اور یہ تاویل کی گئی ہے کہ تثلیث کے اقانیم ثلاثہ خدا کی تین صفتوں سے عبارت ہیں حیات وجود اور علم اور یہ تینوں ایک ہیں یہی باپ بیٹا اور روح القدس ہیں۔ اور تینوں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے صفات الٰہی کے تجسیم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔ قرآن نے بتایا کہ علم غیب خدا کی صفت ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے و عندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور فرمایا کہ مفاتح غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۱۔ حمل لڑکا ہوگا یا لڑکی
۲۔ کل کیا ہوگا
۳۔ بارش کب ہوگی
۴۔ موت کہاں آئے گی
۵۔ قیامت کب آئے گی

قرآن میں ان پانچ کو ان الفاظ میں بتایا ہے۔

ان اللہ عندہ علم الساعۃ و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام و ما تدری نفس ماذا تکسب غدا و ما تدری نفس بای ارض تموت، ان اللہ علیم خبیر۔

ارشادِ نبوت میں ان پانچ ہی کو مفاتح قرار دیا ہے۔

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ معلومات الٰہیہ اگر لاتناہی ہیں تو پھر ان پانچ کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر سید رشید رضا مرحوم نے جو یہاں نکتہ آفرینی فرمائی ہے وہ بہت زیادہ لطیف ہے، اگرچہ دوسرے شارحین قرآن تو اسے یہ کہہ کر آگے چل دیے کہ

> غیب کے خزانے پانچ میں منحصر نہیں ہیں بلکہ وہ تمام چیزیں اس میں داخل ہیں جو ابھی موجود نہیں۔ (مظہری)

اور علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں کہ

> استغراق زیادہ اچھا ہے اور احادیث میں جن پانچ کا ذکر ہے ان کو اہم پر محمول کیا جائے گا حصر مقصود نہیں ہے۔

السید رشید رضا فرماتے ہیں۔

> غیب جو کچھ ہے وہ عالمِ برزخ، عالمِ آخرت اور عالمِ دنیا میں وہ پیداوار جو ابھی موجود نہیں خواہ یہ نباتات ہوں یا حیوانات اور انسان کے وہ اعمالِ کسبیہ جو مستقبل میں ہونے والے ہیں قرآن کی آیت میں ان پانچوں کی طرف اشارہ ہے لفظ ساعت سے عالمِ آخرت کی طرف اشارہ ہے اور بارش سے عالمِ نباتات کی طرف اور ما فی الارحام سے عالمِ حیوان کی طرف، ما تدری نفس سے عالمِ اعمال کی طرف اور بای ارض تموت سے عالمِ برزخ کی طرف اشارہ ہے۔

بالفاظِ دیگر عالم پانچ ہیں عالمِ آخرت، عالمِ برزخ، عالمِ اعمال، عالمِ نباتات، عالمِ حیوانات، پانچ باتیں ان پانچ عالموں کے لیے مفتاح ہیں۔

علم غیب اور اسلام

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں۔ ان میں سے

ایک وصف علم غیب ہے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا اور اولیا کو علم غیب ہوتا ہے جیسا کہ التفتازانی نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کا حضرت عیسٰی کے بارے میں خیال ہے کہ اقنوم علم بدن عیسٰی میں منتقل ہو گیا ہے۔ قرآن نے اس تعلیم کے ذریعے خدا کے سوا بلا استثنا سب کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ اس موضوع پر مقام نبوت کی حد بندی کا ہے یعنی آپ کی ذات گرامی کے بارے میں بتا دینا کہ آپ کو جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ انبا' اظہار اور اطلاع غیب بذریعہ وحی ہے۔ غیب دانی اور علم غیب نہیں ہے تاکہ خدا کے سوا غیب دانی کے عقیدے کا ہمیشہ کے لیے سدّباب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں حضور انور کی غیب دانی کی نفی پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں اور نہ یہاں تفصیل کا محل ہے۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے کہ قرآن نے نبوت سے یہ اعلان کرایا ہے۔

لو كنت اعلم الغيب لا ستكثرت من الخير

اگر میں غیب داں ہوتا تو بہت خیر جمع کر لیتا۔

صرف اس لیے کہ ذات پیغمبر کے صاحب وحی ہونے کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع نہ رہے کہ وحی کی جگہ غیب دانی کا اور رسالت کی جگہ خدائی کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا کیا تحفظ کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عین محفل مسرت میں ان بچیوں کو بھی اس خیال کے اظہار سے روک دیا کہ

فينا نبي يعلم ما في غد

ہم میں پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے

جو ایک شادی کی محفل میں شعر پڑھ رہی تھیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم غیب چونکہ اللہ تعالٰی ہی کی صفت مخصوص ہے لہذا علم غیب کی نسبت اللہ کے سوا کسی اور کی طرف مکروہ ہے

اسی بنا پر حضرت عائشہ صدیقہ نے علی الاعلان لوگوں کے سامنے یہ بات فرمائی

جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب داں کہتا ہے وہ اللہ تعالٰی پر سفید جھوٹ باندھتا ہے۔

اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ غیب دانی کا عقیدہ پیغمبر پر وحی آنے کا انکار ہے

میر سید شریف نے لکھا ہے۔

انما لم یجز الاطلاق فی غیرہ تعالیٰ لانہ یتبادر منہ تعلق علمہ بہ ابتداء فیکون تناقضا۔

غیر خدا پر عالم غیب اس لیے نہیں بولا جاتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا علم بلا واسطہ ہے اور وحی کو ذریعہ مان کر پھر عالم غیب کہنا دراصل تناقض ہے۔
اسی لیے محققین اہل السنۃ والجماعۃ احناف نے اسے عقائد کفر میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابن الہمام حنفی نے المسامرہ میں اور ملا علی قاری حنفی نے شرح الفقہ الاکبر میں تصریح کی ہے۔

جاننا چاہیے کہ انبیاء غیب داں نہیں ہوتے ہیں ہاں وہ باتیں انبیاء کو معلوم ہیں جو اللہ سبحانہ انہیں بتا دیتے ہیں اور احناف نے تصریح کی ہے کہ یہ اعتقاد کہ حضور اقدس غیب داں ہیں کفر ہے۔

دونوں باتیں پوری قوت سے واضح کرنے کے بعد ایک یہ کہ خدا ہی غیب داں ہے اور دوسری یہ کہ خدا کے سوا غیب داں کوئی نہیں۔ اسی کی جامعیت کو بتایا ہے کہ خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔ یہاں تک معدومات کے علم کا ذکر تھا اب موجودات کے علم کا تذکرہ شروع ہوا ہے۔ یعنی اللہ تمام کائنات و موجودات کا علم محیط رکھتا ہے۔ مافی البر والبحر سے مراد تمام موجودات ہیں جیسے صبح و شام بول کر پورا زمانہ اور مشرق و مغرب بول کر پوری زمین مراد ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا تمام کائنات پر علمی احاطہ صرف یہی نہیں کہ کلیات کا اسے علم ہو بلکہ اس کا علم کائنات کی تمام جزئیات اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز، مخفی سے مخفی چیز اس کے علم میں ہے حتی کہ درخت سے جو پتا گرتا ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے وما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا مطلب یہ ہے کہ درخت کا ہر پتا گرنے سے پہلے، گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے، وہ جانتا ہے کہ درخت پر لگا ہوا پتا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا اور کب اور کہاں گرے گا۔ گرنے کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ اس سے تمام حالات کی طرف اشارہ ہو جائے کیونکہ پتے کا زمین پر گرنا اس کے نشوونما اور نباتی زندگی کا آخری حال ہے۔
اس کے بعد فرمایا ولا حبۃ فی ظلمات الارض یعنی ہر وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیری میں پڑا رہتا ہے۔ ظلمات الارض سے مراد زمین کی تہیں اور طبقات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمین

کی گہرائی میں جو دانے پڑتے ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ولا رطب ولا یابس ہر خشک و تر اللہ کے علم میں ہے۔ آخر میں فرمایا الا فی کتاب مبین یہ سب اللہ کے نزدیک کتاب مبین میں ہے۔ کچھ شارحین قرآن کے خیال میں کتاب مبین سے مراد علم الٰہی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ مراد وہ لوح محفوظ ہے جس میں مقادیر خلق لکھی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں سہو و نسیان کی راہ نہیں۔ اس طرح اللہ سبحانہ کا یہ علم محیط تمام کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے دامن میں صرف تخمینی طور پر نہیں بلکہ یقینی طور پر سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن کے اس بیان سے ان لوگوں کی پوری پوری تردید ہو گئی جو اللہ سبحانہ کو صرف کلیات کا عالم مانتے ہیں۔ بتا دیا کہ خدا صرف کلیات کا نہیں بلکہ تمام جزئیات کا بھی عالم ہے۔ درخت سے جو پتا گرتا ہے زمین کی تہوں میں جو دانہ ڈالا جاتا ہے سب اس کے علم میں ہوتا ہے اور ہر خشک و تر اس کے رجسٹر میں درج ہے اور یہ رجسٹر ایسا نہیں ہے جس میں اس کو کوئی چیز تلاش کرنی پڑتی ہو بلکہ اس کی ہر چیز ہر آن بالکل واضح ہے۔ یہ اللہ کے علم کی جامعیت کا ایک تصور ہے۔

اللہ کے اختیارِ کامل کا تصور

ا لے۔ اور وہی ہے جو تمہیں رات میں پورا پورا لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے۔ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ یعنی شب میں سوتے وقت ظاہری احساس و شعور باقی نہیں رہتا اور آدمی اپنے گرد و پیش بلکہ اپنے جسم کے احوال تک سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ گویا اس وقت یہ قوتیں اس سے لے لی گئیں[1] مطلب یہ ہے کہ تمہاری روح نفسیاتی کو جس سے احساس و ادراک متعلق ہیں معطل کر دیتا ہے یا اسے قبض کر لیتا ہے۔ جدید نفسیات کی بولی میں تمہارے شعور کو باطل کر دیتا ہے۔ اصل ارشاد میں یتوفاکم باللیل، آیا ہے۔ توفی باب تفعل سے ہو تو اس کے معنے پورا لینا اور توفیہ باب تفعیل سے ہو تو اس کے معنے پورا دینا ہیں۔ یہ آیت اس معاملہ میں فیصلہ کن ہے کہ لغت میں توفی کے معنے موت کے نہیں۔ یہ بعد کا عرف ہے۔ اگر اس کے معنے موت کے ہوتے تو یہاں قرآن سونے کے لیے استعمال نہ کرتا اور دوسری آیت اللہ یتوفی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الا نفس حین موتھا میں موت کی قید نہ لگاتا۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اصل لغت عربی میں توفی بمعنے موت نہیں آتا بلکہ یہ اصطلاح بعد کی پیداوار ہے۔ فقرے کی پیشانی پر لفظ ھو لگا کر اشارا فرما دیا کہ اختیار ناطق اور قدرت کاملہ صرف اللہ کے لیے ہے۔

اس کے بعد فرمایا اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے۔ یعنی دن میں جو کچھ چلنا پھرنا، نقل و حرکت اور کسب و اکتساب ہوتا ہے وہ سب کامل تفصیل کے ساتھ اللہ کے علم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیداری کی حالت میں تم جو کچھ کر چکے ہو خواہ وہ اچھے اعمال ہوں یا برے اللہ کو سب معلوم ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے ثم یبعثکم فیہ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت پوری کی جائے۔ یعنی اگر وہ چاہتا تو تم سوتے رہتے لیکن موت کا وعدہ پورا ہونے تک پھر نیند کے بعد وہ تم کو بیدار کرتا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر رات میں خدا تم کو وفات دیتا ہے اور جب وفات دیتا ہے تو وہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے جو کچھ تم نے دن کی روشنی میں کیا ہوتا ہے پھر دوسرے دن میں خدا تم کو اٹھاتا ہے اور اس طرح تمہاری مدت حیات اور مقررہ اجل پوری ہوتی ہے جو اللہ سبحانہ نے تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔

آخر میں فرمایا ثم الیہ مرجعکم پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو یعنی دن میں کاروبار کر کے رات کو سونا پھر سو کر اٹھنا یہ روزمرہ کا سلسلہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے دنیا کی زندگی اور پھر موت، پھر دوبارہ زندہ کیے جانے کا، اسی لیے نیند اور بیداری کے تذکرے کے ساتھ مسئلہ معاد پر متنبہ کر دیا گیا[1] مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا اور حساب و جزا کے لیے بارگاہِ الٰہی میں پیش ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا رہنما ہر شب و روز تمہاری اپنی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر رات اللہ سبحانہ، تمہیں مارتا ہے اور پھر تمہیں دن میں بیدار کر دیتا ہے۔ اس طرح گویا زندگی اور موت اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ تم میں سے ہر شخص کو روزانہ کرایا جاتا ہے۔ قرآن نے یہاں ہر رات میں سونے کو توفی اور ہر صبح کو بیداری کو بعث سے تعبیر کر کے اشارہ کیا ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو روزانہ ہو رہا ہے جیسے یہاں سونا اور جاگنا ہے اسی طرح مرنا اور اٹھنا ہے اور جیسے تم میں سے

[1] افادات شیخ الاسلام

کسی سونے والے کے دن کے کاموں سے اللہ بے خبر نہیں اسی طرح جب تم موت کی آغوش میں جاؤ گے تو اللہ سبحانہٗ تمہاری زندگی کے اعمال سے بے خبر نہ ہوگا اور جس طرح ہر رات کو سونے کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی۔

یہ طرز ادا بیسیوں آیات میں اختیار کیا گیا ہے یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں۔ اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا کے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

ہر شخص کی ہر وقت خدا کی نگرانی

۲۷ ۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر کرتا ہے۔

یعنی وہ فرشتے جو تمہاری اور تمہارے اعمال کی نگہداشت کرتے ہیں[۱]۔ قرآن میں دو قسم کے فرشتوں کا ذکر ہے۔ ایک اعمال کی کتابت کرنے والے دوسرے جانوں کی حفاظت کرنے والے۔ کتابتِ اعمال کا کام کرنے والے فرشتوں کا ذکر پارہ ۳۰ میں ہے۔

وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون

اور بلاشبہ تم پر نگران مقرر ہیں عالی قدر لکھنے والے وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

اور جانوں کی حفاظت کرنے والے فرشتوں کا ذکر پارہ ۱۳ میں ہے۔

لہ معقبات من بین یدیہ و من خلفہ یحفظونہ من امر اللہ

انسان کے اگاڑی اور پچھاڑی خدا کے نگران ہیں جو اس کی خدا کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔

یہاں فرشتوں کے لیے حفظ، استعمال ہوا ہے اور قرآن نے فرشتوں کی دونوں قسموں کا کام حفاظت بتایا ہے اس لیے یہاں دونوں مراد ہیں۔ اگرچہ کچھ شارحینِ قرآن نے صرف کراماً کاتبین کو

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

اس کا مصداق قرار دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ خدا اپنی مخلوق کے کسی فرد اور اپنی مملکت کے کسی شہری سے کبھی غافل ہوتا ہے، سب ہر وقت اس کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ برابر اپنے نگران فرشتوں کو ان پر مقرر کرتا ہے جو ایک پل کے لیے بھی ان کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔ اور یہ نگرانی دونوں طرح کی ہے اعمال کی بھی اور جانوں کی بھی۔ اعمال کی حد تک فرشتے طاعات معاصی اور مباحات تک کی نگرانی کرتے ہیں۔ نگرانی کے اسی احاطہ کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے۔

مالھذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا

اور اقوال کے بارے میں آیا ہے

ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید۔

اس موضوع پر زیادہ تفصیل انشاء اللہ تیرھویں پارے میں آئے گی۔

فرشتوں کا قبض روح

۴۳۔ تا آنکہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اسے قبضے میں لے لیتے ہیں اور وہ اس کام میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ یعنی جو فرشتے روح قبض کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں ان کو جس وقت اور جس طرح جان نکالنے کا حکم ہوتا ہے اس میں وہ کسی طرح کی کوتاہی یا رعایت نہیں کرتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ یہ عالم اگر ایک مشین ہے تو فرشتے اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو اللہ سبحانہ کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور مخلوق کے درمیان سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں۔ ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے وہ سراپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے ہیں۔ گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے اور بس۔ یہاں بتایا ہے کہ جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو وہ اس کی روح قبض کرتے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کوئی کوتاہی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کریں۔ نہ ان کے قابو سے کوئی باہر ہو سکتا ہے نہ وہ کسی کو فراموش کر سکتے ہیں۔ یہاں فرشتوں کے لیے لفظ رُسل آیا ہے۔ الزمخشری نے لکھا ہے کہ مراد ملک الموت اور اس کے اعوان و انصار ہیں۔ یاد رہے کہ قبض روح کا عمل حق تعالیٰ کا ہے۔ فرشتے صرف آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں ورنہ موت میں موت کے فرشتہ کا کوئی بھی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ ان کا کام محض تعمیل حکم ہے جس میں یہ قصور نہیں کرتے حافظ ابن جریر کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ یہ آیت عصمت ملائکہ کی کھلی دلیل ہے۔

خدائی حساب ایک لمحہ میں

۶۲۔ پھر تمام کو اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا جو ان کا مالک حقیقی ہے۔ یاد رکھو فیصلہ کا پورا اختیار اسی کا ہے اور بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یعنی ایک لحظہ میں عمر بھر کی برائی اور بھلائی واضح کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد سابقہ سب کو خدا ہی سے پیش آتا ہے اس لیے کہ وہ مولائے حقیقی ہے دوسرے جن سے لوگوں نے عابدانہ و نیاز مندانہ تعلقات قائم رکھے ہیں وہ کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اور یہ بھی بتا دیا کہ الا لہ الحکم فیصلہ کا سارا اختیار تنہا اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو یارائے گفتار نہ ہوگا۔ آخر میں فرمایا کہ ھو اسرع الحاسبین وہ حساب ایک لمحہ میں لے گا یہ نہ خیال کرنا کہ ساری کائنات کے اتنے لمبے چوڑے حساب میں اس کو کچھ زحمت پیش آئے گی یا اس میں زمانہ صرف ہوگا۔ سارا حساب وہ ایک لمحہ میں سب کے سامنے رکھ دے گا۔ اس کی کتاب مبین ہر شخص کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا سارا حساب اس کے آگے پیش کر دے گی۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾
قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ
تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ
اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ
قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّ
سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

اے پیغمبر کہہ دو کہ تم کو دریاؤں اور جنگلوں کے اندھیروں سے کون بچاتا ہے؟ جبکہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہانی سے پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر خدا ہم کو اس تنگی سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار ہوں۔ کہو کہ خدا ہی تم کو اس تنگی سے

اور ہر سختی سے نجات بخشتا ہے پھر تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو، کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک دوسرے سے لڑا کر آپس کی لڑائی کا مزہ چکھائے، دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں۔ اور اس قرآن کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سراسر حق ہے، کہہ دو کہ میں تمہارا وکیل نہیں ہوں، ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

توحید کی نفسیاتی دلیل

سیاق کلام سے وہی مطالبہ عذاب کی تردید ہے۔ اس میں انسان کی اس نفسیاتی بیماری کا ذکر ہے کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تب تو گڑگڑا کر اور تنہائیوں میں صرف خدا کو پکارتا ہے اور خدا سے یہ پیکٹ کرتا ہے کہ اگر خدا نے مجھے اس مصیبت سے بچا لیا تو میں اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہوں گا لیکن مصیبت کا دور گزر جاتا ہے اور عیش و راحت کے

مزے لوٹنے لگتا ہے تو پھر اللہ سے منہ موڑ کر وہی مشرکانہ زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں ابتلائے مصائب سے پہلے تھا اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب کبھی خدا کی پکڑ میں نہیں آسکتا، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اگر اسے عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے تو بے غیرتی سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک دنیوی اسباب و علائق کا کوئی ادنیٰ سا سہارا بھی باقی رہتا ہے انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا اور ایک تنکے کا بھروسہ بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے غافل ہو جائے لیکن جونہی اسباب و علائق کے رشتے ٹوٹے اور یاس و قنوط کی کامل حالت طاری ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اب دنیا کا کوئی ہاتھ اسے بچا نہیں سکتا تو اچانک اس کا سویا ہوا وجدان بیدار ہو جاتا ہے اور خدا پرستی کا جوش اپنے سارے اخلاص کے ساتھ اس کے اندر ابھر آتا ہے۔ اس وقت وہ خدا کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا۔ سارے رشتے، سارے بھروسے، ساری ہستیاں یک قلم نابود ہو جاتی ہیں۔ وہ بے اختیار خدا کو پکارنے لگتا ہے اور اس کی یہ پکار دل کی گڑگڑاہٹ سے ہوتی ہے اور صرف جلوت میں نہیں، بلکہ تنہائیوں میں بھی اس کے دل کے ایک ایک ریشہ سے یہی صدا اٹھتی ہے۔ قرآن یہاں اسی نفسیاتی کیفیت سے انسان کو توحید کا سبق سکھا رہا ہے کہ جسے مصائب میں پکارتے ہو اسی کو راحتوں میں پکارو۔ قرآن نے مشرکین کا شرک یہی بتلایا ہے کہ وہ اللہ کے نیچے مخلوقات کو پکارتے تھے۔ قرآن یہاں پوچھ رہا ہے کہ آفات سے تمہیں کون بچاتا ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ تنہا اللہ ہی قادر اور مختار کل ہے۔

۶۵۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ تم کو دریاؤں اور جنگلوں کے اندھیروں میں کون بچاتا ہے جبکہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہانی سے پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر خدا ہمیں اس تنگی سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار بندے ہوں گے۔ مطلب ظاہر ہے کہ ہجوم مصائب کے وقت اور شدت اضطرار میں جب تم تمام مادی و دنیوی سہاروں سے مایوس ہو جاتے ہو تو فطرت بشری خود بخود اللہ سبحانہٗ کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دعا و زاری سے کام لینے لگتی ہے۔ یہاں فطرت بشری کے اسی احساسِ توحید کو بیدار کیا گیا ہے۔ یہ توحید کی ایک انفسی دلیل ہے۔ انسان کی یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے کہ جب کسی وقت اس پر کوئی آفت آپڑتی ہے تب تو وہ گڑگڑا کر اور دل میں چپکے چپکے خدا ہی کو پکارتا ہے لیکن جب مصیبت ہٹ جاتی ہے تو پھر نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا۔ فرمایا کہ ان سے دریافت کرو کہ سمندر میں یا خشکی میں جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہو تو تمہیں کون مصیبت سے بچاتا ہے؟

ظلمات جمع ہے ظلم کی، اس کے معنے تاریکی ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اسے ہولناکیوں اور شدائد

کے لیے استعارہ بتایا ہے اور یہی بات امام رازی نے لکھی ہے۔
ظلمات دو قسم کی ہوتی ہیں حسی اور معنوی۔ حسی جیسے رات کی تاریکی، بادلوں کی تاریکی اور بادو باراں کی تاریکی، اور معنوی جیسے راہ ناآشنائی کی تاریکی، نشان راہ کی گم شدگی، شدائد اور خطرات کی تاریکی جیسے تیز و تند آندھیاں، سمندروں کے طوفان، جنگلات میں درندوں اور دشمنوں کا خطرہ ان کو ظلمات مجازاً کہا جاتا ہے۔ ظلمات کے مفہوم میں یہ سب داخل ہیں۔
تضرع کے معنے عجز و بیچارگی کے اظہار کے ہیں اور خفیہ کے معنے پوشیدہ اور چپکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم باآواز بلند بھی اللہ ہی سے دعائیں مانگتے ہو اور چپکے چپکے آہستہ آہستہ بھی اسی سے مانگتے ہو اور اس موقعہ پر اللہ کے علاوہ سب حاجت رواؤں کو بھول جاتے ہو اور اس دعا کے وقت تمہارا حال یہ ہوتا ہے کہ تم قسمیں کھا کر اللہ سے عہد کرتے ہو لئن انجانا من ھذہ لنکونن من الشاکرین کہ اگر اس مصیبت سے بچ گئے تو پوری زندگی تیرے ہی ہو کر رہیں گے اور تجھے ہی پکاریں گے۔
اس آیت تدعونہ تضرعا و خفیۃ نے یہ بات کھول دی ہے کہ دعا کے معنے استمداد اور استعانت کے ہیں۔ یہاں دعا بمعنے عبادت نہیں ہے۔ قرطبی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکین کو اس عملی تضاد پر ڈانٹ پلائی ہے کہ پریشانیوں اور بیقراریوں میں تو اللہ سے دعائیں کرتے ہیں اور خوش حالیوں میں اللہ کے ساتھ اوروں سے بھی دعائیں کرتے ہو۔

اور ابوحیان اندلسی نے تدعون کی تشریح اس طرح کی ہے۔

تم اللہ کو پکارتے ہو اپنی حاجات کو ظاہر کر کے علانیہ اور چپکے چپکے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ

تم کھلم کھلا اور چپکے چپکے اسی سے دعائیں کرتے ہو۔

صاحب لباب التاویل علامہ خازن لکھتے ہیں:

یعنی جب تم پر سختیاں آتی ہیں تو صرف اللہ سے دعائیں کرتے ہو جہراً بھی اور سراً بھی۔

اور علامہ بغوی فرماتے ہیں:

جب وہ سمندر کا یا بیابان کا سفر کرتے راستہ بھول جاتے اور ان کو ہلاکت کا اندیشہ

ہوتا ہے تو سب کو چھوڑ کر اللہ ہی سے دعائیں کرتے ۔

حافظ ابن کثیر نے اس کی تشریح یفردون الدعاء لہ وحدہ سے کی ہے۔ یعنی یگانہ خدا سے دُعا کرتے ہیں۔ شارحین قرآن میں سے کسی نے بھی یہاں دُعا کو عبادت کے معنے میں نہیں بتایا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صراحۃً لکھا ہے کہ دُعا سے مراد عبادت نہیں جیسا کہ کچھ مفسرین کا خیال ہے بلکہ دُعا سے مراد استعانت ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئے گی ۔

ہر غم اور تکلیف سے اللہ بچاتا ہے

۶۴ ۔ کہو کہ خدا ہی تم کو ہر تنگی اور سختی سے نجات بخشتا ہے پھر تم اس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ باوجود علم محیط اور قدرت کاملہ کے جس کا بیان اوپر ہوا۔ تمہاری بداعمالیوں کی فوراً سزا نہیں دیتا ہے بلکہ جب مصائب اور شدائد میں پھنس کر تم اس کو عاجزی سے پکارتے ہو اور پختہ وعدے کرتے ہو کہ اس مصیبت سے نکلنے کے بعد کبھی شرارت نہ کریں گے اور ہمیشہ احسان کو یاد رکھیں گے تو بسا اوقات وہ تمہاری دستگیری کر کے ان مہالک اور ہر قسم کی سختیوں سے نجات دیتا ہے لیکن پھر بھی تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہتے اور مصیبت سے آزاد ہوتے ہی بغاوت شروع کر دیتے ہو۔[1] مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ تنہا اللہ ہی قادر مطلق ہے اور وہی تمام اختیارات کا مالک اور تمہاری بھلائی اور برائی کا مختار کل ہے ۔ اور اسی کے ہاتھ تمہاری قسمتوں کی باگ ڈور ہے ۔ اس کی شہادت تو تمہارے اپنے نفس میں موجود ہے جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور اسباب کے سب رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو اس وقت بے اختیار اسی کی طرف رجوع کرتے ہو لیکن اس کھلی علامت کے ہوتے ہوتے بھی تم نے خدائی میں بلا دلیل و حجت اور بلا ثبوت دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے، پلتے ہو اس کے رزق پر اور ان داتا بناتے ہو دوسروں کو، غلام ہو اس کے اور بندگی بجا لاتے ہو دوسروں کی، مدد چاہتے ہو اس کے فضل و کرم سے اور حامی و ناصر ٹھہراتے ہو دوسروں کو، مشکل کشائی کرتا ہے وہ بُرے وقت میں گڑگڑاتے ہو اس کے سامنے اور جب وقت گزر جاتا ہے تو تمہارے مشکل کشا بن جاتے ہیں دوسرے اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں دوسروں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے نام کی۔[1]

یہاں ثم انتم تشرکون کا زور بہت زیادہ قابل توجہ ہے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب ہر قسم کی سختی اور تکلیف سے ہم بچاتے ہیں تو ہمارا شکر بجالاتے اور ہو یہ رہا ہے کہ بجائے شکر کے باغیانہ کردار پیش کر رہے ہو اور خدا سے جس قسم کا تعلق اور جس درجہ کا عجز و نیاز اور جس مرتبہ کی محبت اور جس درجہ کی التجا درکار ہے وہ دوسروں کے لیے بجا لا رہے ہو۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کائنات کا خالق کوئی نہیں اور نفع و ضرر کا مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں لیکن ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں اوروں سے مانگتے ہیں۔ ان ہی کو حاجت روا اور مشکل کشا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کا نام لیتے ہیں۔ ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ غرض براہ راست جو تعلق ان کو ہوتا ہے اللہ سے نہیں اوروں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں کا طرز عمل اولیائے کے مزارات کی نسبت اسی کے قریب قریب ہے۔ شاہ ولی اللہ نے البدور البازغہ میں لکھا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام لینے والوں میں انتہا درجہ کے منافقوں کا بھی یہی عقیدہ اور طرز عمل ہے۔

خدائی گرفت کی صورتیں

۶۷۔ کہہ دو کہ اس پر وہی قادر ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک دوسرے سے لڑا کر آپس کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ یعنی خدا کے امہال و درگزر کو دیکھ کر مامون اور بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ جس طرح وہ شدائد و مصائب سے نجات دے سکتا ہے اسے یہ بھی قدرت ہے کہ کسی قسم کا عذاب تم پر مسلط کر دے۔

اس میں عذاب کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

الف: جو اوپر سے آئے جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوائیں اور بارش

ب: جو پاؤں کے نیچے سے آئے جیسے زلزلہ اور سیلاب وغیرہ، یہ دونوں خارجی اور بیرونی عذاب ہیں جو اگلی قوموں پر مسلط کیے گئے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اس امت کو

[1] تفہیم القرآن

اس قسم کے عذاب عام سے محفوظ کر دیا گیا ہے یعنی اس قسم کا عام عذاب جو گزشتہ اقوام کی طرح اس امت کا استیصال کر دے نازل نہ ہوگا۔ جزئی اور خصوصی واقعات اگر پیش آئیں تو اس کی نفی نہیں ہاں تیسری قسم عذاب کی جسے اندرونی اور داخلی کہنا چاہیے اس اُمت کے حق میں باقی ہے اور وہ پارٹی بندی، باہمی جنگ وجدل اور آپس کی خونریزی کا عذاب ہے۔ موضح القرآن میں ہے کہ قرآن شریف میں اکثر کافروں کو عذاب کا وعدہ دیا۔ یہاں کھول دیا کہ عذاب وہ بھی ہے جو اگلی اُمتوں پر آیا آسمان سے یا زمین سے اور یہ بھی ہے کہ آدمیوں کو آپس میں لڑا دے اور ان کو قتل یا قید یا ذلیل کر دے۔ حضرت نے سمجھ لیا کہ اس اُمت پر یہ بھی عذاب ہوگا۔ اکثر عذاب الیم، عذاب مہین، عذاب شدید اور عذاب عظیم ان ہی باتوں کو فرمایا ہے اور آخرت کا عذاب یہی ہے ان پر جو کافر ہی مرے[1]

آیت میں عذاب کی جو تین صورتیں بیان ہوئی ہیں اس میں من فوقکم اوپر سے عذاب کی تفسیر عبداللہ بن عباس نے ظالم حکمرانوں سے اور من تحتکم کی سرکش رعایا اور نافرمان غلاموں سے بھی کی ہے۔ غالباً حضرت عبداللہ بن عباس کا منشا یہ بتانا ہے کہ یہ بھی اس آیت کے مدلول میں داخل ہے۔

اس آیت میں جو بات بتائی گئی ہے اس کی حیثیت ایک عمومی قانون کی ہے یا اس میں کسی کی کوئی تخصیص بھی ہے۔ اگرچہ کہنے والوں نے یہی کہا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے۔ لیکن محققین اسی طرف گئے ہیں کہ آیت عام ہے اگرچہ اس کا نزول مشرکین سے خطاب کے سیاق میں ہے مگر قوانین ونوامیس اقوام میں اعتبار عموم الفاظ کا ہے نہ کہ خصوصی اسباب کا۔

اس کی تائید حضرت جابر کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں پیش کی ہے فرماتے ہیں کہ

> جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی قل ھو القادر الخ علی ان یبعث عذاباً من فوقکم حضور نے فرمایا اعوذ بوجھک اے اللہ میں آپ کی پناہ لیتا ہوں او من تحت ارجلکم پر آپ نے فرمایا اعوذ بوجھک اے اللہ میں آپ کی پناہ لیتا ہوں او یلبسکم شیعاً و یذیق بعضکم باس بعض سن کر آپ نے فرمایا یہ آسان ہے یا یہ معمولی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی دو باتوں کے مقابلے میں فرقہ فرقہ بننے اور ان کے باہم ایک دوسرے کو مزہ چکھانے کو معمولی یا آسان فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی دو باتوں میں عذاب استیصال بیان کیا گیا ہے جبکہ بعد کی دو باتوں میں عذاب تو ہے مگر عذاب استیصال نہیں ہے عذاب استیصال یہ ہے کہ عذاب کے نتیجہ میں اُمت کا ایک فرد بھی باقی نہ رہے۔

ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> میں نے اللہ سبحانہٗ سے اپنی اُمت کے لیے چار باتوں کی دُعا کی اوّل یہ کہ میری اُمت پر آسمان سے پتھراؤ نہ ہو دوسرے یہ کہ میری اُمت کو زمین میں نہ دھسایا جائے، تیسرے یہ کہ میری اُمت فرقہ فرقہ نہ ہو، چوتھے یہ کہ میری اُمت باہم دست بگریبان نہ ہو، اللہ سبحانہٗ نے پہلی دو دُعائیں قبول فرمالی ہیں لیکن بعد کی دو دعائیں منظور نہیں کی ہیں

یعنی آسمانی عذاب اور زمینی عذاب کے ذریعے تو اُمت کو ختم نہ کیا جائے گا لیکن فرقہ فرقہ ہونے اور باہم سر پھٹول کی یہ اُمت بھی شکار ہو گی۔ اور ابن مردویہ ہی نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا پھر یوں دُعا فرمائی اے اللہ میری امت پر اوپر سے عذاب نازل نہ فرما اور نہ ان کے پیروں کے نیچے سے ان پر عذاب بھیج، نہ ان کو فرقہ فرقہ بنا اور نہ ان میں سر پھٹول کا عذاب نازل کر، حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت جبریل تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے آپ کی اُمت کو اوپر کے اور نیچے کے عذاب سے پناہ دے دی ہے لیکن فرقہ فرقہ بننے اور باہم سر پھٹول کے عذاب سے پناہ نہیں دی ہے۔ اس معاملہ میں وہ اپنے پیشرو اہل کتاب کی کاپی کریں گے اور اس کے نتیجے میں ان کو ان حالات سے دوچار ہونا ہوگا جو تفرق و خلاف کے لیئے ضروری ہے۔

اس موضوع پر اور بھی بہت سی احادیث آئی ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اور علامہ جلال الدین السیوطی نے الدرالمنثور میں ان کو تفصیل سے پیش کیا ہے اسی موضوع پر حضرت ثوبان کی وہ حدیث بھی ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ نے زمین کے مشارق و مغارب کا مجھے مشاہدہ کرایا اور میری امت کی حکومت وہاں تک ہوگی جہاں تک مجھے مشاہدہ کرایا گیا ہے اور مجھے سونے اور چاندی کے خزانے ملے ہیں۔ اور میں نے اللہ سبحانہ سے درخواست کی ہے کہ میری اُمت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کرنا اور یہ بھی درخواست کی ہے کہ میری اُمت پر ایسے بیرونی دشمنوں کو مسلط نہ کرنا جو ان کی بیخ کنی مٹادے، میرے رب نے میرے سے کہا اے محمد میں جب فیصلہ کر دیتا ہوں تو وہ بدلا نہیں جاتا، بلاشبہ میں تم کو یہ عطیہ دیتا ہوں کہ میں تمہاری اُمت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کروں گا اور کسی ایسے بیرونی دشمن کو ان پر مسلط نہ کروں گا جو ان کی ہستی ہی مٹادے خواہ ساری دُنیا ان کے خلاف ایکا کرے۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ باہم ایک دوسرے کو ماریں گے اور قیدی بنائیں گے۔

اور اس کے ساتھ حضرت ثوبان کی وہ حدیث بھی گوش گزار فرمالیجیے جو سنن ابی داؤد میں آئی ہے

آپ نے فرمایا کہ قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ اس لیے ہوگا کہ ہم اس زمانے میں کم ہو جائیں گے فرمایا نہیں تمہاری تعداد بہت بڑی ہوگی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس و خاشاک ہوتا ہے کہ سیلاب ان کو بہاتے لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رُعب دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کمزوری کیا ہوگی فرمایا یہاں تک دنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔

بہر حال ان احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس آیت میں جن عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت عام قانونِ الٰہی کی ہے اور دعاؤں کا منشا یہ ہے کہ جب تک اُمت رشتہ ایمان تھامے رہے اور ایمان کے تقاضے پورے کرتے رہے گی وہ ان سے محفوظ رہے گی۔ بالخصوص جس عذاب تفرقہ کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے اس کی اُمت اسی وقت شکار ہوگی جب رشتہ ایمان نبوت سے کمزور پڑ جائے گا۔ عذاب استیصال بلاشبہ نبوت کی دُعا سے اس اُمت میں ختم کر دیا گیا ہے لیکن دوسرے عذاب بالخصوص عذاب تفرق کی یہ اُمت شکار ہے۔ اسی تفرق و انتشار کا نتیجہ اعداء کا غلبہ اور

تسلط ہے۔ موجودہ دنیائے اسلام کی پیش نظر تاریخ میں کیا حرف بحرف اس کی تصدیق نہیں ہے۔
یاد رہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تفرق اور تشیع کی امت کو خبر دی ہے وہ اس لیے نہیں دی ہے کہ امت ان فتنوں سے ہمدوش ہونے کے اسباب و وسائل فراہم کرے بلکہ اس لیے دی ہے کہ اس سے مقابلہ کرنے اور بچنے کے لیے امت علی وجہ البصیرۃ تیار رہے۔ اسی بنا پر اس آیت کے نازل ہونے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

مسلمانو! میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

(ابن کثیر بحوالہ زید ابن اسلم)

اللہ کے قوانین کا علم حاصل کرو

۶۷۔ دیکھو ہم اپنی آیات کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں۔ یعنی قرآن کو یا عذاب کے آنے کو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب جھوٹی دھمکیاں ہیں عذاب وغیرہ کچھ نہیں آتا[1]
مطلب یہ ہے کہ غور و فکر سے کام لو کہ ہم دلائل کو کس کس انداز میں پیش کر رہے ہیں کبھی محسوس بنا کر اور کبھی معقول بنا کر اور کبھی خالص معلومات غیبی بنا کر۔ صرف اس لیے کہ وہ بات کی تہ کو پہنچ جائیں فقہ نام ہے بات کو دلیل سے اس طرح سمجھنے کا کہ فکر و عمل تک رسائی ہو جائے۔
یہ آیات ہی دراصل علم کتاب کی روح ہیں۔ یہی اللہ کی سنن ہیں جن کے ذریعے امتوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کائنات ہستی میں اللہ کی سنن اور نوامیس کا علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ کی ذات وصفات اور افعال کے علم سے روشناسی نہ ہو۔ اللہ کی صفات کا علم ہی اللہ کی سنن کے علم کے لیے رہنمائے راہ ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اسی کو علم محمود کہا ہے، فرماتے ہیں،

علم محمود اللہ کی ذات صفات اور افعال، مخلوقات ہیں اس کی سنن آخرت کے دنیا پر مرتب کرنے میں اس کی حکمتوں کا علم ہے یہی علم مقصود بالذات ہے۔

امام موصوف نے اس علم کے حاملین کو تمام علماء محدثین، فقہاء، متکلمین اور مفسرین پر برتری دی ہے بلکہ بتایا ہے کہ یہی وہ علم ہے جس کے ذریعے عظماء صحابہ کو دوسروں کے مقابلہ

[1] افادات شیخ الاسلام

میں امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہی وہ علم ہے جس کے بارے میں عمر بن الخطاب کی وفات کے بعد عبداللہ بن مسعود نے یہ فرمایا تھا کہ علم کو اگر دس پر تقسیم کیا جائے تو نو حصے عمر بن الخطاب کے ساتھ چلا گیا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور افعال کا علم انسانیت کا معراج کمال ہے تو اللہ کی مخلوقات میں اللہ کی سنن اور نوامیس کا علم اسی معراج کمال تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وہ عظیم علم ہے جس کے ذریعے انسان کی حیات اجتماعی، تمدنی پروان چڑھتی ہے۔ اور اسی میں امتوں کی تمام ترقیوں کا راز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سمجھایا جا رہا ہے کہ امتوں اور قوموں میں اللہ کے قوانین اور نوامیس کو سمجھو۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی ہے۔ ہوا کا ایک طوفان تمہیں برباد کر سکتا ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا تمہاری بستیوں کو پیوند خاک کر سکتا ہے قبیلوں اور قوموں اور ملکوں کی دشمنی کے الاؤ سے بھڑک سکتے ہیں۔ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو غفلت و مدہوشی میں وقت ضائع نہ کرو۔

اللہ کا رسول اُمت کا وکیل نہیں ہے

۶۹ - اور اس قرآن کو تمہاری قوم نے جھٹلایا ہے حالانکہ وہ سراسر حق ہے، کہہ دو کہ میں تمہارا وکیل نہیں ہوں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا یعنی میرا یہ منصب نہیں ہے کہ تمہاری تکذیب پر خود عذاب نازل کر دوں یا اس کے وقت اور نوعیت وغیرہ کی تفصیل بتلاؤں، میرا کام صرف باخبر اور متنبہ کر دینا ہے آگے ہر چیز کے وقوع کا علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہے جب وقت آ جائے گا تم خود جان لو گے کہ میں جس چیز سے ڈراتا تھا وہ کہاں تک سچ ہے[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن جو ایک امر حق ہے اس کی تمہاری قوم نے تکذیب کی ہے۔ اب ان کا معاملہ ہم پر چھوڑ دو اور ان سے کہہ دو کہ لست علیکم بوکیل کہ میں تم پر کوئی داروغہ بنا کر روانہ نہیں کیا گیا کہ لازماً تمہیں قرآن ماننے پر مجبور کر دوں ورنہ مجھ سے پوچھا جائے گا۔ میری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے وہ میں پہنچا چکا ہوں۔ اب اگر تم عذاب کے لیے مچلے ہوئے ہو تو لکل نبأ مستقر ہر بات کے ظہور کے لیے خدا کی تقویم میں ایک وقت مقرر ہے جب وقت آئے گا تمہیں پتہ لگ جائے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جس طرح پہلی آیات میں یہ کھول کر سمجھا دیا ہے کہ اللہ کا رسول دانائے غیب، مختارِ کل اور خدا نہیں ہوتا ایسے ہی وہ وکیل بھی نہیں ہوتا ہے۔ عربی زبان میں دوسرے کی خدمت انجام دینے کے لیے دو لفظ ہیں،

۱۔ رسول

۲۔ وکیل

ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا، مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے وکیل اپنے مؤکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے اسی لیے خصومت اور جوابدہی کا بھی اسی کو حق حاصل ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل و مختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرے بلکہ چاہے تو اس کے قوانین میں اپنے اختیارِ تمیزی اور صوابدید سے ترمیم بھی کر ڈالے لیکن ایک رسول کا اس کے سوا کوئی حق نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعے بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت اگرچہ بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے۔

قرآن عزیز نے ایک سے زیادہ جگہ یہ بات دہرائی ہے کہ جسے ہم نے رسول بنایا ہے وہ صرف رسول ہے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خود خدا ہی سب کا وکیل ہے تو اب اس کا کوئی وکیل کیونکر ہو سکتا ہے، دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے ہو گی۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ رسول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہیہ اللہ کے بندوں تک پہنچاتے اور بس۔ احکامِ الٰہیہ میں ردوبدل کا اس کو حق نہیں ہے اور کسی کی ہدایت و ضلالت کا بار اس پر نہیں ہے اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جوابدہ ہے۔ جہاں تک کارخانہ عالم کی ذمہ داری و کارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت و وکالت اللہ سبحانہ نے خود اپنے ذمہ لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ اور رسولوں کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے اپنی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی ہے وکالت کی

نہیں تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ لے کہ ہدایت و ضلالت کی جوابدہی اسے خود براہ راست کرنی ہے جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جاسکتا۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ہو وہ زبردستی تمہیں دکھا دوں۔ اور جو کچھ تم نہیں سمجھ رہے ہو وہ بزور تمہیں سمجھا دوں اور میرا یہ کام بھی نہیں کہ اگر تم نہ دیکھو اور نہ سمجھو تو تم پر عذاب نازل کر دوں، میرا کام صرف یہ ہے کہ حق اور باطل کو ممتاز کر کے تمہارے سامنے پیش کر دوں۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو جس برے انجام سے میں تمہیں ڈراتا ہوں وہ اپنے وقت پر خود تمہارے سامنے آجائے گا۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ
يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾
وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَيْسَ لَهَا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ
لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ
شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ ٨ ع١٠ ١٣

اور اے اللہ کے رسول جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات
پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ،
یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں

لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھول میں ڈال دے تو
یاد آجانے پر ان ظلم کار لوگوں کے پاس نہ بیٹھو[80]۔ ان کے
حساب میں سے کسی چیز کے ذمہ دار اہل تقویٰ نہیں ہیں
ہاں ان کو نصیحت کرنا اہل تقویٰ کی ذمہ داری ہے[81]۔ جن لوگوں
نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دُنیا
کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ان کو چھوڑ دو[82]۔
اور ان کو قرآن کے ذریعے یاد دہانی کراتے رہو تاکہ کوئی شخص
اپنے اعمال کے وبال میں وہاں گرفتار نہ ہو جائے جہاں
اللہ کے سوا کوئی بچانے والا اور سفارشی نہ ہوگا اور اگر وہ
سب کچھ بدلہ میں بھی دے گا تو نہ لیا جائے گا[83]۔ یہی وہ لوگ
ہیں جن کو اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑا جائے گا، ان کے
لیے ان کی کافرانہ زندگی کے بدلہ میں کھولتا ہوا پینے کا پانی
اور دردناک عذاب ہوگا[84]۔

جدال کی راہ ہدایت کی راہ نہیں

اب تک اُمت دعوت مخاطب تھی۔ یہاں سے روئے سخن امت اجابت کی طرف ہو گیا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگ بات سننا ہی نہیں چاہتے ہیں ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں میں حق کی طلب نہ ہو اور محض اپنی بات کی پچ کرنے کے لیے اور مطالب حق کو رد و کد کا مشغلہ بنانے کے لیے بحث و نزاع کریں تو تمہاری راستبازی کا تقاضا یہی ہے کہ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ کیونکہ جدال و نزاع کی راہ ہدایت کی راہ نہیں ہے اور جدال کرنے والے کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ بدقسمتی سے دُنیا میں طلبِ حق کی راہ بھی محض جدال و نزاع کی راہ بن گئی ہے لوگ اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے لڑنے جھگڑنے کے عادی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا جھگڑا پیش آ جاتا ہے تو صرف لوگ جیت ہی کے لیے لڑتے ہیں اس خیال سے نہیں لڑتے کہ حق و انصاف کیا ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم انسان اس خیال سے بحث نہیں کرتے کہ حق کو تلاش کیا جائے بلکہ اکثر اوقات ان کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ برسرِ حق نہیں ہیں اور انصاف مدمقابل کے ساتھ ہے لیکن چونکہ اپنا مطلب کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہوتا ہے اس لیے کبھی اعترافِ حق کے لیے تیار نہیں ہوتے حق و انصاف ان سے جس قدر الگ ہوتا جاتا ہے بحث و نزاع کی سرگرمی اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اگر ان کا مقدمہ سب سے زیادہ کمزور ہو گا تو وہ خیال کریں گے کہ بحث و نزاع کی سرگرمی زیادہ ہونی چاہیے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ کم از کم دین کے معاملہ میں وہ ایسا نہ کریں۔ دنیوی معاملات میں کچھ لینا دینا ہوتا ہے اس لیے غرض پرست آدمی اپنی بات کی پچ کرتا ہی رہتا ہے لیکن دین کی راہ لین دین کی راہ نہیں ہے سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ کفر سچائی کے کام کو بھی کاروبار بنا دیتا ہے اور دین کے بارے میں بھی اسی طرح جھگڑتا ہے جس طرح دُنیا کے معاملہ میں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ جب دیکھو کہ یہ لوگ کج بحثیوں اور استہزاء پر اتر آئے ہیں تو ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ صرف اسی وقت ان کے سامنے دعوت پیش کرو جب وہ کچھ سننے اور سمجھنے کے موڈ میں نظر آئیں۔ تمہاری ذمہ داری تبلیغ و تذکیر تک محدود ہے تم ان کے ایمان کے ذمہ دار نہیں ہو۔

۸۰۔ اور اے اللہ کے رسول جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر

کبھی شیطان تمہیں بھول میں ڈال دے تو یاد آجانے کے بعد ان ظلم کار لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ یعنی جو لوگ آیات اللہ پر طعن و استہزاء اور ناحق کی نکتہ چینی میں مشغول ہو کر اپنے کو مستحق عذاب بنا رہے ہیں تم ان سے خلط ملط نہ رکھو کہیں تم بھی ان کے زمرے میں داخل ہو کر مورد عذاب نہ بن جاؤ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے انکم اذا مثلھم ایک مومن کی غیرت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ایسی مجلس سے بیزار ہو کر کنارہ کرے اور کبھی بھول کر شریک ہو گیا تو یاد آنے کے بعد فوراً وہاں سے اٹھ جائے اسی میں اپنی عاقبت کی درستی، دین کی سلامتی اور طعن و استہزاء کرنے والوں کے لیے عملی نصیحت اور تنبیہہ ہے [1]

اگرچہ رأیت واحد کا صیغہ ہے لیکن خطاب عام ہے۔ آیات سے مراد آیات قرآنی ہیں عام شارحین قرآن کی یہی رائے ہے۔ الجصاص نے آیات اللہ کو القرآن بتایا ہے۔ بغوی نے معالم میں بھی یہی بات لکھی ہے، وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی۔ اور یہ فرض خود قرآن نے آپ کا قرار دیا تھا۔ اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی۔ جس ضرب کی روک خود اور سپر سے تو ممکن نہ تھی لیکن لوگ اس کے جواب کے لیے نکتہ چینی، بیہودہ گوئی کا ہتھیار استعمال کرتے تھے اسی کی طرف قرآن نے الذین یخوضون سے اشارہ کیا ہے خوض کے لفظی معنے کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں۔ خاض الماء وہ پانی میں گھس گیا۔ اسی سے خوض فی الحدیث کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنے ہیں بات میں سے بات نکالنا، بال کی کھال ادھیڑنا، کسی بات میں اعتراض، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نت نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کی معنویت کے لیے آیا ہے۔ سورہ نساء جو سورہ انعام کے بعد نازل ہوئی اس میں اس خوض کی تفسیر بھی آئی ہے ارشاد ہے۔

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا
ویستھزأ بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ۔

اللہ تمہارے لیے یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم دیکھو اور سنو کہ خدا کی آیتوں کے

---

[1] افادت شیخ الاسلام

ساتھ کفر کیا جارہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جارہی ہے تو تم اس مجلس سے اٹھ جاؤ،
جب تک وہ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں ان کے پاس نہ بیٹھو۔

اس آیت میں فی الکتاب سے اسی سورہ انعام والی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سورہ انعام والی آیت میں اہل ایمان کو صاف حکم مل رہا ہے کہ جو لوگ قرآنی احکام و مسائل پر نکتہ چینی کرتے ہوں، بیہودہ گوئی کرتے ہوں ان کے پاس بیٹھنا جائز نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی واجب ہے۔ اگرچہ آیت اپنے نزول کے اعتبار سے مشرکین کے حق میں ہے مگر علماء کہتے ہیں کہ یہی حکم مسلمانوں کے ان فرقوں کا بھی ہے جو اہداف ہی کو چھوڑ کر الہویٰ کے پیروکار ہیں اور جو افکار و اعمال کے پیمانے محض اپنے میلان نفس اور رجحان طبع کے تحت تراشتے ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کو یہ ہدایت کیوں دی ہے؟ دراصل اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمت دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اس کی تضحیک، اس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے بیمار کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اس کے سامنے اس چیز کو پیش کرنا اس کے بخار اور ہذیان دونوں کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہو۔ وہ کبھی ایسی غلطی نہ کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی ہے کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت میں چھوٹ ہو رہے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب ان کی بحرانی کیفیت دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اس غیرت حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی داعی حق کے لیے غلط اور خاموش رہنا بھی غلط اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہونے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے

سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہاں اس حکم میں یہ دونوں ہی پہلو پیش نظر ہیں۔ پہلا تو سیاق کلام ہی سے واضح ہے اور دوسرے کو قرآن نے سورہ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں واضح فرمادیا۔ اسی لیے اسی ہدایت کا حوالہ دے کر وہاں منافقین کی گرفت فرمائی ہے کہ یہ لوگ مخالفین اسلام کی ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ قرآن میں اس سے روکا جا چکا ہے[1]

یاد رہے کہ جو حکم قرآن کے احکام کے بارے میں بتایا گیا ہے وہی بعینہٖ سارے اسلامی قانون اور اس کے سارے احکام کا ہوگا۔ اسلام کا جہاں بھی مذاق اڑایا جائے وہاں بیٹھنا اور ان کی مجالس میں شریک ہونا بے غیرتی اور اس پر راضی ہونا نفاق اور کفر ہے۔ الجصاص نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے کہ:

> یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ملحدین اور کفار کی ان مجالس میں شرکت ناجائز ہے جہاں کفر و شرک کی نمائش ہو۔

آخر میں فرمایا ہے واما ینسینک الشیطٰن یعنی اگر تجھے شیطان بھلا دے، محققین کی رائے یہی ہے کہ اس میں بھی عام خطاب ہے اور جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو مخاطب قرار دیا ہے وہ معنے یہ کرتے ہیں کہ اگر بالفرض شیطان آپ کو بھلا دے۔ بھولنا ہو یا شیطان کا بھلا دینا ہو مقام نبوت کی حد تک اس میں اہل السنہ والجماعۃ کا کیا موقف ہے۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ پارہ ۱۷ میں آئیں گی۔ یہاں تو صرف یہ سمجھنے کی بات ہے کہ اس تاکید کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ بسا اوقات آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزاء تک پہنچ جاتی ہے ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں لیکن خیال کرتا ہے کہ بری مجلس سے اٹھ کر کیسے جائے۔ یا اگر مناظر قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے حریف کیا کہے گا یہ دونوں خیال آدمی کے لیے فتنہ ہیں۔ اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیرت کی دلیل ہے آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اسے خاموشی سے برداشت کر لے گا تو خدا اور اس کے دستور و ضابطہ کا حق تو ماں باپ اور تمام دنیا سے زیادہ ہے۔

---

[1] تدبر قرآن

اس فقرے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورت حال سے دوچار کر دے تو ایسے موقع پر کیا طرز عمل اپنانا چاہیے یہی ادا صرف یہی کہ لا تقعد بعد الذکری یعنی متنبہ ہوتے ہی ایسی مجلس سے اٹھ جائے اور بس۔

اہل تقویٰ کی ذمہ داری

۸۱- ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری اہل تقویٰ پر نہیں ہے ہاں ان کو نصیحت کرنا اہل تقویٰ کی ذمہ داری ہے۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر پرہیزگار جھگڑنے اور طعن کرنے والوں کی مجلس سے اٹھ کر چلے آتے تو طاعنین کی گمراہی میں پڑا رہنے کا کوئی مواخذہ اور ضرر ان متقین پر عائد نہیں ہو سکتا۔ ہاں ان کے ذمہ بقدر استطاعت اور حسب موقع نصیحت کرتے رہنا ہے۔ شاید وہ بد بخت نصیحت سن کر اپنے انجام سے ڈر جائیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ پرہیزگار اور محتاط لوگوں کو اگر کسی واقعی معتد بہ دینی یا دنیوی ضرورت سے ایسی مجلس میں جانے کا اتفاق ہو جاتے تو ان کے حق میں طاعنین کے گناہ اور باز پرس کا کوئی اثر نہیں پہنچتا۔ ہاں ان کے ذمہ بشرط قدرت نصیحت کرنا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت ان پر بھی نصیحت کا اثر پڑ جائے[1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے بچ کر کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث کر کے ضرور انہیں قائل کر کے چھوڑیں گے اور ان کے ہر لغو و مہمل اعتراض کا ضروری جواب دیں گے اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنہیں گمراہی میں بھٹکتا دیکھ رہے ہیں انہیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اتر آئیں تو اہل حق کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کشتیاں لڑیں، اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کے بجائے انہیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہیے جو خود طالب حق ہوں[2]

اس آیت میں اہل ایمان کو یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ ان پر کافروں سے متعلق تبلیغ و دعوت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ صرف اللہ کے دین کو پہنچا دینے کی ہے۔ ان پر ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ کفار اگر ایمان لے آئیں تو اس کی جزا خود پائیں گے اور اگر کفر ہی پر اڑے رہیں گے تو اللہ کی عدالت میں خود اس کی جوابدہی کریں گے۔ اہل ایمان نے اگر دعوت پہنچا دی تو ان سے ان سرکشوں کے بارے میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ خدا کے یہاں کسی شخص سے کسی دوسرے کی ذمہ داریوں سے متعلق سوال نہ کیا جائے گا۔ اہل ایمان پر خود ذمہ داری دوسروں کے باب میں عائد ہوتی ہے وہ صرف تبلیغ و تذکیر کی ہے اور اس فرض کی پاسبانی کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل ایمان جب دیکھیں کہ کوئی سازگار موقعہ ان تک بات پہنچا دینے کا ہے تو ان کو اللہ کی بات پہنچا دیں، اپنے کو اہل کفر کی ضلالت وہدایت کا مسئول سمجھ کر ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات اسی پارے کے آغاز میں آیت ۱۰۵ کے تحت گزر چکی ہے یعنی

یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل

اس آیت کا اس پہلو سے بھی مطالعہ فرمائیے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ صحابہ کرام میں دعوت و تبلیغ کا کس قدر جوش تھا اس سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ صحابہ کرام کو شہادت حق کی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے ہدایت قبول نہ کی تو عنداللہ کی بارگاہ میں ان کی کوتاہی کی گرفت ہو۔

یہ سورت مکی ہے اور یہ بات اس وقت کہی جا رہی ہے جب کہ اللہ کے رسول کو اسلام کی دعوت دیتے ہوتے بارہ سال گزر چکے ہیں۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ان حالات میں یہ آیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے جوش تبلیغ کی خوب عکاسی کر رہی ہے

مذاق اڑانے والوں کو نظر انداز کر دو

۸۲۔ اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ان کو چھوڑ دو۔ یعنی اپنے اس دین کو جس کا قبول کرنا ان کے ذمہ فرض تھا اور وہ مذہب اسلام ہے اور دنیا کی لذتوں میں مست ہو کر عاقبت کو بھلا بیٹھے[1] واقعی دین سے مراد وہی دین ہے جو اللہ نے ان کے لیے اتارا تھا اور جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صحابہ کرام دعوت و تبلیغ کے ذریعے ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی تھی اس قدر گر چکے تھے کہ وہ اللہ کے دین کا مذاق اڑاتے تھے، یہ کہہ کر قرآن نے مسلمانوں کے جذبہ غیرت و حمیت کو ابھارا ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور اسے کھیل تماشا بناتے ہیں۔ تم ان سے کس خیر کی امید رکھتے ہو، ان کو چھوڑ دو ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لوگ زندگی کے معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ اور ایسے لا ابالی ہیں کہ دین کو بھی وہ اپنے مسخرے پن کا موضوع بنا لیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کے بھی معنے منبادر ہیں۔ اس کے سوا شارحین قرآن نے دوسرے مطالب بھی بتائے ہیں مثلاً یہ کہ ان لوگوں کو نظر انداز کر دو جو اعمال حق کی جگہ ایسے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو کھیل تماشے کی طرح بے حقیقت ہیں یا یہ کہ جن لوگوں نے ہاتھ سے بنائے ہوئے کھلونوں یعنی بتوں کو دین بنا رکھا ہے یا یہ کہ جن لوگوں نے دین کو اپنی خواہشوں اور چاہتوں کے لیے بازیچہ بنا لیا ہے یا یہ کہ جن لوگوں نے دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ مناصب ریاست غلبہ اور سرمایہ فراہم کرنے کا وسیلہ بنا کر پورے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے لیکن صحیح مطلب وہی ہے جو ہم نے پہلے پیش کر دیا ہے۔

آخرت فراموشی کا سرچشمہ

آخر میں فرمایا ہے وغرتھم الحیاۃ الدنیا دنیوی زندگی پر وہ مغرور ہیں یہ ہے۔ ساری خرابیوں کی جڑ۔ یہ دنیا پرستی اور عاجلہ پسندی وہ بس کی گانٹھ ہے جو قلب انسانی کی رگوں میں فکر آخرت سے بے نیازی کا زہر پیوست کر دیتی ہے اور پھر اس کے فطری مزاج کو خراب کر دیتا ہے۔ جب تک اس زہر سے اس کا دل پاک نہیں ہوگا اس کے لیے خدا پرستی کی راہ اختیار کرنا محال ہے۔ پُر اثر تبلیغ کی کوئی مقدار بھی اس کو حسن قبول پر آمادہ نہیں کر سکتی خواہ وہ زبان سے واہ واہ کے نعرے کتنے بلند کرے وہ ایمان کے صحیح تقاضوں کو سنے گا اور اس طرح اغماض کر جائے گا گویا وہ اس کا سرے سے مخاطب ہی نہیں۔ اگر آپ زیادہ اصرار سے کام لیں تو وہ معذرتیں کرے گا۔ پھر تاویلوں کی نقاب منہ پر ڈال دے گا اور بدرجہ آخر انتہائی جسارت کے ساتھ مذاق کرنے پر اتر آئے گا۔ یہی غرور دنیا ہے جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور یہی ان کے زعم کے مطابق وہ کامیاب زندگی ہے جو ان کو حاصل ہے اور جس میں وہ مگن ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کھا رہے ہیں عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کہیں سے ان کے اطمینان میں کوئی

رخنہ نہیں ہے۔ اگر ان کی زندگی غلط ہے جیسا قرآن کہتا ہے تو وہ تباہ کیوں نہیں ہو جاتے۔ اور جب وہ یہاں مسلمانوں سے بہتر حالت میں ہیں تو ان کے خدا کے محبوب ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ان کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اسی زندگی کو اصلی اور ساری زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں بلکہ امتحان و ابتلا کے اصول پر چل رہی ہے اس لیے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن ان کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اس کی حیثیت ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

قرآن کے ذریعے آخرت کی تذکیر

۸۳۔ اور ان کو قرآن کے ذریعے یاد دہانی کراتے رہو تاکہ کوئی شخص وہاں اپنے اعمال کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے جہاں اللہ کے سوا کوئی بچانے والا اور سفارشی نہ ہوگا اور اگر وہ سب کچھ بدلہ میں دے دے گا تو نہ لیا جائے گا۔ اصل ارشاد میں ان تبسل آیا ہے یہ ابسال سے مضارع مجہول ہے اس کے معنے روکنے محروم کرنے اور ہلاکت کے حوالہ کرنے کے آتے ہیں۔ یہاں تینوں معنے درست ہیں ان سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ لفظ مخافۃ یا اس کے ہم معنے کوئی لفظ محذوف ہے۔ ترجمہ تینوں معنے کے لحاظ سے اس طرح ہے، قرآن کے ذریعے تذکیر کرو اس اندیشہ سے کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے دوسرا یہ کہ قرآن کے ذریعے تذکیر کرو اس اندیشہ سے کہ گرفتار ہو جائے کوئی جان اپنے کیے میں۔ تیسرا یہ کہ نصیحت کرو اس اندیشہ سے کہ کوئی جان اپنے اعمال کی پاداش میں ثواب سے محروم ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دین اسلام کا مذاق بناتے ہیں اب ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے بس صرف قرآن کے ذریعے اپنا تذکیر دعوت کا فرض ادا کیجیے تاکہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتار عذاب نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سزا جس کو جو بھی ملے وہ اپنے ہی کرتوتوں کے باعث ہوگی۔ اسی کو قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے کل نفس بما کسبت رھینۃ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تبلیغ و تذکیر کا جو حکم بھی ہے اس کی تہ میں شفقت علی الخلق کا جذبہ کارفرما ہے، آگے قرآن نے اس گرفتاری کا چہرہ پیش کیا ہے لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع ہر ایک کا اپنے عمل سے سابقہ پڑے گا۔ عمل ہی ہلاک کرے گا اور عمل ہی نجات دے گا، نہ کوئی

کسی کا اللہ کے سوا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی ہوگا۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنے سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا۔ وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں دیوتا یا فلاں اوتار یا تو خود ہی کارساز کے لیے اور بگڑی ہوئی بنانے کے لیے کافی ہو جائیں گے اور یا ان کی سفارش و مداخلت کام کر جائے گی۔ قرآن نے سفارش کے اسی تصور پر یہاں ضرب کاری لگائی ہے۔

آخر میں فرمایا و ان تعدل لفظ عدل یہاں فدیہ کے معنے میں ہے یعنی جس طرح یہاں معاوضے اور بدلے دے کر کام ہو جاتا ہے وہاں اگر کوئی معاوضہ کی ہر نوع بھی پیش کرے گا قبول نہ کیا جائے گا وہاں عذاب سے چھٹکارے کے لیے صرف افکار صحیحہ اور اعمال صالحہ کی کرنسی کام آئے گی۔

چونکہ دُنیا میں انسان اس کا خوگر ہے کہ اگر کبھی کوئی جرم کرتا ہے اور اس کی سزا سامنے آتی ہے تو سزا سے بچنے کے لیے تین ہی قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ کبھی اپنی جماعت کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے سزا سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بڑے آدمیوں کی سفارش سے کام لیتا ہے اور یہ بھی نہ ہو تو پھر یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے کچھ مال خرچ کرتا ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ اللہ کے دربار میں سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست ہو سکتا ہے نہ کسی کی سفارش اللہ کی اجازت کے بغیر ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مال قبول کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہوگا اور وہ اسے پیش کرنا چاہے گا تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

کفر کی دردناک سزا

۴ ۸ - یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑا جائے گا ان کے لیے ان کی کافرانہ

زندگی کے بدلے میں کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا۔ یعنی ایسے لوگوں کو جو تکذیب و استہزار کی کرتوت میں پکڑے گئے ہوں نہ کوئی حمایتی ملے گا جو مدد کرکے زبردستی عذاب الٰہی سے چھڑا لے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہوگا جو سعی و سفارش سے کام نکال دے اور نہ کسی قسم کا فدیہ اور معاوضہ قبول کیا جائے گا۔ اگر بالفرض ایک مجرم دُنیا بھر کے معاوضے دے کر چھوٹنا چاہے گا تو چھوٹ نہ سکے گا۔ گزشتہ آیت میں خاص اس مجلس سے کنارہ کشی کا حکم تھا جہاں آیات اللہ کے متعلق طعن و استہزاء اور ناحق جھگڑے کیے جارہے ہوں اس آیت میں ایسے لوگوں کی عام مجالست وصحبت ترک کر دینے کا ارشاد ہے مگر ساتھ ہی حکم ہے کہ ان کو نصیحت کر دیا کرو تاکہ وہ اپنے کیے کے انجام سے آگاہ ہو جائیں[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کا مذاق اڑاتے اور اسے اپنی تفریح کا مشغلہ بنائے ہوتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال اور اپنی کمائی کی وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوتے، ان لوگوں کی سزا اپنی کا فرانہ زندگی کی وجہ سے یہ ہوگی کہ ان کو کھولتا ہوا گرم پانی اور انواع و اقسام کا دردناک عذاب ہوگا۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ ان آیات میں اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ مسلمان ان مجالس میں شرکت سے اپنے کو بچا کر رکھیں جو منکرات، فواحش، معاصی پر مشتمل ہوں۔ یہ احکام اس لیے ہیں تاکہ بری صحبت کا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے۔ قرآن نے اس معاملہ میں راہ اعتدال اختیار کی ہے۔ تنگ ظرف لوگوں کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ فلاں قوم چونکہ تمہاری مخالف ہے اس لیے ان کے پاس نہ بیٹھو، ان سے بات چیت نہ کرو اور نہ افراط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ صحبت بد کے اثر کی پرواہی نہ کرو۔ پہلی صورت میں معاشی گاڑی رک جاتی دوسری صورت میں اخلاق تباہ ہو جاتے اس لیے درمیانی صورت اختیار کی کہ ایسے لوگوں کی ہم نشینی سے بچ کر رہو جہاں خدا، خدا کا رسول، قرآن، سنت، خلافت اور امامت آخرت کو بازیچہ اطفال اور مجلسی تفریح کا سامان بنایا جاتا ہے۔ ان مجالس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خالص کافروں کی ہوں بلکہ اگر نام نہاد مسلمانوں کی مجالس بھی ایسے منکرات پر مشتمل ہوں تو ان کا حکم بھی یہی ہے جب کہ آج کل بیشتر تعلیم یافتہ دین ناآشنا مسلمانوں کی مجالس بھی اس نقصان سے خالی نہیں ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قُلْ أَنَدْعُوا مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ
أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ
فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ
قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾
وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوهُ ۚ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٧٢﴾
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ
يَقُولُ كُن فَيَكُونُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ ۚ
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٧٣﴾

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خدا کو چھوڑ کر
ان کو پکاریں جو نہ تو ہمیں فائدہ دیتے ہیں نہ نقصان پہنچا سکتے
ہیں اور باوجودیکہ اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا ہے پھر ہم
الٹے پاؤں پھر جائیں[۵۵]۔ اور ہماری مثال اس آدمی کی سی ہو کر

رہ جائے۔ جیسے شیطانوں نے بیابان میں گمراہ کر دیا ہو، وہ
حیران و پریشان ہو۔ اس کے کچھ ساتھی اسے ہدایت کی طرف
یہ کہہ کر بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا[٨٦]۔ اے پیغمبر کہہ دو
کہ اللہ کی ہدایت ہی اصلی ہدایت ہے[٨٧]۔ اور ہمیں حکم دیا گیا
ہے کہ رب العالمین کے سامنے سر اطاعت جھکا دیں اور
نیز ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور ہر حال میں اللہ
سے ڈرتے رہو، اسی کے حضور میں تمہیں اکٹھا کیا جائے گا[٨٨]
اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو علم و حقیقت
کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جس دن
وہ کہہ دے گا کہ ہو جا بس ہو جائے گا[٨٩]۔ اس کی بات حق
ہے اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو اس دن اسی کے لیے
بادشاہت ہوگی وہ غیب و شہادت کا جاننے والا ہے اور

وہ حکمت و دانائی والا اور آگاہ ہے۔ ۹۰

ہدایت کا واحد ذریعہ

اللہ کی ذات و صفات کی نشاندہی صرف نبوت کرتی ہے اور وہی اللہ کی صحیح معرفت کا جس میں نہ جہالت اور گمراہی کا شائبہ ہو نہ غلط فہمی یا غیر مناسب اندازِ بیان کا شبہ ہو واحد وسیلہ ہے۔ نبوّت کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعے سے وہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے نہ ذہن کی تیزی و ذکاوت کافی ہو سکتی ہے نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ بن سکتی ہے نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گزر ہے، نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچا سکتی ہیں، نہ تجربات کا خزانہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اللہ نے اسی حقیقت کا اظہار اہلِ جنت کی زبانی کیا ہے جو سچے بھی ہیں اور صاحبِ تجربہ بھی، اور یہ موقعہ بھی ایسا ہے کہ وہاں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کا کوئی گزر نہیں - الحمد للّٰہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ اور اس اقرار کے ساتھ وہ انبیاؑ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہی معرفت صحیح کا ذریعہ اور اس راہ کے رہنما تھے لقد جاءت رسل ربنا بالحق اس سے معلوم ہوا کہ نبوّت ہی کے ذریعے ان کے لیے ممکن ہو سکا کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کر سکیں اور اس کی مرضی اور اس کے احکام معلوم کریں۔

ماورائے عقل و حواس حقائق کی دریافت کے بارے میں انسانوں کی عقلی و باطنی قوتیں جتنی ہیں بے بس، کمزور، محدود اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔

آیئے اسی سلسلے میں ان عارفین اور محققین کی شہادتیں اور تجربات بھی سنتے جایئے جو عقل و قلب دونوں کوچوں سے نہ صرف آشنا بلکہ دونوں کے محرمِ اسرار ہیں۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اپنے تحقیقی مکتوبات میں اس موضوع کو بار بار چھیڑا ہے کہ عقل انسانی نبوّت کی رہنمائی کے بغیر وجودِ باری کا تو اثبات کر سکتی ہے لیکن اللہ سبحانہٗ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت اور تقدیس و تنزیہ اور توحید صحیح کے مقام تک پہنچ نہیں سکتی۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ،

خلاصہ یہ کہ عقل اس دولتِ عظمیٰ کے ثابت کرنے سے قاصر اور نبوّت کی رہنمائی

کے بغیر اس دولت سرا کا راستہ پانے سے عاجز ہے۔

فلسفہ اشراق اور مذاہب کی تاریخ بھی اس کی پوری طرح پر تائید کرتی ہے کہ محض عقل و استدلال یا فلسفہ و اشراق پر تکیہ کرنے والوں نے خدا کی معرفت اور اس کے لیے صحیح صفات ثابت کرنے اور صحیح افعال کی نسبت کرنے میں کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں اور کن کن گمراہیوں اور نادانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مجدد صاحب نے مکتوبات میں واضح کیا ہے کہ جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے بالاتر ہے۔ اسی طرح نبوت کا مقام عقل سے ماوراء ہے۔ خدا کی تنزیہ کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور نبوت کی تعلیم پر موقوف ہے۔ قرآن نے یہاں اسی ہدایت نبوت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۸۵۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خدا کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور باوجودیکہ اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا ہے پھر ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔ یہ آیت دراصل تفریع ہے ان باتوں پر جو پچھلی آیات میں بتائی گئی ہیں۔ یعنی جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر جاندار کا روزی رساں اللہ ہے، تمام مصائب و مشکلات وہی آسان کرتا ہے، انسانی حواس اور طاقتیں اسی کے قبضے میں ہیں، زمین و آسمان اور بحر و بر کا کلی اور تفصیلی غیب بھی صرف وہی جانتا ہے اور بحر و بر کے شدائد اور ہر کرب و ضرر سے وہی نجات دیتا ہے اس سے پتہ چلا کہ مالک و مختار، متصرف و کارساز اور عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کوئی دوسرا نہیں ہے تو کیا اس کے باوجود ہم اللہ کے سوا ایسوں کو پکاریں جنہیں ہمارے نفع و نقصان کا ذرہ برابر اختیار نہیں جو نہ متصرف و مختار ہیں نہ غیب دان، اگر ہم ایسا کریں تو ہم ہدایت یافتہ ہونے کے بعد پھر گمراہ ہو جائیں۔ کیونکہ اس سے بڑی سفاہت اور حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دانائے کل اور مختار کل کو چھوڑ کر ان کو پکارنا شروع کر دیا جائے جو کچھ بھی نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے ہم اس گمراہی میں مبتلا رہے تو اس کے لیے کچھ عذر تھا لیکن اب اگر ہم رجعت اختیار کریں گے تو ہمارے پاس کیا عذر ہو گا مالا ینفعنا ولا یضرنا میں ان معبودوں کے لیے ما کا استعمال تحقیر کے لیے ہوا ہے ورنہ جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور جن کے تماثیل اور اصنام کو پوجتے تھے، وہ شخصیتیں ہیں۔ یا ما کا استعمال بے جان مجسموں کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ آیت میں استفہام انکار و تعجب ہے یعنی اس سے بڑی اچنبھے والی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اللہ کو چھوڑ کر ان سے دعائیں مانگیں جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آیت میں نہایت بلیغ انداز

میں اس کی پانچ وجہیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ اس صورت میں قادر و مقتدر کو چھوڑ کر بے بس اور بے اختیار کو اپنانا ہے، دوسرے یہ کہ ایسا کرنا بلندی کے بعد پستی، عزت کے بعد ذلت، علم کے بعد جہل کا شکار ہونا ہے، تیسرے یہ کہ ایسا کرنا تقاضائے عقل نہیں ہے بلکہ یہ پسپائی انتہائی بے عقلی کی دلیل ہے چوتھے یہ کہ جسے اللہ نے ضلالت سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر گامزن کیا ہو، اسے کون ہے جو گمراہ کر سکے۔

ایمان وکُفر کی مثال

۸۶ ـ اور ہماری مثال اس آدمی کی سی ہو کر رہ جائے گی جسے شیاطین نے بیابان میں گمراہ کر دیا ہو وہ حیران و پریشان ہو، اس کے کچھ ساتھی اسے ہدایت کی طرف یہ کہہ کر بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا۔ یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ گمراہوں کو نصیحت کر کے سیدھی راہ پر لائے اور جو خدائے قدوس سے بھاگ کر غیر اللہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے ہیں ان کو خدائے واحد کے سامنے سر بسجود کرنے کی فکر کرے۔ اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی ایسی ہستی کے آگے سر جھکائے گا جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ نقصان یا اہل باطل کی صحبت میں رہ کر توحید و ایمان کی صاف سڑک چھوڑ دے گا اور شرک کی بھول بھلیوں کی طرف الٹے پاؤں پلٹ جائے گا۔ اگر معاذ اللہ ایسا ہو تو اس کی مثال اس مسافر کی سی ہو گی جو اپنی راہ جاننے والے رفقاء کے ساتھ جنگل میں سفر کر رہا تھا کہ ناگاہ غول بیابانی خبیث جنات نے اسے بہکا کر راستہ سے الگ کر دیا۔ وہ چاروں طرف بھٹکتا پھرتا ہے اور اس کے رفقاء ازراہ خیر خواہی اسے آواز دے رہے ہیں کہ ادھر آؤ راستہ ادھر ہے مگر وہ حیران و مخبوط الحواس ہو کر نہ کچھ سمجھتا ہے نہ ادھر آتا ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ مسافر آخرت کے لیے سیدھی راہ اسلام و توحید کی ہے اور جن کی رفاقت و معیت میں یہ سفر طے ہوتا ہے وہ پیغمبر اور اس کے متبعین ہیں۔ جب یہ بد بخت شیاطین و مضلین کے پنجہ میں پھنس کر صحرائے ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اس کے ہادی اور رفقاء ازراہ ہمدردی جادۂ حق کی طرف بلا رہے ہیں مگر یہ نہ کچھ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے تو اے گروہ اشرار کیا تمہاری غرض یہ ہے کہ ہم اپنی ایسی مثال بنا لیں۔ یہ آیت ان مشرکین کے جواب میں اتری جنہوں نے مسلمانوں سے ترک اسلام کی درخواست کی تھی [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مومن وحی و نبوت کی ہدایت اور علم و یقین کی روشنی اپنے سامنے رکھتا ہے اس لیے فلاح و سعادت کی شاہراہ سے کبھی بھٹک نہیں سکتا لیکن منکرینِ حق کے سامنے کوئی روشنی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی بیابان میں کھو گیا ہو اور حیران و سرگرداں پھر رہا ہو، کبھی ایک طرف کو دوڑے کبھی دوسری طرف کوئی مقرر اور یقینی راہ اس کے سامنے نہ ہو۔ یہاں تقدیر تشبیہ اس طرح ہے انرد علی اعقابنا بعد الهداية مثل ر دالذی استھوتہ کیا ہم ہدایت کے بعد اس شخص کی طرح پسپائی اختیار کرلیں جسے شیاطین نے کسی صحرا میں بھٹکا دیا ہو۔ اصل ارشاد میں استھوتہ الشیاطین آیا ہے۔ اس کے معنے عقل و خرد سے بیگانہ بنا دینے، راستہ بھلا دینے کے ہیں۔ فعل استھوا کی شیاطین کی طرف نسبت عربی ذہنیت کے مطابق ہے۔ اہلِ عرب کا خیال تھا کہ جنوں کی ساری صورتیں شیاطین کی تاثیر ہیں اور جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے۔ وہ جن شیطان بھوت بلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے۔ گو اختلافِ صورت کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام تھے۔ جو جنات جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے۔ اور مسافروں کو اپنی صورتیں بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کے مذکر کا نام غول اور مونث کو سعلاۃ کہتے تھے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مرض لگنا اور صفر اور غول کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ نویں پارے میں سورہ اعراف کے آخر میں آرہی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ یہ تشبیہ ایمان و کفر کی حقیقت سمجھانے کے لیے دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایتِ الٰہی اور حق کی شاہراہ پا جانے کے بعد اگر ہم تمہاری راہ پر چلیں اور پھر سے کفر و شرک اپنالیں تو ہماری مثال اس شخص کی سی ہو جائے گی جس کو شیاطین نے کسی بیابان میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و درماندہ ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا ہو۔ اس کے کچھ ساتھی اسے پکار رہے ہیں کہ راستہ ادھر ہے۔ ہماری طرف آؤ لیکن اس کی عقل ایسی گم ہو کر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو کہ کدھر جائے۔

یہ ایمان و کفر کو سمجھانے کے لیے ایک تشبیہ ہے اس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ کافر بیابان میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہے۔ شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے اسے گمراہ کر دیا ہے اور کچھ اہلِ ایمان اسے اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن وہ ان کی پکار نہیں سنتا ہے۔ دیکھیے کس خوبی کے ساتھ ایمان و کفر کی پوری تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ ایمان کی راہ سرتا سر روشنی اور علم و یقین کی راہ ہے کفر کے سامنے کوئی روشنی نہیں ہوتی وہ تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ایک

طرف مومن اعلان کرتا ہے کہ دانائے کل اور مختار کل، کشاف حاجات اللہ سبحانہ ہے۔ اور مومن یہ بات علم یقین اور وحی و نبوت کی روشنی میں کہتا ہے دوسری طرف مشرک کہتا ہے کہ فلاں فلاں بھی اختیار رکھتے ہیں۔ ہر قسم کی حاجت روائی فرما سکتے ہیں لیکن اس کے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں وہ یہ بات محض اپنے خیال اور گمان سے کہتا ہے وہ اگر علم کا نور ہے تو یہ بلا شبہ جہل کی تاریکی ہے یہ شرک کا بدبودار اور گدلا پانی ہے۔ اس مثال پر غور کرو جس قدر غور کرتے جاؤ گے حقیقت کی وضاحت بڑھتی جائے گی۔

ہدایت کی راہ تو نبوت کی راہ ہے

۸۷۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصلی ہدایت ہے۔ یعنی ہم سے یہ اُمید نہ رکھو کہ ہم اسے چھوڑ کر شیاطین کی بتلائی ہوئی راہوں پر چلیں گے[1] یہ الہدیٰ یعنی ہدایت کی حقیقی اور اصلی راہ نبوت و وحی کی راہ ہے۔ جو روز اول سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق و امتیاز تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ جس طرح اللہ سبحانہ نے وجدان حواس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا، اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرقہ و امتیاز سے پاک ہے وہ سب کے لیے ہے اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔ یہ جتنی راہیں الگ الگ بنالی گئی ہیں مثلاً یہودیت اور مسیحیت یہ سب انسانی گمراہی کی بناوٹیں ہیں۔ ہدایت کی راہ تو بس ہدایت کی ہی وہ راہ ہے جسے محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں جو کوئی اس پر چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا۔ اسی لیے قرآن ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو نبوت محمدیہ سے ہٹ کر بنائی گئی ہیں۔ یہ انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں اور انسانی بناوٹ کی راہیں ہدایت کی راہ نہیں ہو سکتیں ہدایت کی راہ تو ھدی للعالمین وہی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے جسے عالمگیر نبوت لے کر آئی ہے۔ اسی عالمگیر ہدایت کو الدین کے نام سے پکارا جاتا ہے یعنی نوع انسانی کے لیے حقیقی دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ الغرض الہدیٰ وہ دین ازلی ہے جس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لاتے ہیں یہ اب ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ آپ خاتم النبیین کا دین کامل دین اور

[1] افادات شیخ الاسلام

آپ کا صحیفہ تمام صحیفہ الٰہی پر مہیمن اور حادی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے اسی بنا پر اسے الہدیٰ کہا گیا ہے۔

ہدایت الٰہی کی عملی تصویر

۸۸ ۔ اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رب العالمین کے سامنے سر اطاعت جھکا دیں اور نیز ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو اس کے حضور میں تمہیں اکٹھا کیا جائے گا۔ یعنی ہمیں حکم ہوا ہے کہ خداوند کائنات کے مکمل ہر جہتی ہمہ گیر و دائمی قانون کے پورے فرمانبردار ہو جائیں۔ اسلام کے معنے کہا مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ نے جو قانون سعادت انسان کے لیے اپنے نبی کی وساطت سے روانہ کیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ اسی کا نام دین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا رب، مالک کارساز اور صاحب روا ہے۔ اس کے سوا کون حقدار ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کیا جائے۔ یہی الدین القیم ہے، یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی اسی کا نام اسلام ہے اور اسی کی عملی تصویر اقامت صلاۃ ہے۔ ارشاد ہے وان اقیموا الصلاۃ اقامت صلاۃ اسلام کے عملی ارکان میں چونکہ سرفہرست ہے اور اسلام میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام نسلم لرب العالمین کی رو سے اللہ کی بندگی کا کام ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی ہے اس کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے اور اسی حیثیت سے یہاں نسلم لرب العالمین کے بعد اس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ایک مومن کی زندگی رب العالمین کے لیے مسلمانہ اور مطیعانہ ہو اور اسے اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس انداز بیان سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ نماز اسلام کا سب سے پہلا مظہر ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ نماز اسلام کا لازمی مظہر بھی ہے۔ غور فرمائیے آخر انداز بیان کو غائب سے بدل کر حاضر کیوں کیا گیا ہے۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر میں تو اس براہ راست خطاب کے زور میں یہی راز سمجھتا ہوں۔ اسی لیے نماز کے ساتھ تقویٰ پر زور دیا گیا ہے۔ اصل ارشاد میں واتقوہ آیا ہے۔ یہاں تقویٰ اللہ کی ناراضی کے اس گہرے احساس کا نام ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا اور برے کام سے روکتا ہے یا یوں کہیے کہ تقویٰ

ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویہ اللہ کے لیے اطاعت، فرمانبرداری یعنی مسلمانہ زندگی کا رویہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا رہتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں کہ جس کو وہ پسند نہیں کرتا۔

اللہ کی ناراضگی سے بچنے کی یہ خواہش اور کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جبکہ انسان اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے اندیشہ کے تحت اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے آپ کو من چاہی زندگی گزارنے سے روکے رہے گویا التقویٰ کا مقام پا لینے کی واحد سبیل یہ ہے کہ فکرِ آخرت سے دب کر انسان اپنے نفس کو لگام دے اور اپنی خواہشوں میں اسے آزادانہ چھوڑے جیسا کہ یہاں قرآن نے الیہ تحشرون کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی مسلمانہ زندگی اس لیے گزرتی ہے اور اللہ کی نافرمانی سے اس لیے بچنا ہے کہ ایک روز خدا کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔

تخلیق بالحق سے استدلال

۸۹۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو علم و حقیقت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جس روز وہ کہہ دے گا کہ ہو جا بس ہو جائے گا۔ یعنی وہ کوئی ناقص العلم، ناقص القدرت ناقص القویٰ، دیوی، دیوتا نہیں ساری موجودات کا خالق، سب کو نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ مخلوقات کے سارے مصالح کی رعایت اس کے سوا کوئی کہیں کرسکتا ہے نام تو زمین و آسمان کا لیا گیا ہے مگر مراد جیسا کہ علامہ آلوسی نے سمجھا ہے سارے علویات و سفلیات ہیں۔ بالحق کی قید خاص معنویت کی خاطر لگائی ہے یعنی کائنات کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی چیز حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ یہ تخلیق بالباطل نہیں کہ بغیر کسی معین اور مقرر مقصد و نظم کے وجود پذیر ہو گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس دقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ مربوط ہوتی، اہل ایمان اور ارباب دانش کی یہ صدا آل عمران میں پڑھ چکے ہو،

ربنا ما خلقت ھذا باطلاً

ایک اور مقام پر قرآن میں حق کا مقابلہ لعب سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں ہوئی چنانچہ ارشاد ہے۔

وما خلقنا السماوات والارض وما بینہما لاعبین ما خلقنا ھما الّا بالحق۔

ہم نے آسمان وزمین اور اس کی درمیانی مخلوقات کو محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ ہم نے ان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

ایک مقام پر تخلیق بالحق کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ وفیضان کے لیے ہے اور اللہ سبحانہ، چاہتا ہے کہ جو کچھ بناتے اس طرح بناتے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع اور راحت ہو۔ ایک موقعہ پر اجرام سماویہ کا ذکر کر کے فرمایا ما خلق اللہ ذالک الّا بالحق۔ ایک جگہ فطرت کے جمال اور زیبائی کو بیان کیا ہے اور تخلیق بالحق سے تعبیر کیا ہے خلق السماوات والارض بالحق وصورکم فاحسن صورکم یہاں تخلیق بالحق سے قرآن کا استدلال یہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو، اور کسی بالائی قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے۔ جب کائنات کی تخلیق حکمتوں اور مصلحتوں کے جلو میں یعنی بالحق ہوتی ہے۔ بس ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو اور یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے۔ یہ زندگی کیسے وجود میں آئے گی فرمایا ویوم یقول کن فیکون بس اس روز فرمائے گا کہ ہو جا تو بس ہو جائے گا۔

قیامت کی آمد کا اعلان

۹۰۔ اس کی بات حق ہے اور جس روز صور پھونکا جائے گا تو اس روز اسی کے لیے بادشاہت ہو گی وہ غیب وشہادت کا جاننے اور وہ حکمت ودانائی والا اور آگاہ ہے۔ بات کے حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہو کر رہنا ہے۔ عربی زبان میں حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے۔ یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، انمٹ ہو، اسے حق کہیں گے باطل ٹھیک ٹھیک اس کی نقیض ہے۔ منشا یہ ہے کہ خدا کی بات ہو کر رہنی ہے اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور جس دن حشر کے لیے صور پھونکا جائے اس روز ظاہری اور مجازی طور پر بھی خدا کے سوا کسی کی سلطنت نہ رہے گی لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار[1] مطلب یہ ہے کہ اس دن

[1] افادات شیخ الاسلام

سارا اختیار اور ساری بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار کی ہو گی - اس دن نہ کسی کا زور چلے گا نہ کسی کو کوئی اختیار حاصل ہو گا نہ کسی کی سعی و سفارش اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گی سب خدا کے سامنے سرافگندہ ہوں گے صرف اسی کا حکم ناطق و نافذ ہو گا -

اس روز کا یہاں قرآن نے چہرہ یہ پیش کیا ہے یوم ینفخ فی الصور، صور کے لفظی معنے نرسنگھا کے ہیں - اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا اس لیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے - چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے - قرآن بھی ہے کہ اس دن ندا ہو گی لمن الملک الیوم؟ آج کس کی بادشاہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا للہ الواحد القہار، غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظم کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرہ حساب کے اعلان کا ہو گا - اس لیے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لیے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو جیسا کہ صور کے لفظی معنے دلالت کرتے ہیں - اگرچہ کچھ ارباب لغت نے صور کو صورت کی جمع قرار دیا ہے - چنانچہ شیخ ابوالفضل جمال قرشی لکھتے ہیں -

> صور بالضم بمعنے شاخ ہے - نیز وہ چیز کہ جس کو حضرت اسرافیل خلق کو مارنے اور جلانے کے لیے پھونکیں گے - ارشاد الٰہی ہے یوم ینفخ فی الصور، کلبی نے کہا ہے مجھے نہیں معلوم کہ صور کیا ہے نیز بیان کیا جاتا ہے کہ صور صورت کی جمع ہے جس کے معنے پیکر اور پتلے کے ہیں یعنی مردوں کے پیکروں میں روحیں پھونکی جائیں گی اور حسن البصری نے تو اس کو واو کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے -

یہ دوسرا قول ابوعبیدہ اور مقاتل کا ہے مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ فرمایا ہے ثم نفخ فیہ اخریٰ نیز ارشاد ہے فاذا نقر فی الناقور یہ صور پھونکنے کا بیان ہے، علاوہ ازیں خود ارشاد نبوت میں اس کے معنے نرسنگھا کے موجود ہیں - چنانچہ امام احمد، ابوداؤد، نسائی، دارمی، ترمذی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے - الصور القرن ینفخ فیہ، صور نرسنگھا ہے کہ جس کو پھونکا جائے گا صور پھونکنے کی صحیح کیفیت کیا ہو گی؟ اس کی تفصیل ہماری سمجھ سے بالا ہے - قرآن نے جو

کچھ بتایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے صور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہوجائیں گے، پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا اور سب زندہ ہوجائیں گے اور بس۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے عالم الغیب والشھادۃ مطلب یہ ہے کہ جو خدا یہ صفات رکھتا ہے جن کا ذکر ان دو تین آیات میں ہو چکا ہے وہی اس لائق ہے کہ ہم اس کے تابع فرمان ہوں۔ اس کے سامنے انتہائی عبودیت اختیار کریں اور ہر آن اس سے ڈرتے رہیں۔ اسی کا ہم کو حکم ہوا ہے جس سے ہم کسی حال میں منہ نہیں موڑ سکتے ہیں[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ
وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ
عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ
الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ
قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝
فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے باپ آزر سے
کہا تھا کہ کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میرے نزدیک تو تم اور

تمہاری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے[92]۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھائے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے[93]۔ پھر جب اس پر رات کی اندھیری چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ان کو پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں[94]۔ پھر جب اس نے چاند چمکتا ہوا دیکھا تو اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو بول پڑا کہ اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہیں دکھائی تو میں ضرور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں[95]۔ پھر جب سورج چمکتا ہوا دیکھا تو ابراہیم نے کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے یہ بڑا ہے

لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو ابراہیم نے کہا اے میری قوم
میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو[96]
میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف
کر لیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز
شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔[97]

توحید کا جامع تصور

اس سے پہلے تخلیق سے توحید پر استدلال کیا تھا، یعنی کائنات خلقت کی تمام باتیں یقین دلا رہی ہیں کہ یہ کارخانہ علم و حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے اور کوئی بنانے والا ہے جو چاہتا ہے کہ ایک منظم، مرتب، کامل اور حسن و خوبی رکھنے والا کارخانہ وجود میں آجائے۔ اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ توحید الٰہی کی بھی حجت حضرت ابراہیم پر کیوں کر القا کی گئی۔ حضرت ابراہیم کا ظہور ایک ایسے عہد اور ملک میں ہوا جب بابل اور نینوا کی عظیم الشان قومیں اجرام سماویہ کی پرستش میں مبتلا تھیں، اور شہر اُور میں زہرہ، چاند اور سورج کے مندر تھے جہاں صبح و شام پرستاری کے لیے لوگ جمع ہوتے تھے، لیکن حضرت ابراہیم کے قلب سلیم پر خدا پرستی کی صداقت کھول دی گئی۔ خدا نے ان پر اپنی بادشاہت اور کارفرمائی کے جلوے کچھ اس طرح روشن کیے کہ بے خبری و غفلت کا کوئی پردہ بھی ان کی معرفت میں حائل نہ ہو سکا۔ یہ حقیقت جب ان پر کھول دی گئی تو علم و بصیرت کی حجت نے ان کی رہنمائی کی۔ قرآن نے یہاں ایک ایسے پیرایہ بیان میں جو اس کی عجیب و غریب بلاغت کا مظہر ہے اس کا مرقع پیش کیا ہے۔ زمین و آسمان کے نظام سلطنت کے مطالعہ اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے حضرت ابراہیم کو بصیرت و یقین کی غیر معمولی قوت حاصل ہو گئی۔

اسی غیر معمولی بصیرت کی بدولت آپ نے قوم کے سامنے انہی سیاروں کے نظام طلوع و غروب سے توحید کی ناقابل انکار حجت پیش کی جن کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ تارے، یہ چاند یہ سورج تمہارے معبود ہیں۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ مان لیتا ہوں کہ یہ تارا میرا معبود ہے مگر دیکھو تو یہ غائب ہو گیا اور یہ چمکتا ہوا چاند دیکھو یہ تو ڈوب گیا۔ اور یہ تابناک سورج یہ تو واقعی سب سے بڑا ہے مگر دیکھو یہ بھی غروب ہو گیا۔ تم ہی سوچو طلوع و غروب کے نظام میں جکڑے ہوئے بے اختیار سیارے کہیں معبود ہو سکتے ہیں۔ میں تو ان سب سے منہ پھیر کر پوری یکسوئی کے ساتھ اس خدا کی طرف رخ کرتا ہوں جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور جس کے اشارے پر یہ کائنات گردش کر رہی ہے۔ میں تمہارے ان جھوٹے بے اختیار معبودوں سے بالکل بے تعلق ہوں۔ یہ ہے تخلیق بالحق سے توحید الٰہی پر استدلال۔ گویا حضرت ابراہیم نے اثباتی پہلو میں ایسے وجود کو سامنے رکھا جس کی طرف سارے وجود منتہی ہیں اور سلبی پہلو میں صرف اجمالاً شرکت کے حدود کی نفی پر کفایت کی۔ اس بیان میں خدا ایک موجود کو بتایا ہے اور موجود وہ جس نے تمام مخلوق کو خلعت وجود سے سرفراز فرمایا۔ اور جس کا وجود ذاتی اس صفات ثبوتیہ بھی لامحالہ حقیقی ہوں گی۔ اور جب مخلوقات اپنے وجود ہستی میں اس کی محتاج ہوں گی تو بلا شبہ اپنی صفات میں بھی اس کی محتاج ہوں گی اس لیے حضرت ابراہیم نے صاف کہہ دیا لم نعبد مالا یسمع ولا یبصر۔

۹۱۔ اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ علمائے انساب کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ کا نام تارخ ہے۔ ممکن ہے کہ تارخ نام ہو اور آزر لقب ہو۔ ابن کثیر نے مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ آزر بت کا نام تھا۔ شاید اس بت کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے خود ان کا لقب آزر پڑ گیا ہو۔[1]

ابراہیم و آزر ناموں کی تحقیق

ابراہیم حضرت خلیل اللہ کا نام نامی ہے۔ حضرت نوح کے بعد سلسلہ نبوت کے بانی ہیں تورات کے سفر تکوین سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم سام بن نوح کی اولاد میں دسویں فرزند

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ ان کی پیدائش کلدان کے شہر اُور میں ہوئی ہے۔ تورات میں جو سب سے پہلا سیاسی واقعہ مذکور ہے وہ حضرت ابراہیم کے عہد شمالی عرب میں عراق اور شام کے بادشاہوں کی جنگ ہے۔ اس موقعہ پر شنعار بابل کے بادشاہ کا نام امرافیل یا امورافیل ہے۔ بہرحال اگر یہ قیاس صحیح ہے تو حمورابی اور حضرت ابراہیم کا زمانہ ایک ہی ہوگا۔ یعنی حضرت مسیح سے ۱۹۰۰ سال پہلے۔ حمورابی کے ایک اور کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید یہ دُنیا کا سب سے پہلا مقنن، بابل کے ایک منارے پر اس کے قوانین کندہ ملے ہیں جو تورات کے احکام سے بہت مشابہ ہیں۔ گمراہ لوگوں کا خیال ہے کہ تورات کے احکام انہیں قوانین سے ماخوذ ہیں لیکن اہل حق کہہ سکتے ہیں کہ یہ احکام حضرت کی شریعت کے ہیں جن کو حمورابی نے سنا اور قبول کیا اور حمورابی کے یہ قوانین اصلاً عربی کتابت ہے۔ لفظ ابراہیم کو اہل عرب سات طرح بولتے ہیں۔ ۱۔ ابراہیم، ۲۔ ابراہام، ۳۔ ابراہوم، ۴۔ ابراہم، ۵۔ ابرہم، ۶۔ ابرام، ۷۔ برہم۔ کچھ کے خیال میں ابراہیم مرکب امتزاجی ہے جیسے بعلبک یعنی دو اسموں کو ملا کر نام رکھ دیا گیا ہے۔ اصل میں اب رہم تھا۔ مجد الدین فیروز آبادی نے اس کی تصغیر بُریبرہ اور بریہیم بتائی ہے اور علامہ مرتضیٰ زبیدی شارح قاموس نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ شاید صاحب قاموس کے خیال میں یہ لفظ عربی ہے۔

مورخین نے حضرت ابراہیم کا نسب نامہ یہ بتایا ہے ابراہیم بن تارخ بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالج بن عابر بن شالح بن ارفکشد بن سام ابن نوح علیہ السلام، یہ تورات کے مطابق ہے اس میں حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ ہے لیکن یہاں قرآن نے حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر بتایا ہے۔ حیرت ہے کہ شارحین قرآن کی اکثریت اور مورخین کہتے ہیں کہ نام تارخ ہے اور لقب آزر ہے لیکن ہمیں امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری کا تاریخ کبیر میں یہ فیصلہ پسند ہے۔

ابراہیم آزر کے بیٹے ہیں۔ تورات میں ان کا نام تارخ ہے اور اللہ نے قرآن میں آزر بتایا ہے اگرچہ مورخین اور نسابین کے یہاں ان کا نام تارخ ہے۔

مورخین اور شارحین قرآن کو اصرار ہے کہ باپ کا نام تارخ ہے اور کچھ نے قرآن کے سارے مخاطبات سے بے پرواہ ہوکر لکھ دیا ہے کہ

ان کے والد تارخ کا حضرت ابراہیم کے بچپنے ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ چچا نے پرورش کی تھی۔ اور چونکہ وہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا اس لیے ادار کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ادار قدیم کالدی زبان میں بڑے پجاری یا محافظِ معبد کو کہا کرتے

تھے۔ یہی ادار ہے جس نے بعد میں عربی میں آزر کی شکل اختیار کر لی اور اسی لیے قرآن نے اسی کا ذکر آزر کے نام سے کیا ہے۔

محض تکلف بارد ہے کہ باپ کو مارا جائے اگر قرآن اور تاریخ کو آپ جمع کرنا ہی چاہتے ہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ادار کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں عربی میں آکر یہی آزر ہو گیا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور بت پرست تھا یعنی بت گری بت فروشی کے ساتھ بت کی پرستاری کرتا تھا اس لیے آزر ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا۔ اور لقب نے چونکہ نام کی جگہ لے لی اس لیے قرآن نے اسی نام سے پکارا۔ یہ تو جمع کی صورت ہے ورنہ اگر جمع ممکن نہ ہو تو ہم قرآن کے مقابلے میں تورات اور تاریخ دونوں کو چھوڑ دیں گے وہ ہمارے خیال میں حجت ہی نہیں ہیں۔ قرآن کی حیثیت ان سب سے بالا ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ آزر کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے علمی سرمایہ میں روایتی اختلاف ہے اور وہ مہیمن ہونے کی حیثیت میں اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے ایک کسوٹی بن کر آیا ہے اور براہ راست وحی ہے اس لیے ماننا چاہیے کہ آزر ہی حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔

حضرت ابراہیم کی تین بیویاں تھیں۔ سارہ، ہاجرہ، اور قطورا۔ سارا سے حضرت ابراہیم کے یہاں حضرت اسحاق ہوئے۔ حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب جو بنی اسرائیل کے باپ تھے اور عیسو جن کا لقب ادوم تھا۔ قطورا سے حضرت ابراہیم کے یہاں لابن نامی لڑکا ہوا اور ہاجرہ کے بطن سے صرف ایک بیٹا ہوا یعنی حضرت اسماعیل۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں راز کو بھی بے نقاب کر دیا جائے کہ آزر کو کیوں حضرت ابراہیم کا باپ نہیں مانا جاتا اور یہ کس ذہن کا تخلیقی کارنامہ ہے لیکن اس جلد کی ضخامت زیادہ ہونے کے اندیشے سے یہاں قلم کو روکتا ہوں اور انشاء اللہ سترہویں پارے میں اس راز کو بے نقاب کر دوں گا۔

شرک کھلی گمراہی ہے

۹۲۔ کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میرے نزدیک تو اور تیری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اس سے زیادہ صاف اور صریح گمراہی اور کیا ہو گی کہ اکرم المخلوقات انسان اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھروں کو خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے سر بسجود ہو جائے اور انہی سے مرادیں مانگنے لگے[1]۔

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے بت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے یہ تو ایک کھلی گمراہی ہے جس میں آپ مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی۔ شہر اُور کی آبادی اڑھائی لاکھ کے قریب تھی۔ یہ جنوبی عراق میں فرات کے کنارے آباد تھا اور محل وقوع وہ مقام تھا جسے آج کل تل العبید کہتے ہیں۔ یہاں بت پرستی کی وہ ساری بنیادیں استوار ہو چکی تھیں جو آگے چل کر نینوا اور بابل میں زیادہ وسیع اور منظم شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پرستش کا مبدا کواکب تھے۔ سب سے بڑا بت شمس کا تھا یعنی سورج کا اس کے نیچے بہت سے بت مختلف طاقتوں یا مختلف قبیلوں اور آبادیوں کے تھے۔ خود شہر اُور کا محافظ بت نالغار تھا یعنی چاند۔ حضرت ابراہیم کا ظہور اسی شہر میں ہوا۔ جب آنکھ کھولی تو خود اپنے گھر میں بت پرستی پائی لیکن اللہ نے سچائی کی حجتوں اور وحی کی دلیلوں سے ان کا قلب سلیم اس طرح معمور کر دیا تھا کہ نہ تو قوم و وطن کی جہالت و گمراہی اسے چھو سکی نہ خود عزیزوں اور بزرگوں کا اعتقاد راسخ اسے متاثر کر سکا۔ انہوں نے پہلے اپنے گھرانے میں تبلیغ کی۔ اور اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہا اتتخذ اصناما آلھۃ؟ اور تمام قوم کو پیام حق پہنچایا۔ حافظ ابن تیمیہ نے صابئین کی تحقیق میں الرد علی المنطقیین میں جو کچھ لکھا ہے وہ محققانہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم صابی تھی وہ حضرت ابراہیم کے مقام بعثت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> یہاں علت اولیٰ، عقل اول اور نفس کلیہ کے ہیکل تھے۔ نیز زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، شمس، عطارد اور قمر کے ہیکل تھے۔ یہاں صابئین کا خاص مرکز تھا عیسائیت سے پہلے ان کا مذہب یہی تھا۔ عیسائیت کے بعد ان مشرک صابئین کے بقا کے ساتھ ساتھ ان میں عیسائیت پھیلی۔ یہاں تک کہ اسلام آیا اور وہاں یہ صابئین اور فلاسفہ حکومت اسلامی میں آخری وقت تک موجود رہے، اور انہی میں سے وہ صابئین جو بغداد وغیرہ میں طبیب یا منشی تھے۔ ان میں سے بعض اسلام نہ لائے۔ چوتھی صدی میں فارابی جب حران گیا ہے تو انہیں سے فلسفہ سیکھا۔ اہل دمشق کا مذہب بھی عیسائیت سے پہلے یہی تھا۔ ان کی نماز کا قبلہ قطب شمالی تھا۔ اسی لیے دمشق میں بہت سی کہنہ مسجدیں ہیں جن کا ایک قبلہ قطب شمالی کی طرف بھی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد کے نیچے ایک بہت بڑا معبد ہے جس کا ایک قبلہ قطب شمالی کی طرف ہے یہ انہیں لوگوں کا معبد ہے۔

حضرت ابراہیم کا مولد بابل کا شہر اُور اور منشا شہر حران ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جو صابئیت کے مرکز اور درسگاہ ہیں۔ اس بنا پر ہمارے مفسرین اور خصوصاً حافظ ابن تیمیہ کا یہ دعویٰ قابل قبول ہونا چاہیے کہ یہی وہ بدبخت قوم ہے جس میں حضرت ابراہیم نے ظہور پایا تھا۔ تورات میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کو عراق کے شہر اُور، حران سے تعلق تھا اور ان کا خاندان غیر خداؤں کو سجدہ کرتا تھا۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم اپنے باپ کو مخاطب کر کے ان ہی صابئی مجسموں کے بارے میں فرما رہے ہیں۔ یہاں ان ستاروں کے ہیکلوں کو اصنام کہا ہے اور سورہ انبیاء میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون۔ یہ کیا تماثیل ہیں جن کی پوجا پر تم جم کر بیٹھے ہوئے ہو۔ اور سورہ عنکبوت میں قوم ہی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، انما تعبدون من دون اللہ اوثانا، خدا کو چھوڑ کر تم اوثان کی عبادت کرتے ہو اور سورہ مریم میں اپنے والد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا یا ابت لا تعبد الشیطان اے باپ شیطان کی عبادت نہ کر، اور سورہ صافات میں سب کو یکجا کر کے قوم کو خطاب کیا اتعبدون ما تنحتون کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود گھڑتے ہو۔ اصنام، اوثان اور تماثیل عنوان ہیں دراصل ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ الٰہ تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ الٰہ ہوتا تھا جو رب البلد سمجھا جاتا تھا۔ اور شہر کا رب البلد ننار سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ دوسرا بڑا شہر لرسہ تھا جو بعد میں اُور کے بجائے مرکز حکومت ہوا اس کا رب البلد شماس سورج دیوتا تھا۔ ان بڑے الٰہوں کے تحت بہت چھوٹے الٰہ بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی ستاروں اور سیاروں میں سے منتخب کیے گئے۔ ان آسمانی دیوتاؤں کی شبیہیں مختلف شکلوں میں بنائی گئی تھیں جن کو اصنام، اوثان اور تماثیل کہتے تھے اور تمام مراسم عبادت ان ہی کے آگے بجا لاتے تھے۔

اُور کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم کے زمانے میں حکمران تھا اس کے بانی اول کا نام رانمو تھا جس نے دو ہزار تین سو قبل مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی اس کے حدود مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس خاندان کو نمو کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم کی ہجرت کے بعد اس خاندان پر مسلسل تباہی نازل ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُور کو تباہ کیا اور نمرود کو ننار کے بت سمیت پکڑ کر لے گئے پھر لرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُور کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لرسہ اور اُور دونوں اس کے

زیرِ حکم ہو گئے، ان تباہیوں نے نمار کے ساتھ اُور کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

بہرحال حضرت ابراہیم کے مخاطب اصنام، تماثیل اور اوثان کی پرستش کرتے تھے۔ اور یہ بھی قرآن سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب ان کے اپنے تراشیدہ اور بنائے ہوتے ہوتے تھے۔ لہٰذا بتوں، مورتیوں اور ہیکلوں کی پرستش کا مدار کواکب تھے۔ سب سے بڑا بت شمس کا تھا۔ اس کے نیچے بہت سے بت تھے۔ چاند کے بت کو نانعار کہتے تھے۔

اصنام ہوں یا تماثیل اور یا اوثان یہ ان ہی کواکب کے بت، مورتیاں اور ہیکل تھے۔ اور یہ شرک کی ترقی یافتہ صورت تھی جب انسانوں میں کسی قدر تہذیب و تمدن پیدا ہوا تو انسان نے مخلوقاتِ ارضی سے ہٹ کر دیکھا تو اس کو آسمان کے بلند اور روشن ستارے عبادت کے بہترین مستحق نظر آئے چنانچہ اس کی پرستش شروع ہوئی۔ مشہور عرب مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے کہ چونکہ یہ ستارے نکلتے اور ڈوبتے رہتے تھے اس لیے ان کی خیالی تصویریں بنا بنا کر لوگوں نے ان کو پوجنا شروع کیا۔ ستارہ شناسی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا ہے۔ آب و ہوا اور جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر ان مقامات کی فضائی، آسمانی ابر اور گرد و غبار سے عموماً صاف رہتی ہے۔ سامی بدو راتوں کو اپنی بھیڑوں، بکریوں اور مویشیوں کے گلوں کو لے کر آسمانی خیمہ کے سائے میں رات بسر کرتے تھے۔ جب کبھی آنکھ کھلتی سامنے صحیفہ آسمانی کھلا نظر آتا اس لیے انہوں نے کواکب ہی کو معبود بنا لیا اور ان ہی کی تصاویر مجسمے اور ہیکل پوجنے لگے۔ یاد رہے کہ دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں گزری جس نے محض لکڑی، پتھر اور اینٹ کو پوجا ہو۔ دراصل اس زمانہ کے سامیوں کا اعتقاد تھا کہ تمام دنیا ارواح سے بھری ہوئی ہے جن میں زیادہ تر ارواح خبیثہ اور کچھ ارواح طیبہ ہیں۔ ان کے مذہب کا خلاصہ یہ تھا کہ ارواح خبیثہ کو نذر و نیاز، قربانی اور چڑھاوے سے خوش رکھنا اور ارواح طیبہ کی مدح و ثنا گا کر ان کے مقابلے کے لیے تیار کرنا۔ ان میں سے ہر روح کا مسکن ایک ستارہ ہے۔ بابل کے کھنڈروں میں جو تختیاں اور ہیکلوں کے جو کتبات پڑھے گئے ہیں ان میں بیسیوں معبودوں کے نام ملے ہیں۔ ہم یہاں شہروں کے نام کے ساتھ ان کے کچھ دیوتاؤں کے نام لکھتے ہیں۔

	شہر کا نام	معبود کا نام	
۱۔	اُدر	سن	چاند

۲-	لرسہ	شمس	آفتاب
۳-	اروخ	انو	ستاروں کا دیوتا
۴-	—	اشتار	زہرہ
۵-	کوتو	نمرغل	مریخ
۶-	بابل	مردوک	مشتری
۷-	ہارنیپ	نبو	عطارد
۸-	سپور	شمس	آفتاب
۹-	اکار	نینو	چاند
۱۰-	اشور	اشور	"

یہ بابل کا حال ہے۔ مصر میں بھی سامی قوموں کے زمانے میں ستارہ پرستی جاری تھی۔ سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا جس کو وہ اپنی زبان میں رَع کہتے تھے۔ان کے دارالحکومت کا نام مدینۃ الشمس تھا۔ یہیں آفتاب دیوتا کا مندر تھا۔ بادشاہ آفتاب دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کا لقب رعمیس ہوتا تھا یعنی سورج کا بیٹا[1]

تاریخ کی یہ داستان اگر صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم میں شرک محض ایک عقیدہ اور بُت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیم دعوتِ توحید لے کر اٹھے اور سب سے پہلے اس کے خلاف کام کا آغاز گھر سے کیا، اور والد کو مخاطب سامنے رکھ کر ساری قوم سے کہا اتتخذ اصناما الھۃ انی ارٰک وقومک فی ضلال مبین۔

عقل وبینش کی خداداد روشنی

۹۳- اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کو بادشاہت کے جلوے دکھائے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جاتے۔ یعنی جس طرح بت پرستی کی شناعت و قبح ہم نے ابراہیم پر

---

[1] ارض القرآن

ظاہر کر کے اس کی قوم کو قائل کیا اسی طرح علویات و سفلیات کے نہایت محکم اور عجیب و غریب نظام ترکیبی کی گہرائیوں پر بھی اس کو مطلع کر دیا تھا کہ اسے دیکھ کر خدا تعالیٰ کے وجود و وحدانیت وغیرہ پر اور تمام مخلوقاتِ سماوی و ارضی کے محکومانہ عجز و بیچارگی پر استدلال اور اپنی قوم کے عقیدہ کواکب پرستی و ہیاکل سازی کو علی وجہ البصیرت رد کر سکے۔ اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبہ پہ فائز ہو بلاشبہ عالم کا یہ مکمل و احکم بہترین نظام اور نظم و نسق ہی ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر بالبداہت اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس عظیم الشان مشین کا بنانے اور چلانے والا، اس کے پرزوں کو نہایت مضبوط ترتیب اور سلیقہ سے جوڑنے والا اور لاکھوں برس سے ایک ہی انداز پر اس کی حفاظت کرنے والا بڑا زبردست حکیم و قدیر اور صانع ہے جس کے حکیمانہ تصرف اور نفوذ و اقتدار سے مشین کا کوئی چھوٹا سا پرزہ باہر نہیں جا سکتا۔ یہ کام یوں ہی بخت و اتفاق یا بے شعور طبیعت یا اندھے بہرے مادے نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا مشہور حکیم اسحاق نیوٹن کہتا ہے کہ

کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض عام قوتِ جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں۔ یہ قوتِ جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف دھکیلتی ہے اس لیے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کوئی خدائی ہاتھ ہو جو باوجود قوت جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنی مدارات پر قائم رکھ سکے۔ کوئی سبب طبیعی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ دیا ہو کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معین مدارات پر اور ایک خاص جہت ہی میں حرکت کریں جس میں کبھی مختلف نہ ہوں پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبعی نہیں جس سے ہم ان منظم و محفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرام کے مواد اور ان کی کمیات سے پورا پورا واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مادے کی کس قدر مقدار سے کتنی قوتِ جاذبہ صادر ہو گی۔ اس نے اپنے زبردست اندازے سے کواکب اور شمس کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کیے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے تصادم و تزاحم نہ ہو۔ اور عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے۔ ہر چھوٹا بڑا ستارہ نہایت مضبوط نظام کے ماتحت

معین وقت پر طلوع ہوتا ہے۔ جب کوئی سیارہ غروب ہو کر دنیا کو اپنے اس فیض و تاثیر سے محروم کر دے جو طلوع کے وقت حاصل تھا تو نہ اس ستارے کی اور نہ کسی مخلوق کی قدرت میں ہے کہ ایک منٹ کے لیے اسے واپس لاتے یا غروب سے روک دے۔

یہ رب العالمین کی شان ہے کہ کسی وقت بھی کسی قسم کے افاضہ سے عاجز نہیں والشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم، والقمر قدرناہ منازل حتیٰ عاد کالعرجون القدیم لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر و لا اللیل سابق النہار و کل فی فلک یسبحون۔ یہ علویات کا حال ہے اسی سے سفلیات کا اندازہ کر لو۔ یہ ہی تکوینی عجائب اور ملکوت السماوات والارض ہیں جن کے دیکھنے سے ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر لا احب الافلین اور انی وجھت وجھی... الخ بے ساختہ جاری ہو گیا۔ کما تدل علیہ الفاء فی قولہ تعالیٰ فلما جن...[1]

اصل ارشاد میں وکذالک آیا ہے۔ اس کے معنے ہیں اور ایسے ہی۔ کیسے؟ یہ یہاں محذوف ہے شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی تشریح کی ہے۔ مثلاً شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ جس طرح بت پرستی کی شناعت و قباحت ہم نے ابراہیم پر ظاہر کی تھی اسی طرح ہم نے ابراہیم کو علویات اور سفلیات سے بھی مطلع کر دیا لیکن ہمیں یہاں علامہ زمخشری کی بات زیادہ پسند ہے کہ ذالک کا مشار الیہ نری کا مصدر ہے یعنی ایسے ہی عجیب و غریب بصیرت سے ہم نے ابراہیم کو مالا مال کیا ہے یہ اراآت کس طرح کی تھی مادی آنکھوں سے یا چشم ہوش سے دیدۂ بصارت سے یا دیدۂ بصیرت سے محققین کا قول ہے بصارت حسی نہیں بلکہ بصیرت عقلی سے زمخشری رقمطراز ہیں ھدیناہ بطریق الاستدلال ہم نے ابراہیم کو عقلی استدلال بتایا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ہم ابراہیم کو طریق استدلال سمجھائیں گے امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ اراآت عقلی بصیرت کی تھی۔ نسفی اور آلوسی کی بھی یہی رائے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارے سامنے آثار کائنات اور آفاقی آیات نمایاں کی ہیں اسی طرح ابراہیم کے سامنے بھی یہی آفاقی آیات تھیں مگر تم ان آیات کو دیکھ کر بھی ان میں بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ حضرت ابراہیم نے ان آیات کو دیکھا اور ان کے ذریعے وہ حقیقت تک پہنچ گیا کہ کائنات کیا ہے، صرف ایک سلسلہ اسباب ہے اور یہاں ایک سبب کا عمل اور بہت سے اسباب پر موقوف ہے۔ مثلاً بارش ہونا ایک سبب ہے لیکن خود اس سبب کے وجود میں آنے کے لیے بہت سے اسباب

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں مثلاً یہ کہ

۱۔ پانی حرارت سے بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔
۲۔ پانی کے بخارات کا وزن مخصوص ہوا سے کم ہوتا ہے۔
۳۔ ہوا سے کم وزن مخصوص رکھنے والی گیس فضا میں اوپر اٹھتی ہے۔
۴۔ سورج کی شعاعیں جس واسطہ سے گزرتی ہیں اسے گرم نہیں کرتی ہیں لہٰذا ہوا زمین سے حرارت لے کر گرم ہوتی ہے۔
۵۔ زمین کے اندر ایک کشش ثقل ہے جس سے فضا کی نچلی سطح کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔
۶۔ ہوا اپنے دباؤ کی نسبت سے حرارت کو جذب کر سکتی ہے لہٰذا فضا کے اوپر کے طبقے سرد ہوتے ہیں۔
۷۔ بخارات آبی کو جب سردی لگنے لگے تو وہ جم کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔
۸۔ مائعات جب زمین پر گرتے ہیں تو کشش ثقل کے عمل سے گول ہو کر قطرات بن جاتے ہیں۔
۹۔ ہوائیں سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف چلتی ہیں۔
۱۰۔ زمین پانی کی بہ نسبت سورج کی گرمی زیادہ جذب کرتی ہے۔ وہلم جرا

یہ کائنات دراصل ایک سلسلہ ہے گویا اللہ سبحانہٗ کا بنایا ہوا یہ ایک کلیہ ہے کہ اسباب میں اور بہت سے اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ نگاہ ابراہیم نے اسی امانت کے ذریعہ معلوم کر لیا کہ یہ سب قوانین اور اسباب ہیں اور ان سب کی باگ ڈور ایک ذات کے ہاتھ میں ہے وہی مسبب الاسباب ہے۔ وہی اصل یا حقیقت کائنات ہے۔ انسان وجدانی طور پر سمجھتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فلسفی نے تسلیم کیا ہے کہ کائنات کی رنگا رنگی کا مدار ایک ہی ہے۔ اور اس کثرت کی ساری عمارت ایک ہی وحدت پر قائم ہے۔ یہی وحدت ہے جس کی فطرت یا ماہیت کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطیاں کی ہیں۔ یہی غلطیاں مذاہب، فلسفوں اور نظریوں کے اختلاف کا سبب ہیں۔ اگر ہمیں اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو پوری کائنات کو صحیح طور پر جان سکتے ہیں۔ کائنات کا مطالعہ اور اس پر تفکر و غور ہی ہمارے اندر صحیح خداشناسی پیدا کر سکتا ہے یہ پوری کائنات خدائی صفات اور افعال کا مظہر ہے۔ اللہ سے بیگانگی ہمارے تمام استدلال اور تمام علم کو کمزور کر دیتی ہے۔ تمام قوانین قدرت اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں جو اللہ کی ذات میں مخفی ہیں ان کے ظہور میں آنے سے اللہ کی صفات ظہور میں آ رہی ہیں۔ ھو الاول والآخر

والظاہر والباطن۔

اس آیت میں بتایا یہ جارہا ہے کہ حضرت ابراہیم پر کائنات کے مطالعہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے اسرار و حقائق کھول دیے۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت ابراہیم نے یہ بات پالی کہ اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور وہ یگانہ تنہا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ یقین و اذعان کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ انہوں نے قوم کے سامنے اور باپ کے سامنے شرک و بت پرستی کے خلاف عقل سلیم کی حجتیں اور وجدان صادق کی شہادتیں پیش کیں۔

حضرت ابراہیم کا زہرہ پرستی سے انکار

۹۴۔ پھر جب اس پر رات کی اندھیری چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ان کو پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔ کہ انہیں اپنا رب بنالوں کیا ایک مجبور قیدی اور بیگاری کو شہنشاہی کے تخت پر بٹھلانا کوئی پسند کرسکتا ہے۔ باقی ابراہیم علیہ السلام کا ھذا ربی کہنا یا تو استفہام انکاری کے لہجے میں ہے یعنی کیا یہ ہے میرا رب اور یا بطریق تہکم و تبکیت ہے یعنی یہ ہے میرا رب تمہارے عقیدے اور گمان کے موافق۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

انظر الی الھک الذی ظلت علیہ عاکفا ای فی زعمک

اس کے سوا مفسرین کے دوسرے اقوال بھی ہیں مگر ہمارے خیال میں یہی راجح ہے[1]

حضرت ابراہیم جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں بابل اور مصر پر قدیم سامی قومیں حکمران تھیں۔ حضرت ابراہیم کی دعوت کا جو نقشہ قرآن نے بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب نبوت پر پہنچنے کے بعد حضرت ابراہیم کی ابتدائی دعوت کی کیفیت کیا تھی؟ اس میں بتایا گیا کہ حضرت ابراہیم کس طرح ملکوت السماوات والارض کا مشاہدہ کرکے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح استدلال کرکے راہ توحید معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حضرت ابراہیم جس گرد و پیش میں پروان چڑھے ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف چاند، سورج اور زہرہ و مشتری کی پرستش ہو رہی تھی اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیم کی دعوت کی ابتداء یہیں سے ہوئی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چاہیے کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی عبادت و پرستاری کے لائق ہے۔ اسی فکر میں وہ ڈوب گئے
قرآن نے یہاں بتایا ہے کہ رات ہونے پر جب ان کی نگاہ کوکب پر پڑی۔ کوکب عربی میں زہرہ کو
کہتے ہیں جیسے النجم کہکشاں کو کہتے ہیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ قدیم جاہلی قوموں میں
سب سے زیادہ پرستش دو ستاروں مشتری اور زہرہ کی ہوتی تھی۔ ابوحیان الاندلسی نے عبداللہ
بن عباس اور قتادہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہاں کوکب سے مراد زہرہ ہے۔ ستارہ دیکھا اور دیکھ
کر فرمایا ھذا ربی، یہ میرا رب ہے یعنی میرا مالک ہے میرے کام بنانے والا ہے۔ یہ بات حضرت
ابراہیم نے ذاتی سوچ و بچار کے موقعہ پر فرمائی یا قوم سے مناظرہ کے وقت کہی۔ ہمارے کچھ شارحین
قرآن نے پہلی بات کو اختیار کیا ہے اور اس کے لیے حضرت ابراہیم کے بچپنے میں زہرہ پرستی کا
ایک قصہ بھی گھڑ لیا ہے۔ حیرت ہے کہ حافظ ابن جریر نے بھی یہی بات کہہ دی ہے لیکن ہماری
رائے میں قرآنی سیاق سے قریب تر یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات حضرت ابراہیم نے میدانِ
مناظرہ میں فرمائی ہے۔ یہ بات آپ نے اپنی ستارہ پرست قوم کو مخاطب کر کے فرمائی اور ان پر حجت
الزامی قائم کرنے کے لیے کہی۔ مخالف پر حجت الزامی قائم کرنا تبلیغ و مناظرہ علمی کے معمولات
میں سے بلکہ عام گفتگو میں دستور ہے کہ دوسرے کے خیال کو اپنی زبان میں بجنسہٖ دہرا دیتے ہیں اور
لب و لہجہ سے ہمیشہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کا خیال نقل ہو رہا ہے۔ اُردو و فارسی، عربی
اور انگریزی ہر زبان میں یہ اندازِ بیان عام ہے۔ خود قرآن حکیم میں ایک جگہ قیامت کے موضوع پر
ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرمائیں گے این شرکائی میرے شریک کہاں ہیں۔ مطلب بالکل واضح
اور صاف ہے کہ وہ کہاں ہیں جو تمہارے خیال میں میرے شرکاء ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے
کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے شریکوں کا وجود تسلیم کر رہا ہے۔ امام رازی، امام قرطبی، ابوحیان اندلسی،
ابن العربی اور ابن قتیبہ نے یہی بات پسند کی ہے کہ خود سیاقِ قرآن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ بات
میدانِ مناظرہ میں کہی گئی ہے۔ پہلے بتایا کہ ہم نے ابراہیم پر ملکوت السماوات والارض کے اسرار و
حقائق کھول دیے تھے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اس ارائت کے نتیجے میں کس طرح ابراہیم نے
اپنی قوم پر واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہے ہیں وہ
ساری چیزیں خود اپنے وجود سے گواہی دے رہی ہیں کہ وہ ملکوتِ الٰہی کے تابع اور اس کے احکام
اور قوانین کے تحت مسخر ہیں، مجال نہیں کہ سرِ مو اِدھر اُدھر ان سے تجاوز کر سکیں۔
اس کے بعد قرآن نے بتایا کہ اس کہنے کے بعد کیا ہوا فرمایا کہ جس بات کو پہلے تعریضاً وطنزاً

پیش کیا تھا اب اس کو کھول دیا فلما افل قال لا احب الا فلین جب زہرہ ستارہ ڈوب گیا تو آپ نے فرمایا کہ ڈوب جانے والوں کو میں نہیں چاہتا ہوں۔ افلین جمع کا صیغہ لاکر اشارہ کر دیا کہ یہ ستارہ بھی اس زنجیر کی ایک کڑی ہے جو محکومی اور مقہوری کے تحت کسی کے تحت کام کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر حضرت ابراہیم نے اس واضح حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ان ستاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوبنا کیوں نہیں دیکھتے جب طلوع کے ساتھ غروب اور آنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت و شکل میں سر مو تغیر آجائے تو یہ تو گویا وہ خود زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آتے نہیں لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں اور لا احب فرما کر حضرت ابراہیم نے اپنے مخاطبوں کے جگر و دماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ اللہ کے ساتھ بندے کا تعلق محبت و درد کا ہے نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر، مجرد خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو۔ انسان کے تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں محبت اور خوف یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں چونکہ عبادت کی اصل بنیاد محبت ہے اس لیے یہاں محبت ہی کا ذکر کیا۔

حضرت ابراہیم کا قمر پرستی کا انکار

۹۵۔ پھر جب اس نے چاند چمکتا ہوا دیکھا تو اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو بول پڑا کہ اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہیں دکھائی تو میں ضرور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ چاند چونکہ بہت حسین اور چمکدار سیارہ ہے اگر خدا دستگیری نہ فرمائے تو بے شک انسان اس کی چمک دمک پر مفتون ہو کر رہ جائے[1]

پہلی آیت میں لا احب الا فلین کہہ کر تعریض کی تھی کہ ڈوبنا ایک قسم کی دنائت اور پستی ہے اور ایک طرح کا سقوط و انحطاط ہے اور ایک انداز کا عیب ہے۔ ایسی چیز تو محبت کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لائق نہیں۔ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال جہاں ہو وہ قابل عبادت نہیں۔ اور پھر جس طرح ضعف بصارت اس بات کی دلیل ہے کہ نور چشم اس کا ذاتی نہیں بلکہ کسی بصیر قدیم کا عطیہ ہے اسی طرح کواکب کے نور کا ضعف اور اضمحلال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کا ذاتی نہیں ہے۔ لہذا کواکب کا یہ غروب ہونا ان کی فقیری اور محتاجی اور بے چارگی بتاتا ہے اور ظاہر ہے کہ بیچارہ و مجبور معبود نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں من القوم الضالین کہہ کر کھلے لفظوں میں ان پر بدراہ اور گمراہ ہونے کا فتویٰ لگا دیا۔ یہ تعریض اور طنز پہلی تعریض سے زیادہ زوردار اور صاف ہے۔ یہاں صرف اتنی بات پر اکتفا نہیں فرمایا کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی کھول کر فرما دی کہ ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ میرا اس سے بچنا خاص اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے۔ اللہ سبحانہٗ ہدایت کا سرچشمہ ہے اگر وہ ہدایت ارزانی نہ فرماتے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے درپے ہو سکتا ہے۔ ہدایت ہمیشہ اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ میں جادۂ توحید پر گامزن ہوں۔ اگر اس کی ہدایت اور توفیق نہ ہوتی تو میں بھی ان گمراہوں کی صف میں ہوتا۔ بتانا یہ ہے کہ ہدایت کا حصول بھی اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اور اس کا بقا اور ہدایت پر ثابت قدم رہنا بھی اللہ سبحانہٗ کی توفیق و امداد سے ہے۔

حضرت ابراہیم کا آفتاب پرستی سے انکار

۹۶ - پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو ابراہیم نے کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے یہ بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو ابراہیم نے کہا کہ اے میری قوم میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ یعنی نظام فلکی میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ فیض رساں سیارہ ہے۔ شاید عالم مادی کی کوئی چیز اس کے بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض تاثیر سے مستغنی ہو لیکن یہ بھی ڈوب گیا۔ یہ بھی تو کسی کے حکم کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ اس کی روشنی کو بھی قرار نہیں ہے پہلے بڑھنے لگی پھر ڈھلنے لگی، پھر رفتہ رفتہ چھپ گئی۔ حضرت ابراہیم نے کہا۔ نہیں ان میں سے کوئی بھی میرا رب نہیں ہو سکتا کیونکہ سب زبان حال سے کہہ رہے ہیں ہم مختار نہیں مجبور ہیں، حاکم نہیں محکوم ہیں۔ یہ تو سب خدا کے مزدور ہیں جو وقت مقرر پر آتے اور چلے جاتے ہیں۔ ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر پر قادر نہیں پھر ان کو خدائی کے حقوق میں شریک کرنا کس قدر گستاخی

اور قابل نفرت فعل ہے۔[1]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا تعلق حضرت ابراہیم کی ذاتی اور انفرادی سوچ سے نہیں ہے بلکہ اس ساری داستان کا تعلق قوم سے مناظرہ سے ہے۔ اسی لیے آخر میں لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے انی بری مما تشرکون لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔ اس تمام داستان کا مقصد اپنے تاثرات کا اظہار ہی نہیں بلکہ قوم کے ضمیر کو بیدار کرنا تھا۔ جن لوگوں نے اسے حضرت ابراہیم کے ذاتی تاثرات کی داستان قرار دیا ان کے ذہنوں میں یہاں یہ سوال ابھر آ کر کیا بچپن سے حضرت ابراہیم پر روزانہ رات نہ آتی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند تاروں اور سورج کو غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے۔ اگر روزانہ وہ دیکھتے تو یہ واقعہ اس طرح کیوں پیش کیا گیا کہ رات ہوئی تو ستارہ دیکھا، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس واقعہ سے پہلے تاروں، چاند اور سورج دیکھنے کا کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے اس قدر ناقابل ہو گیا کہ اس سے گلوخلاصی کی خاطر یہ قصہ تراشا گیا کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش ایک غار میں ہوئی اور ان کی والدہ نے نمرود کے خوف سے ان کی پرورش بھی غار ہی میں کی۔ کیونکہ نجومیوں نے نمرود کو بتا رکھا تھا کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمام بتوں کو توڑ دے گا اور دین مروجہ کے خلاف بغاوت کرے گا نمرود نے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ حضرت ابراہیم غار میں ایک دن میں اتنے بڑھے جتنے دوسرے لوگ مہینے میں بڑھتے اور مہینہ میں ان کا اٹھان اتنا تھا جتنا دوسروں کا سال میں ہوتا ہے۔ پندرہ روز کے بعد انہوں نے اپنی ماں سے مطالبہ کیا کہ مجھے غار سے باہر لے چلو۔ باہر آ کر انہوں نے جب رات کو ستارہ، چاند اور صبح کو سورج دیکھا تو یوں کہا۔ یہ روایت گھڑی ہوئی ہے۔ اس کی روایت کا سہرا سدی کے سر ہے۔ سدی کا نام محمد بن مروان ہے۔ محدثین کی تحقیق میں یہ کذاب ہے اصل بات وہی ہے کہ یہ ذاتی فکر کی بات نہیں بلکہ میدان مناظرہ اور علمی مجلس کی بات ہے۔

توحید کا زندہ جاوید پیمانہ

۹۷۔ میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یعنی ساری مخلوق سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یکسو ہو کر صرف خالق جل وعلا کا دروازہ پکڑ لیا ہے جس کے قبضہ اقتدار میں سب علویات و سفلیات ہیں [1]۔
یہ اس اعلان برأت کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودان باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رُخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ توحید و اسلام کی عظیم ربیت ہے۔ گویا اثباتی پہلو میں یہاں ایسے وجود کو سامنے رکھا ہے جس کی طرف سارے وجود منتہی ہیں۔ اور سلبی پہلو میں صرف اجمالاً شرکت کے حدود کی نفی پر کفایت کی حضرت ابراہیم نے بتا دیا کہ خدا ایک موجود ہے اور موجود بھی وہ جس نے موجودات کو خلعت وجود سے سرفراز فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ صفات ثبوتیہ تابع وجود ہیں۔ جس کا وجود ذاتی ہو گا اس کی صفات ثبوتیہ بھی لامحالہ حقیقی ہوں گی۔ اور مخلوقات چونکہ اپنی ہستی میں اللہ کی محتاج ہیں اس لیے اپنی صفات میں بھی اس کی محتاج ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیم نے خدا کے تنزیہی پہلو کو اشراک میں سمیٹ دیا اور اثباتی پہلو کو زیادہ تفصیل سے پیش کیا۔ یہی نبوت کا طریق کار ہے۔ انسان مجرد نہیں مادی بھی ہے۔ اس کا تصور کسی ایسے موجود کا متلاشی ہے جسے خوف و ہراس میں پکارے تو پکار سکے اور عیش و راحت میں یاد کرنا چاہے تو یاد کر سکے جتنا یہ اس کا متلاشی ہو اس سے زیادہ وہ اس کا منتظر ہو۔ یہ گرنے لگے تو وہ سہارا دے، یہ بھوکا ہو تو کھانا کھلائے۔ یہ پیاسا ہو تو وہ پانی پلائے، یہ بیمار ہو تو وہ شفا دے۔ اگر یہ سو جائے تو وہ اس کی نگہداشت کرے۔ خلاصہ یہ کہ اس کے ماضی و حال اور مستقبل کے تینوں زمانوں کی زندگیاں اسی نظر رحمت کے نیچے پھل اور پھول رہی ہیں۔

مظاہر کائنات کی تسخیر، ان کے عجز و بیچارگی اور مقہوریت میں توحید کی بہت بڑی دلیل ہے ان کا انقیاد و طاعت اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ذات ہی متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے اپنے حسن و عظمت کے باوجود ایک مضبوط پائدار نظام حکمت کے ماتحت مقہور و مسخر ہیں۔ اور پھر ان کو جو جتنا شاندار ہے اس کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے۔ حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط اور کسوف و خسوف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے آثار جو ہم ان میں دیکھتے ہیں دوسری کسی چیز میں بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی الوہیت کے دلائل میں سے شمار کیا۔ توحید کی یہ دلیل اجمال و تفصیل کی مختلف صورتوں میں قرآن میں بیان ہوئی ہے۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ
وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ
كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ
وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ
سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ
وقف لازم — ع ۱۲ — ۹ — ۵
هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ ؕ
نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

اور ابراہیم سے اس کی قوم نے ردو کد کی، ابراہیم نے کہا کیا
تم مجھ سے اللہ کے بارے میں اُلجھتے ہو حالانکہ اس نے مجھے
راہِ راست دکھادی ہے[۹۰]۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے
شریکوں سے نہیں ڈرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ جب تک

میرا رب مجھے نقصان پہنچانا نہ چاہے مجھے کوئی نقصان نہیں
پہنچا سکتا، میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہے پھر کیا ہوش
میں نہ آؤ گے[۹۹]۔ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں
سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو
خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے
اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے[۱۰۰]۔ بتاؤ اگر
تمہیں کچھ پتہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ
بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے، فی الواقع امن والے
اور کامیاب تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اور جنہوں
نے اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہیں کی[۱۰۱]۔ یہ تھی ہماری
وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں
دی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں، واقعہ یہ

ہے کہ تیرا رب نہایت دانا اور علم والا ہے۔ [۱۰۲]

توحید عبادت کے لیے حجت بالغہ

شرک کی بنیاد چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قوم نے حضرت ابراہیم کو طرح طرح سے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈرول سے معلوم ہوتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطہ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سودخواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور باہم بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے معبودوں سے ان کی دعائیں زیادہ درازیٔ عمر خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ معبود تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ معبود ہوتا تھا۔ اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ ہر شہر میں ان بڑے معبودوں کے ماتحت بہت سے چھوٹے معبود بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی دیوتاؤں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسمِ عبادت انہی کے آگے بجالاتے تھے۔

ننار کا بُت اُور شہر میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب ننار کی بیوی ننگل کا معبد تھا۔ ننار کے معبد کی شان ایک شاہی محل کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ ایک پجارن جاکر اس کی دلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف رہتی تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو معبود کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک بار اپنے آپ کو راہِ دیوتا میں کسی اجنبی کے حوالہ کرنا ذریعہ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں ہے کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پجاری ہوتے تھے۔ پجاریوں کی ایک خاص جماعت پیدا ہو چکی تھی اور بت پرستی کی تاریخ میں اصلی کارفرما جماعت ہمیشہ یہی رہی ہے

یہ لوگ عوام سے الگ ہو جاتے ہیں اور عوام کو اپنے قبضہ اقتدار میں رکھنے کے لیے مندروں کی معجزانہ قوتیں برابر بڑھاتے رہتے تھے۔

نمارد محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغات، مکانات، اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تجار سب ہر قسم کے غلے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لاکر مندر میں نذر کرتے تھے جنہیں وصول کرنے کے لیے مندر میں پجاریوں کا ایک بڑا سٹاف موجود تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی جانب سے پوجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی مندر میں تھی۔ پجاری اس کے جج تھے۔ ان کے فیصلے خدا کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے شرک اور کواکب پرستی کے خلاف عقلِ سلیم کی حجتیں اور وجدان صادق کی شہادتیں پیش کیں تو پجاری اور ان کے ہمنوا دنگ رہ گئے۔ ان کے پاس حضرت ابراہیم کے سوالات کا کوئی جواب نہ تھا اور بجائے عقل و بینش کی بات کے دھونس اور دھاندلی سے کام لینے لگے۔

۹۸۔ اور ابراہیم سے اس کی قوم نے رد و کد کی، ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں الجھتے ہو حالانکہ اسی نے مجھے راہِ راست دکھائی ہے۔ یعنی جس کو خدا سمجھا چکا اور ملکوت السماوات والارض کی علی وجہ البصیرت سیر کرا چکا کیا اس سے یہ اُمید رکھتے ہو کہ وہ تمہارے جھگڑنے اڑنے سے وہ جدل و بحث سے بہک جائے گا، کبھی نہیں [1] مطلب یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے عقل و بینش کی ترازو میں رکھ کر بات کہی اور شرک سے اپنی برأت کا اعلان کر دیا اور توحید کا ڈنکا علی رؤس الاشہاد بجا دیا تو وہ لوگ حضرت سے اُلجھ گئے۔ یہ اُلجھن کیا تھی، وہی جو ہر زمانے کی شرک پسند طبائع کیا کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم جو ان کواکب کو مختار کل کہتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ ان کو یہ اختیارات خدا کی طرف سے عطائی طور پر حاصل ہوتے ہیں مستقل اور ذاتی طور پر تو صرف اللہ مختار کل ہے۔ عطائی طور پر کواکب کو مختار سمجھنا شرک نہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جس اللہ نے قوت و طاقت بخشی ہوئی ہے ان کی عبادت کرنا ایمان باللہ کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ عبادت میں واسطہ ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شفیع ہیں۔ وہ ذہنی طور پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کواکب اور ان کے نام پر بنائے ہوئے بتوں سے اتنے مرعوب اور خوفزدہ تھے کہ ان کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ابراہیم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو۔ وہ کہتے کہ ہم اللہ کے منکر نہیں ہیں، مانتے ہیں کہ اللہ خالق ہے مالک ہے لیکن جن کی ہم پرستاری کرتے ہیں یہ بھی اللہ کے منظورِ نظر ہیں۔ ورنہ اللہ کو تو ہم بھی ایک مانتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اتحاجونی فی اللہ تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں اس کو یگانہ کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا۔ خدا نے ہی تو مجھے یہ راہ بتائی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یاد رہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی۔ اور یہ بات صرف حضرت ابراہیم کی قوم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق، مالک اور مدبر ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی یا دیوتا مانتے ہیں وہ اگرچہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں لیکن ان کا اللہ سے ایسا تعلق ہے کہ اگر وہ کسی کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور کسی سے کچھ چھیننا چاہیں تو چھین سکتے ہیں کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ کسی سے دولت چھین کر غریب کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو بیمار یا تندرست کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

الغرض مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ان دیوتاؤں کو ایسے جزوی کاموں کے اختیارات دے رکھے ہیں اور اس بنا پر وہ ان کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ ان کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے اور اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان سے مدد مانگتے تھے۔ قرآن نے ان کے ان ہی اعمال کو شرک قرار دیا ہے اور بیشتر قوموں اور ملکوں میں یہی شرک رہا ہے ایسے مشرک دنیا میں بہت کم ہوئے ہیں کہ جن کا عقیدہ یہ ہو کہ اس دنیا کے پیدا کرنے اور چلانے میں اللہ کا کوئی ساتھی اور شریک ہے اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں کسی مشرک قوم نے اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر نہیں سمجھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مشرکین عرب کے متعلق تو قرآن و حدیث میں صاف صاف اس کی شہادت موجود ہے اور قرآن ہی میں ان کے اس طرزِ عمل کا جگہ جگہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں بھی قرآن حضرت ابراہیم سے ان کی قوم کے اسی الجھاؤ کا ذکر کر رہا ہے کہ ہم ان کو خدا نہیں خدا کے دربار میں شفیع مانتے ہیں اور ہم تو ان کو صرف

عبادت خدا میں واسطہ قرار دیتے ہیں۔ اسی کا حضرت ابراہیم جواب دے رہے ہیں کہ و قد ھدان میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ خدائی ہدایت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ محض وہم و گمان کی بنا پر کہہ رہے ہو۔

اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں

۹۹۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا ہوں بلکہ جانتا ہوں کہ جب تک مجھے میرا رب نقصان پہنچانا نہ چاہے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے پھر کیا ہوش میں نہ آؤ گے۔ حضرت ابراہیم کی قوم کہتی تھی کہ تم جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتے ہو آگاہ رہو کہیں اس کے وبال میں تم معاذ اللہ مجنون اور پاگل نہ ہو جاؤ یا اور کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ اس کا جواب دیا کہ میں ان سے کیا ڈروں گا جن کے ہاتھ میں نفع و نقصان اور تکلیف و راحت کچھ بھی نہیں، ہاں میرا معبود مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو اس سے دنیا میں کون مستثنیٰ ہے وہ ہی اپنے علم محیط سے جانتا ہے کہ کس شخص کو کن حالات میں رکھنا مناسب ہوگا[1]

شرک کی بنیاد تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے لوگوں نے حضرت ابراہیم کو طرح طرح سے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے تم بیزاری کا اعلان کرتے ہو۔ تم ان کی ضرور پکڑ میں آجاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ بالکل اسی قسم کی بات قوم عاد نے حضرت ہود سے کہی تھی۔ اعتراك بعض آلهتنا بسوء ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار تم پر پڑ گئی ہے اور بس حضرت ہود علیہ السلام نے کہا تم کہتے ہو کہ تمہارے معبودوں کی مار مجھ پر پڑی ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تمہارے معبودوں سے کوئی سروکار نہیں ہے تم اور تمہارے معبود میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ تمہارا بھروسہ اپنے معبودوں پر ہے میرا سہارا اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے یہاں حضرت ابراہیم نے بھی اپنے مخاطبوں کو یہی جواب دیا لا اخاف ما تشرکون به مجھے تمہارے ان معبودوں کا کوئی خوف کوئی ڈر اور کوئی اندیشہ نہیں ہے جن کو تم خدا کا شریک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بنا رکھے ہو۔ یہ کواکب اور کواکب کی یہ شبیہیں جن کو اصنام، تماثیل اور اوثان کی صورت میں تم پوجتے ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ نہ نفع رساں ہیں اور نہ نقصان بے بصارت بے سماعت مورتیاں ہیں نہ یہ ذریعہ قرب ہیں اور نہ وسیلہ شفاعت ہیں۔ ہاں مجھے اگر نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ نفع و نقصان اسی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بھی بینکا کر سکے۔ مجھ پر اگر افتاد آئے گی تو صرف اللہ کی مشیت، ارادے اور حکم سے آئے گی اور اگر میرے اللہ کی مشیت ہو تو ان تمہارے معبودوں کی جانب سے بھی مجھے تکلیف پہنچ سکتی ہے ممکن ہے کہ کوئی بت مجھ پر گر جائے اور میں زخمی ہو جاؤں یا آسمان سے ستارہ ٹوٹ جائے اور میں ہلاک ہو جاؤں۔ یہ اللہ کی مشیت سے ہو سکتا ہے اس میں تمہارے معبودوں کی مشیت کا کوئی دخل نہیں ہے نہ ان کا ارادہ الٰہی پر کوئی اثر ہے۔ مخلوق خواہ کوئی ہو اس کا خالق کی مشیت پر کوئی اثر نہیں ہے۔ آگے اس کی وجہ بتائی ہے وسع ربی کل شیئ یعنی چونکہ اللہ کے ارادہ اور علم باہم مربوط ہیں اور علم الٰہی کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اس لیے ممکن نہیں ہے کہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق اللہ کی صفات اور افعال پر اثر انداز ہو سکے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور سچے سے سچے عزم کی تکمیل بھی اللہ کی توفیق ہی پر منحصر ہے۔ اس لیے بندے کو کوئی بات بھی صرف ذاتی اعتماد پر دعویٰ کے ساتھ نہ کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم نے الا ان یشاء ربی فرمایا کیونکہ پہلے صیغہ متکلم کے انداز میں لا اخاف ما تشرکون فرمایا اور اس میں ایک قسم کا دعویٰ تھا اس لیے فوراً فرمایا الا ان یشاء ربی یہ غایت ادب ہے۔

آخر میں فرمایا افلا تتذکرون کیا اس صاف اور کھلی وضاحت کے بعد بھی تم اپنے معبودوں کے بارے میں اپنے موقف پر ڈٹے رہو گے اور نصیحت یاب نہ ہو گے۔ کہنا تو یہ چاہیے کہ افلا تتفکرون؟ لیکن تذکر یہ بتانے کے لیے لاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں کواکب اور ان کی مورتیوں کی عظمت اور روحانی اقتدار و تصرف کی ہیبت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے خلاف کسی کا بے دھڑک زبان کھولنا ان کے وہم و گمان میں نہ آسکتا تھا اس لیے فرمایا کہ کیا تمہارے دلوں میں نصیحت قبول کرنے اور عبرت پذیری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

شرک کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے

۱۰۰۔ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے یعنی میں تمہارے معبودوں سے کیوں ڈروں حالانکہ نہ ان کے قبضے میں نفع و ضرر ہے۔ اور نہ توحید کو اختیار کرنا کوئی جرم ہے جس سے اندیشہ ہو۔ ہاں تم خدا کے باغی اور مجرم بھی ہو اور خدا مالک نفع و ضرر بھی ہے لہٰذا تم کو اپنے جرائم کی سزا سے ڈرنا چاہیے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ ڈرنا تو تمہیں چاہیے کہ خدا سے جس درجہ کا تعلق جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت اور جس درجہ کی التجا انسان کو درکار ہے اس کا رُخ تم نے شرکاء کی طرف بدل دیا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ کواکب اور ان کے اصنام، تماثیل اور اوثان کائنات اور آسمان و زمین کے خالق نہیں ہیں۔ پھر بھی تم ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی سے مانگتے ہو، ان ہی کو حاجت روا سمجھتے ہو، اُٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہو، ان ہی کی نذریں اور نیازیں چڑھاتے ہو، بتاؤ جرم تم کر رہے ہو یا میں۔ ڈرنا تمہیں اللہ سے چاہیے کہ اس کی پوری زندگی میں بغاوت کر رہے ہو یا مجھے ان تمہارے جھوٹے معبودوں سے ڈرنا چاہیے جن کے اللہ کے شریک ہونے مختار کل ہونے، حاجت روا ہونے پر تمہارے پاس علم و یقین اور وحی کی کوئی دلیل نہیں ہے جو کچھ کر رہے ہو محض افترائی ہو۔ میرے پاس تو اللہ کے معبود ہونے علم و بصیرت کی دلیل اور وحی و نبوت کی حجت بالغہ موجود ہے۔ تمہارا شرک کے موضوع پر موقف افترائی ہے اور میں توحید کے موضوع پر سلطانی موقف رکھتا ہوں۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم چور ہو کر مجھے ڈرا رہے ہو۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اور قرآن نے شرک کے بارے میں یہاں جو بات کہی ہے کہ مالم ینزل بہ سلطاناً۔ یہ قرآن کے اہم انکشافات میں سے ہے۔ یعنی شرک کا سارا کاروبار محض افترائی اور من گھڑت ہے۔ اس کی پشت پر کوئی سلطانی دلیل نہیں ہے۔

سلطانی دلیل وہ ہے جس میں سلطانیت کی صفت ہو۔ عربی زبان میں سلطان کے معنے غلبہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور تسلط کے آتے ہیں۔ چونکہ بادشاہوں کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اس لیے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ اس آیت میں سلطان کا لفظ دراصل غلبہ، استیلا اور تسلط کے معنے میں استعمال کیا گیا ہے ینزل تنزیل سے بنا ہے۔ تنزیل کے معنے اتارنے کے ہیں۔ چونکہ عام طور پر قرآن میں وحی کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ منسوب کیے گئے ہیں۔ اس لیے عام خیال یہی ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہیں ہوئی۔ یا انبیاء کو اس کے متعلق کوئی علم عطا نہیں ہوا۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کچھ قوانین ایسے ہیں جن میں اللہ سبحانہ نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے۔ یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط ہے اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقفیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے مثلاً آگ جلاتی ہے، مرچ تلخ ہے وغیرہ۔ اللہ سبحانہ کے ان ہی قوانین کو قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر سلطانی دلائل کہتا ہوں اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں ہیں جن کے ساتھ انسانی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہ قرآن کی زبان میں افترائی ہوں گی۔ اس تقسیم کے بعد اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ اور جتنا کچھ ہے اگر اس کا خالق اللہ ہے تو خالق سے ہی ان چیزوں کو مانگنا اور ان راہوں سے حاصل کرنا جن سے خالق دے رہا ہے یہ سلطانی دلائل اور سنت اللہ کہلاتے گی اور اللہ کے علاوہ کسی اور سے مانگنا یا ان راہوں کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے تلاش کرنا افترائی عمل ہوگا۔ مثلاً خدا کے ساتھ سورج سے چاند سے پانی سے مورتیوں سے مقابر سے مانگنا۔ یا بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈنا، جوتے بغیر لہلہاتی فصلوں کی آس لگانا خدا کے مقررہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرز عمل کر کے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہونا ہے۔ اسی لیے قرآن نے شرک کے لیے منفی انداز میں مالم ینزل بہ سلطاناً کی تعبیر اختیار کی ہے اور اثبات کے انداز میں اسے افتری علی اللہ کذباً فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرک خدا کی دنیا میں قائم کردہ اور اس کے سلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن نے صاف بتایا ہے کہ مشرکین جن کو پیدائش اور تخلیق کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں وہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں، افسانوی مغالطوں، اور شاعرانہ پیرائوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ان کی پشت پر کوئی سلطان نہیں ہے۔

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و آباؤکم ما انزل
اللہ بھا من سلطان۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطانیت کے قدرتی پیمانہ سے ہٹ کر انسانیت نے عبادت کے باب

ہیں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں سے کام لیا ہے یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کی پوجا کی گئی ہے وہ حضرت ابراہیم کی زبان میں ضلال مبین کے سوا کچھ نہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ انسان کی اس بے راہ روی نے لوگوں کو کیا کیا کرنے پر مجبور کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان ہی گمراہیوں کی بدولت قوموں اور امتوں کو قرنہا قرن تک غیر سلطانی نہیں بلکہ افترائی دلائل و قوانین کی جکڑ بندیوں کا شکار رہنا پڑا ہے اور کتنے ہیں جو ان ہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم کو ان افترائی اور غیر سلطانی افکار سے لوگوں کو ہٹانے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑی ہے یہاں شرک اور بت پرستی کے خلاف عقل سلیم کی حجتیں اور وجدان صادق کی شہادتیں پیش کیں اور عقل ہی سے اپیل کر کے کبھی فرماتے ہیں انی بریٔ مما تشرکون اور کبھی اعلان کر رہے ہیں کہ لوگو ما انا من المشرکین اور کبھی علی رؤس الاشہاد بتا رہے ہیں لا اخاف ما تشرکون بہ اور کبھی افلا تتذکرون کہہ کر جھنجھوڑ رہے ہیں اور کبھی دریافت کر رہے ہیں کہ کیف اخاف ما اشرکتم اور آخر میں ان کے افکار اور اعمال کے گھروندے پر مالم ینزل بہ سلطانا" کی ضرب کاری لگا رہے ہیں۔

ایمان میں شرک کی ملاوٹ ضلالت ہے

۱۰۱۔ بتاؤ اگر تمہیں کچھ پتہ ہے تو دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے۔ فی الواقع امن و اطمینان والے اور کامیاب تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہیں کی۔ احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کی تفسیر شرک سے فرمائی ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں فرمایا ہے۔

ان الشرک لظلم عظیم

گو یہاں ظلم کی تنوین تعظیم کے لیے ہوئی۔ حاصل مضمون یہ ہوگا کہ مامون اور مہتدی صرف وہ لوگ ہوں گے جو یقین لائے اس طرح کہ اس میں شرک کی ملاوٹ بالکل نہ ہو۔ اگر خدا پر یقین رکھتے ہوئے شرک کو نہ چھوڑا تو وہ نہ ایمان شرعی ہے اور نہ اس کے ذریعے سے امن و ہدایت نصیب ہو سکتی ہے وہو کما قال، وما یومن اکثرھم باللّٰہ الا وھم مشرکون۔

چونکہ ایمان و شرک کا جمع ہونا بظاہر مستبعد تھا اس لیے حضرت شیخ الہند نے ایمان کا ترجمہ یقین سے اور ظلم کا ترجمہ نقصان سے کیا جو لغت عرب کے بالکل مطابق ہے جیسا کہ قرآن کی آیت ولم تظلم منہ شیئا میں ہے اور اس نقصان سے شرک ہی مراد لیا جائے گا جیسا کہ احادیث میں تصریح ہو

چکی ہے اور خود نظم کلام میں لفظ لبس اس کا قرینہ ہے اس کی مفصل تحقیق حضرت شیخ الہند مقدمہ میں فرما چکے ہیں وہاں دیکھ لی جائے۔[1]

جس حدیث کی طرف شیخ الاسلام نے اشارہ فرمایا ہے وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بحوالہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، اس طرح آئی ہے کہ،

جب قرآن کی یہ آیت الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم نازل ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ بھلا ہم میں ایسا شخص کون ہوگا جس نے کوئی بھی ظلم نہ کیا ہو۔ آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد یہ ظلم نہیں بلکہ شرک مراد ہے کیا تم نے لقمان کی وہ بات نہیں سنی جو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہی تھی، یا بنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم

ایمان میں شرک کی ملاوٹ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ سب سے خطرناک یہ ہے کہ زبان پر توحید کا دعویٰ ہو اور عملاً اس کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک بھی بنایا جائے۔ قرآن نے ایسے ہی ایمان کا شکوہ کیا ہے وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون جس کے ایمان میں کسی قسم کا بھی شرک شامل ہوگا وہ نہ تو ہدایت یافتہ ہوگا اور نہ اسے آخرت میں امن و اطمینان نصیب ہوگا۔ ایمان اسی وقت نجات بخش ہوتا ہے جبکہ اس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔

حضرت ابراہیم نے پہلے بتایا تھا کہ ایک تم ہو کہ عقل و بینش سے بالا اور سلطانی قوانین کے خلاف موقف اختیار کیے ہوئے کہہ رہے ہو کہ اللہ کی ہستی کو مانا جائے، یعنی اس پر یقین کیا جائے کہ اس ساری کائنات کی پیدا کرنے والی اور عالم کے اس سارے کارخانے کو چلانے والی اللہ کی ذات ہے لیکن اس کے ساتھ یہ نہ ماننے کہ روزی صرف اللہ ہی دیتا ہے اولاد اللہ ہی دیتا ہے، اللہ ہی مارتا ہے اور جلاتا ہے، مختار کل صرف اللہ ہے عالم غیب صرف اللہ ہے حاضر و ناظر صرف اللہ ہے بلکہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی یا دیوتا سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہیں تو اللہ کی مخلوق لیکن وہ بھی اگر دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں چھیننا چاہیں تو چھین سکتے ہیں۔ کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی سے دولت چھین کر غریب بنانا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چاہیں تو بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو بیمار بنانا چاہیں تو بنا سکتے ہیں اور کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

الغرض حضرت ابراہیم کے مخاطب مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان دیوتاؤں کو ایسے جزوی کاموں کے اختیارات دے دیے اور اس بنا پر وہ انہیں راضی اور خوش رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، ان کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے اور اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان سے مدد مانگتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے یہاں اور قرآن کے دوسرے مواقع پر ان کے اسی خیال کو اور اسی طرزِ عمل کو شرک قرار دیا ہے۔ اور اکثر قوموں اور ملکوں کے مشرکوں کا یہی شرک رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے مخاطب اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے بلکہ ان کا واقعی جرم یہ تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور ان صفات کے لوازم میں شریک کرتے تھے۔ اس موقعہ پر حضرت ابراہیم نے اپنے مخاطبوں کو خالص عقلی اور علمی رنگ میں سمجھایا ہے کہ اللہ کی صفات اور صفات کے لوازم میں کوئی شریک نہیں ہے۔ دوسرے موقعہ پر بھی بات عملی رنگ میں سمجھائی ہے یعنی جب آپ نے دیکھا کہ آباد اجداد کی کاپی کرنے کی اٹاٹوپ تاریکی ان کے دلوں پر اس طرح چھا گئی ہے کہ عقل و بینش کی کوئی روشنی ان کو نظر نہیں آتی۔ ہر دلیل و حجت کا جواب ان کی زبانوں سے یہی نکلتا ہے وجدنا آبارنا لھا عابدین جب حضرت ابراہیم نے قوم کی جہل و نادانی کی یہ حالت دیکھی تو آپ نے محسوس کیا کہ حجتوں اور دلیلوں کی روشنی ایسے لوگوں کے لیے بالکل بیکار رہے۔ ان کے دلوں میں بتوں کے اقتدار و تصرف کا وہم اعتقاد بن کر جم گیا ہے۔ جب تک اس پر چوٹ نہیں لگے گی ان کی آنکھیں کھلنے والی نہیں ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان کو سمجھانے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے اور وہ طریقہ ایسا ہو کہ میری دلیلوں اور موعظتوں سے نہیں بلکہ عالم واقعہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ صدیوں کی یہ گھڑی ہوئی عظمتیں اور نسلوں کی مانی ہوئی معبودیں بے اختیار مورتیوں اور بے جان پتھروں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں اور انسانوں کی بڑی تعداد کا کسی مدت تک کسی بات کو مان لینا اس کی صداقت کا ثبوت نہیں ہے۔ صداقت کا ثبوت صرف عقل سلیم کی حجت ہے۔ یہ عملی طریقہ کیا تھا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ جلد سترہ سورہ انبیاء میں آئے گی۔

آیت کا مطلب صاف یہ ہے کہ شرعاً وہ ایمان نجات کے لیے کافی نہیں جس میں خدا کو مانا جائے لیکن اس کی صفات اور لوازم میں دوسری مخلوقات کو شریک کیا جائے خواہ یہ مخلوق

کواکب ہوں یا فرشتے یا جنات، انبیاء ہوں یا اولیاء، عناصر اربعہ یا خواہ کچھ ہوں، شرک ہر حال میں شرک ہے۔ زمانوں، ملکوں، قوموں کے بدلنے سے شرک کے قوالب بدل جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں لہ اشباح و قوالب، ہر پیغمبر نے اپنے دور کے قوالب کو سامنے رکھ کر شرک کی قباحت پیش کی ہے۔

اللہ کی حجت بالغہ

۱۰۲۔ یہ بھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تیرا رب نہایت دانا اور علم والا ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کو ایسے دلائل قاہرہ دے کر ان کی قوم پر غالب فرمانا اور دنیا و آخرت میں سربلند کرنا اسی علیم و حکیم کا کام ہو سکتا ہے جو ہر شخص کی استعداد و قابلیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر چیز کو اس کے مناسب موقع و مقام پر رکھتا ہے لہ

یہاں توحید کی اس دلیل کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے بیان ہو چکی ہے۔ قرآن کے اس انداز بیان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیم کا فکری ارتقاء سمجھتے ہیں ان کا یہ خیال قرآن کے خلاف ہے یہ حضرت ابراہیم کے فکر کا ارتقاء بلکہ آپ کی دعوت کا ارتقاء ہے۔ اگر اس میں حضرت ابراہیم کے تخیل کو دخل ہوتا تو یہاں اس کے لیے حجتنا کی تعبیر نہ ہوتی۔ دراصل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ ساری داستان اس سے پہلے کی ہے۔ بنیاد کی یہی اینٹ غلط ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ یہ سب کچھ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد پیش آیا ہے۔ آغاز نبوت میں انہوں نے اپنے آپ کو دعوت دی۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج یہ حقیقت پیش کی کہ پرستش اسی کی کرنی چاہیے جس کی پرستش کے لیے علم و بصیرت کی شہادت موجود ہے اور بنیاد اس معاملے کی علم و حقیقت ہے نہ کہ رسوم و رواج، یہی بنیادی صداقت ہے جس سے خدا پرستی کی راہ کی تمام روشنیاں ظہور میں آئیں اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کا یہ اعلان ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

انی وجھت وجھی للذی فطر السماوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین ۔
صداقت کا یہ اعلان ایک نبی کے علاوہ کون کر سکتا ہے اور اس پر بھی غور فرمایئے کہ اگر معاملہ ذاتی فکری ارتقا کا ہوتا تو یوں نہ کہا جاتا کہ اتیناھا ابراھیم علی قومہ بلکہ کہا جاتا کہ اتیناھا ابراھیم علی نفسہ یہ انداز تعبیر بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ معاملہ کا تعلق نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد علمی مناظرے سے ہے نہ کہ ذاتی، فکری ارتقا سے ۔
یہاں سب سے بڑی بات جو اس فکری، ذاتی ارتقا کی تائید میں پیش کی جاتی ہے وہ صرف یہ کہ آپ نے تارے، چاند اور سورج کو دیکھ کر ھذا ربی فرمایا ہے ۔ گویا تارے، چاند اور سورج کو اپنا رب مانا ہے لیکن میدان مناظرہ میں تدریجی طریقہ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس لیے مانتا ہے کہ وہ اپنے حریف کو اسی داؤ پر پچھاڑنا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤ سمجھتا ہے ۔ آخر ان کی قوم کے پاس سورج، چاند اور زہرہ کی خدائی کی دلیل اس کے سوا کیا تھی کہ یہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں ۔ حضرت ابراہیم نے اسی دکھتی رگ پر انگلی دی ہاں یہ طلوع ہوتے ہیں اور چمکتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ ڈوبتے بھی ہیں ۔ اگر ان کا طلوع تمہارے خیال میں ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو، ان کی بے ثباتی، بے کسی اور بے بسی کا بھی مشاہدہ کر لو ۔ بس اسی ایک ضرب سے ستاروں کی الوہیت و قدوسیت کا گھروندا مسمار کر دیا ۔ اور وہ لاجواب ہو کر حضرت ابراہیم کو دھمکیاں دینے لگے ۔ اسی موقعہ پر حضرت ابراہیم نے فرمایا لا اخاف ما تشرکون بہ ۔
آخر میں فرمایا ہے کہ نرفع درجات من نشاء یعنی جسے چاہتے ہیں اسی طور پر کمالات کے درجات پر فائز کرتے ہیں ۔ درجات درجہ کی جمع ہے ۔ سبزی کے بنڈل کو کہتے ہیں ۔ کنائی زبان میں مراتب معنوی مراد ہوتے ہیں، خیر، منصب، علم، قیادت، رزق وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے ۔ کچھ قاریوں نے درجات کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور کچھ نے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے ۔ پہلی قرأت کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کے چاہتے ہیں درجات بلند و بالا کر دیتے ہیں ۔ اور دوسری قرأت کا مطلب یہ ہے کہ درجات والوں کے جتنے چاہتے ہیں ہم درجات بلند کرتے ہیں منشا یہ بتانا ہے کہ ہم علم و عمل کے جتنے درجات کمال ہیں اس کا فیضان کرتے ہیں ۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَ
اِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَ
لُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَ
اِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾ ذٰلِكَ
هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا
لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا
بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ
لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٠﴾ ١٥ ع ٨ ١٦

اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ان میں سے

ہر ایک کو ہدایت بخشی[۱۰۳] - اور نوحؑ کو بھی ہدایت سے نوازا اس سے پہلے[۱۰۴] - اور اس کی ذرّیت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں، اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی، یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے، اور اسماعیل، الیسع، یونس، اور لوطؑ کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو عالم والوں پر فضیلت بخشی، اور ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے ہیں، اور ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی[۱۰۵]، یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے رہ جاتا[۱۰۶] - یہ لوگ ہیں

جن کو ہم نے کتاب اور شریعت اور نبوت عطا فرمائی، تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کردیں گے تو کچھ پروا نہیں، ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کردیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں[۱۰۷]۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی ان ہی کے طریقے پر چلو، اعلان کردو میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں ہوں یہ تو بس تمام جہانوں کے لیے ایک یاددہانی ہے[۱۰۸]۔

نبوت کی غرض و غایت

انبیاء کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش میں بہت بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ اس مقصد کی نشان دہی کی جائے جس کی طرف قرآن کی ان آیات میں اشارا کیا گیا ہے۔ ان آیات میں نبوت کا اولین مقصد ہدایت بتایا گیا ہے کہ وہ فی الواقع اللہ سبحانہ کی صفت ہادی کا مظہر بن کر آتے ہیں۔ یہاں هدينا پھر هدينا هم الى صراط مستقيم اور آخر میں کھول کر کہا ہے ذالك هدى الله يهدى به من يشاء من عباده، اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی ہیں بار بار قرآن نے ھدیٰ کہا ہے۔

اس ہدایت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر

فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں۔

دراصل اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط و تفریط پیدا ہو گی، روئے زمین پر فساد رونما ہو گا۔ انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہو گی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرے کی کمی بیشی نہیں ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں اسی توازن کی ضرورت ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات اسی توازن کا نام قرآن کی زبان میں صراط مستقیم ہے، یہی حق اور عدل ہے۔

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرے ذرے اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازے اور تقدیر سے قائم ہے۔ یہی توازن اور برابری رسولوں کے ذریعے آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے۔ بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور با ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ انسانی دنیا کی سکینت و طمانینت اور امن و امان کا نظام اسی صراط مستقیم کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے۔ انبیاء کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ صراط مستقیم پر قائم رہیں دنیا کے نظام کی امن و سلامتی کے لیے ہے۔

۱۰۳۔ اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی۔
یعنی نہ صرف یہ کہ ہم نے ابراہیم کو ذاتی علم و فضل سے سرفراز کیا بلکہ بڑھاپے میں اسحاق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا۔ یعقوب وہی اسرائیل ہیں جن کی طرف دنیا کی ایک عظیم الشان قوم بنی اسرائیل منسوب ہے۔ جن میں سے ہزاروں نبی اٹھائے گئے بلکہ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ مذکور ہے کہ ابراہیم کے بعد حق تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے ان ہی کی نسل میں نبوت اور پیغمبری رکھ دی ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے حضرت ابراہیم کے روحانی و ایمانی درجات کا ذکر کیا تھا اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو رفع ذکر اور بقائے دوام کی عزت سے سرفراز کیا، ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیا اور بلند مرتبہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ دراصل حضرت ابراہیم کے تین بیویاں تھیں سارہ، ہاجرہ اور قطورا۔ سارہ کے بیٹے حضرت اسحاق تھے ان کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب جن کا لقب اسرائیل ہے اور عیصو جن جن کا لقب ادوم ہے۔ اس سلسلہ میں سے ادوم حضرت یعقوب سے الگ ہو کر اپنے چچا اسماعیل کے پاس عرب میں آباد ہو گئے بقیہ سلسلے شام میں رہے۔ قطورا کے بطن سے تمام اولاد کو جن میں ایک کا نام مدین تھا عرب ہی میں ان کے والد محترم نے بسایا، ان میں سے بنو مدین اور ددان کے سوا اوروں کے حال کا پتہ نہیں ہے، ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل ہوتے انہوں نے بھی اپنے باپ کے حکم سے عرب ہی میں سکونت کی۔

یہاں سب سے پہلے حضرت اسحاق کا ذکر شاید اس لیے کیا ہے کہ حضرت اسماعیل کے بعد حضرت اسحاق حضرت ابراہیم کو ایک سو سال کی عمر میں حضرت سارہ کے بانجھ ہونے کے باوجود خدا کی نشانی کے طور پر عطا ہوئے۔ حضرت ابراہیم کے ایمان، احسان، اخلاص اور اسلام کا جب حضرت اسماعیل کی قربانی کے ذریعہ امتحان ہو چکا تو دوسرا بیٹا حضرت سارہ کے یہاں ہوا۔ اسحاق اصل تلفظ کے اعتبار سے یضحق ہے۔ یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ یضحک ہنستا ہے ہوتا ہے۔ خدا کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم کو سو برس اور حضرت سارہ کو نوے سال کی عمر میں اسحاق کے ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم نے اسے اچنبا سمجھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آگئی تھی اس لیے ان کا نام بھی اسحاق تجویز ہو گیا۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔ عربی قاعدہ سے یضحق مضارع کا صیغہ ہے اور اہل عرب کا ہمیشہ سے دستور ہے کہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام استعمال کرتے ہیں جیسے یزید، یعرب یملک اور تورات میں ہے:-

خدا نے ابرہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اس کو سری مت کہنا بلکہ اس کا نام سرہ ہے اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی میں تجھے بیٹا دوں گا، یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ قوموں کی ماں ہو گی اور ملکوں کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے تب ابرہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کے بیٹا پیدا ہو گا اور کیا سارا جو نوّے برس کی ہے بیٹا جنے گی

اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے تب خدا نے کہا کہ بے شک تیری بیوی سارہ تیرے لیے بیٹا جنے گی تو اس کا نام اضحاق رکھنا۔

(باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹)

حضرت اسحاق کی شادی کے بارے میں قرآن خاموش ہے لیکن تورات بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحاق کی شادی فلسطین کے اس کنعانی خاندان میں نہ کروں گا بلکہ میری خواہش یہ ہے کہ میں اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لیے تو سامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحاق سے کر دے، اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحاق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کر دے۔ الیعزر حضرت ابراہیم کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہو گیا، جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے۔ الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا اسی کے قریب حضرت ابراہیم کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا۔ ابھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لیے جا رہی تھی۔ الیعزر نے اس سے پانی مانگا لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا۔ الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا۔ لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بنا کر لے گئی۔ مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لایان کو اطلاع دی۔ لایان نے الیعزر کی بے حد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی۔ الیعزر نے حضرت ابراہیم کا یہ پیغام سنایا۔ لایان کو اس پیغام سے بے حد مسرت ہوئی اور اس نے بہت ساز و سامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

رفقہ سے حضرت اسحاق کے دو جڑواں بچے ہوئے عیسو اور یعقوب، اس وقت حضرت اسحاق کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ حضرت اسحاق عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور ان کی اہلیہ رفقہ حضرت یعقوب سے زیادہ لگاؤ رکھتی تھیں۔

حضرت یعقوب اپنی والدہ کے حکم سے فدان آرام اپنی ننہیال چلے گئے تو ان کے ماموں لایان نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال ان کے یہاں رہ کر کام کریں تو وہ اس عرصہ کو مہر قرار دے کر ان کی اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت یعقوب نے اس سے شادی کر لی اور

اس کے علاوہ تین شادیاں اور کیں، ایک کا نام لیّہ، دوسری کا نام راحیل، تیسری کا نام زلفا اور چوتھی کا نام بلہا تھا۔ ان سب سے اولاد ہوئی۔ حضرت یعقوب خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔ انہوں نے برسوں اس خدمت کو انجام دیا کلاً ھدینا میں لفظ کل کو فعل سے پہلے لاکر اشارہ کر دیا کہ ان دونوں کو ہدایت کی نعمت بالاستقلال ملی تھی ان میں تابع و متبوع کا رشتہ نہ تھا کیونکہ دونوں پیغمبر تھے اور دونوں اسی دین توحید اور صراط مستقیم کے داعی تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ حضرت اسحاق کا زمانہ ۲۰۶۰ء قبل مسیح تا ۱۸۸۰ء قبل مسیح ہے اور حضرت یعقوب کا زمانہ ۲۰۰۰ء ق م تا ۱۸۵۰ء ق م ہے۔

حضرت نوحؑ بھی ہدایت لے کر آئے

۱۰۴۔ اور ہم نے نوح کو بھی اس سے پہلے ہدایت سے نوازا۔ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعض فروع کا ذکر تھا۔ اب بعض اصول کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم کے اجداد میں سے ہیں اور جس طرح ابراہیم کے بعد نبوّت و کتاب کا انحصار صرف ان کی ذرّیت میں کر دیا گیا۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے بعد نوع انسانی کا انحصار نوح کی نسل میں ہو گیا۔ طوفان کے بعد گویا وہ دُنیا کے لیے آدم ثانی ہوئے ارشاد ہے:

وجعلنا ذریتہ ھم الباقین [1]

حضرت نوح بن لمک حضرت ابراہیم کے اجداد میں سے مشہور و معروف نبی ہیں۔ تورات میں بھی جو نسب نامہ درج ہے اس کے اعتبار سے حضرت ابراہیم خلیل حضرت نوح کی گیارہویں پشت میں ہیں۔ آپ کا وطن وہی تھا جو تاریخ کے ابتدائی دور میں نسل انسانی کا وطن تھا۔ یعنی عراق کا دوابہ دجلہ و فرات آپ کا زمانہ قیاسی و تخمینی طور پر ۲۹۴۸ء ق م تا ۱۹۹۸ء ق م سمجھا گیا ہے۔ آیت میں ھدینا کہہ کر بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے حضرت نوح کو بھی ہم نے اسی راستہ کی ہدایت کی تھی اور آپ نے بھی اسی کی دعوت دی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت ہمیشہ سے ایک ہے۔ خدا کے جتنے پیغمبر گزرے خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں سب کی راہ ایک تھی اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانونِ عبادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ گویا دین کی وحدت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ ایک ہی دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو اور محمد رسول اللہ کو عطا کیا گیا ہے۔

سب انبیا صراط مستقیم کے علمبردار تھے

۱۰۵۔ اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس کو بھی اور یہ سب نیکوکاروں میں سے ہیں اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو جہان والوں پر فضیلت بخشی، اور ان کے آباؤ اجداد ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے ہم نے ہدایت یافتہ بنائے ہیں اور ان کو برگزیدہ بنایا اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ ظاہری ملک و سلطنت کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام میں داؤد و سلیمان ہم رنگ ہیں اور مصائب و شدائد میں صبر کرنے کے لحاظ سے ایوب و یوسف میں خاص مشابہت ہے۔ باقی موسیٰ و ہارون کے قریبی تعلقات کی نسبت تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود حضرت موسیٰ نے ہارون کو بطور وزیر کے حق تعالیٰ سے طلب کیا تھا[1]

ومن ذریتہ میں ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم ہیں۔ یہی بیشتر شارحین قرآن کی رائے ہے۔ اگرچہ حافظ ابن جریر نے ضمیر کو حضرت نوح کی طرف لوٹایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ موضوع یہاں حضرت ابراہیم کی ذات گرامی ہے۔ حضرت نوح کا ذکر بھی مناقب ابراہیم ہی کو بتانے کے لیے آیا ہے۔ بتایا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے اصول و فروع پر اللہ کے انعامات کی بارش ہوئی ہے اور اس پر یہ بھی اضافہ پیش نظر رکھئے کہ اللہ سبحانہ نے نبوت کو نوح و ابراہیم کی نسل میں محدود اور محصور کر دیا۔

لقد ارسلنا نوحاً و ابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ

پہلے اسحاق و یعقوب اور نوح کا ذکر کیا تھا اب یہاں ان آیات میں چودہ نبیوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کا ذکر نہ تاریخی ترتیب سے ہے اور نہ مراتب و مناقب کے لحاظ سے۔ قرآن نہ تاریخی دستاویز ہے اور نہ مناقب و مدائح کا مجموعہ ہے۔

ان آیات میں انبیاء کو تین قسموں میں پیش کیا ہے۔ پہلی قسم میں حضرت داؤد، سلیمان،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایوب، یوسف اور موسیٰ و ہارون ہیں۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ نے ان کو دُنیا میں نبوت و رسالت کے ساتھ ملک و حکومت اور زعامت و سیادت سے مشرف فرمایا ہے۔ پہلے حضرت داؤد و سلیمان کا ذکر کیا، دونوں مالدار بھی تھے اور صاحب تاج و تخت بھی تھے۔ پھر حضرت ایوب اور یوسف کا ذکر کیا حضرت ایوب سرمایہ دار تھے اور حضرت یوسف حکومت میں وزارت کے منصب پر تھے۔ دونوں مصائب میں مبتلا ہوتے، صبر کیا، انعامات سے نوازے گئے تو شکر کیا اور حضرت موسیٰ و ہارون حاکم تھے لیکن بادشاہ نہ تھے۔ ان میں ہر دو ایک خاص امتیازی شان رکھتے تھے اسی شان کے لحاظ سے ان کا ذکر ہوا ہے۔

دوسری قسم میں حضرت زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو پیش کیا ہے یہ سب بزرگ انبیاء میں زہد اور ترک دنیا میں مثالی شخصیتیں ہیں۔ پہلی قسم کے انبیاء کو اگر دینی اور دنیوی ریاست کے یک جا ہونے کی بنا پر محسنین کہا ہے تو ان کو ان کی خالص زاہدانہ زندگی کی وجہ سے صالحین کہا ہے ویسے ہر نبی محسن اور صالح ہوتا ہے۔

تیسری قسم میں حضرت اسماعیل، الیسع، یونس اور حضرت لوط کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ان میں نہ تو پہلی قسم کی طرح دنیا کا جاہ و جلال تھا اور نہ دوسری قسم کی طرح زاہدانہ زندگی میں مبالغہ تھا اس لیے ان کو بعد میں لاتے اور آخر میں ایک جامع بات فرمادی کلا فضلنا علی العالمین ہر نبی بلاشبہ عالمین کی مخلوقات سے اعلیٰ و اولیٰ اور افضل ہوتا ہے۔

اس سے آپ کو یقیناً یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ قرآن میں یہاں انبیاء کے تذکرے میں یہ ترتیب کیوں قائم کی گئی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محسنین، صالحین اور فضلنا علی العالمین کے تنوع میں کیا حکمت ہے۔

آئیے اب ان بزرگ ترین ہستیوں کا کچھ تاریخی چہرہ بھی پڑھ لیجئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

داؤد علیہ السلام مشہور اور جلیل القدر رسول ہیں جن پر زبور نازل ہوئی تھی۔ داؤد عجمی نام ہے اور علمیت و عجمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ آپ ذریت ابراہیم علیہ السلام سے ہیں اور آپ کا شمار انبیاء بنی اسرائیل میں ہے۔ اللہ سبحانہ نے آپ کو دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا کہ صاحب منصب نبوت بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی۔ اور بادشاہ ہونے کے باوجود کسب و محنت

سے اپنی روزی کماتے اور اسی پر ان کا گزر تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہایت پیارا روزہ اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کا ہے کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ اور نہایت پیاری نماز اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آدھی رات تک سوتے تھے اور تہائی رات تہجد پڑھتے تھے اور جب چھٹا حصہ رات کا باقی رہتا تو پھر سو رہتے تھے۔ اور صحیحین میں ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوموسیٰ اشعری تجھ کو داؤد علیہ السلام کی بانسریوں میں سے ایک بانسری دی گئی ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، نہایت خوش آواز تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات سفر میں ان کو قرآن پڑھتے سنا دوسرے روز یہ حدیث بیان فرمائی یعنی تیری آواز ایسی دلکش ہے گویا تیرا گلا بانسری ہے اور تیری آواز میں لحن داؤدی کا اثر ہے۔

یاد رہے کہ تورات اور اسرائیلی روایات میں حضرت داؤد اور اوریا کی بیوی کا جو افسانہ مذکور ہے اور جس کو غلطی سے بعض غیر محتاط مفسرین نے بھی سورہ ص کی تفسیر میں نقل کر ڈالا ہے محض کذب و افترا ہے۔ علامہ داؤدی رقمطراز ہیں :-

داؤد اور اوریا کی بیوی کے قصے میں کوئی روایت ثابت نہیں۔

اور قاضی عیاض فرماتے ہیں :

لیکن داؤد علیہ السلام کا قصہ سو ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ مورخین نے اہل کتاب سے نقل کیا ہے اور جسے کچھ شارحین قرآن نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے اس کی طرف التفات کیا جائے نہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ کسی حدیث میں۔

بہرحال داؤد علیہ السلام نبی برحق ہیں اور ان کا زمانہ ۹۶۲ سنہ قبل مسیح ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

حضرت سلیمان حضرت داؤد کے فرزند ارجمند تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کی ذات بابرکات میں نبوت و سلطنت دونوں کو مکمل طور پر جمع کر دیا تھا۔ حافظ ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں رقمطراز ہیں :

سلیمان عجمی نام ہے۔ علمیت و عجمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ عجمیت میں اس کی نظیر اس امر میں کہ اس کے بھی آخر میں الف اور نون ہیں جیسے ہامان، ماہان اور سامان

اور اس کا غیر منصرف ہونا علمیت اور الف نون زائدہ کی وجہ سے نہیں کیونکہ الف نون کا زیادہ ہونا اشتقاق و تصریف پر موقوف ہے اور عجمی ناموں میں عربی اشتقاق اور تصریف کا دخل نہیں ہے۔ (البحر المحیط ج ا ص ۳۱۸)

شام و فلسطین کے علاوہ آپ کی حدود مملکت مشرق کی سمت میں عراق کے دریائے فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحد مصر تک وسیع تھی۔ آپ کی سلطنت کی وسعت، عظمت اور شوکت پر دوست دشمن سب کا اتفاق ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ بھی بڑی عابدہ و صالحہ تھیں۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان بن داؤد کی ماں نے حضرت سلیمان سے کہا تھا کہ بیٹا رات میں زیادہ نہ سونا کیونکہ رات میں زیادہ سونا مرد کو روز قیامت محتاج کر کے چھوڑتا ہے۔

حضرت سلیمان کا زمانہ حکومت ۹۹۰ ق م تا ۹۳۰ ق م ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

تورات اور کتب تاریخ میں ایک نام یوباب بھی آتا ہے اور محققین کا خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ دراصل عبرانی میں یوباب کو ادب کہا گیا ہے اور یہی ادب عربی میں ایوب ہو گیا۔ لیکن اس تحقیق کے باوجود کہ ایوب اور یوباب اور ادب مختلف زبانوں میں ایک شخصیت کے نام ہیں۔ حضرت ایوب کی شخصیت سے متعلق مسئلہ پھر بھی حل طلب ہے، اور تفصیل چاہتا ہے۔

تورات کے بیان کے مطابق یوباب دو جدا جدا شخصیتوں کا نام ہے۔ ایک بنی یقطان میں سے ہے اور دوسرا بنی ادوم میں سے۔ اگر ایسا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایوب اور یوباب ایک شخص کے دو نام ہیں تو ان دونوں میں سے ایوب اور یوباب کون ہے؟ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ ایوب اور یوباب اس کا نام ہے جو بنی یقطان کی نسل سے ہے اور عرب عاربہ سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

> اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب عرب تھے عرب میں ظاہر ہوتے تھے اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت

موسیٰ نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفر ایوب میں ہے کہ وہ عوص کے ملک میں رہتے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ ان کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں عوص کو ارام بن سام بن نوح کا بیٹا قرار دیا ہے اور آرام بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں ہیں۔[1]

عرب مورخ ابن عساکر کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ وہ حضرت ایوب کو قریب بعید ابراہیمی مانتا ہے اور کہتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کے معاصر اور دین ابراہیمی کے پیروکار ہے۔ دیکھو فتح الباری جلد ۶

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام بنو ادوم میں سے ہیں ان کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م اور ۸۰۰ ق م کے درمیان ہے فرماتے ہیں :

یہ بات کہ حضرت ایوب ایک ادومی عرب تھے۔ خود سفر ایوب سے ثابت ہے عوص کی سرزمین میں ایک مرد صالح راست گو خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا (۱:۱) عوص تورات میں دو آدمیوں کا نام ہے ایک تو نہایت قدیم عوص بن ارم بن سام بن نوح (تکوین ۳۶، ۲۹) باتفاق اہل کتاب اس سے عوص ثانی مراد ہے عوص کے بنی ادومی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفر ایوب میں رفقائے ایوب کے جو مسکن بتاتے ہیں وہ تیمن، نعمان اور شوحان بتائے ہیں۔ اوّل کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا۔ (تکوین ۳۶، ۳۵)

زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اس لیے آسان ہے کہ کلدان اور سبا کا اس میں ذکر معاصرت ہے۔ سبا کا زمانہ عروج ۱۰۰۰ سے ۸۰۰ ق م ہے اس لیے ان دونوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب کا زمانہ قرار دینا چاہیے۔[2]

یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ کے تعین میں دونوں حضرات سبا اور کلدانیوں کی معاصرت کی سند پیش کرتے ہیں مگر نتیجہ دونوں کا جدا جدا اور متضاد نکالتے ہیں۔

سید سلیمان کی تائید مشہور مورخ یعقوبی سے بھی ہوتی ہے۔ اس لیے بلاشبہ یہی صحیح ہے کہ ایوب بنی ایوب علیہ السلام ہیں اور راجح یہی ہے کہ وہ بنی یقطان سے نہیں بلکہ بنی ادوم سے ہیں۔ البتہ

---

[1] ترجمان القرآن [2] ارض القرآن

زمانے کے متعلق ہمیں سید صاحب سے اتفاق نہیں ہے کہ حضرت ایوب کا زمانہ ۲۰۰۰ سنہ سے ۱۷۰۰ سنہ قبل مسیح کے درمیان ہے۔ صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ اور حضرت یعقوب کے زمانہ کے درمیان ہے اور سنہ ۱۵۰۰ ق م اور سنہ ۱۳۰۰ ق م کے لگ بھگ ہے۔ اس پر انشاء اللہ سیر حاصل بحث آپ کو سترھویں پارے میں ملے گی۔

حضرت یوسف علیہ السلام

یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے حضرت یعقوب کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ یہ بھی اپنے والد، دادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر اللہ کے جلیل القدر نبی بنے اور ملت ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے ان کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں بالکل جدا تھی۔ حضرت یعقوب کی محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف کی پیشانی میں چمکتا ہوا نور نبوت پہچانتے اور وحی الٰہی کے ذریعے اس کی اطلاع پا چکے تھے۔ ان کی پیدائش کنعان میں ہوئی۔ بعد کو مصری حکومت میں وزارت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کا زمانہ سنہ ۱۹۱۰ تا سنہ ۱۸۰۰ قبل مسیح ہے۔ ان کے تمام حالات پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ بارہویں پارے میں آئے گا جہاں ان کے نام سے قرآن میں پوری سورت ہے جو ان کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بہترین ذخیرہ ہے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام

حضرت موسیٰ کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران اور ان کی والدہ کا نام یوکابد تھا۔ باپ کا شجرہ نسب یہ ہے۔

عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام اور حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔ حضرت موسیٰ کا اسم گرامی قرآن میں ۱۳۶ بار آیا ہے جبکہ حضرت ہارون کا ۲۰ جگہ ذکر آیا ہے۔

فرعون شاہ مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد اسکندر تک فراعنہ کے ۳۱ خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون ہیکسیس عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندان کی ایک شاخ تھی۔ یہ بات کہ

حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مورخین عرب اس کو بھی عمالقہ کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں لیکن اب جدید مصری حفائر کی تحقیقات اور حجری کتبات نے بتایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رعمیسس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ سنہ قم سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ سنہ قم پر ختم ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ یہ مصری دارالآثار کے مصور ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ سنجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں ڈالا وہ بھی رعمیسس دوم ہے یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا۔ حضرت موسیٰ اس کے زمانے میں پیدا ہوتے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی۔

یہاں صرف اشارات میں موسیٰ اور ہارون کے حالات پر تفصیلی بحث کے لیے آپ کو پارہ ۱۶ کا انتظار کرنا ہوگا۔

حضرت زکریا علیہ السلام

زکریا کے نام سے قرآن جس شخصیت کا ذکر کر رہا ہے یہ وہ نہیں جن کا ذکر مجموعہ تورات صحیفہ زکریا میں آیا ہے کیونکہ تورات میں جس کا ذکر ہے ان کا ظہور دارا کے زمانے میں ہوا ہے اور دارا کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے ہے۔ اور قرآن نے جس زکریا کا چہرہ پیش کیا ہے وہ حضرت مسیح کی والدہ حضرت مریم کے کفیل و مربی ہیں اور یحییٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ حضرت زکریا کے والد کا نام کیا ہے اس میں مورخین کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں اور ابن عساکر نے تاریخ میں وہ سب اقوال نقل کر دیے ایک خیال ہے کہ ان کے والد کا نام ادن ہے کوئی لدن کوئی شبوی اور کوئی یرحنا بتاتا ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے ہیں۔

بنی اسرائیل میں کاہن ایک معزز عہدہ تھا اور اس کے ذمہ خدمت یہ تھی کہ وہ ہیکل صخرہ بیت المقدس کی پاکیزہ رسوم ادا کرے۔ اس کے لیے مختلف قبائل میں کاہن الگ الگ منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس کی خدمت انجام دیتے۔ زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی۔ یہاں قرآن نے ان کا صفِ انبیاء میں تذکرہ کیا ہے۔

زکریا علیہ السلام سلالہ داؤد میں سے تھے اور ان کی اہلیہ الیشع حضرت ہارون کی ذریت سے تھیں۔
مسند امام احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

حضرت زکریا نجار یعنی بڑھئی تھے۔

حیرت ہے کہ امام حاکم نے المستدرک میں اس حدیث کو نقل کر کے یہ لکھ دیا کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط پر ہے اور بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا اور امام ذہبی نے تلخیص المستدرک میں اس پر کوئی گرفت نہیں کی حالانکہ حدیث صحیح مسلم میں یہ روایت فضائل زکریا کے باب میں موجود ہے اور حافظ ابن کثیر نے اسی روایت کو تفسیر میں بحوالہ بخاری پیش کیا حالانکہ امام بخاری نے سرے سے اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی۔ بہر حال حضرت زکریا اپنی روزی نجاری کے پیشے سے حاصل کرتے تھے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت یحییٰ حضرت زکریا کے فرزند ارجمند اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل ہے ان کا نام بھی اللہ سبحانہ، کا تجویز فرمودہ ہے۔

مالک ابن انس فرماتے ہیں کہ یحییٰ ابن زکریا اور عیسیٰ ابن مریم کا رحم مادر میں استقرار ایک ہی زمانے میں ہوا۔ اور ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ سے چھ ماہ پہلے ہوا تھا اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب حضرت زکریا کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوتے چھ ماہ گزر گئے تب جبریل فرشتہ مریم علیہا السلام پر ظاہر ہوتے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کے ہونے کی بشارت دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے چھ ماہ بڑے تھے۔

یحییٰ علیہ السلام کی شخصیت یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان متنازعہ فیہ ہے۔ یہودی ان کے منکر ہیں لیکن عیسائی ان کو حضرت مسیح کا منادی مانتے ہیں اور ان کے والد حضرت زکریا کو صرف کاہن مانتے ہیں اور اہل کتاب ان کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عبری یوحنا یحییٰ کا ہم معنی ہو اور یہ بھی ممکن ہو کہ عبری کے یوحنا نے عربی میں یوحنا کا تلفظ اختیار کر لیا ہو۔
انجیل لوقا میں بھی قرآن عزیز کی طرح یہ تصریح ہے کہ یہ نام ان کے خاندان میں کسی شخص کا ان سے پہلے نہ تھا اس لیے خاندان والوں نے جب سنا تو تعجب کا اظہار کیا اور ان کی عام رہائش کے متعلق

لکھا ہے کہ:

یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متی باب ۳ آیت ۴، ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

یہ مشہور پیغمبر ہیں۔ ان کے تفصیلی واقعات پر خود قرآن میں سیر حاصل بحث ہے۔ ان کا ۲۵ بار قرآن میں ذکر آیا ہے۔ جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم علی الاطلاق خاتم الانبیاء والرسل ہیں، ایسے ہی حضرت عیسیٰ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور انور اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت قدرتِ خداوندی کا شاہکار ہے یعنی بغیر باپ کے محض حکم الٰہی سے ولادت ہوئی۔ قرآن نے ان کا چہرہ معجزاتی شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جیسے ان کی تشریف آوری میں اللہ کی شانِ قدیری کا اظہار ہے ایسے ہی آپ کی روانگی اور پھر دنیا میں تشریف آوری میں بھی اللہ کی شانِ قدیری کا مظاہرہ ہے۔ حضرت عیسیٰ پر تبصرہ پیچھے جلدوں میں کچھ گزر چکا ہے اور انشاء اللہ پارہ ۱۶ میں اس پر تفصیلی تبصرہ آرہا ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

قرآن عزیز نے ان کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاہ نبی کہا گیا ہے۔ بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک شخص کے دو نام ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں، دوسرے اس آیت میں قرآن کا اندازِ بیان بھی اس کی تردید کرتا ہے۔ علاوہ ازیں مورخین نے جو حضرت ادریس کا نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامے سے قطعاً جدا ہے جو حضرت الیاس سے متعلق ہے۔ بیشتر مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس حضرت ہارون کے خاندان سے ہیں اور ان کا نسب نامہ یہ ہے

الیاس ابن یاسین بن فنحاص بن یعزار ابن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون علیہ السلام

حضرت الیاس کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا شہر ان کی رسالت وہدایت کا مرکز تھا۔ ان کا زمانہ ۸۷۵ تا ۸۵۰ قبل مسیح ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے حضرت ہاجرہ کے بطن سے صاحبزادے ہیں۔ اسماعیل عبرانی شماع ایل ہے۔ شماع سننا اور ایل (اللہ) لفظی معنے خدا کا سننا۔ خدا نے چونکہ ابراہیم کی دعا اور ہاجرہ کی فریاد سنی اس لیے بچہ کا نام شماعیل پڑا۔ ۹۹ برس کی عمر میں حضرت سارہ کے بطن سے بھی ایک فرزند کے تولد کی بشارت ہوئی لیکن حضرت ابراہیم کو اس بشارت سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس بشارت کے جواب میں انہوں نے خدا سے یہ دعا کی ۔

اے کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ (تکوین)

اللہ سبحانہ، نے فرمایا

اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ ۱۸، ۲۰۔

آخر یہ بشارت استجابت کو پہنچی اور اسماعیل کا گھرانہ آباد ہوا اور ان کے ایک لڑکی اور بارہ لڑکے ہوئے۔ لڑکی کا نام تورات میں ایک جگہ باسمہ اور دوسری جگہ محلاہ لکھا ہے۔ بارہ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ نبایوط، قیدار، ادبائیل، بیشام، مشماع، دوما، مشا، حدر، تیما، یطور، نفیش، قیدماہ۔ یہ باروں بیٹے حسب بشارت ربانی اپنے خاندان کے بارہ رئیس تھے۔ ان میں سب سے بڑے نبایوط اور ان سے چھوٹے قیدار تھے۔ حضرت اسماعیل اولوالعزم من الرسل میں سے تھے۔ ان کا زمانہ ۲۰۰۰ تا ۱۹۳۲ ق م ہے ۔

حضرت الیسع علیہ السلام

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت الیسع حضرت الیاس کے چچازاد بھائی ہیں۔ ابن عساکر نے ان کے نسب کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی اولاد میں سے ہیں اور سلسلہ نسب یہ ہے الیسع بن عدی بن شوتم بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام اور اگر تورات کے یسعیاہ نبی اور الیسع ایک ہی شخصیت ہیں تو تورات نے ان کو عموص کا بیٹا قرار دیا ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس کے جانشین اور خلیفہ ہیں۔ اوائل عمر ہی میں ان کی رفاقت میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت الیسع کی عمر مبارک کیا ہوئی اور بنی اسرائیل میں کتنے عرصہ تک انہوں نے حق تبلیغ ادا کیا۔

قرآن عزیز نے ان کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ یہاں اور سورہ ص میں ذکر پر اکتفا کیا ہے تورات کے بعض صحیفوں میں ان کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام

مورخین اسلام اور اہل کتاب اس پر متفق ہیں کہ یونس علیہ السلام کے نسب سے متعلق اس سے زیادہ کوئی بات ثابت نہیں کہ ان کے والد کا نام متی ہے اور اہل کتاب یونس کو یوناہ اور متی کو امتی بولتے ہیں یہ کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ عبری اور عربی زبانوں کا لفظی اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کے زمانے کا تعین تاریخ کی روشنی میں مشکل ہے البتہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ جب ایران میں طوائف الملوکی کا دور تھا اس وقت نینوا میں حضرت یونس کا ظہور ہوا لیکن یہ تاریخی نقطہ نظر سے غلط ہے کیونکہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مستقر نینوی ۶۱۲ سنہ ق م میں تباہ ہوا۔ علاوہ ازیں اہل کتاب کی روایات یہ شہادت دیتی ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کے عہد کے بعد ۶۹۰ سنہ قبل مسیح میں جب نینوی نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی تب ایک اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ ان کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت دی، اور جب انہوں نے کوئی پروا نہ کی تو نینوی کی تباہی کی پیش گوئی فرمائی اور اس سے ستر برس بعد ۶۱۲ سنہ ق م میں نینوی تباہ و برباد ہو گیا لہٰذا حضرت یونس کا عہد ۶۹۰ سنہ سے بھی قدیم ہونا چاہیے۔ غالباً شاہ عبدالقادر کی یہ بات درست ہے،

خرقیل کے یاروں میں سے تھے۔ یونس علیہ السلام نے بڑے شوق میں عبادت کی اور دُنیا سے الگ ہو کر حکم ہوا کہ ان کو بھیجو شہر نینوا میں مشرکوں کو منع کریں بُت پوجنے سے۔

(موضح القرآن)

امام بخاری نے کتاب الانبیاء علیہم السلام کے ذکر میں اپنی تحقیق کے مطابق جو ترتیب قائم کی ہے اس میں یونس علیہ السلام کا ذکر حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب اور حضرت داؤد علیہم السلام کے درمیان کیا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم کے برادرزادے ہیں۔ ان کے والد کا نام ہاران ہے۔ حضرت لوط کا بچپن حضرت ابراہیم ہی کے زیرِ سایہ گزرا۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ ملتِ ابراہیم کے پہلے مسلم اور السابقون الاولون میں داخل ہیں۔ یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے اور جب حضرت ابراہیم مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہمسفر تھے۔

اُردن کی وہ جانب جہاں آج بحرِ میت یا بحرِ لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں تھیں اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانے میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے۔ سدوم اور عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں یہ مقام شروع سے بحر نہ تھا۔ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر نیچے چلی گئی۔ اور پانی ابھر آیا اسی لیے اس کا نام بحرِ میت اور بحرِ لوط ہے۔

آخر میں فرمایا و من ذریتھم واخوانھم جتنے حضرات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے یہ سب انبیائے صادقین تھے۔ اللہ کے مقبول و برگزیدہ ان کے فسق اعتقادی و عملی سے متعلق جتنی بھی روایات شائع ہوں اگرچہ وہ بائیبل ہی کے ذریعہ سے ہوں سب کی سب موضوع و باطل ہیں۔ من آبآئھم میں من تبعیضیہ ہے کچھ کے معنی میں ہے۔ یعنی ان کے باپ دادے، ان کی اولاد، ان کے بھائی بند سب نہیں بلکہ کچھ ہدایت کی دولت سے نوازے گئے ہیں۔ یہاں امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ اس آیت میں حضرات انبیا کے آباؤ اجداد اور اخوان یعنی اصول و فروع کا ذکر مقام شرف و مدح میں کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرات انبیا سے ہر قسم کا رشتہ باعث شرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کچھ کو یہ سعادت حاصل ہوتی۔ اور سب کو ہم نے برگزیدگی دی اور صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ صراطِ مستقیم سے مراد علم و عمل کی وہ دولت ہے جس کا ذکر آپ سورہ فاتحہ میں پڑھ چکے ہیں۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین یعنی علم و عمل کی وہ راہ جو انعام یافتہ حضرات کو ملتی ہے جس میں علم کی گمراہی اور عمل کی بے راہ روی نہیں ہوتی۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں الہدیٰ، الدین القیم، اور الاسلام ہے۔ اس آیت نے یہ راز کھول دیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ

سے ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی ایک دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاءؑ آتے رہے۔ اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔ یہ تعلیم صراطِ مستقیم کی تھی۔ یعنی نبوت کے علم و عمل کے ذریعے آئی ہو کہ اللہ کی توحید اس کے صفاتِ کاملہ، اللہ کی خالص عبادت، اقرارِ نبوت، حقوقِ انسانی، اخلاق فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی بازپرس اور جزاء و سزا۔ یہ انبیائی ہدایت کے وہ بنیادی امور ہیں جن میں کوئی اختلاف نہیں۔ انبیاءؑ کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ایک صاحبِ شریعت پیغمبر کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اس وقت مبعوث ہوا ہے جبکہ صراطِ مستقیم انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہوگئی۔ حضرت ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ تشریف لاتے ہیں۔

دعوتِ انبیاءؑ کا سب سے اہم رکن

۱۰۶ ۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کر رہ جاتا۔ یعنی خالص توحید اور معرفت اور اطاعتِ خداوندی کا راستہ وہی ہے جس پر حق تعالیٰ اپنے فضل و توفیق سے مقبول بندوں کو چلاتا ہے۔ پھر اس کے صلہ میں حسبِ استعداد درجات بلند کرتا ہے اور اس کے مقابلہ میں شرک انسان کے تمام اعمال کو حبط کر دیتا ہے اور کسی کی تو حقیقت کیا ہے اگر بالفرضِ محال انبیاءؑ مقربین سے معاذاللہ ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو سارا کیا دھرا اکارت ہو جائے [1]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نبوت کی راہ سے آئے ہوئے علم و عمل کو قرآن صراطِ مستقیم کہتا ہے اور اسی کو وہ ھدی اللہ کہتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت توحید ہے۔ اللہ سبحانہ کے بارے میں عقیدہ اور عبد و معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ اور ہر ماحول میں انبیاءؑ علیہم السلام کی پہلی دعوت اور ان کا سب سے بڑا اور اہم مقصد رہا ہے،

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہمیشہ ان کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور صرف وہی عبادت دُعا، توجہ اور قربانی کا مستحق ہے۔ اللہ سبحانہ، کی تمام صفات میں صفت توحید ایک خاص اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے جس طرح پورے اسلام اور اللہ کی صراط مستقیم کی جان اس کے عقائد ہیں، اسی طرح ان عقائد کی جان توحید و یقین ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ صفت دراصل دوسری تمام صفات ہی کا نقطہ کمال ہے اس لیے صرف یہ ایک صفت فی الواقع ساری صفات کی نمائندگی اور قائمقامی کرتی ہے جس نے شعور و یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اللہ ہی معبود ہے۔ اس نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی ساری صفتوں پر علم الیقین رکھنے کا اعلان کر دیا۔ صفت توحید کی اس ممتاز اور جامع حیثیت کو اگر سامنے رکھا جائے تو ضروری نہیں رہ جاتا کہ ساری صفتوں کے تقاضے بیان کرے اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق الگ الگ گفتگو کی جاتے اس کے بجائے صرف اسی ایک صفت کے تقاضوں کا سامنے آجانا کافی ہوگا اس لیے گفتگو ان تقاضوں تک محدود رہے گی۔ قرآن میں حضرت ابراہیم، حضرت نوح اور دوسرے انبیاء کی تقریریں بتاتی ہیں کہ عقیدہ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے یہ ہیں۔

۱۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے۔ یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۲۔ سارے اعمال و حرکات صرف اسی کے لیے مخصوص رکھنے چاہئیں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی قسم کے ہوں۔ سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے۔ نذر صرف اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے۔ دُعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے، نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

۳۔ وہ جذبات اور احساسات بھی اللہ ہی کے لیے خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی رُوح پائی جاتی ہو، توکل صرف اسی پر کیا جائے، امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں، تقویٰ صرف اسی کا اختیار کیا جائے۔ خوف صرف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو، جو پوجے جانے کا مستحق ہو جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعتراف نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے دلی اور کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دُعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے جس سے امیدیں

وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا ذرہ بھی ہو۔

توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا انکار بھی توحید پر ایمان کے دعویٰ کو بے معنی بنا دیتا ہے۔

توحید کے اسی جامع تصور کو قرآن نے یہاں ھدی اللہ سے تعبیر کیا ہے یعنی جیسے پہلی آیت میں صراط مستقیم فرمایا تھا اسی کو یہاں ھدی اللہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صراط مستقیم ہی اللہ کی ہدایت ہے باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔

توحید کے جامع تصور کے ساتھ یہاں تصویر کا دوسرا رخ بھی بیان کر دیا۔ ولو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون۔ شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے۔ اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے اور اسی لیے یہاں فرمایا کہ جس شرک میں تم مبتلا ہو اگر بالفرض کہیں یہ ارباب ہدایت بھی مبتلا ہو جاتے تو وہ بھی ان مراتب پر فائز نہ ہوتے ممکن تھا کہ کوئی شخص کامیاب ڈاکہ کر کے فاتح کی حیثیت سے دنیا میں شہرت پالیتا یا زر پرستی میں کمال پیدا کر کے قارون کا سا نام پیدا کر لیتا یا کسی اور صورت میں دنیا کے بدکاروں میں نام ور بدکار بن جاتا۔ لیکن یہ امام ہدایت اور امام المتقین ہونے کا شرف اور یہ دنیا کے لیے خیر و صلاح کے سرچشمہ ہونے کا مقام تو کوئی بھی نہ پاسکتا۔ اگر شرک سے مجتنب اور خالص خدا پرستی کی راہ پر ثابت قدم نہ ہوتے[1]۔ اس میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کو تنبیہہ کی ہے۔ مخاطب قریش بھی ہیں اور بنی اسرائیل بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انہیں حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کی وجہ سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ تم تو در کنار اگر وہ بھی بفرض محال شرک میں آلودہ ہو جاتے تو ان کے اعمال بھی اکارت ہو کر رہ جاتے۔ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو گئی کہ شرک سے زندگی کے سارے نیک اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں۔ یعنی کسی قسم کی کوئی نیکی قبول نہیں کی جاتی۔

---

[1] تفہیم القرآن

واضح رہے کہ شرک و کفر تو سب کے نزدیک حقیقتہً حبط عمل کا موجب ہیں لیکن کبیرہ گناہوں کے حبطِ عمل کے مفہوم میں ذرا اختلاف ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ پارہ ۱۶ میں آئے گی۔

انبیاء انسانیت کے کامل ترین نمونے ہیں

۱۰۷ ۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب، شریعت اور نبوت عطا کی ہے تو اگر لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کوئی پرواہ نہیں ہے ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ اگر مکہ کے کافر یا دوسرے منکرین ان باتوں یعنی کتاب، شریعت اور نبوت کا انکار کر دیں گے تو خدا کا دین ان پر موقوف نہیں ہے۔ ہم نے دوسری قوم یعنی مہاجرین و انصار اور ان کے اتباع کو ان چیزوں کی تسلیم و قبول اور حفاظت و ترویج کے لیے مسلط فرما دیا ہے جو ہماری کسی بات سے بھی منہ موڑنے والے نہیں ہیں[۱] مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر و مشرک لوگ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کر دیں ہم نے اہل ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جو اس نعمت کا قدر کرنے والا ہے[۲]۔ ھاؤلاء سے اشارہ اہل مکہ کی طرف ہے۔ منشا یہ ہے کہ اگر یہ اہل مکہ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے تو اے اللہ کے پیغمبر آپ اس کی پرواہ نہ کریں کیونکہ ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مقرر کر دیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ وکلنا توکیل سے ہے اس میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ حفاظت کا مفہوم بھی ہے اور قوماً سے مراد یہاں صحابہ کی وہ جماعت بھی ہے جو اب تک حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی اور وہ بھی جو آئندہ ہونے والے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں اگر ایک طرف صحابہ کی استقامت کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف مستقبل میں اسلام کے غلبے کی پیش گوئی ہے۔

اس آیت میں انبیاء علیہم السلام کو تین چیزوں کے عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب یعنی اللہ کا ہدایت نامہ، دوسرے حکم یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم اور اس کے اصولوں کو معاملاتِ زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت اور مسائل حیات میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت، تیسرے نبوت یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں۔ حکم کے معنے عربی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔ یعنی ہدایت الٰہی کی روشنی میں نبوت جو فیصلہ کرتی ہے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] تفہیم القرآن

اسے حکم کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں :

حکم کے معنے کسی چیز کا فیصلہ کرنا کہ یہ چیز ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسروں کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے :

حکم کے معنے علم، سمجھ، فقہ اور منصفانہ فیصلہ کرنے کے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکم کے معنے اس فیصلہ کے ہیں جو نبوت پیش پا افتادہ مسائل کے بارے میں وحی الٰہی کی روشنی میں کرتی ہے۔ اسی لیے ہم نے یہاں حکم کے معنے شریعت کے کیے ہیں کیونکہ شریعت نام ہی ان فیصلوں کا ہے۔

وحدتِ دین کا اعلان

۱۰۸۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے تم بھی ان کے طریقے پر چلو، اعلان کر دو کہ میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں ہوں، یہ تو بس تمام جہانوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام عقائد، اصول دین اور مقاصد کلیہ میں متحد ہیں۔ سب کا دستور اساسی ایک ہے ہر نبی کو اسی پر چلنے کا حکم ہے۔ آپ بھی اسی طریق پر چلتے رہنے کے مامور ہیں۔ گویا اس آیت میں متنبہ کر دیا کہ اصولی طور پر آپ کا راستہ انبیائے سابقین کے راستہ سے جدا نہیں۔ رہا فروع کا اختلاف وہ ہر زمانہ کی مناسبت و استعداد کے اعتبار سے پہلے بھی واقع ہوتا رہا ہے اور اب بھی واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔ علمائے اصول نے اس آیت کے عموم سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ میں شرائع سابقہ کا ذکر فرمائیں۔ تو وہ اس امت کے حق میں بھی سند ہے۔ بشرطیکہ شارع نے اس پر کلی یا جزئی طور پر انکار نہ فرمایا ہو[1]

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے وہ یہی لوگ ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا ہے اور جن کو اللہ نے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز فرمایا ہے آپ بھی ان کی اقتدا کریں، ان کے نقش قدم پر چلیں۔ اصل ارشاد میں فبھداھم اقتدہ آیا ہے۔ اقتدار کے معنے لغت میں اس شخص کے طریقہ پر چلنے کے ہیں جس کو قدوہ اور اتباع کے لیے نمونہ بنا لیا جائے۔ اگر لغت میں اقتدا۔ کے معنے یہی ہیں تو یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حضور انور کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان انبیاءؑ کی اقتداء کرنے کا کس چیز میں حکم ہو رہا ہے۔ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ آپ کو اصول دین میں اقتداء کا حکم ہوا ہے لیکن اصول دین اور عقائد تو قرآن عزیز میں دوسرے ادیان کے مقابلہ میں کامل ترین وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور ان مسائل میں جو تکمیلی شاہکار قرآن نے پیش کیا ہے وہ دوسرے انبیاءؑ کی کتب میں نہیں ہے اس لیے یہ بات کچھ جچی کو نہیں لگتی کہ وہ ذات گرامی جو دین کے اصول و عقائد میں کمال کی علمبردار ہو کر آئی ہے اس سے یہ کہا جائے کہ ان میں اپنے پیشروؤں کی اقتداء کرو۔ جبکہ ہم زبان نبوت سے یہ اعلان بھی کر رہے ہیں کہ لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی، اگر موسیٰ علیہ السلام بقید حیات ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اصل میں مطلب یہ ہے کہ جن ۱۸ انبیاء کے نام بتائے گئے اور جن کو اللہ نے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اے پیغمبر اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے میں، دین کو دعوت اقامت حجت اور مخاطبوں کی تکذیب پر صبر کرنے میں، ان انبیائے سابقین کی سیرت عملی کو اپنائیے اور اس راہ میں ان کی عملی سیرت کی ساری خوبیاں سمیٹ لیجئے مثلاً نوح، ابراہیم اور آل داؤد کا شکر، یوسف، ایوب، اسماعیل کا صبر، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کی قناعت اور موسیٰ و ہارون کی ہمت اور شجاعت کو راہِ دعوت میں اپنائیے۔ ان میں سے ہر پیغمبر کی اللہ نے رہنمائی کی اور ہر ایک کے درجات بلند کیے ہیں اور پھر رفع درجات میں باہم فرقِ مراتب قائم کیا ہے۔ ان سب کی سیرت کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے آپ اپنالیں آپ کا مقام ان سے بالا ہو گا۔

امام رازی نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ علماء کے نزدیک یہ آیت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تمام انبیاء سے افضل، اعلیٰ اور برتر ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ شرف و مجد کی ساری خوبیاں اور خصال کمال اگر سب میں الگ الگ ہو کر موجود ہیں، داؤد و سلیمان اگر نعمت پر صفت شکر کا نمونہ ہیں تو ایوب بلاؤں میں صبر کی مثال ہیں۔ یوسف میں صبر و شکر یکجا ہے تو موسیٰ علیہ السلام قانون کی سنگینی کے علمبردار ہیں زکریا، یحییٰ، اور الیاس زہد و تقویٰ کی تصاویر ہیں تو یونس و اسماعیل گریہ و زاری میں اور صداقت و راستی کے پیکر ہیں۔ ان سب کی انفرادی حیثیت کو بیان کر کے اللہ سبحانہٗ کا یہ ارشاد فبھدٰھم اقتدہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کو حکم ہو رہا ہے کہ عبودیت و طاعت کی ساری خوبیاں اپنے اندر پیدا کیجئے۔ معلوم ہوا کہ آپ کی ذات تمام صفات کمال کی جامع ہے اور اس شانِ جامعیت کی وجہ سے آپ سب سے افضل ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دو میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا ہوں اگر قبول کرو گے تو تمہارا فائدہ ہے رد کرو گے تو تمہارا ہی نقصان ہے۔ یہ دین کی دعوت ہے کوئی کاروبار نہیں ہے یہ قرآن جس کی میں دعوت لے کر آیا ہوں بلاتمیز پوری کائنات کے لیے ایک تذکیر اور یاد دہانی ہے میرا کام صرف تذکیر ہے اور بس۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ
تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ
تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ
يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ
يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور انہوں نے اللہ کی کوئی قدر نہیں پہچانی جبکہ انہوں نے
کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری[۱۰۹]۔ ان سے
کہو وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں
کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے جس کو تم
ورق ورق کر کے کچھ ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے

ہو اور تم کو ان چیزوں کی تعلیم دی گئی جن کو تم نہیں جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا[۱۱۱] ۔ کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو ان کی کج بحثوں میں چھوڑ دو کھیلتے رہیں[۱۱۱]۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلی چیز کی[۱۱۲]۔ اور تاکہ تم آگاہ کرو اُم القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو[۱۱۳]، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں، وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔[۱۱۴]

ہدایت کا واحد ذریعہ محمد رسول اللہ ہیں

حضرت ابراہیم کے واقعات کے ضمن میں حضرت ابراہیم کی اولاد کی نبوت و رسالت کا ذکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بیان کرنے کے لیے بطور تمہید پیش کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ سے وہی کہا گیا ہے جو پہلے پیغمبروں سے کہا گیا ہے۔ ان معنوں میں آپ کی دعوت کوئی نئی دعوت نہیں ہے بلکہ یہ ان ہی انبیاء کی دعوت کا تکرار ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ پہلی ساری دعوتیں مقامی اور ملکی تھیں اور آپ کی دعوت بین الاقوامی اور پوری انسانیت کے لیے ہے اور آپ کی ذات ان سب نبیوں کے اوصاف و خصائل کی جامع بن کر تشریف لائی۔ نوح کا جوش تبلیغ،

ابراہیم کا ولولہ توحید، اسحاق و اسماعیل کا ایثار، موسیٰ کی سعی و کوشش، ہارون کی رفاقت حق، یعقوب کی خوئے تسلیم، داؤد کا غربت حق پر ماتم، سلیمان کا سرود حکمت، زکریا کی عبادت، یحییٰ کی عفت، عیسیٰ کا زہد، یونس کا اعتراف قصور، لوط کی جانفشانی، ایوب کا صبر سب کچھ بیک وقت آپ کی ذات مبارک میں موجود تھا اور آپ کے مرقع حیات میں یہ سارے نقش و نگار عملاً نمایاں تھے اور یہ اس لیے کہ آپ کی ذات گرامی دنیا کے لیے آخری پیغمبر بنا کر روانہ کی گئی، آپ کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا آپ ایسی کتاب لے کر آئے جو کامل ہے جس کی تکمیل کے لیے پھر کسی دوسرے کو نہ آنا تھا۔ آپ کی تعلیم دائمی وجود رکھنے والی ہے یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا ہے اس لیے آپ کی ذات مبارک کو مجموعہ کمال بنا کر روانہ کیا گیا۔ اسی لیے اب روئے سخن منکرین توحید سے ہٹ کر منکرین نبوت کی طرف ہو گیا اور ان لوگوں کا رد کیا ہے جو وحی و کتاب کے نزول پر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی کتاب کسی انسان پر نازل نہیں ہوئی یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

منکرین تنزیل دو طرح کے تھے۔ پہلا گروہ علمائے اہل کتاب سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ فی الواقع وحی و تنزیل کے منکر نہ تھے لیکن تعصب اور نفسانیت کی وجہ سے نزول قرآن پر اظہار تعجب کرتے تھے اور کہتے کہ خدا کا کلام کبھی اس طرح نازل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ عرب میں یہی لوگ پڑھے لکھے اور باخبر سمجھے جاتے تھے اس لیے مشرک بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ دوسرا گروہ فی الواقع وحی و نبوت کا منکر تھا۔ یہاں پہلے علمائے اہل کتاب کو الزامی جواب دیا ہے۔ اگر خدا اپنا کلام نازل نہیں کرتا تو حضرت موسیٰ پر تورات کس نے نازل کی پھر فرمایا کہ یہ کلام حق جو نازل ہوا ہے مکہ کے شہریوں کو برائیوں سے روکتا ہے، نیکیوں کی دعوت دیتا ہے اور اپنی دعوت سے اس نے ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جو عبادت الٰہی میں ثابت قدم ہے۔

۱۰۹ ۔ اور انہوں نے اللہ کی کوئی قدر نہیں کی جبکہ انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ پچھلے رکوع میں منصب نبوت اور بہت سے انبیاء علیہم السلام کا نام بنام تذکرہ تھا اور یہ کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھی توحید و معرفت کی اسی صراط مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں جس پر انبیائے سابقین کو چلایا گیا تھا۔ پیغمبروں کا ہدایت خلق کے لیے بھیجنا حق تعالیٰ کی قدیم عادت رہی۔ آیات حاضرہ میں ان جاہلوں اور معاندوں کا رد کیا گیا ہے جو بد فہمی، جہل و بغاوت یا نبی کریم کی عداوت کے جوش اور غصہ میں بے قابو ہو کر حق تعالیٰ کی اس صفت ہی کا انکار کرنے لگے کہ وہ کسی انسان کو اپنی وحی و مکالمہ خاص سے مشرف فرمائے۔ گویا انزال کتب و ارسال رسل کے

سلسلے ہی کی سرے سے نفی کر دی گئی ہے[1]

یہ آیت بتا رہی ہے کہ نبوت اور وحی سے الگ ہو کر اللہ کی ذات اور اس کی حقیقی صفات کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ کی صحیح معرفت کا جس میں نہ جہالت و گمراہی کا شائبہ ہو نہ غلط فہمی یا غیر مناسب انداز بیان کا شبہ واحد وسیلہ نبوت اور وحی ہے۔ اور اس بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے وہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے نہ ذہن کی تیزی و ذکاوت کافی ہو سکتی ہے نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ ہو سکتی ہے نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گزر ہو سکتی ہے۔ نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچا سکتی ہیں نہ تجربات کا خزانہ ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

صرف نبوت اور وحی کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل ہو اور اس کی مرضی اور احکام معلوم کریں۔

یہ آیت اس بات کی واضح اور صاف دلیل ہے کہ نبوت و وحی کا وجود ظہور اللہ کی صفات ربوبیت و رحمت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ جو لوگ وحی و نبوت کے منکر ہیں وہ نہیں جانتے کہ جس کی ربوبیت و رحمت نے انسان کی پروردگاری کا ایسا نظام قائم رکھا کیا ممکن ہے کہ اس نے انسان کی روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون کوئی نظام کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔ جس طرح انسانی جسم کی ضرورتیں ہیں اسی روح انسانی کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کی نشو و نما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو لیکن رُوح کی نشو و نما کے لیے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔

اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا حال یہ ہے کہ ہر ذرہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھتی ہے تو کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی نظم نہ ہو، حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں یہ بات خوب لکھی ہے کہ؛

اللہ کی ذات گرامی انسانی جسم کی پرورش کے لیے تو آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح انسانی کی پرورش کے لیے اس کے پاس ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ کا قانون ہے کہ باران رحمت نمودار ہوتی ہے اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرے کو مالامال کر دیتی ہے۔ پھر کیا ضروری نہیں ہے کہ جب عالم انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی باران رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیام زندگی

[1] افادات شیخ الاسلام

پہنچائے، روحانی سعادت کی اسی بارش کا نام نبوت اور وحی ہے۔ فی الواقع منکرین نبوت کو اللہ کی معرفت حاصل نہیں اور اللہ کے قدر شناس نہیں ہیں۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ - میں قرآن نے ان ہی لوگوں کا چہرہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ نہ خدا کی صفتوں سے آشنا ہیں اور نہ اس کی عنایات سے باخبر ہیں جو کہتے ہیں کہ ما انزل اللہ علی بشر من شیئ۔

منکرین نبوت کو الزامی جواب

۱۱۰ - ان سے کہہ دو کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو۔ اور تم کو ان چیزوں کی تعلیم دی گئی ہے جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا - یعنی اگر واقعی خدا نے انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری تو توراۃ مقدس جیسی عظیم الشان کتاب جو احکام و مرضیات الٰہیہ پر بندوں کو مطلع کرتی اور رشد و ہدایت کی عجیب و غریب روشنی اپنے اندر رکھتی اور ان چیزوں کا علم عطا کرتی تھی جنہیں تم اور تمہارے باپ دادا بلکہ کل بنی آدم بھی بدون اعلام الٰہی محض اپنی عقل و حواس سے دریافت نہیں کر سکتے تھے وہ کہاں سے آگئی اور موسیٰ علیہ السلام پر کس نے اتاری۔ مانا کہ آج تم اسے ورق ورق اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کو اپنی خواہش کے موافق دکھلاتے اور اس کے بہت سے احکام و اخبار کو چھپائے ہوئے ہو اور اس طرح اس کی اصل روشنی تم نے باقی نہیں چھوڑی ہے تاہم جو حصہ آج باقی رہ گیا ہے وہ ہی پتہ دے رہا ہے کہ جس محل کے یہ کھنڈرات ہیں وہ اپنے زمانہ عروج میں کیا عظیم الشان ہوگا۔[1]

یہ اس بات کا کہ "خدا نے انسان پر کچھ نہیں اتارا،، الزامی جواب ہے کہ اگر خدا نے کچھ نہیں اتارا تو یہ بتائیں کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ علیہ السلام لے کر آتے اور جو لوگوں کے لیے ہدایت اور روشنی بن کر نازل ہوئی، اس کے بعد "تجعلونہ قراطیس تبدونھا و تخفون کثیرا" فرمایا اس میں دو قرأتیں ہیں ایک تو وہی ہے جو آپ قرآن میں پڑھتے ہیں۔ دوسری قرأت وہ ہے جو ابن کثیر اور ابو عمرو نے اپنائی ہے یعنی یجعلونہ قراطیس یبدونھا و یخفون کثیرا" پہلی بصیغہ خطاب ہے اور دوسری بصیغہ غائب ہے۔ اسی لیے شارحین کا اس کے مطلب اور مصداق میں اختلاف ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ کچھ اکابر نے تو اسے مشکلات میں قرار دیا ہے۔ جن لوگوں نے اسے بصیغہ خطاب پڑھا ہے انہوں نے اس کا مصداق یہودیوں کو قرار دیا ہے۔ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر سورۂ انعام مکی ہے تو یہودی کیوں کر مخاطب ہو سکتے ہیں؟ اس شبہ کی گرفت سے بچنے کے لیے کچھ نے صاف کہہ دیا ہے کہ سورہ انعام اگرچہ مکی ہے لیکن یہ آیت مکی نہیں بلکہ مدنی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ سورہ انعام کی یہ آیت بھی مکی ہے لیکن چونکہ کفار قریش اور دوسرے مشرکین عرب حضور کے دعوئ رسالت کی تحقیق کے لیے علماء یہود کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے دریافت کرتے تھے کہ تم اہل کتاب ہو بتاؤ کہ کیا واقعی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوی وحی میں سچے ہیں پھر ان کے جواب کی لوگوں میں تشہیر کرتے اس لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو جسے مشرکین مکہ نے حجت بنا رکھا تھا نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے لیکن حافظ ابن جریر نے عام شارحین سے علیحدہ یہ تشریح کی ہے کہ گفتگو قریش سے ہو رہی ہے اس سورت میں یہود کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات کہ اللہ نے انسان پر کچھ نازل نہیں کیا۔ مشرکین کی بات ہے یہودیوں کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہودی تو وحی و نبوت کے قائل ہیں۔ اور قرأت بصیغہ غائب زیادہ اچھی ہے مگر ابن جریر نے اس کی وجہ نہیں بتائی کہ اگر مشرکین سے خطاب ہے تو جواب میں حضرت موسیٰ کو بطور حجت کیوں پیش کیا گیا ہے جبکہ مشرکین حضرت موسیٰ کو نبی ہی نہیں مانتے۔ شارحین قرآن نے ابن جریر کی اس دلیل کا کہ یہودی جو خود تورات کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا یہ جواب دیا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچی باتوں کو رد کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس اپنی مسلمہ صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد رسول اللہ کی نبوت کو رد کرنے پر تلے ہوتے اور مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ حضور کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود نفس رسالت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

اصل بات یہ ہے کہ آپ اسی سورت کے آغاز میں پڑھ چکے ہیں۔ الذین اتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں۔

اور یہ تاریخ کی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ مکہ میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کفار عرب کو آپ کے اس دعوئ پر یقین نہیں آیا۔ اس لیے انہوں نے معجزات طلب کیے پھر ان کو خیال آیا کہ مدینہ، خیبر اور شام میں جا کر یہودیوں سے ملیں اور ان سے پوچھ کر

چند ایسے سوالات دریافت کریں جن کے جوابات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگے جائیں اس خیال کی بنا پر وہ یہودیوں سے جاکر ملتے ان سے آپ کے حالات بیان کرتے اور آپ سے پوچھنے کے لیے ان سے سوالات مانگتے تھے۔ جیسا کہ آپ پندرہویں جلد میں تین تاریخی سوالات کے بارے میں پڑھیں گے یعنی اصحاب کہف کا حال، حضرت موسیٰ اور خضر کی ملاقات کا واقعہ اور ذوالقرنین کا قصہ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توریت کا کتاب الٰہی ہونا، مشرکین مکہ کو معلوم تھا اسی لیے انہوں نے یہودی علماء کے پاس وفد روانہ کیا تھا۔ اس وفد کی سربراہی نضر بن الحارث اور عقبہ ابن معیط کررہے تھے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں کا ذکر آیا ہے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ما انزل اللّٰہ علی بشر من شیئ کہنے والے مشرکین ہیں اور ان کا ہی یہاں ذکر کیا جارہا ہے اور ان ہی سے الزاماً کہا جارہا ہے کہ اگر انسان پر اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا تو بتاؤ کہ موسیٰ پر تورات کس نے اتاری ہے جو واقع میں کفر و شرک کی ظلمتوں کو چاک کرنے والی خدائی روشنی تھی اور جو لوگوں کو ضلالت و گمراہی سے ہٹا کر ہدایت پر لگانے والی تھیں لیکن یہودیوں نے اس کتاب الٰہی کو ورق ورق بنا دیا ہے۔ اصل ارشاد میں قراطیس آیا ہے۔ یہ قرطاس کی جمع ہے قرطاس کے معنے ورق کے ہیں۔ شارحین قرآن نے تورات کو قراطیس بنانے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ یہود نے اس کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ الزمخشری نے لکھا ہے جعلوہ قراطیس مقطعۃ وورقات متفرقۃ درا صل یہود نے تورات اس طرح جمع نہیں کی تھی جس شکل میں قرآن ہے بلکہ انہوں نے تورات کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جز کو الگ قلم بند کیا تھا۔ اس طرح ان کو اس کے احکام کو چھپانے کا موقع آسانی سے مل جاتا تھا۔ جب ایک کتاب کے اجزاء الگ الگ کاپیوں کی صورت میں ہوں تو چھپانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اسی لیے یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ تبدونہا و تخفون کثیراً، اس سے صاف طور پر معلوم ہورہا ہے کہ یہود کے علماء نے اپنے مصالح کی خاطر کتاب الٰہی کا بیشتر حصہ لوگوں سے چھپا لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی پر ایک خاص گروہ کی اجارہ داری قائم تھی۔ احوال و ظروف میں آیات کا یہ کتمان اس نسیان اور کتاب فراموشی سے بالکل جدا اور علیحدہ چیز ہے جس کا قرآن نے فنسوا حظا ماذکروا بہ میں ذکر کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ بات قریش سے کہی جارہی ہے حافظ ابن کثیر نے عبداللہ ابن عباس، مجاہد اور عبد بن کثیر سے یہی بات نقل کی ہے اور حافظ ابن جریر کا بھی یہی مختار ہے اور ابن کثیر نے اسی کو اصح کہا ہے اس لیے صیغہ غائب والی قرأت زیادہ مناسب ہے۔ علامہ سید رشید رضا کی یہ نکتہ آفرینی قابل داد ہے کہ سورت مکی ہے اور یہ آیات بھی مکی ہیں۔ مکہ میں یہ آیت صیغہ غائب ہی سے پڑھی جاتی تھی۔ مدینہ میں آکر جب مسلمانوں کو یہودی علماء کی

کتمان آیات کا عملی تجربہ ہوا تو یہی آیت یہودیوں کو مخاطب بنا کر بصیغہ خطاب تلاوت کی گئی ہے۔ اس مفاہمت سے سارے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔ آخر میں فرمایا ہے وعلمتم مالم تعلموا انتم ولا اباؤکم امام مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کے مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ یعنی تم پر یہ اللہ کا احسان عظیم ہے کہ تم کو وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو ما انزل اللہ الخ تو یہ دیدہ دلیری کی انتہا ہے

نبوت کو جواب کی تلقین

۱۱۱۔ کہہ دو کہ اللہ ہی نے پھر ان کو ان کج بحثیوں میں چھوڑ دو کھیلتے رہیں۔ یعنی ایسا نور و ہدایت بجز خدا کے اور کس خزانے سے آ سکتا ہے۔ اگر ایسی صاف اور بدیہی چیز کو بھی یہ لوگ نہیں مانتے۔ تو آپ تبلیغ و تنبیہ کر کے سبکدوش ہو جائیے اور ان کو چھوڑ دیجئے کہ یہ اپنی خرافات اور لہو و لعب میں لگے رہیں جب وقت آئے گا خدا ان کو خود ہی بتلائے گا[1] اس آیت میں اللہ فعل محذوف کا فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر تم ان کو جتا دو کہ کتاب تورات کا نازل کرنے والا اللہ ہے اور تبلیغ اور بیان حق کے بعد ان کی طرف سے نظر التفات کو ہٹا لیجئے۔ ان کو ان کی باطل پرستیوں میں لگا رہنے دیجئے۔ آپ کی ذمہ داری صرف بیان و تبلیغ ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔ حضور انور کو جواب دینے کے حکم میں اشارہ ملتا ہے کہ مخاطب کو نہ یارائے اقرار ہے اور نہ مجال انکار، انکار میں مکابرہ ہے اور اعتراف میں مغلوبیت کی رسوائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سوال کا یہی اور صرف یہی جواب ہے۔ اور ایسا ظاہر ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان ہی پر خدا کا کلام نازل ہوتا رہا ہے اور اب بھی انسان ہی پر نازل ہو رہا ہے۔ دراصل مشرکین نے جس ذہنی تحفظ کے ساتھ ما انزل اللہ علی بشر من شیئ، کہا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بشریت اور نبوت میں تنافی سمجھتے تھے وہ اس کے قائل ہی نہ تھے کہ ایک بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اسی کو وہ کبھی ابعث اللہ بشرا رسولا کہتے اور کبھی ابشر یھدوننا کہتے۔

سبحان اللہ قرآن کی معجزانہ بلاغت کہ ایک لفظ اللہ کے اندر وہ سارے دفتر آ گئے جو انکار و سرکشی کی ان ساری صداؤں کے جواب میں لکھے جا سکتے ہیں۔ قل اللہ کہہ دو اللہ نے موسیٰ پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کتاب نازل کی ہے اور تم مانتے ہو کہ موسیٰ بشر تھے، پھر میری نبوّت کو کیوں نہیں مانتے ہو۔ دراصل وہ سمجھتے تھے کہ روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو محض ایک انسان کے ذریعے ظاہر نہیں ہو سکتا ضروری ہے کہ انسان سے کوئی بالاتر ہستی ہو، اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا ہے۔ ہر داعی کے منکروں نے یہ بات ضرور کہی ہے ما انتم الا بشر مثلنا، تم تو ہماری طرح کے بشر ہو پھر تم پر نزول وحی کیسے مان لیں۔ مشرکین مکہ بھی کہتے تھے ابشر یھدوننا؟

نبوّتِ محمدیہ کی پہلی علمی دلیل

۱۱۲- اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے بابرکت ہے تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی چیز کی۔ یعنی اگر خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ مبارک کتاب کہاں سے آئی جس کا نام قرآن ہے اور جو تمام پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اگر یہ آسمانی کتاب نہیں تو بتلاؤ کس کی تصنیف ہے جس کا مثل لانے پر جن و انس قادر نہ ہوں کیا اسے ایک اُمّی تصنیف کر سکتا ہے[1] یہ بھی اسی الزامی جواب کا تتمہ ہے انسان پر خدا کا کلام نازل ہونے کے لیے پہلے الزاماً کہا تھا من انزل الکتاب حضرت موسیٰ پر نور و ہدایت پر مشتمل کتاب کس نے اتاری معلوم ہوا کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور نازل ہوا ہے اب یہ اسی کا تتمہ ہے کہ یہ کلام جو محمد رسول اللہ پر نازل ہوا ہے یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس کے تعارف میں پہلے اس کے دو بنیادی وصف پیش کر کے اس کا مرتبہ و مقام بتایا اور بعد ازیں اس کے نزول کا مقصد بتایا۔

سب سے پہلا وصف یہ بتایا کہ یہ کتاب مبارک ہے۔ مبارک کا لفظ برکت سے بنا ہے۔ برکت کے معنے زیادتی، بڑھوتری، وسعت پہنائی، جماؤ و استقرار کے آتے ہیں۔ یہ لفظ لا کر اس عالمگیر برکت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسماعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہوگا۔ پیدائش ۲۲ میں ہے:

خداوند فرماتا ہے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اور اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ رکھا، میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تیری نسل سے زمین کی قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔

یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ قرآن کے نزول اور حضور انور کی تشریف آوری سے پوری ہوئی۔ قرآن بڑی خیر و برکت والی کتاب ہے یعنی اس میں اصول عقائد کی مثالوں سے توضیح اور دلائل سے تائید ہے۔ اس میں ایک طرف اگر مکارم اخلاق اور فضائل آداب ہیں تو دوسری طرف عبادات و معاملات کے احکام ہیں۔ اس میں تمدن و تہذیب کا اگر اجتماعی ضابطہ ہے تو سیاست و حکومت کا شورائی نظام ہے۔ الغرض یہ کتاب الٰہی نہ صرف قانونی نظام ہے اور نہ محض اخلاقی ڈھانچہ بلکہ اس میں بیک وقت روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تقاضوں کا جواب ہے۔ یعنی اس میں انسان کی جسمانی اور روحانی فلاح و بہبود کے بہترین اصول پیش کیے گئے ہیں عقائد صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے، اخلاق فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ قرآن نے اپنا یہی وصف چار بار دہرایا ہے۔ ایک مقام تو یہی ہے۔ اسی سورت کے آخر میں آرہا ہے:

هذا كتاب انزلناه مبارك فاتبعوه واتقوا

سورہ انبیاء میں ہے:

هذا ذكر مبارك انزلناه افانتم له منكرون

سورہ ص میں ہے:

كتاب انزلناه اليك مبارك ليدبروا آياته

دوسری صفت قرآن حکیم کی یہ بتائی ہے کہ یہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ یعنی اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے یہ کتاب ان سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو ان میں پیش کی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی قرآن کو قبول کرتا ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کرتا ہے کیونکہ اس کی ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، جھٹلاتی نہیں ہے اور جب قرآنی تعلیم دوسری تمام تعلیمات کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان تمام تعلیمات کے اندر ایک ہی ثابت و قائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں،

مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں میں کوئی بات کہی گئی اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک رہی ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو قدرتی طور پر ماننا پڑے گا کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا ہے لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑتا رہا۔ اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقاء و حفاظت، دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہی دین ازلی ہو گا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا اسی لیے ارشاد ہوا ہے۔

یاایھا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

اسی حقیقت کی طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے،

تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور جن کی مائیں الگ الگ ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی بے نقاب ہو گئی کہ قرآن وحدتِ ادیان کا نہیں بلکہ وحدتِ دین کا علمبردار ہے۔ وحدتِ دین یہ ہے کہ سب نبیوں کا ایک ہی دین ہے جو از آدم تا محمد رسول اللہ مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں میں آتا رہا ہے۔ اور وحدتِ ادیان یہ ہے کہ سارے موجود دینوں کو حق سمجھا جائے، توحید کی راہ بھی صحیح ہو اور شرک کی راہ بھی، وہ دو خداؤں کے قائل کو بھی راست رو خیال کرے، اور تین خداؤں کے پرستار کو بھی، وہ وحی و رسالت پر ایمان رکھنے والوں کو بھی صراط مستقیم پر گامزن تصور کرے اور اس کے منکروں کو بھی، وہ حلول و اتحاد اور اوتار کے نظریات سے نفرت کرنے والوں کو بھی برسرِ حق مانے اور ان نظریات کے پیروؤں کو بھی، کیونکہ یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں جو مختلف سمتوں سے سفر کر رہے ہیں۔ وحدتِ ادیان کا یہ تصور قرآن کا نہیں بلکہ گیتا اور اس کے بعد ان پڑھ صوفیوں کا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور محمد رسول اللہ کو عطا کیا گیا ہے۔ اگلوں کے پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنی ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے ہیں اور اس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکال لی ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پھر حکم ہوتا ہے

کہ اے محمد رسول اللہ تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں۔

نزولِ قرآن کا مقصد

۱۱۳۔ اور تاکہ تم آگاہ کرو ام القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو۔ ام القریٰ بستیوں کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں۔ مکہ معظمہ تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور جغرافیائی اعتبار سے بھی قدیم دنیا کے وسط میں مرکز کی طرح واقع ہے اور جدید دنیا امریکہ اس کے نیچے ہے۔ اور روایات حدیثیہ کے موافق پانی سے زمین بنائی گئی تو سب سے پہلے یہی جگہ نمودار ہوئی۔ ان وجوہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا گیا اور آس پاس سے مراد یا عرب ہے کیونکہ دنیا میں قرآن کے اولین مخاطب وہی تھے۔ ان کے ذریعے سے باقی دنیا کو خطاب ہوا اور یا سارا جہان مراد ہو جیسے فرمایا لیکون نذیر اللعالمین[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو اس مقصد کے لیے اتارا کہ تم اس کے ذریعے ام القریٰ اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو اعمالِ بد کے نتائج سے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ اگر انہوں نے اس کتاب کو اور آپ کی رسالت کو قبول نہ کیا تو اس کے نتائج سنگین ہوں گے۔ گویا اس کتاب الٰہی کا مقصد نزول بھی وہی ہے جو ہر زمانہ میں آسمانی کتابوں کا مقصد رہا ہے یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجام بد سے خبردار کرنا۔

شہر مکہ کو ام القریٰ کو کہا ہے۔ لفظی معنے تو وہی ہیں جو شیخ الاسلام نے بتائے ہیں۔ یعنی بستیوں کی جڑ، عربی میں ام کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں، یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصہ کو ام الراس کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے، فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ علماء نے مکہ کو ام القریٰ کہنے کی اور وجوہ بھی بتاتی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس لیے کہ ساری اقلیموں کی روحانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پرورش کا سامان یہیں سے ہوتا ہے۔ بعض نے کہا اس لیے کہ قدیم جغرافیہ کے لحاظ سے یہ زمین کے عین وسط میں واقع تھا۔ کسی نے کہا اس لیے کہ اس وقت حجاز خصوصاً اس کا یہ شہر تہذیبوں کا سنگم تھا یعنی اس کے ایک بازو میں مصری، رومی، یونانی تہذیب تھی اور دوسرے بازو میں کلدانی ایرانی اور ہندی تمدن، کسی نے کہا اس لیے کہ آج بھی دُنیا کے تین براعظموں ایشیا، یورپ اور افریقہ کا سراہ عین ساحل حجاز سے پھوٹتا ہے۔

بہرحال ام القریٰ مکہ کا نام ہے، حجاز کا دارالحکومت ہے اور یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر کی بنا ایک نوجوان پیغمبر حضرت اسماعیل کی ہجرت گاہ اور ایک دریتیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد ہے۔ سطح سمندر سے ۳۳۰ کیلومیٹر بلند ہے، چاروں طرف پہاڑیوں نے قدرتی دیواریں کھینچ دی ہیں۔

ومن حولہا سے مراد حضرت ابن عباس کی رائے میں تمام روئے زمین ہے اور مکہ کے لیے یہاں ام القریٰ کی تعبیر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے اور اب تو عبادت میں اس کی مرکزیت بالکل واضح اور صاف ہے۔ روئے زمین کے تمام مسلمان ام القریٰ کے اردگرد بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ یہ آیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالمگیر ہونے کی دلیل ہے۔ آپ زمین کے کسی خاص خطے یا کسی خاص قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ ساری دُنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری آیات میں بھی یہ بات کھول کر بتائی گئی۔

نبوت محمدیہ کی دوسری عملی دلیل

۱۱۴۔ اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جسے آخرت کی زندگی پر یقین اور بعدالموت کا خیال ہوگا۔ اسی کو ہدایت اور طریق نجات کی تلاش ہوگی وہی پیغام الٰہی کو قبول کرے گا اور نماز وغیرہ عبادات کی حفاظت کرے گا[1] یہ نبوتِ محمدیہ کی دوسری عملی دلیل ہے۔ یعنی جیسے آپ اپنی نبوت کی صداقت کے لیے علمی اعجاز قرآن کی صورت میں لے کر آئے اسی طرح اللہ نے آپ کو نبوت کی صداقت کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عملی اعجاز بھی عطا فرمایا، آپ کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دُنیا پرست اور خواہش نفس کے بندے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو آپ نے علم و عمل سے تیار کیا جن کی نظرِ حیات دُنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے۔ یعنی نبوّت کی قوت تاثیر اور فیض صحبت کا اثر ان پر یہ ہوا کہ ان پر اس زندگی کی کم مائیگی، بے حقیقی اور ناپائیداری اور اُخروی زندگی کی عظمت و ابدیت واضح ہو گئی اور یہ کہ آخرت ہی وہ اہم اور عظیم حقیقت ہے جس کے لیے مجاہدین جہاد کرتے ہیں اور اس فکر سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوا اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی میں ممتاز ہیں۔ کیا یہ خصوصیات اور یہ نتائج کسی ایسے شخص کی صحبت کے ہو سکتے ہیں جو جھوٹا ہو، ہرگز نہیں۔ زہد و تواضع، ایثار و ہمدردی، عدالت و شجاعت، حکمت و صداقت جیسے فضائل چھوڑ کر محافظت صلاۃ کا ذکر اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ ان کی پوری زندگی علی صفۃ الصلاۃ تھی۔ زندگی میں محافظت صلاۃ اور فکرِ آخرت کے بہترین اور مثالی نمونے صحابہ کرام کے حالات میں اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی مورخ و ادیب یا نفسیات و اخلاق کا کوئی عالم جمع کرے اور ان سے ایک جامع اور منفرد شخصیت تیار کرے تو انسانی سیرتوں میں ایک ممتاز ترین سیرت و شخصیت تیار ہو جاتے اور انسانیت کے عظیم مرقع اور انسانیت کی عالمی تاریخ کی جلوہ گاہ میں ایک حسین ترین پیکر کا اضافہ ہو جائے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِىَ اِلَىَّ وَلَمْ
يُوْحَ اِلَيْهِ شَىْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ
وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ
بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾
وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا
خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا
كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع ۴ (۱۱ / ۱۷)

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ بول کر افترا کرے ، یا کہے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے اور فی الواقع اس پر کوئی وحی نہیں آئی ، اور اس سے بھی جو کہے کہ میں بھی

ایسی وحی اتارتا ہوں جیسے خدا نے اتاری ہے[115]۔ اور اے پیغمبر وہ منظر بڑا حیرت انگیز ہوگا اگر ظالموں کو اس حالت میں دیکھو، جب وہ جانکنی کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں باہر نکالو[116]۔ آج وہ روز ہے کہ جو کچھ تم خدا پر تہمتیں باندھتے تھے اور اس کی آیتوں کے مقابلہ میں گھمنڈ کرتے تھے اس کی پاداش میں تمہیں رسوا کرنے والا عذاب دیا جائے گا[117]۔ اور پھر اللہ سبحانہ کا ارشاد ہوگا، کہ تم ہمارے حضور میں تن تنہا آئے ہو جس طرح تمہیں ہم نے پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا اور جو کچھ ساز و سامان ہم نے تمہیں دُنیا میں دیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو[118]۔ اور آج ہم تمہارے ساتھ ان ہستیوں کو نہیں دیکھتے ہیں جنہیں تم شفاعت کا

وسیلہ سمجھتے تھے اور جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ تمہارے
معاملات میں خدا کے شریک ہیں، تمہارے سارے رشتے ٹوٹ
گئے اور جو کچھ تم گمان کرتے تھے سب کے سب تم
سے ہوا ہو گئے۔[119]

ختم نبوت کمال نبوت کا لازمی نتیجہ ہے

اس آیت میں جھوٹے مدعیان نبوت کے لیے ایک عظیم وعید اور بہت بڑی تہدید ہے۔ پہلے چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کے لیے دو دلیلیں پیش کی تھیں۔ ایک علمی اور دوسری عملی، علمی قرآن عزیز ھذا کتاب انزلناہ مبارک اور عملی معاشرہ صحابہ والذین یومنون بالاخرۃ ان دو کے جلو میں جو نبوت آئی ہے وہ علم و عمل کا کمال لے کر آئی ہے۔ اس کمال کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کی ذات پر نبوت ختم ہو کیونکہ دین کے کمال اور نبوت کے تمام کے بعد دنیا کو نبوت کی ضرورت نہیں۔ اب انسانیت اپنے اس تنگ دائرے سے نکل چکی تھی، جس میں وہ متعدد تاریخی اسباب کی بنا پر صدیوں سے رہ رہی تھی۔ اب وہ علم و تمدن، باہمی تعارف، عالمی وحدت اور تسخیر کائنات کے مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی اور اس کی امید پیدا ہو گئی کہ وہ جغرافیائی تقسیم اور سیاسی اختلافات پر قابو حاصل کر سکے گی۔ قبیلہ، خاندان، قوم و وطن کے بجائے اب وہ کائنات وسیع انسانیت، عالمگیر ہدایت اور مشترک علم و فن کے مفہوم سے آشنا ہو رہی تھی۔ سارے قرآن اور شواہد بتا رہے تھے کہ اب انسانیت کی فلاح و سعادت اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بنیاد اس وحی پر رکھے جو خدا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو چکی اور اس عقیدے اور شریعت پر کاربند ہو۔ ان اصول و کلیات اور ان احکام و حدود کی پابند ہو جو اس آسمانی صحیفے نے عطا کی ہیں جو مبارک اور مصدق لما بین یدیہ اور اللہ کی آخری کتاب ہے۔

سلسلہ نبوت کے خاتمہ سے انسانی صلاحیتیں اور قوتیں اس خطرے سے محفوظ ہو گئیں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک نئے نبی یا دعوت کا ظہور ہو اور وہ سارے کام چھوڑ کر اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کرنے میں لگ جائیں۔ ختم نبوت قرآن کی مبارکیت اور مصدقیت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ جسے محمد رسول اللہ ساتھ لے کر تشریف لائے اور جو عقائد و قوانین اخلاقی و اجتماعی تعلیمات کے لحاظ سے ہر طرح اکمل اور ان صالح اور صحیح بنیادوں پر قائم تھا جن پر صالح معاشرہ اور صحت مند تہذیب قائم ہوتی ہے اور فرد اپنی مطلوبہ تکمیل اور معاشرہ معراج ترقی و کمال کو پہنچتا ہے۔

جو کسی نبی و نبوت کا مدعی یا داعی اور علمبردار ہے وہ نبوت محمدیہ اور قرآن کا بدترین دشمن اور اسلام کے بدخواہوں اور مخالفین کا بہترین معاون اور آلہ کار ہے اور قرآن عزیز کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں اس کا جرم ناقابل معافی ہے۔

گویا پہلی آیت میں اگر عموم بعثت کا ذکر تھا تو اس آیت میں ختم نبوت کا ذکر کر دیا گیا، تاکہ ہر دیکھنے والا نبوت محمدیہ کے دونوں امتیازات عموم بعثت اور ختم نبوت یکجا دیکھ لے۔

۱۱۵۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ بول کر افترا کرے یا کہے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے اور فی الواقع اس پر کوئی وحی نہیں آئی اور اس سے بھی جو کہے کہ میں بھی ایسی وحی اتارتا ہوں جیسے خدا نے اتاری ہے۔ خدا پر بہتان باندھنے سے شاید یہ مراد ہے کہ خدا کی طرف ان باتوں کی نسبت کرے جو اس کی شان رفیع کے لائق نہیں۔ مثلاً کسی شخص کو اس کا شریک ٹھہرائے یا بیوی بچے تجویز کرے یا یوں کہے ما انزل اللّٰہ علی بشر من شیئ یعنی اس نے بندوں کی ہدایت کا کوئی سامان نہیں کیا ایسا کہنے والا سخت ظالم ہے۔ اسی طرح جو شخص نبوت کا جھوٹا دعوی کرے یا یہ ڈینگ مارے کہ خدا کے جیسا کلام میں بھی لا سکتا ہوں جیسا کہ بعض مشرکین کہتے تھے لو نشاء لقلنا مثل ھذا۔ یہ سب باتیں انتہائی ظلم اور دیدہ دلیری کی ہیں جس کی سزا کا تھوڑا سا حال آگے مذکور ہے [1]

اس میں تین صورتیں بیان ہوئی ہیں:

پہلی یہ کہ نبوت ہی کا انکار کرے اور کہے کہ اللہ سبحانہ کسی بندے پر وحی نازل ہی نہیں کرتا ہے دوسری یہ کہ خود مدعی نبوت ہو کر سامنے آجائے اور کہے مجھ پر بھی وحی آتی ہے، تیسری یہ کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وحی الٰہی اور نبوت کا باقاعدہ مقابلہ کرے اور کہے کہ ایسا کلام تو میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ قرآن ان تینوں صورتوں کو صرف ظلم نہیں بلکہ اس کے مرتکب کو اظلم قرار دیتا ہے۔ یہاں افترار علی اللہ کذباً سے انکار وحی مراد ہے اگرچہ اس کے عموم میں اور بھی بہت سی چیزیں آسکتی ہیں لیکن موقعہ و محل کا تقاضا یہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جرم کی سنگینی میں یہ تینوں برابر ہیں منکرِ نبوت اور مدعی نبوت اور مقابلِ نبوت واقعی نبی کا انکار جیسے سنگین جرم ہے ایسے ہی جھوٹا دعویٰ نبوت بھی جرم ہے اور ان دو کی طرح یہ بھی سنگین جرم ہے کہ یہ کہہ کر نبوت کا استخفاف کرے کہ اس جیسی بات تو میں بنا سکتا ہوں۔

یہ دعویٰ کہ اللہ نے انسانی ہدایت کے لیے کسی انسان پر کوئی وحی نہیں اتاری ہے۔ یعنی انسان کو اس کارگاہ میں آزاد، خود مختار چھوڑ دیا ہے۔ خدا پر بہت بڑا الزام ہے اور اس کی صفات رحمت و ربوبیت کا انکار ہے یعنی جس پروردگار کی ربوبیت و رحمت نے جسم کی تربیت کا یہ تمام فیضان قائم کر رکھا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جسمانی پرورش و ہدایت کے لیے سب کچھ کرے لیکن روحانی تربیت کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہ ہو، جو شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے اور خدا کی طرف نسبت کر کے کہتا ہے وہ بلاشبہ افتراءً علی اللہ کذباً کا سنگین جرم کر رہا ہے ٹھیک اسی طرح وہ بھی ظالم ترین انسان ہے جو نبی نہیں ہے اور نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو جاتے۔ حافظ ابن تیمیہ نے آیت کے زور سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک شخص خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرا نبوت کا جھوٹا دعویٰ لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں زیادہ ظالم کون ہے فرمایا کہ مدعی نبوت زیادہ ظالم ہے کیونکہ خدائی کے بارے میں انسانیت دھوکا نہیں کھا سکتی ہے وہ جانتی ہے کہ مخلوق خالق نہیں ہو سکتا لیکن نبوت کے بارے میں دھوکا ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قرآن نے اس شخص کو بھی ظالم ترین انسان قرار دیا جو قرآن کے مقابلے میں یہ کہے کہ اس قسم کا کلام میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ علامہ جمالی نے اسی میں ان لوگوں کو بھی داخل کیا ہے جو اعجازِ قرآنی کا انکار کرتے ہیں۔

مرنے کے وقت کا سماں

۱۱۶۔ اور اے پیغمبر وہ منظر بڑا ہی حیرت انگیز ہوگا اگر تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھو کہ جب وہ جانکنی کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں باہر نکالو۔ یعنی موت کی باطنی اور روحانی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھائے ہوں گے اور مزید تشدد اور اظہارِ غیظ کے لیے کہہ

رہے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں جنھیں بہت دنوں سے بالنواع الحیل بچا رہے تھے[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ افتراً علی اللہ کذباً، نبوت و وحی کا جھوٹا دعویٰ اور نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کا اپنے فکر و فن سے دنیا میں مقابلہ کرتے ہیں وہ وقت بھی آنے والا ہے جب اس کی زندگی کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہو جائے گی۔ کتنا دردناک ہے؟ اس وقت صرف اس کے گزشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہو گی۔ ہر عمل کی صورت اس کے سامنے موجود ہو گی اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیں گی۔ ان آیات میں اسی وقت کا نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح کے جسم سے الگ ہونے کا منظر کیسا ہوتا ہے۔ اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

کچھ شارحین قرآن نے فرشتوں کے اخرجوا انفسکم کہنے کو تمثیلی مجاز کا پیمانہ قرار دیا ہے یعنی ملائکہ کا قبض روح کرنا اس قرض خواہ کے کردار سے مشابہ ہے جو قرض دار سے قرض مانگنے میں سنگین رویہ اختیار کرتا ہے اور کسی قسم کی کوئی مہلت نہیں دیتا، لیکن صاحبِ انتصاف اسے بے مروت بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملائکہ فی الواقع یہ اعمال کریں گے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

> کافر جب موت کے قریب ہوتا ہے تو فرشتے اس کو عذاب اور نکال، بیڑیوں، ہتھکڑیوں، جہنم، گرم پانی اور رحمان و رحیم کی ناراضگی کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ سن کر اس کی روح بدن میں بکھر کر رہ جاتی ہے اور نکلنے سے انکار کرتی ہے۔ فرشتے مارتے ہیں تا آنکہ روح کو جسم سے یہ کہہ کر نکال لیتے ہیں، اخرجوا انفسکم،

یہاں امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ فرشتوں کا اخرجوا انفسکم کہنا بطور امر نہیں بطور زجر و تعریض ہے۔ کافروں کے شدائدِ نزع کو اور بڑھانے کے لیے ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جان تو فرشتے نکال رہے ہوں گے، اپنی جان خود نکالنا انسان کا کام نہیں ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کی جان یا روح اس کے جسم سے الگ یا مغائر ہے۔

برزخ کا عذاب

۱۱۷۔ آج وہ روز ہے کہ جو کچھ تم خدا پر تہمتیں باندھتے تھے اور اس کی آیتوں کے مقابلہ میں گھمنڈ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتے تھے اس کی پاداش میں رُسوا کن عذاب دیا جائے گا۔ یعنی سخت تکلیف کے ساتھ ذلت و رُسوائی ہوگی[1] الیوم جس کے معنے آج کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں۔ اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے دیکھو فتح القدیر شوکانی تفسیر ابی السعود و تفسیر روح المعانی) اور کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد یوم الحساب ہے۔

آیت میں پہلے تینوں جرائم کے لیے یہاں جامع تعبیر قول علی اللہ بغیر الحق کی اختیار کی گئی ہے پہلی بات کہ اللہ نے انسان کی ہدایت روحانی کا کوئی سامان نہیں کیا، دوسری بات کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ اور تیسری بات کہ اپنی عقل اور رائے کو خدا کے نازل کردہ قانون کے مقابلہ میں پیش کرنا، تینوں قول علی اللہ بغیر الحق میں داخل ہیں، اور اس کے ساتھ دوسرا جرم بھی بیان کر دیا۔ وکنتم عن آیاتہ تستکبرون۔ استکبار کے لفظ میں اعراض کے معنے بھی ہیں، اسی لیے یہاں اس کا صلہ عن آیاتہ اللہ کی آیات سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ مہلک اعراض وہ ہے جس کا منشا غرور اور تکبر ہو، یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی وراثت ہے، دولت اور ریاست کے گھمنڈ میں انسان حق کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتا ہے۔ قریش مکہ کو بھی گھمنڈ تھا جس کا وہ مظاہرہ نبوت سے روگردانی کی صورت میں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری موجودگی میں عبدالمطلب کے یتیم کو نبوت کیوں ملی ہے مکہ یا طائف کے کسی حاکم کو کیوں نہیں ملی ہے۔ اسی کا نام استکبار ہے سب سے پہلے اس کا ظہور شیطان سے ہوا۔ اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو برتر سمجھا اور کہا کہ انا خیر منہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس جرم کی سزا دی ہے۔ اسی تکبر کی وجہ سے دولت مند لوگ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہو اور بازاروں میں چلتا ہو اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں اس میں وہ شامل ہوں۔

بارگاہِ الٰہی میں بے ساز و سامان پیشی

۱۱۸۔ اور پھر اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہو گا کہ تم ہمارے حضور میں تن تنہا آئے ہو جس طرح ہم نے پہلی بار تمہیں اکیلا پیدا کیا تھا اور جو کچھ ساز و سامان ہم نے تمہیں دُنیا میں دیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ

[1] افادات شیخ الاسلام

آتے ہو، یعنی نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی تہیدست چلے آرہے ہو اور جس ساز و سامان پر فخر و ناز تھا اسے ہمراہ نہیں لاتے کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ پہلی بات فرشتوں نے موت کے وقت کہی تھی، اب یہ ایک بالکل نئی بات ہے جو اللہ سبحانہ روزِ قیامت ان سے کہے گا۔ حافظ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے امام رازی کا یہ فرمانا کچھ درست نہیں کہ اس کا ماقبل پر عطف ہے۔ یہاں خلقناکم کا زور بتا رہا ہے کہ یہ بات روزِ قیامت میدانِ حشر میں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب ہمارے حضور میں متفرق ہو کر تن تنہا آتے ہو یا یہ کہ تم اپنے اہل و عیال، خاندان و رشتہ داروں اور انداد و اوثان کو چھوڑ کر اکیلے آئے ہو نہ تمہارے ساتھ کوئی پارٹی ہے نہ نوکر چاکر ہیں نہ اموال و املاک ہیں، ننگ و دھڑنگ ایسے آرہے ہو جیسے ہم نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا تھا۔ وترکتم ماخولناکم وراء ظھورکم، یعنی جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آتے ہو۔ یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ اُخروی ذمہ داری ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ وہ مال و متاع جس کے بھروسہ پر خدا کو چھوڑتا ہے، نبوت کی تکذیب کرتا ہے سب یہیں رہ جاتا ہے، اس میں سے کچھ بھی ساتھ نہ جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انبیاء کا نظریۂ آخرت صحیح ہے تو ہم بڑے سرمایہ دار ہیں وہاں بھی دے دلا کر کام بنا لیں گے۔ قرآن نے صاف کہہ دیا کہ وہاں یگانہ اور تنہا آؤ گے سامانِ دنیا میں سے کچھ بھی ساتھ نہ ہوگا۔ نبوت کی دعوت میں توحید کے بعد دوسری اہم چیز عقیدۂ آخرت کا اہتمام ہے۔ انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے ماننے اور چاہنے والوں میں اللہ کی رحمت کی امید اور طلب پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ اعمال کا تعلق آخرت کی جزا و سزا سے جوڑتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ یہ ایمان طاعت اور استغفار، اللہ کی رحمت کو جوش میں لاتے ہیں، روزی بکھیرتے ہیں اور بارش لاتے ہیں۔ لوگوں کو قحط اور عسرت سے بچاتے ہیں۔

بناوٹی رہنماؤں کی پیروی کا نتیجہ

۱۱۹۔ اور آج ہم تمہارے ساتھ ان ہستیوں کو نہیں دیکھتے ہیں جنہیں تم شفاعت کا وسیلہ سمجھتے تھے اور جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ تمہارے معاملات میں خدا کے شریک ہیں۔ تمہارے سارے رشتے ٹوٹ گئے اور جو کچھ تم گمان کرتے تھے سب کے سب ہوا ہو گئے۔ یعنی جن کو تم

لہ افادات شیخ الاسلام

سمجھتے تھے کہ اڑے وقت میں تمہارا ہاتھ بٹائیں اور مصیبت میں ساتھ ہوں گے وہ کہاں چلے گئے۔ آج ہم ان کو تمہاری سفارش اور حمایت پر نہیں دیکھتے۔ حمایت و نصرت کے وہ علاقے آج ٹوٹ گئے اور جو لمبے چوڑے دعوے تم کیا کرتے تھے سب رفو چکر ہو گئے[1] آیت میں شرکاء سے مراد وہ معبود، مطاع اور مقتدیٰ ہیں جن کو دنیا کی زندگی میں خدا کی ربوبیت اور الوہیت میں شریک سمجھتے تھے، قرآن کی یہ آیت اس باب میں فیصلہ کن ہے کہ مشرکین جن کو خدا کی عبادت میں شریک کرتے تھے وہ بے جان مجسمے، تصویریں اور بت نہ تھے، کیونکہ بے جان چیزوں کے شفیع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی با ہوش انسان اس کو باور نہیں کر سکتا کہ کسی عقل مند نے کبھی محض اینٹ اور پتھر کی عبادت کی ہو۔ یہ جو کچھ بھی ہوا پیغمبروں، بزرگوں، جنوں اور دیگر باعزت اور ذی مرتبہ مخلوق ہی کے نام پر ہوا۔ کسی کا مجسمہ قبلہ توجہ سمجھا گیا تو کسی کا فوٹو، کسی کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ کو متبرک سمجھ کر اس کی پرستش کی گئی، کہیں کسی کی قبر کو قاضی الحاجات سمجھا گیا۔ شرک کی ابتداء ہی بزرگوں اور خدا رسیدہ انسانوں کی قبروں، ان کی عبادت گاہوں اور نشست و برخاست کی جگہوں سے ہوئی ہے میر سید شریف جرجانی نے شرح مواقف میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے:۔

بت پرست دو واجب الوجود الہٰوں کے قائل نہیں ہیں اور نہ وہ اوثان کو صفاتِ الوہیت سے موصوف مانتے ہیں اگرچہ وہ ان کو الٰہ کہتے ہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے، کہ انہوں نے انبیاء، اولیاء، فرشتوں اور ستاروں کی تماثیل بنا رکھی تھیں اور عابدانہ طور پر ان کی ہی تعظیم و تکریم کرتے تھے تاکہ ان کے ذریعے سے وہ الٰہ حقیقی تک رسائی حاصل کر سکیں۔

اور امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

ان مشرکوں نے اصنام اور اوثان اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی صورتوں پر بنا رکھے تھے اور انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ اب ان کی تصاویر اور تماثیل کی عبادت کرتے ہیں تو یہ بزرگ ان سے خوش ہوتے ہیں اور ان کے حق میں اللہ کی بارگاہ میں سفارش کرتے ہیں۔ اور اس کی نظیر اس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی اس عقیدت سے دب کر تعظیم کرتے ہیں کہ اس طرح یہ بزرگ ان کی اللہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی بارگاہ میں سفارش کریں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۱۴ ص ۸۱)

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں :

مشرکین اور مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بڑے بڑے کاموں کی تدبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے اور ایسے ہی وہ کام بھی جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پختہ فیصلہ فرما دیا ہے اس نے ان میں کسی کو اختیار نہیں دیا لیکن تمام امور میں مشرکوں کا مسلمانوں سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کا شرک میں مذہب یہ ہے کہ ان سے پہلے خدا کے جو نیک بندے گزرے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے اور اللہ کا تقرب حاصل کیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر ان کو الوہیت اور حاجت روائی کا عہدہ دے دیا ہے لہٰذا وہ بھی عبادت کے مستحق ہیں۔ اور مشرکین کا یہ خیال بھی ہے کہ وہ بزرگ سنتے بھی ہیں دیکھتے بھی ہیں اور اپنی عبادت کرنے والوں کی سفارش بھی کرتے ہیں۔ ان کے کاموں کو بناتے اور بگاڑتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان ہی نیکو کاروں پر مشرکین نے پتھروں کے بت اور ان بتوں کو اصل شخصیتوں کی طرف توجہ کیلیے قبلہ بنایا ہے۔

قرآن نے ان ہی شرکاء کے بارے میں یہاں یہ انکشاف کیا ہے لقد تقطع بینکم کہ ان کے باہمی رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ عابد اور معبود کے درمیان جو روابط تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے اور ان کے تراشیدہ رشتوں میں سے کوئی رشتہ وہاں قائم نہ رہے گا یعنی مشرکین کے جتنے بھی شرکاء سے تعلقات ہیں یہ سب اسی دنیا تک محدود ہیں۔ آخرت میں جو حقائق کے مشاہدے و معائنہ کا وقت ہو گا سب ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ
الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ
الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ
ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ
لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ
يَعْلَمُونَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ
وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِي
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ
خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ
دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ۗ انْظُرُوا إِلَىٰ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكُمْ
لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٩٩﴾

بلاشبہ اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، وہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور وہی مُردے کو زندہ سے نکال رہا ہے یہ سارے کام اللہ کر رہا ہے پھر تم کدھر بہکے جارہے ہو[120]۔ سپیدہ صبح کو وہی نکالتا ہے رات کو سکون اسی نے بنایا ہے اور چاند اور سورج کو حساب کے لیے اسی نے مقرر کیا ہے، یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے[121]۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا، بلاشبہ ہم نے علم والوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں[122]۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر ہر کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک جائے امانت ہے، یہ نشانیاں ہم نے سمجھ بوجھ والوں کے لیے واضح کر دی ہیں[123]۔

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے ہر قسم کے نباتات اگائے پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کیے پھر ان سے تہ بر تہ چڑھا ہوا غلہ نکالا، اور کھجور کے شگوفے سے پھلوں کے جھکے ہوتے گچھے پیدا کیے اور انگور، زیتون اور انار کے باغ بنائے جو باہم ملتے جلتے ہیں اور الگ الگ بھی درختوں کے پھل لگنے اور پکنے پر غور کی نظر ڈالو، بلاشبہ ان میں ایمان والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔[۱۲۴]

منکرینِ وحی و تنزیل کا تحقیقی جواب

لوگوں کا وحی کے موضوع پر انکار ان لفظوں میں نقل کیا تھا کہ ما قدروا اللّٰہ الخ اللہ کی خدائی کا جو اندازہ کرنا چاہیے تھا وہ انھوں نے نہیں کیا۔ یعنی اگر خدا کی صفات و اعمال کی انھیں معرفت ہوتی تو کبھی ایسا خیال نہ کرتے یہ مجمل جواب تھا۔ اب یہاں اسی اجمال کی تشریح کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جس پروردگار عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ حال ہے کہ اس نے تمہاری زندگی و معیشت کے لیے ہر طرح کا سر و سامان مہیا کر دیا اور کارخانہ خلقت کی کوئی چیز نہیں جو فیضان اور افادہ نہ رکھتی ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ تمہارے جسم کی ہدایت و پرورش کے لیے تو سب کچھ کر دیتا مگر تمہاری روح کی ہدایت و پرورش کے لیے

کچھ بھی نہ کرتا۔

رُوح کی ہدایت و پرورش کا یہی سامان ہے جو وحی و تنزیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اگر تم کہتے ہو کہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے تو یقیناً تم نے خدا کی صنعتوں اور کاموں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اسے اس منزلت سے گرا دینا چاہا جس کی تمام کائنات ہستی شہادت دے رہی ہے۔

جو زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے کیا تمہاری رُوح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دے گا؟ جو ستاروں کی روشن علامتوں سے بیابانوں اور سمندروں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے کیا تمہاری رُوح کو چھوڑ دے گا کہ بھٹکتی پھرے اور اس کی رہنمائی کے لیے کوئی روشنی نہ ہو۔ تم اس بات پر تو کبھی حیران نہیں ہوتے کہ کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان سے باران رحمت برس رہی ہے لیکن اس پر تمہیں تعجب ہوتا ہے کہ انسان کی روحانی پرورش کے لیے سامان زندگی مہیا ہے اور خدا کی وحی نازل ہو رہی ہے افسوس کہ تم نے ایسا سمجھ کر خدا کی رحمت و ربوبیت کی بڑی ہی ناقدری کی ہے[1]

۱۲۰۔ بلاشبہ اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے وہی زندہ کو مُردے سے نکالتا ہے اور وہی مُردے کو زندے سے نکال رہا ہے یہ سارے کام اللہ کر رہا ہے پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو یعنی زمین میں دبائے جانے کے بعد گٹھلی اور دانہ کو پھاڑ کر سبز پودا اگانا یا جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنا مثلاً آدمی کو نطفہ سے نطفہ کو آدمی سے پیدا کرنا اسی خدا کا کام ہے پھر اسے چھوڑ کر تم کدھر بہکے جا رہے ہو کیا اور کوئی ہستی تمہیں ایسی مل سکتی ہے جو ان کاموں کو انجام دے سکے ہے[2]

یہاں سے اس بات کا تحقیقی جواب دیا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہ نے انسان کو ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم رکھا ہے اور اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی ہے فرمایا کہ جسم کی پروردگاری کی حد تک اس کے نظامِ ربوبیت پر غور کرو کہ چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی کو پھاڑ کر کلی نکالے پھر ان کو پودے اور درخت بنائے اور پھر ان کی پرورش کے لیے زمین و آسمان، ابر و ہوا، گرمی اور سردی، خزاں اور بہار سب کو حکم دیتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ آگے فرمایا کہ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی، بے جان چیز سے زندگی کی نمائش اور پھر زندگی پر فنا کا مشاہدہ اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہر روز

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

ہو رہا ہے۔ نطفہ سے آدمی اور آدمی سے نطفہ کی مثال تو عام زبان زد خلائق ہے لیکن اس بلیغ فقرے کی معنویت اس سے زیادہ گہری ہے۔ یہ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کی بے جان دانہ سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی سرسبز و شاداب درخت پر زردی اور مردنی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی کا مشاہدہ انسانوں اور حیوانوں میں ہو رہا ہے یہاں تک کہ قوموں، امتوں، اور ملتوں میں موت و حیات کی بھی داستان برابر دھرائی جا رہی ہے۔ اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا یہ کمال ہے کہ ہر دانہ اور گٹھلی کے لیے کارسازی اور زندگی و موت کا ایک جامع منصوبہ رکھتی ہے اور یہ تمام کام اللہ ہی کر رہا ہے تو پھر یہ کہنا کہ عالم انسانیت کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے، عقل سے محرومی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ عقل کا اندھاپن اور بہکنا نہیں اور کیا ہے۔

اس موقعہ پر اگرچہ دوسرے شارحین قرآن نے ان آیات کو دلائل توحید قرار دیا ہے۔ یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر و اعتبار سے مختلف حیثیت رکھتی ہے اسی طرح قرآنی آیات کا استشہاد بھی بیک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے، البتہ خصوصیت کے ساتھ زور کسی خاص پہلو کے لیے ہوتا ہے۔ ان آیات کا سیاق و سباق بتلا رہا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ نظام ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت کے استدلال پر دی گئی ہے ورنہ اسی نظام ربوبیت سے توحید عبادت پر بھی استدلال ہو سکتا ہے اور اسی سے وجود معاد پر بھی قرآن میں استدلال ہوا ہے۔

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

۱۲۱۔ سپیدہ صبح کو وہی نکالتا ہے، رات کا سکون اسی نے بنایا ہے۔ سورج اور چاند کو حساب کے لیے اسی نے مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔ یعنی رات کی تاریکی میں سے جو پہلی پھٹ کر صبح صادق نمودار ہوتی ہے اس کا نکالنے والا بھی اللہ ہے اور رات دن اور چاند سورج کا جو حکیمانہ نظام اور ان کی رفتار کا جو حساب اللہ نے مقرر فرمایا ہے اس میں بھی ذرا تخلف یا کم و بیش نہیں[1] مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے جسم انسانی کی پروردگاری کے لیے زمین میں یہ کارسازی فرما رکھی ہے۔ ذرا نگاہ اٹھا کر اس کی شان ربوبیت کا آسمان میں تماشا دیکھو، وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر رہا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی طرح پردہ شب کو چاک کر کے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔ وجعل اللیل سکنا کہ اللہ سبحانہ نے تمہاری رات کو سکون بخش اور کلفت کو دور کرنے والی بنایا ہے۔ تم اس میں دن بھر کی تھکاوٹ دور کرتے ہو اور تمہارے قویٰ اور اعصاب اس میں از سر نو میدان عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ سکون کی تعبیر رات کے لیے اختیار فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ رات کے بعد صبح اس لیے آتی ہے کہ اس میں طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جدّ و جہد کر سکو۔ اور اصباح ولیل کے باہمی تقابل سے شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں بھی بتا دی ہیں اور اشارہ کر دیا کہ لیل و نہار کی یہ تبدیلی زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دل بستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر لیل و نہار کا یہ اختلاف نہ ہوتا تو دنیا میں زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ اگر تم کبھی قطب شمالی اور قطب جنوبی میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف نہیں ہے تو معلوم ہو جائے کہ رات دن کا اختلاف گزران کے لیے کیسی عظیم الشان نعمت ہے۔ رات دن کے اختلاف نے زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ دن کی روشنی جدّ و جہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھا دیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی شروع ہو جاتی ہے۔

منشا یہ ہے کہ رات دن اور صبح و شام کی اس نوعیت پر غور کرو، کیا تمہاری یہ عقل باور کرتی ہے کہ جو ذات گرامی تمہارے جسم کی نشو و نما کے لیے یہ اہتمام کر رہی ہے اس کے پاس تمہاری روح کی پرورد گاری کے لیے کوئی سامان نہیں ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھاؤ دن رات کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں کو دیکھو والشمس والقمر حسبانا ان کے لیے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ ہے اس سے وہ سر مو تجاوز نہیں کر سکتے۔ انہی سے دن، مہینے، سال معین ہوتے ہیں، ان ہی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ ان پر غور کرو یہ تمام نظام اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کوئی بات بغیر حکمت و مصلحت کے نہیں ہے۔ سورج کو دیکھو جس کی درخشندگی سے تمام ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں، چاند کو دیکھو جس کی گردش تمہارے لیے ماہ و سال بتا رہی ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو بتاؤ کیسے ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی عزیز و علیم کی جانب سے ہے۔ کیا ممکن ہے کہ اللہ کی صفت علم تمہاری جسمانی ربوبیت کے لیے سب کچھ کرے لیکن اس کی یہی صفت تمہاری روحانی پرورش و ہدایت کا کوئی سامان نہ کرے۔ خدا کی وحی

نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو رہی ہے۔ اگر تمہیں اس پر تعجب ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کی صفت عزت اور علم کو اس طرح نہیں مانا جس طرح اسے ماننا چاہیے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آ جاتی ہے کہ وہ ایک انسان کی پرورش کے لیے یہ پورا کارخانہ حیات سرگرم رکھے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے وحی نازل کرے۔

ستاروں کی خدمت گزاری

۱۲۲- اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا، بلاشبہ ہم نے علم والوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ یعنی بلا واسطہ ان سے راستہ معلوم کر دیا یا بالواسطہ، مثلاً قطب نما کے ذریعے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انتظامات کیے کیا وہ تمہاری روحانی و اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری روحانی ہدایت و سعادت کا کوئی انتظام نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ مادی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی روحانی زندگی میں بھٹکنے کے نقصان سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس رب رحیم کو ہماری مادی فلاح کی اتنی فکر ہے کہ صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سمتِ سفر بتانے کے لیے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کیسے عقل باور کر سکتی ہے کہ اس نے ہماری اخلاقی و روحانی سعادت کے لیے کوئی سامان نہ کیا ہوگا اور اسے صاف صاف دکھانے کے لیے کوئی سراج منیر روشن نہ کیا ہوگا۔

اس کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ ستارے اللہ نے تمہاری خدمت گزاری کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ اب یہ کیسی بے خبری ہے کہ ستارے خود تو اپنے سے بتا رہے ہیں کہ ان کے خالق نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک کر کے ان کی عبادت کرنے لگو۔ یہ خود اپنی خدمت گزاری سے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے۔ اس لیے خدا کی ہی عبادت کرنی چاہیے نہ کہ ان ستاروں کی، ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش سے ہوتا ہے۔ یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پیدا ہوا تھا۔ اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں فلک کج رفتار جیسی تلمیحات نے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔

جنم لیا ہے۔ اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو بچھتر کی طرف منسوب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں بچھتر کی وجہ سے بارش ہوئی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو برکت بھی آسمان سے نازل فرماتا ہے لوگوں میں ایک نہ ایک فریق اس کا منکر ہو جاتا ہے۔ کتنا ظلم ہے کہ بارش تو خدا کرے اور لوگ یہ کہیں کہ فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ جب کوئی جماعت کسی مخلوق میں حقیقی یا خلاف واقعہ تاثیر کا اعتقاد رکھتی ہے وہاں اسلامی قانون اپنا لب و لہجہ تردید میں سخت کر دیتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ستاروں کے متعلق عرب کے معتقدات کا سرچشمہ ان کے اوہام تھے۔ وہ ستاروں کو بہت سے حوادث میں اسی طرح موثر سمجھتے تھے جیسا کہ آج بہت ضعیف الاعتقاد مسلمان بزرگوں کی قبروں کو سمجھ لیتے ہیں اور تاثیر بھی ایسی جو محض ان کے دماغوں کی تراشیدہ اور صرف وہمی ہوتی ہے۔ قرآن نے عالم اسباب اشیائے کے اسباب خود مقرر کیے ہیں لیکن اس سے روکا ہے کہ غیر سبب کو سبب یا سبب کو بڑھا کر مؤثر حقیقی کے برابر کر دیا جائے۔ قرآن کی توحید اس رخنہ اندازی کو برداشت نہیں کرتی ہے کہ کوئی شخص کائنات کے اندر ایک ذرے کی جنبش میں بھی اللہ کی قدرت و قوت کے سوا کسی اور کو شریک سمجھے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسی کی مخلوق ہے اور اسی کی قدرت سے حرکت کرتا ہے۔

آخر میں فرمایا قد فصلنا الآیات لقوم یعلمون آیات سے مراد آیات تکوین ہو یا آیات تنزیل دونوں کا حاصل ایک ہے۔ اگر آیات سے مراد آیات تکوین ہوں یعنی دلائل تو مطلب یہ ہے کہ ان دلائل کو ہم نے اہل علم کے لیے کھول کر پیش کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کی اس حقیقت تک رسائی ہو سکے کہ اس اسباب کی اس کائنات میں علت موثرہ اللہ کا ارادہ ہے اور اگر آیات سے مراد آیات تنزیل ہوں تو مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کو ہم نے کھول کر اس لیے بیان کیا ہے کہ ان سے اہل علم عبرت حاصل کریں۔

عالم انفس میں شہادت

۱۲۳- اور وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ ہے پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار اور ایک جائے امانت ہے، یہ نشانیاں ہم نے سمجھ بوجھ والوں کے لیے واضح کر دی ہیں۔ یعنی حضرت آدم سے پیدا کیا، مستقر یعنی ٹھہرنے کی جگہ جسے ٹھکانا کہا اور مستودع سپرد کیے جانے اور امانت کی

جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ تو لغوی معنے ہوتے آگے دونوں کے مصداق کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم کو پسند ہے یعنی اوّل سپرد ہوتا ہے ماں کے پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دُنیا کے اثر پیدا کرے، پھر اگر ٹھہرتا ہے دنیا میں اور پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے پھر جا ٹھہرے گا جنت میں یا دوزخ میں[1] مطلب یہ ہے کہ وہی ایک خدا ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور نسل انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ ایک جان سے مراد حضرت آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسل انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ مستقر کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور مستودع اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی بطور امانت رکھی جائے۔ کچھ قراء نے مستقر کو قاف کے زیر سے پڑھا ہے اور کچھ نے قاف کو زبر دے کر پڑھا ہے۔ یہاں مستقر سے کیا مراد ہے عام شارحین قرآن نے عبداللہ بن عباس کی رائے کو اپنایا ہے کہ مستقر ماں کا رحم ہے اور مستودع باپ کی پیٹھ ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مستقر رحم مادر ہے اور مستودع زمین ہے عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ مستقر دنیا ہے اور مستودع آخرت ہے اور عبداللہ بن مسعود ہی سے یہ بھی منسوب ہے کہ مستقر رحم مادر ہے اور مستودع قبر ہے۔ الغرض اس موضوع پر ایک سے زیادہ خیالات ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے یہاں یہ بات خوب فرمائی ہے کہ مستقر دو ہیں اور مستودع بھی دو ہیں۔ مستقر اوّل دُنیا ہے اور پھر آخرت میں جنت و دوزخ ہے اور مستودع اوّل ماں کا پیٹ ہے اور پھر قبر کا پیٹ ہے۔ ماں کے پیٹ میں رہ کر عالمِ دُنیا میں یعنی مستقر میں آنے کی تیاری کرتا ہے اور قبر کے پیٹ میں رہ کر آخرت میں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا ہے ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین۔ مستودع سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دُنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا یہ جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دُنیا میں اس کی مدتِ حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کرتا ہے اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہوگا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخر میں فرمایا قد فصلنا الایات لقوم یفقھون یعنی ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں۔ پہلی آیت کے آخر میں یعلمون اور یہاں یفقھون فرمایا ہے علم اور فقہ میں فرق ہے۔ علم عقل کا فعل ہے جبکہ فقہ دل کا کام ہے جسے ہم اردو میں تہ کو پہنچ جانا اور مغز سخن کو تاڑ جانا کہتے ہیں وہ ہی عربی میں فقہ ہے۔ یعنی بات کی گہرائی تک پہنچ جانا فقہ ہے۔ اگر کوئی صرف ظاہر کلام کو اور مظاہر اشیاء کو جانتا ہے وہ عالم تو ہے لیکن فقیہ نہیں ہے۔ اسلام میں قانون کے علم کو فقہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ آیات کی گہرائیوں میں جا کر اور غواصی کر کے دقائق تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ یہاں ستاروں کا معاملہ دید سے متعلق ہے اور ان کے ذریعے راستہ معلوم کرنے کا تعلق ظواہر سے ہے اس میں دقت نظر کی چنداں حاجت نہیں ہے اس لیے پہلی آیت کا انجام یعلمون پر فرمایا اور دوسری آیت میں نفس واحدہ سے نسل انسانی کے وجود میں آنے اور اس کے مختلف احوال کا ذکر ہے اس زیادہ لطافت اور کاریگری و تدبیری میں زیادہ دقت نظر ہے اس لیے اس کا خاتمہ یفقھون پر فرمایا۔ شارحین قرآن میں سے یہ بات علامہ زمخشری نے سمجھی ہے۔

نظام ربوبیّت کی کارسازی

۱۲۴۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے ہر قسم کے نباتات اگائے پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کیے پھر ان سے تہ بر تہ چڑھا ہوا غلہ نکالا اور کھجور کے شگوفے سے پھلوں کے جھکے ہوئے گچھے پیدا کیے اور انگور، زیتون اور انار کے باغ بنائے جو باہم ملتے جلتے ہیں۔ اور الگ الگ بھی درختوں کے پھل لگنے اور پکنے پر غور و فکر کی نظر ڈالو۔ بلا شبہ ان میں ایمان والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ آسمان سے بارش سبب ہے نباتات کی روئیدگی کا متشابہا غیر متشابہ یعنی صورت و شکل، مقدار و رنگ، بو اور مزہ کے اعتبار سے بعض پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں۔ اذا اثمر وینعہ یعنی جب ابتداءً پھل آتا ہے تو کچا بد مزہ اور ناقابل انتفاع ہوتا ہے، پھر پکنے کے بعد کیسا لذیذ، خوش ذائقہ اور کارآمد بن جاتا ہے۔ یہ سب خدا کی قدرت کا ظہور ہے۔

اس رکوع میں حق تعالیٰ کے جن افعال و صفات اور مظاہر قدرت کا بیان ہوا ان سے خدا کے وجود، وحدانیت اور کامل الصفات ہونے پر استدلال تو واضح ہے لیکن غور کیا جائے تو وحی و نبوت کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے کیونکہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہماری

دنیوی زندگی اور مادی حوائج کے انتظام و انصرام کے لیے اس قدر اسباب ارضی و سماوی مہیا فرماتے ہیں تو یہ کہنا کس قدر لغو اور مہمل ہوگا کہ ہماری حیات اخروی اور روحانی ضروریات کے انجام پانے کا اس نے کوئی سامان نہیں کیا۔ یقیناً جس رب کریم نے ہماری جسمانی غذاؤں کے نشوونما کے لیے آسمان سے پانی اتارا ہے ہمارے روحانی تغذیہ کے لیے اسی نے سحاب ہائے نبوت سے وحی والہام کی بارش نازل فرمائی ہے۔ جب وہ بحر و بر کے اندھیروں میں ستاروں کے ذریعے ظاہری رہنمائی کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ باطنی رہنمائی کے لیے اس نے ایک ستارہ بھی آسمان روحانیت پر روشن نہ کیا ہو۔ رات کی تاریکی کے بعد اس نے صبح صادق کا اجالا کیا اور مخلوق کو موقع دیا کہ وہ اپنے دنیوی کاروبار میں چاند سورج کی روشنی سے ایک معین حساب کے تحت منتفع و مستفید ہوتی رہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کفر و شرک، ظلم و عدوان اور فسق و فجور کی تاریک رات میں اس کی طرف سے کوئی چاند نہ چمکا، نہ صبح صادق کا نور پھیلا نہ رات ختم ہوئی کوئی آفتاب طلوع ہوا، خدا کی ساری مخلوق ابدالآباد کے لیے جہل و ضلالت کی اٹاٹوپ اندھیری میں پڑی چھوڑ دی گئی۔ کیا گیہوں کے دانے اور کھجور کی گٹھلی کو پھاڑ کر خداوند قدوس سرسبز درخت اگاتا ہے مگر انسان کے دل میں معرفت ربانی کی استعداد کا جو بیج فطرۃً بکھیرا گیا تھا وہ یوں ہی بیکار ضائع ہو جاتا ہے کہ نہ ابھرے نہ پھلے نہ پکے اور نہ تیار ہو۔ اگر جسمانی حیثیت سے اس دنیا میں حیات و موت کا سلسلہ قائم ہے۔ خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا رہتا ہے تو روحانی نظام میں خدا کی اس عادت کا کیوں انکار کیا جائے۔ بلاشبہ وہ روحانی طور پر بھی وہ بہت دفعہ ایک زندہ قوم سے مردہ قوم اور مردہ قوم سے زندہ افراد پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح اس نے ہماری دنیوی زندگی کے مستقر و مستودع کا حکیمانہ بندوبست کیا ہے۔ حیات اخروی کے لیے مستقر و مستودع کا سامان اس سے کہیں بڑھ کر کیا ہے فلہ الحمد والمنۃ وبہ الثقۃ والعصمۃ

یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح ہم خدا تعالیٰ کو اس کے کاموں سے پہچانتے ہیں یعنی جو کام وہ اپنی قدرت کاملہ سے کرتا ہے کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ ویسا کام کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے کلام کو بھی ہم اسی معیار پر جانچ سکتے ہیں۔ کہ خدا کا کلام وہی ہو سکتا ہے کہ اس جیسا کلام ساری مخلوق بھی مل کر نہ بنا سکے۔ پھر ساُنزل مثل ما انزل اللّٰہ کا دعویٰ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے گویا اس رکوع میں حق تعالیٰ کی صفات و افعال بیان کر کے ان تمام مسائل کی حقیقت پر متنبہ کر دیا جن کی تغلیط گزشتہ رکوع میں کی گئی تھی [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب بھی ودیعت فرمائی ہے اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا۔ بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کیے ذوق نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہماری مادی ضرورتوں کا اس سیر چشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے۔ ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ دے جو خود اس نے ہماری روح اور ہمارے دلوں میں اپنی ہدایت کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ عقل یہ باور ہی نہیں کرتی ہے کہ ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے تو غذا اور پانی فراہم کیا جائے اور ہماری روحانی تشنگی کے بجھانے کا کوئی سامان نہ ہو۔

اسی کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے زیر نظر آیت میں ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آسکتے ہیں بشرطیکہ دل کے دروازے ایمان کے لیے کھلے ہوتے ہوں۔ اسی لیے آخر میں فرمایا ہے ان فی ذالك لآیات لقوم یومنون۔

سب سے پہلے ربوبیت عامہ کا انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ نبات کل شیئ کہہ کر ذکر کیا ہے۔ اس کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا حال یہ ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک طرف سے آنکھ بند کرے لیکن اپنی شب و روز کی اس سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے۔ نباتات کو دیکھو، ربوبیت عامہ کے بعد ربوبیت خاصہ کا ذکر کیا کہ فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حبا متراکبا) فرمایا کہ ان ہی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے ہم سبز خوشے اور بالیں نکالتے ہیں۔ اور اپنی قدرت سے تر بہ تہ دانے جما دیتے ہیں۔ سوچو گیہوں کا ایک دانہ ہے، اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ وجود میں آسکتا تھا اگر تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ ہوتا۔

اس کے بعد پھلوں کا ذکر فرمایا ومن النخل من طلعھا الخ کھجور سے پھل کی کیونکہ اسے اہل عرب میں عام پھل کی حیثیت حاصل تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا کہ اس کے درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکتے ہوتے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا ہر چیز کی طرف توجہ

دلاتی ہے تاکہ اس کاریگری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے ۔

کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر کیا ہے والزیتون والرمان الخ ان پھلوں کا ذکر صرف اس لیے ہوا کہ یہ اہل عرب میں مشہور پھل تھے ۔ اصل میں یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا ہے تو اس میں صرف روٹی نہیں ہے بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں ۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ جو دیے ہیں تو اس میں بھی اپنی رحمت کی یہ شان دکھاتی ہے کہ ایک ایک چیز گونا گوں اور اقسام و انواع کی ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی اور باہم دگر شکل و صورت، رنگ قامت اور ذائقہ میں مختلف بھی تمہارے لیے مہیا کی ہے

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر ان ہی صفات سے اپنے ظاہر و باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبہ شکر و سپاس کو پیدا کرے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت کیا ہے ۔

پھر فرمایا انظروا الیٰ ثمرہ اذا اثمر و ینعہ یعنی ان میں سے ہر چیز کو لے کر اس کے پھلنے سے لے کر اس کے پکنے تک کے ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو اللہ سبحانہ کی قدرت، حکمت، ربوبیت فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اس قدر شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار بھی نہ کر سکو گے ۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ
عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ع ۱۳ ۱۸
اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ
وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ
شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫
وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

اور لوگوں نے خدا کے ساتھ عبادت میں جنوں کو شریک ٹھہرا لیا ہے حالانکہ جنوں کو اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے[125]۔ اور انہوں نے بغیر علم کے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی ہیں، خدا کی ذات پاک ہے اور اللہ کی ذات ان تمام باتوں سے برتر و بلند ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں[126]۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا بغیر نمونہ کے بنانے والا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے

بیٹا ہو جبکہ اس کی بیوی نہیں ہے اسی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[127] یہی خدا تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا اسی سے عابدانہ تعلقات قائم کرو، ہر چیز کا وہی نگران اور کارساز ہے۔[128] اسے نگاہیں نہیں پا سکتی ہیں اور وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے، وہ بہت ہی لطیف اور باخبر ہے۔[129]

مشرکانہ عقائد کا رد

یوں تو کفر کی ہر قسم انسانیت کے لیے سب سے بدنما داغ ہے لیکن اس کی جو قسم سب سے بدتر ہے وہ شرک ہے یعنی خدا تعالیٰ کی ذات صفات لوازم صفات عبادت اور اس کی حدودِ عظمت میں کسی کو شریک کرنا، اللہ سبحانہ، نے ہر شخص کی فطرت کو شرک کی ہر آلودگی سے پاک وصاف بنایا ہے۔ اپنے کو شرک کی سنجاست سے ملوث کرنے کا مجرم انسان خود ہے۔ پروردگار عالم نے تخلیق عالم سے پہلے یہ طے کر دیا ہے کہ اس کی بارگاہ میں ہر کوتاہی و لغزش قابل معافی ہو سکتی ہے مگر شرک کا جرم ہرگز قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ شرک اللہ سبحانہ، پر سب سے بڑا افترا ہے۔ سب سے بڑھ کر بے دلیل بات اور نفس انسانی کے لیے ایک ابدی موت ہے۔ شرک انسانی فطرت سے تخم سعادت کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور اس کی روحانی ترقی کی تمام استعدادیں باطل کر دیتا ہے

شدہ شدہ اس کی فطرت کا یہ استعدادی فقدان اس کے حواس ظاہرہ کو بھی تماماتر کر دیتا ہے کہ پوری صحت و سلامتی کے باوجود اپنے فطری احساس سے بھی یکسر معریٰ اور معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کی اس حالت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

لہم قلوب لا یفقہون بہا و لہم اعین لا یبصرون بہا ولہم آذان لا یسمعون بہا اولٰئک کالانعام بل ہم اضل اولٰئک ہم الغافلون۔

ان کے پاس عقلیں ہیں مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔

چونکہ ان کے حواس ظاہرہ کا یہ تعطل ان کی قلبی استعداد کے فقدان سے شروع ہوتا ہے اسی لیے آیت میں سب سے پہلے ان کی قلبی موت اور قلبی بے حسی کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۵۔ اور لوگوں نے عبادت میں خدا کے ساتھ جنوں کو شریک ٹھہرا لیا ہے حالانکہ جنوں کو اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے۔ یا تو جن سے مراد یہاں شیاطین ہیں، چونکہ کفر و شرک کا ارتکاب شیطان کے اغوائے سے ہوتا ہے اس لیے اس کے اغواء اور اضلال سے غیر اللہ کی عبادت کرنا گویا اس کی عبادت ہوئی، ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کا رد کرتے ہوئے فرمایا یا ابت لا تعبد الشیطان دوسری جگہ ارشاد ہے؛

الم اعہد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیطان

اے اولاد آدم کیا ہم نے تم سے کہہ نہ دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو

فرشتے قیامت میں کہیں گے:

سبحانک انت ولینا من دونہم بل کانوا یعبدون الجن

تو پاک ہے تو ہی ہمارا کارساز ہے نہ کہ وہ بلکہ یہ جنات کی عبادت کرتے تھے۔

اور یا جن سے مراد قوم جن لی جائے، جن کے بعض سرداروں سے اہل جاہلیت استعانت کیا کرتے تھے۔ بہرحال وہ ہماری طرح خدا کی عاجز مخلوق ہے، پھر مخلوق ہو کر خالق کا شریک کیسے ہو سکتا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اہل عرب فرشتوں کی طرح جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کا ان سے رشتہ قائم کرتے تھے و جعلوا بینہ، و بین الجنۃ نسبا"، اسی لیے وہ جنات کو خدا کی عبادت میں شریک کرتے تھے، چنانچہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کو بھی پوجتے تھے۔ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے۔ قرآن میں انہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوھم رھقا" اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا۔ چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام پر قربانیاں ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور پر جنوں کی پوجا کرتی تھی۔ جن اور شیطان کی نسبت اہل عرب کے عجیب عجیب اعتقادات تھے۔ وہ جن، شیطان بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے۔ اگرچہ اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے جو جن میدانوں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مونث بھی۔

عبید بن ایوب الغیری کہتا ہے:

وغولا قفرۃ ذکر وانثی

کان علیھا قطع البجاد

اور بیابان کے دو غول مرد بھی اور عورت بھی گویا دونوں پر کمل کے ٹکڑے ہیں۔ مونث کو سعلاۃ بھی کہتے تھے:

اذل وسعلاۃ وغول بقفرۃ

اذا اللیل وارى الجن فیہ ارنت

میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی ہے تو اس میں آواز دیتے تھے۔

قرآن عزیز نے شرک کی تردید میں جعلوا للہ شرکاء الجن کی بلیغ تعبیر اختیار کر کے شرک پر ضرب کاری لگائی۔ فقرے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لیے۔ یہ کہہ کر شرکا کی تفسیر بطور بدل فرمائی یعنی جن۔ یہ نہیں فرمایا جعلوا الجن شرکاء للہ یعنی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا

شریک بنالیا ہے۔ فقرے میں تغیر و تبدل یہ بتلانے کے لیے ہوا ہے کہ حیرت اور تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ شرکت کا یہاں وجود ہے نفس شرکت کوئی اچنبھے والی بات نہیں بلکہ اچنبھے والی بات یہ ہے کہ اللہ کا کوئی شریک ہو۔ اگر تعبیر جعلوا الجن شرکاء للہ ہوتی تو معلوم یہ ہوتا کہ جنوں کو شریک بنانا قابل حیرت ہے ورنہ نفس شرکت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور قاری کا یہ تاثر واقعہ کے خلاف ہوتا۔

اس کے بعد جنات کو خدا کا شریک بنانے کی قباحت کو زیادہ زوردار بنانے کے لیے فرمایا وخلقھم کہ کس قدر عقل کا بودا پن ہے کہ ان کو خدا کا شریک بنا رہے ہیں جو خود خدا کی مخلوق ہیں۔ خدا کی پیدا کی ہوئی چیز آخر خدا کی عبادت میں کیسے شریک ہو سکتی ہے۔ خدا کی خالقیت کے بارے میں مشرکین بھی نبوت کے ہمنوا تھے۔ اس لحاظ سے جنات کے بارے میں شریک کا عقیدہ ان کے اصل موقف سے متصادم تھا۔ فکر و عمل کے اسی تضاد کو جتانے کے لیے وخلقھم فرمایا ہے۔

شرک سر تا سر جھوٹ کا گھروندا ہے

۱۲۶۔ اور انہوں نے بغیر علم کے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی ہیں۔ خدا کی ذات پاک ہے اور ان تمام باتوں سے بلند و برتر ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو کچھ یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور مشرکین ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اللہ کی ذات ہر شرکت سے پاک ہے اور اس کی شان ترکیب و تحلیل سے پھر باپ بیٹے کا تصور کیسے ہو سکتا ہے[1]

اصل ارشاد میں خرقوا آیا ہے۔ عربی میں خرق، خزق، خرم، حزب اور خرز جیسے الفاظ میں معنوی ہم آہنگی ہے۔ سب کے معنے سوراخ کرنے کے ہیں۔ امام راغب نے خرق کے معنے کسی کو خراب کرنے کے لیے بغیر سوچ بچار کاٹنے کے بتاتے ہیں۔ خُرق خاکے پیش کے ساتھ حماقت کو کہتے ہیں۔ اسی سے پھوہڑ عورت کو خرقاء کہتے ہیں۔ یہ باب نصر ہے اور جب یہ باب ضرب سے آتے اور خرق الکذب بولا جائے تو اس کے معنے جھوٹ گھڑنے اور تراشنے کے ہیں۔ زمخشری نے بغیر علم کے معنے یہ بتلائے ہیں کہ بغیر اس کے کہ ان کو اپنے دعویٰ کی حقیقت معلوم ہو، محض بیوقوفی اور نادانی سے یہ بے پر کی اڑا رہے ہیں کہ خدا کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ خواہ یہ بات بیٹے بنانے کی حد تک عیسائیوں اور یہودیوں کے منہ سے نکلی ہو اور خواہ فرشتوں کو بیٹیاں بنانے کی

[1] افادات شیخ الاسلام

۔۔۔ عرب نے کہی ہو۔ یہ سب باتیں وہ بغیر کسی دلیل عقلی اور علمی کے کہتے ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا کہا تو قرآن نے ان کے اس دعویٰ کو ذالک قولھم بافواھھم یعنی یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ کہا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا تو قرآن نے کہا کہ مالھم بہ من علم ان کو کوئی پتہ نہیں ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ دین کی حدود میں خدا کے بارے میں خواہ اس کا تعلق اس کی ذات سے ہو یا صفات سے یا لوازم سے کوئی بات وحی کی رہنمائی کے بغیر محض من گھڑت خیال سے نہیں کہی جا سکتی۔ اگر ایسا افکار میں کیا گیا تو یہ اتباعِ ظن ہوگا اور اگر اعمال میں کیا گیا تو یہ اتباعِ ہوا ہوگا۔

آخر میں سبحانہٗ وتعالیٰ عما یصفون، یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے جو ذات خالق مالک قدیر علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے موصوف کرنا جو مخلوق کی صفات میں اس کی ان تمام صفات کے انکار کے مترادف ہے جن کا ماننا عقلاً ضروری ہے اگر خدا کو ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دیا جائے اور اس کو اولاد کا باپ بنا دیا گیا تو وہ خدا کہاں رہا ہے پھر تو اس کے لیے کفاءت اور ہمسری مان لی گئی اور اس سے مدِ مقابل اور حریف بھی مان لیے گئے۔

اللہ سبحانہٗ کی حقیقی عظمت

۱۲۷۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا بغیر نمونے کے بنانے والا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے بیٹا ہو جبکہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ اسی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ جس نے تنہا تمام آسمان و زمین بدون کسی نمونہ اور توسط آلات وغیرہ کے ایسے انوکھے طرز پر پیدا کر دیے، آج اس کے لیے شرکاء کی امداد اور بیٹے کا سہارا تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر تعجب ہے کہ جب تم کسی مخلوق کو فی الواقع خدا کی اولاد قرار دیتے ہو تو ان بچوں کی ماں کسے بناؤ گے اور ماں کا تعلق خدا کے ساتھ کس قسم کا مانو گے۔ عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں لیکن یہ جسارت وہ بھی نہیں کر سکے کہ مریم صدیقہ کو العیاذ باللہ خدا کی بیوی قرار دے کر تعلقات زناشوئی کے قائل ہو جائیں۔ جب ایسا نہیں تو مریم کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ خدا کا بیٹا کیوں کر ہو گیا۔ دنیا کے دوسرے بچوں کو بھی خدا تعالیٰ ان کی ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کرتا ہے اور وہ معاذ اللہ

خدا کی نسلی اولاد نہیں کہلاتے۔ یہ فرق کہ کوئی بچہ محض نفخہ جبرئیلیہ سے بغیر توسط اسباب عادیہ کے پیدا کر دیا جائے اور دوسروں کو عام اسباب کے سلسلہ میں پیدا فرمائیں۔ البتہ نبوت کے مسئلہ پر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اسباب و مسببات ہوں یا خوارق عادات سب کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس چیز کو کس وقت کس طرح پیدا کرنا مصلحت و حکمت ہے[1]

اس آیت میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس عقیدے کے رد میں کہا جا سکتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ فیصلہ کن حجت ہے مگر منطقی طریقہ کی نہیں جو دلوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ قرآنی طریقہ کی جو دل کے ایک ایک ریشہ میں اتر جاتی ہے بدیع السماوات والارض الخ ایک نہیں بلکہ متعدد طریقوں سے بتایا ہے۔ پہلے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اللہ کے مبدعات میں سے ہیں، مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز مخلوق ہے، مخلوق ہو کر بیٹے کا درجہ کیسے حاصل کر سکتا ہے، آسمان و زمین کو کوئی بیٹا نہیں کہتا ہے۔ ثانیاً، بتایا کہ اللہ کی ذات خالق الاجسام ہے۔ خالق اجسام خود جسم نہیں ہو سکتا اور ولادت جسم کی خصوصیات سے ہے، ثالثاً اولاد چاہتی ہے مذکر و مونث کی ہم جنسی کو اور اللہ کی ذات مجانست سے پاک ہے، رابعاً بیٹا والد کا ہمسر اور کفو ہوتا ہے اور اللہ کی ذات کفاءت کے داغ سے پاک ہے، کیونکہ مخلوقات میں سے کسی میں بھی یارائے ہمسری نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی مخلوق ہے مولود کوئی نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کے متعلق قرآن نے جو بلند تخیل پیش کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا اور قرآن کی سب سے چھوٹی سورت قل ھو اللہ احد نازل ہوئی۔ حضرت ابی بن کعب جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں وہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث بھی چھوڑ جاتا ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے سوچنے کی بات ہے کہ قرآن سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا اور قرآن کی تعلیم کے بعد کتنا پاک اعلیٰ اور بلند تخیل ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابی کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن ان کا دل اب قرآن کے فیضِ بیان سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابوہریرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے

[1] افادات شیخ الاسلام

سن کر فرماتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھے گالی دی، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں وہ ایک صمد ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ تنزیہہ و تقدیس کے یہ کس قدر شاندار موتی ہیں۔

توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ عبادت پر استدلال

۱۰۲۔ یہی خدا تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا اسی سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو ہر چیز کا وہی نگران اور کارساز ہے۔ اس کی عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ مذکورہ بالا صفات کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر استحقاق معبود بننے کا رکھتا ہے اور اس لیے بھی کہ تمام مخلوق کی کارسازی اسی کے ہاتھ میں ہے[1] اس آیت میں ربوبیت، خالقیت اور وکالت سے توحیدِ عبادت پر استدلال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو رب تمہارا پروردگاری کر رہا ہے اور جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور جو تمہاری ہر آن، ہر لمحہ کارسازی کر رہا ہے اور جس کی خالقیت اور ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ریشہ ریشہ میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے۔ کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جاتے؟

مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کی ذات خالقیت وربوبیت میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی شان معبودیت میں بھی یگانہ ہو، کیونکہ اگر کوئی دوسری ہستی اس کی عبادت میں شریک مان لی جائے تو اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔

اس فقرے میں پہلے ربکم پھر خالق کل شیئ اور آخر میں فاعبدوہ لاکر بتا دیا کہ اللہ کی ذات چونکہ رب ہے خالق ہے، اس لیے عبادت صرف اس کی ہونی چاہیے۔ یہ توحیدِ عبادت کا ایجابی پہلو ہے لیکن لا الٰہ الا ھو کہہ کر توحیدِ عبادت کے سلبی پہلو کو بھی نمایاں کر دیا۔ ایجابی یہ ہے کہ عبادت صرف اس کی کرنی چاہیے اور سلبی یہ کہ اس کے سوا کسی کی نہ کرنی چاہیے۔ قرآن نے یہاں ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں کے ذریعہ توحیدِ عبادت کا ایسا کامل نقشہ پیش کر دیا ہے کہ عبادت میں ہر قسم کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شرکت کی راہیں ہمیشہ کے لیے بند کر دی ہیں۔ اور بتا دیا کہ ہر قسم کی قدرت، ہر قسم کی قوت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماورائے عرش سے لے کر زیر فرش تک ہر ذرے پر حکمران ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں ہے، انسان کی پیشانی کو چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے سامنے جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

تنزیہہ کی تکمیل

۱۲۹۔ اسے نگاہ نہیں پا سکتی ہیں اور وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے وہ بہت ہی لطافت والا اور باخبر ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں ہے کہ اس کو دیکھ لے، ہاں وہ خود از راہ لطف و کرم اپنے کو دکھانا چاہے تو آنکھوں میں ویسی قوت بھی پیدا فرما دے گا۔ مثلاً آخرت میں مومنین کو حسب مراتب رویت ہوگی، جیسا کہ نصوص کتاب و سنت سے ثابت ہے یا بعض روایات کے موافق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں رویت ہوئی علی اختلاف الاقوال باقی مواضع میں چونکہ کوئی نص موجود نہیں ہے لہٰذا عام قاعدے کی بنا پر نفی رویت ہی کا عقیدہ رکھا جائے گا۔ مفسرین سلف میں سے بعض نے ادراک کو احاطہ کے معنے میں لیا ہے یعنی نگاہیں کبھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی ہیں۔ آخرت میں رویت ہو گی احاطہ نہ ہو گا۔ ہاں اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمام ابصار و مبصرات کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ اس وقت لطیف کا تعلق لا تدرکہ اور خبیر کا وھو یدرک سے ہوگا۔[1]

یہاں قرآن نے تصور الٰہی کی حد تک اگر اثباتی حد تک بدیع، خالق، رب، وکیل، کے ذریعہ خدائی تصور پیش کیا ہے تو سلبی حد تک ایسا عجیب انداز اختیار کیا ہے کہ تصور الٰہی کی تمام تصویروں میں قرآن کی پیش کردہ تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ یہ آیت تصور تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے، جس کی کوئی نمود نزول قرآن کے وقت دنیا میں موجود نہ تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکا تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھی ہستی کی پرستش کی جائے۔ لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی وہ بھی اس طرح کے تشبیہ و تمثیل سے یکسر آلودہ ہے۔ دراصل قرآن سے پہلے فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا اس لیے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تشبیہ و تمثیل پر رکھنی پڑی۔ قرآن نے تشبیہہ و تمثیل کے سارے پردے چاک کر دیے اور تنزیہہ کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار، البتہ یہ بات یاد رہے کہ تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور صاف رکھا جائے۔ تعطیل یہ ہے کہ تنزیہہ کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتداء نہیں ہے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کی ہستی ہے اور ضرور ہے مگر کیسی ہے؟ اس ادراک سے عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے۔ اس کے لیے صفات ہیں مگر ایسی نہیں جن کا خیال و وہم ادراک کر سکیں۔ غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہے جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوہ مجوبی چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسن گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے۔ جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔ غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے کمال درجہ تک پہنچا دیتی ہے، دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ نزاکت کا عالم یہ ہے کہ اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں۔ اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبیہہ میں کھوئے جاتے ہیں۔ راہِ نجات یہی ہے کہ دونوں کے درمیان قدم رہے۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے تنزیہہ کی بھاگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات اس کی دلآویز معقول کا مرقع کھینچے گا۔ تنزیہہ تشبیہ کی پرچھائی سے بچاتی رہے گی۔

ہمارے متکلمین میں صفات باری کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے۔ اور باطنیہ نے قطعی انکار کر دیا، معتزلہ نے صاف انکار نہیں کیا مگر ان کا رُخ اسی طرف ہے۔ چنانچہ یہاں انہوں نے ادراک کی نفی کو رویت کی نفی بنا ڈالا۔ اور دُنیا تو دُنیا آخرت میں بھی اہلِ ایمان کے لیے رویت باری کا

انکار کر گئے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ جنت میں اللہ سبحانہ کا دیدار ہوگا۔ قرآن وسنت کی نصوص اس کی موید ہیں۔ اس آیت میں رویت کی نفی نہیں بلکہ ادراک کی نفی ہے۔ ادراک اور رویت میں بہت بڑا فرق ہے۔ ادراک کے معنے لغت میں احاطہ میں لے لینے کے ہیں۔ ادراک کی نفی سے رویت کی نفی نہیں ہوتی ہے اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ نگاہیں اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نگاہوں کا احاطہ کر سکتا ہے، نگاہیں اللہ کا احاطہ کیوں نہیں کر سکتی ہیں اس لیے کہ اللہ کی ذات لطیف ہے۔ اور اللہ نگاہوں کا کیوں احاطہ کر لیتا ہے اس لیے کہ اللہ کی ذات خبیر ہے۔

آیت کے ایک اور معنے بھی کیے گئے ہیں کہ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز مایوس ہونے کی نہیں۔ تمہاری نگاہیں تو واقعی اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہیں لیکن وہ تمہاری نگاہوں کا ضرور ادراک کر لیتا ہے یعنی جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اس دنیا میں ان آنکھوں سے اسے نہیں دیکھ سکتا ہے لیکن اللہ تو اپنے چاہنے والوں کو دیکھ رہا ہے۔ اس طرح یہ آیت قرآنی اس ارشادِ نبوت سے ہم آہنگ ہے جو صحیحین میں حدیثِ جبریل کے نام سے موسوم ہے اور جس میں حضور نے جبریل کے اس سوال کے جواب میں مالاحسان؟ احسان کیا ہے ارشاد فرمایا ہے :

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس توجہ سے کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ اسے حقیقۃً نہیں دیکھ سکتے مگر وہ تو تمہیں واقعۃً دیکھ رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی یہ چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب اور بعد دل کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اسے یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہے اگر بھول جائے تو دور ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اسے نہیں دیکھ سکتی تو کوئی بات نہیں اس کی نگاہیں تو ہر وقت آدمی کو دیکھ رہی ہیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ
فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ
وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ
اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾

دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا، اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں[۳۰]۔ اس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں کہ تم کسی سے پڑھ رہے ہو اور جو لوگ علم رکھتے

ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں[131]۔ اے اللہ کے رسول
اس وحی کی پیروی کیجئے جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے
نازل ہوئی ہے کیونکہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے
اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو[132]۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی
تو یہ لوگ شرک نہ کرتے، تم کو ہم نے ان پر نگران نہیں
بنایا ہے اور نہ تم ان کے وکیل ہو[133]۔

نبوت کا کام دعوت و تبلیغ ہے

نبی کا سب سے پہلا اور اہم کام تبلیغ و دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا کی جانب سے ملی ہے، اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آتے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں چبھیں ان کو رگ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا، مال و متاع، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آتے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضا، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

نبوت کی دعوت و تبلیغ کا یہی مطلب ہے۔ دُنیا میں جس قدر انبیاءؑ آئے ہیں انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا ہے اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی اور آج دُنیا میں جو کچھ محبت خدا، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بلا واسطہ یا بالواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکر، بڑے بڑے شاعر، بڑے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا لینا سمجھتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے اور ہر ممکن طریقے سے اس کے پھیلانے اور اہل دُنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر نابیناؤں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہِ راست دکھاتے ہیں۔ ان آیات میں قرآن نے اسی حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ لوگوں کے پاس سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے حقائق آچکے ہیں۔ اب فائدہ اٹھانا اور نہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے آپ کی ذمہ داری صرف یہی ہے کہ ان تک پیغام پہنچے۔

۱۰۴۔ دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔ یعنی اگرچہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے بصیرت افروز نشانات و دلائل ہمارے سامنے ہیں جو آنکھ کھول کر دیکھے گا خدا کو پالے گا اور جو اندھا بن گیا اس نے اپنا نقصان کیا میرے ذمہ یہ نہیں ہے کہ کسی کو دیکھنے پر مجبور کروں[1]۔

آلوسی فرماتے ہیں کہ محققین کی رائے میں یہاں قل محذوف ہے۔ یعنی اے پیغمبر کہہ دو اور بتا دو کہ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس بصائر آچکے ہیں۔ بصائر بصیرت کی جمع ہے۔ اس کے معنے دیدہ عقل، دانش کے آتے ہیں۔ جیسے ظاہری آنکھ کے لیے بصر اور جمع ابصار آتی ہے ایسے باطنی دید کے لیے بصیرت اور جمع بصائر آتی ہے۔ حضرت معاویہ نے کسی ہاشمی سے طنزاً کہا اے بنی ہاشم تصابون فی ابصارکم تمہاری آنکھوں میں فتور ہے ہاشمی نے جواباً کہا کہ اے بنی اُمیہ تصابون فی بصائرکم تمہاری عقلوں میں فتور ہے۔ یہاں بصائر سے مراد دلائل عقلی اور وہ وسائل ہیں جن سے ہر انسان حق کو معلوم کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ لوگو! اللہ کی جانب سے تمہارے پاس حق بینی کے وسائل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہنچ چکے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی ظاہری و باطنی نشانیاں لے کر آ گئے ہیں۔ ظاہری نشانیاں اور دلائل تو وہ ہیں جن کو لوگ عموماً معجزات کہتے ہیں اور باطنی آیات و دلائل جیسے مدعی نبوت کی صداقت معصومیت، تزکیہ تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد و فلاح اور تائید و نصرت، اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے بھی باطنی آثار نبوت سکے حقیقی بصائر ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف ظاہر بین لوگوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے دیکھتے ہیں اور ان باطنی دلائل میں قرآن کی آیات بھی ہیں جن کو عقل، فقہ اور علم کے حوالے سے ابھی ابھی پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا ہے کہ نبی شناسی کے سارے عقلی پیمانے تمہارے پاس موجود ہیں۔ اب ان کا استعمال کرنا تمہارا کام ہے۔ نبی شناسی کا پیمانہ صرف ظاہری اور مادی معجزہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے پیمانے بھی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کے اخلاق و کردار کو دیکھا جائے، دوسرے یہ کہ اسے نبیوں کے ترازو میں رکھ کر تولا جائے۔ تیسرے یہ کہ اس کی تعلیمات کو دیکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کی دعوت ایک استدلالی اور عقلی دعوت ہے کیونکہ اس کے بغیر حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور بحث و نظر کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ ہی وہ ربانی آواز ہے جس نے عقل انسانی کو مخاطب کیا ہے، غور و فکر کی دعوت دی ہے، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ دلائل کی روشنی کھلے آفتاب کی طرح تمہارے سامنے موجود ہے اب جو ان کی مدد سے حق کو دیکھ کر ایمان و عمل صالح کا سرمایہ فراہم کرے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنے گا اور حق سے روگردانی کر کے گمراہی میں پڑا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا۔ اسی کے ہم معنے قرآن میں اور آیات بھی ہیں لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت اور من عمل صالحاً فلنفسہ و من اساء فعلیہا، آخر میں فرمایا ہے و ما انا علیکم بحفیظ یعنی میں تمہارا نگران اور محافظ نہیں ہوں۔ میری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے وہ پوری ہے رقیب و حفیظ تو اللہ کی ذات ہے وہ تمہارے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے حساب لینا اس کا کام ہے اور حساب کے بعد جزاء و سزا بھی اس کا کام ہے۔

قرآنی دلائل کی قوت تاثیر

۱۳۱۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں کہ تم کسی سے پڑھ رہے ہو اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر حقیقت کو

روشن کر دیں۔ یعنی ان آیتوں کو مختلف پہلوؤں اور عجیب و غریب انداز سے اس لیے سمجھاتے ہیں کہ آپ سب لوگوں کو پہنچا دیں اور ان میں استعداد و احوال کے لحاظ سے دو فریق ہو جائیں ضدی اور بدفہم تو یہ کہیں کہ ایسے علوم و معارف اور موثر مضامین ایک اُمی سے کیسے بن پڑتے ضرور مختلف اوقات میں کسی سے سیکھتے رہے ہوں گے۔ پھر پڑھ پڑھا کر ہمارے سامنے پیش کر دیئے لیکن سمجھدار اور انصاف پسند لوگوں پر حق واضح ہو جائے گا اور شیطانی شکوک و شبہات ہو جائیں گے[1]

مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے اس سورت یا اس موضوع پر عجیب و غریب اور پُرشوکت انداز میں دلائل پیش کیے ہیں ایسے ہی ہم پورے قرآن میں اصول ایمان اور محاسن اخلاق کو ثابت کرنے کے لیے پلٹ پلٹ کر دلائل بیان کر رہے ہیں اور ہم یہ کام دو وجوہ سے کرتے ہیں۔ اول اس لیے کہ جو لوگ اس کلام کو پڑھ کر یا سن کر اس کے مقصد و مدعا پر غور نہیں کرتے بلکہ اسے سننے اور پڑھنے کے بعد اس ٹوہ میں لگ جاتے ہیں کہ آخر یہ اُمی انسان یہ مضامین کہاں سے لایا ہے۔ یہ ضرور کہیں سے پڑھ کر آتا ہے، دوسرے اس لیے کہ کچھ لوگ اس کلام کو سن کر اس کے مقصد و مدعا پر غور کرتے ہیں۔ اور جو حکمت و موعظت کی باتیں اس میں بتائی گئی ہیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان دونوں وجہوں کے پیش نظر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ سمجھنے والے چاہیں تو سمجھ لیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا پسند کریں اڑے رہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ضدی اور معاند تو قرآن سن کر کہتے ہیں کہ اے پیغمبر ضرور تو کسی سے پڑھ کر آیا ہے اور اہل علم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قریش کو جس شخص کی نسبت شبہ تھا کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے اس کے متعلق امام طبری نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی شخصیت اور نام کے متعلق صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا جو اپنی زبان میں کتب مقدسہ کبھی کبھی پڑھتا تھا اور آپ راستہ چلتے کبھی کبھار اس کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی پر قریش نے کہا کہ حضور انور کو بھی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس کا جواب ہے کہ اس غلام کی اور جو کتابیں وہ پڑھتا ہے ان کی زبان عربی نہیں ہے اور نہ وہ عربی جانتا ہے، حضور انور عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اور خود قرآن کی زبان عربی مبین ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضور اقدس غیر زبان کو سمجھ لیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں

[1] افادات شیخ الاسلام

کلام کرے۔ بہرحال قرآن یہاں بتا رہا ہے کہ قرآن سن کر کچھ لوگ آپ پر قرآن سیکھنے کا الزام بھی لگائیں گے اور اس بہانہ سے ہدایت کی سعادت سے محروم ہوجائیں گے۔ دراصل ان لوگوں نے قرآن سننے اور پڑھنے کے بعد مغزِ سخن تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ چونکہ مخالفانہ تعصب پہلے سے ان پر قبضہ کیے ہوئے ہے اس لیے خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صورتیں وہ اپنے ذہن سے تراش رہے ہیں اور انہیں اس طرح بیان کررہے ہیں کہ گویا انہوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کرلی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اقدس کی پیغمبرانہ زندگی مکہ میں پورے ۱۳ برس اور مدینہ میں ۱۰ سال قائم رہی۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی معلم سے فیض پاتے ہوتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانے یا بڑی حد تک خلوت وجلوت میں آپ کے ساتھ رہتا کہ وقت ضرورت آپ اس سے قرآن بنواتے، احکام ومواعظ سیکھتے، اسرار ونکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا کیونکہ جو شخص خود مدعی نبوت کو تعلیم دے رہا ہے وہ کیوں کر اس کی نبوت کو تسلیم کرسکتا ہے۔ پھر اس شہرتِ عام، ذکرِ جمیل، رفعتِ مقام کو دیکھ کر جو مدعی نبوت کو حاصل ہو رہی تھی وہ خود پردے کے پیچھے گمنامی پسند کرتا اور صحابہ کرام کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا۔ جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہ تھا اگر آپ فی الواقع اس سے تعلیم حاصل کرتے تو قریش جو آپ کی تذلیل وتکذیب اور آپ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا تھے ان کے لیے آسان تھا کہ اس غلام عجمی کو آپ سے الگ کردیتے کہ آپ کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعتہً درہم برہم ہوجاتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

اتباعِ وحی اور نبوّت

۱۰۶۔ اے اللہ کے رسول اس وحی کی پیروی کیجیے جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے اور ان مشرکین سے بے رخی اختیار کرلیجیے۔ یعنی آپ خدائے واحد پر بھروسہ کرکے اس کے حکم پر چلتے رہیں اور مشرکین کے جہل وعناد کی طرف خیال نہ کریں کہ ایسے روشن دلائل و بیانات سننے کے بعد بھی راہِ راست پر نہ آئیں۔ [1]

پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ ایک طرح کے انسان وہ ہیں جو قرآن کو سن کر اس کے مقصد پر غور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کرتے ہیں۔ دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو قرآن سننے کے بعد اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ آخر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم امی ہو کر یہ مضامین کہاں سے لا رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے فطری فساد کا مظاہرہ کرتے ہیں اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ پتا دینے کے بعد اب حکم ہو رہا ہے کہ آپ گفتار و کردار میں وحی الٰہی پر جمے رہیں، اسی پر عمل کریں۔ مقتدا ہونے کے لیے علم و عمل میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ پوری زندگی میں وحی کا بھرپور اتباع کریں۔ یہ توحید ربوبیت ہے اور اس کا اور توحید الوہیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جیسے اللہ سبحانہ، اجسام کی پروردگاری کے لیے رزق نازل کر رہا ہے ایسے ارواح کی پرورش کے لیے وحی کا نزول ہوا ہے، اللہ کے سوا الٰہ کوئی نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ ان مشرکین کی پروا نہ کیجئے، ان سے اعراض کر لو۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ پیغمبر کا مقام وحی کی اتباع اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ نبوت اور اس کے منکرین کی نزاع صرف اس بات پر تھی کہ نبوت کہتی تھی میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے مخالف کہتے تھے ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے، نبوت کہتی تھی کہ اگر میری بات سمجھ میں آئے تو مان لو سمجھ میں نہ آئے تو ماننے والوں کو ان کی راہ چلنے دو۔

یہاں نبوت کو ہدایت ہو رہی ہے کہ جو نہیں مانتے ان سے اعراض کر لیجئے ان کی خرافات کی کوئی پروا نہ کیجئے کیونکہ صداقت کا معاملہ سرتا سر سمجھنے بوجھنے اور سمجھ بوجھ کر اختیار کر لینے کا ہے۔ اس میں نہ تو کسی طرح کی زبردستی ہے نہ کسی طرح کی لڑائی۔ ان کی بھلائی کے لیے ایک بات کہی گئی ہے اگر سمجھ میں آجائے مان لے نہ آئے نہ مانے۔ ہر شخص اپنے نفس کا مختار ہے چاہے بھلائی کی راہ چلے اور چاہے برائی کی اگر کوئی برائی کی راہ چلے گا تو کسی دوسرے کو کچھ نہ کچھ دے دے گا کہ وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے، اگر برائی کی چال چلے گا تو کسی دوسرے کا نقصان نہیں کرے گا کہ وہ اس سے بگڑنے لگے اپنی اپنی راہ ہے اور اپنی اپنی کمائی۔

رسول لوگوں کا نگران اور کارساز نہیں

۱۳۳۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ شرک نہ کرتے تم کو ہم نے ان پر نگران نہیں بنایا ہے اور نہ تم ان کے وکیل ہو۔ یعنی حق تعالیٰ کی تکوینی حکمت اس کی مقتضی نہیں ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو زبردستی مومن بنا دے بے شک وہ چاہتا تو روئے زمین پر کوئی مشرک باقی نہ چھوڑتا لیکن شروع سے انسانی فطرت کا نظام اس نے ایسا بنا رکھا ہے کہ آدمی کوشش کرے تو یقیناً ہدایت قبول کر سکے تاہم قبول کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو۔ پہلے اس مسئلہ کی تقریر گزر چکی ہے

آپ کا فرض تبلیغ اور احکام الٰہی کا اتباع ہے ان کے ذمہ دار اور جواب دہ آپ نہیں ہیں۔ [1]

اس آیت میں دو قانون بتائے گئے ہیں ایک ولو شاء اللہ ما اشرکوا اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ یعنی اللہ نے ایمان کے معاملہ کو جبر و قہر کے تحت نہیں بلکہ بندے کے ارادے و اختیار کے تحت رکھا ہے۔ اللہ کی یہ عادت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو اپنے قانون تکوینی کے تحت کسی کو بھی مشرک نہ بننے دیتا لیکن ایسی زبردستی سے نیک و مومن بنا دینا اللہ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہاں دو صداقتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات اور اس کے ذرّے ذرّے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ آسمان و زمین میں کوئی چیز نہیں جو اس کے اشارے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے۔ اسی طرح انسان اور اس کے تمام اعمال، افکار، اخلاق بھی اسی کی مشیت کے تحت ہیں دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار دیا ہے۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جاتے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کر لیا جاتے جس طرح دوسری مخلوقات تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز جزا و سزا شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار ہو جائیں۔ ظلم و انصاف دُنیا میں باقی نہ رہے۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنے ہو جائے۔ قرآن یہاں یہ سمجھا رہا ہے کہ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں تک دلائل کی پوری قوت سے آوازہ حق پہنچائیں اور اس کے پہنچانے میں کوئی کمی نہ کرو۔ اب اگر کوئی حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے یہ تو انسان کے ارادہ اختیار کی چیز ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تکوینی طور پر انسان کو دوسری مخلوقات کی طرح طاعت و ایمان پر مجبور کر دیتا اور یہاں کوئی بھی مشرک نہ ہوتا۔ منشا الٰہی یہ ہے کہ انسان کے لیے حق و باطل کے انتخاب کی آزادی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ حق و باطل میں سے کس کو منتخب کرتا ہے۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے حق کی روشنی پیش کریں اور خود اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر قائم رہیں۔

دوسرا قانون یہ بتایا ہے کہ اللہ نے آپ کو داعی اور مذکر بنا کر روانہ کیا ہے۔ آپ ان کے اعمال و

---

[1] افادات شیخ الاسلام

افکار کے نگران اور وکیل نہیں۔ یعنی آپ کا کام یہ ہے کہ نصیحت بات سمجھا دیں یہ نہیں ہے کہ نگہبان بن کر ان پر مسلط ہو جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ آپ کو ان کی ہدایت کی ٹھیکیداری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ حضور انور کو مخاطب کرتے ہوئے بھی بات یوں ادا کی ہے وما انت علیھم بجبار آپ ان پر حاکم جابر نہیں ہیں کہ جبراً و قہر سے منوالیں گے نیز فرمایا کہ لست علیھم بمصیطر آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن آپ ان کو ضرور راہِ حق پر چلا کر رہیں گے۔

بالفاظِ دیگر یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کا اختلاف ناگزیر ہے اور آپ تمام انسانوں کو ایک ہی فکر و رائے کا نہیں بنا سکتے ہو لہٰذا جس بات کو حق سمجھتے ہو اس کی دعوت دو لیکن اس کی فکر نہ کرو کہ ساری دنیا آپ کی ہمنوا بن جائے جن کی بات سمجھ میں آئے گی مانیں گے جن کی سمجھ میں نہیں آئے گی نہیں مانیں گے۔ آپ لوگوں پر پاسبان نہیں بنائے گئے ہیں کہ ان کے ہر فکر و عمل کی پاسبانی کریں نہ آپ پر اس کی ذمہ داری ہے کہ ضرور ہی دوسرے کو نیک بنا دیں۔

اگر خدا چاہتا تو انسانوں کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک طرح کے ہوتے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ اپنی رائے اور اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر شخص کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے آپ کی نظر میں اس کی راہ خواہ کتنی بُری ہو لہٰذا ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور صبر سے کام لو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا
بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ
فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن
جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا
يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ
وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١٠﴾

ع ۱۰

اور اے اہلِ ایمان جو لوگ خدا کے سوا جن دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کو بُرا نہ کہو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر نادانی میں خدا کو بُرا کہنے لگیں۔[۱۳۴] ایسے ہی ہم نے ہر اُمت کے لیے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر ان کو اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے وہ ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے تھے۔[۱۳۵] اور یہ لوگ

خدا کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی سامنے آجائے تو

وہ اسے ضرور مان لیں گے آپ فرما دیجیے کہ نشانیاں تو اللہ ہی

کے پاس ہیں اور مسلمانو! تمہیں ان لوگوں کا حال کیا معلوم ہے

اگر نشانیاں آبھی جائیں پھر بھی یہ لوگ یقین کرنے والے نہیں

ہیں۔[۱۳۶] اور ہم ان کے دلوں اور نگاہوں کو اسی طرح پلٹ رہے

ہیں جیسے یہ پہلی بار اس پر ایمان نہیں لاتے اور ہم ان کو

ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا چھوڑ رہے ہیں۔[۱۳۷]

معاندین کو معجزے سے ایمان نہیں ملتا

نفسیات انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر چیز میں برائی اور خباثت نظر آتی ہے جلی سے جلی، واضح سے واضح برہان بھی ان کے دل کے شک اور قلب کے زنگ کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہیں اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ نبوت سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔

چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور وہ یقین کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں

اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی ان کو شک و شبہ کے گرداب سے باہر نہیں نکال سکتی وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں اور کبھی فریب اور قوتِ شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نہیں ہوتی۔ حجت کے لیے ایک بار ان کو معجزہ دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا۔ پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کو تسلی نہ ہو گی، چنانچہ اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراتب کو بیان کر دیا ہے وان یروا کل آیۃ لا یومنوا بھا اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو ایمان نہ لائیں گے۔

مسلمانوں کو فرطِ شفقت سے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ یہ رو سیاہ قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ رہنے پائیں۔ خدا نے فرمایا کہ معجزہ دیکھنے پر بھی ان کے قلوب کو اطمینان نہ ہو کیونکہ اس شک و شبہ کا منشا محض عناد ہے حق طلبی نہیں ہے۔ اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلی ہی دفعہ ایمان لے آتے۔

۱۳۴۔ اور اے اہلِ ایمان یہ لوگ خدا کے سوا جن دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کو بُرا نہ کہو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر نادانی میں خدا کو بُرا کہنے لگیں۔ یعنی تم تبلیغ و نصیحت کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے اب جو کفر و شرک یہ لوگ کریں اس کے خود ذمہ دار ہیں تم پر اس کی کچھ ذمہ داری نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم اپنی جانب سے بلا ضرورت ان کے مزید لعنت و کفر کا سبب نہ بنو، مثلاً فرض کیجئے ان کے مذہب کی تردید یا بحث و مناظرہ کے سلسلے میں تم غصہ میں آکر ان کے معبودوں اور مقتداؤں کو سب و شتم کرنے لگو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جواب میں تمہارے معبود برحق اور محترم بزرگوں کی بے ادبی کریں گے۔ اس صورت میں اپنے واجب التعظیم معبود اور قابلِ احترام بزرگوں کی اہانت کا سبب تم بنے لہٰذا اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے۔ کسی مذہب کے اصول و فروع کی معقول طریقے سے غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رکاکت پر تحقیقی و الزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جداگانہ چیز ہے لیکن کسی قوم کے پیشواؤں اور معبودوں کی تحقیر و توہین، دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا ہے [1]

اوپر کی آیات میں شرک اور مشرکین پر سخت تنقید ہوئی ہے اور نبوت کو حکم ہوا ہے کہ مخالفوں کے رد یہ کے پیشِ نظر صبر اور حلم سے کام لیجئے اور مشرکین کی خرافات سے بے پرواہ ہو جائیے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکم کے ساتھ تمام اہل ایمان کو حکم دیا کہ تم بھی شرک کی تردید میں ایسا انداز اختیار نہ کرو جس سے مشرکین کے معبودوں کی تحقیر و تذلیل مقصود ہو۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ الذین یدعون من دون اللہ سے کون مراد ہیں؟ وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ دوسروں کی عبادت کرتے ہیں یعنی عابدین، اگر عابدین مراد ہیں تو ظاہر ہے قرآن نے اس کی کبھی اجازت نہیں دی کہ اختلاف خیال کی بنا پر کسی کو بُرا کہا جائے یا گالی دی جائے بلکہ حکم دیا ہے قولوا للناس حسنا ایک اور آیت میں بھی یہ حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے۔

و قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم

اے پیغمبر میرے بندوں میں کہہ دو کہ وہ بات کہیں جو سب سے زیادہ اچھی ہو بے شک شیطان چھیڑ ڈالتا ہے آپس میں۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی باہم خوشگواری پیدا کرتے ہیں اور بدگوئی اور بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں نیک بات کہیں اچھے لہجے میں اور نرمی سے کہیں۔ اس میں تلقین کی گئی ہے کہ منکرین سے گفتگو کرو تو پسندیدہ طریقے پر کرو۔ اس طرح کی باتیں نہ کہو جس سے باہم فتنہ و فساد پیدا ہو، اور بجائے کھینچنے کے اور زیادہ وہ لوگ متنفر ہو جائیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے بعض مشرکوں کو کہا تھا انکم من اھل النار تم جہنمی ہو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اس بات سے روکا گیا کہ تعین کے ساتھ کسی انسان یا جماعت کو ایسا نہ کہیں کہ تم جہنمی ہو، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کس آدمی کا خاتمہ کس حال پر ہونے والا ہے بہت ممکن ہے کہ جسے تم بُرا کہہ رہے ہو اسے ہدایت کی توفیق ملنے والی ہو اور اس کی جگہ جنتیوں میں ہو۔ بلا شبہ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ بات حق ہے اور یہ حق نہیں ہے لیکن کسی خاص جماعت یا فرد کی نسبت حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ ضرور جہنمی ہے۔ اس طرح کسی کو بُرا بھلا کہنے سے ممکن ہے اور زیادہ اپنی غلطی میں ضدی ہو جائے لہٰذا جو کچھ بھی زبان سے نکالو حُسن و خوبی کی بات ہو، سختی و خشونت اور سب و شتم کی بات نہ ہو۔

دوسری بات یہ کہ الذین یدعون من دون اللہ سے مراد عابد نہیں بلکہ معبود ہیں۔ یعنی جن کی وہ عبادت کرتے تھے وہ اصنام، اوثان، تماثیل کی صورت میں ہوتے تھے لیکن دنیا میں کوئی قوم ایسی

نہیں گزری جس نے محض لکڑی، پتھر اور اینٹ کی بے جان مورت کو معبود بنایا ہو بلکہ بت، تصویر اور تمثال جب بھی بنایا گیا ہے کسی جاندار مخلوق بلکہ بزرگوں، پیغمبروں اور نیک بندوں کے نام اور شکل ہی پر بنایا گیا ہے اور بتوں سے وہ کام لیا گیا جو فوٹو اور تصویر سے لیا جاتا ہے کہ ان کے سامنے رکھنے سے ذی صورت اور صاحب تصویر کا خیال جمنے کی وجہ سے یک جہتی واقع ہوتی ہے اور خیالات میں پراگندگی نہیں ہوتی ہے غور فرمائیے کہ قرآن عزیز میں جن پانچ بتوں کا ذکر ہے ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ حضرت نوح کے زمانے کے نیک اور صالح انسانوں کے نام ہیں۔ ان ہی کی تصویریں بنا کر ان کی پرستش ہوتی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کا انکشاف ہے کہ یہ پانچوں حضرت ادریس کے صاحبزادوں کے نام ہیں، بلکہ حافظ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں یہ بھی بتایا ہے کہ

اکثر سلف کا بیان ہے کہ یہ پانچ حضرت نوح کی قوم کی نیکو کار اور بزرگ ہستیاں تھیں جب وہ وفات پا گئے تو لوگوں نے اولاً ان کی قبروں کی مجاوری کی بعد ازیں ان کی تصویریں اور بت بنا لیے اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کی عبادت شروع کر دی۔

قرآن کریم میں لات بت کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق صحیح بخاری میں ہے کہ یہ ایک نیک آدمی تھا جو حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ۸ھ میں مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو اس وقت بیت اللہ میں ۳۶۰ بت نصب تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

صورۃ ابراھیم و اسماعیل فی ایدیھما من الازلام

حضرت ابراہیم و اسماعیل کے ہاتھوں میں تیر تھے۔

مسند احمد میں ہے کہ بتوں میں ایک مجسمہ حضرت مریم کا بھی تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ عزیٰ ایک عورت تھی، منات بھی انسان کا نام تھا۔ الاتقان میں ہے کہ قرآن میں بتوں کے وہ نام جو انسانوں کے تھے ان میں لات و منات ہیں۔ قرآن میں بعل بت کا ذکر آتا ہے۔ الاتقان میں ہے کہ یہ ایک عورت کا نام ہے جس کا مجسمہ بنا لیا گیا تھا۔ اساف، نائلہ اور ہبل کے بارے میں بھی یہی انکشاف تاریخ میں موجود ہے۔

بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دو چیزیں ایک مجسمے، تصویریں، تماثیل اور اصنام ہیں۔ دوسری وہ شخصیتیں ہیں جن کے یہ مجسمے اور بت بنائے گئے ہیں بت اپنی یاد کے لحاظ سے جمادات ہیں۔ لیکن جن کے یہ بت بنائے گئے وہ ذوی العقول ہستیاں ہیں۔ قرآن نے مشرکین کے شرک کی تردید

میں دونوں چیزیں پیشِ نظر رکھی ہیں۔ کبھی وہ بتوں پر جمادات ہونے کی حیثیت میں بھرپور حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے انکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جهنم تم اور تمہارے معبود اللہ کے سوا جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس موقعہ پر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو عربی زبان میں بے جان چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے ما، اور کبھی ان ہستیوں کا ذکر کرتا ہے جن کے وہ بت بنا لیے گئے ہیں اس موقعہ پر وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جو ذوی العقول کے لیے عربی میں استعمال ہوتے ہیں جیسے الذین اور جمع مذکر کے صیغے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک دقیق نکتہ کی نشاندہی فرمائی ہے:

> اللہ تعالیٰ ان مشرکین کی یہ کہہ کر کبھی تردید کرتا ہے کہ حکم اور ملک صرف اللہ کا ہے اور کبھی یہ کہہ کر کہ یہ جمادات ہیں۔

عام شارحین قرآن نے الذین یدعون من دون اللہ سے مشرکین کے وہ معبود مراد لیے ہیں جو بتوں کی صورت میں ہیں اور اس کے نتیجے میں تین مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ خود قرآن حکیم نے بتوں کو سخت و سست کہا ہے مثلاً کہا ہے انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جهنم تم اور تمہارے معبود جہنم میں جائیں گے، ان کو طاغوت کہا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اگر آیت میں بت مراد ہیں تو قرآن نے ذوی العقول کی تعبیر کیوں اختیار کی یہ کیوں نہیں فرمایا و ما تعبدون من دون اللہ وہ چیزیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ تیسری مشکل یہ ہے کہ مشرکین تو خود اللہ کو مانتے تھے بلکہ اللہ کو اس کائنات کا خالق، مالک، مدبر کہتے تھے اس لیے وہ اللہ کو گالیاں کیسے دے سکتے ہیں؟

ان تینوں مشکلات سے بچنے کے لیے حل یہ بتایا گیا ہے۔

اولاً یہ کہ آیاتِ قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہے گئے ہیں وہاں کسی کی دل آزاری پیشِ نظر نہیں ہے اور نہ کوئی سمجھدار انسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو برا کہنا یا مشرکین کو چڑانا مقصود ہے اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہل محاورہ سمجھتے ہیں جیسے عام طور پر عدالتوں میں ہر روز سامنے آتا رہتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم نے جابجا بتوں کے بے حس و شعور اور بے علم و قدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہو جائے۔ لیکن اس جواب میں کوئی جان نہیں ہے۔ اس صورت میں بتوں کو

بُرا کہنا کوئی طاعت نہیں بلکہ ایک امر مباح ہوگا جیسا کہ ابو منصور سے صاحب روح نے نقل کیا ہے۔ اور کچھ نے اس مشکل سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے کہ قرآن میں جو بتوں کی بے بسی کی تصویر کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آتی ہے بلکہ اس کی حیثیت تنقید و توضیح کی ہے۔

ثانیاً بتوں کے لیے ما تعبدون من دون اللہ کی تعبیر چھوڑ کر الذین تعبدون کی تعبیر مشرکین کے خیال کے مطابق ہے کہ وہ بتوں کو ذوی العقول میں شمار کرتے تھے۔ یہ بات علامہ قرطبی نے لکھی ہے لیکن اس دعویٰ کی انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

ثالثاً یہ کہ مشرکین اللہ کو مانتے تھے وہ اللہ کو کیسے گالیاں دے سکتے ہیں اس مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ بعض اوقات غیض و غضب کی وجہ سے انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اس حالت میں واہی تباہی بکنے لگتا ہے۔ یہ بات علامہ آلوسی نے روح المعانی میں بتائی ہے۔

اصل یہ ہے کہ میرے خیال میں، ہمیں ذرا حقیقت میں نگاہ سے معاملہ کے اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کو ہدایت یہ ہو رہی ہے کہ شرک کی تردید یہ رنگ اختیار نہ کرنے پائے کہ مسلمان تردید شرک کے جوش میں ان کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں جن کی مشرکین عبادت کرتے ہیں۔ الذین یدعون من دون اللہ اپنے حقیقی معنے میں ہے اس سے مراد بُت نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ بُتوں کو بُرا کہتے کہتے اور ان کی بُرائی بیان کرتے کرتے ان ہستیوں کو نشانہ نہ بنالینا جن کے ان مشرکین نے بُت تیار کیے ہیں۔ تصویر بے شک غلط ہے لیکن جس کی تصویر بنائی گئی ہے وہ بے قصور اور ان کے اس کردار سے بے خبر ہے اپنی تنقید کا ان کو نشانہ نہ بنانا۔ بیت اللہ میں حضرت ابراہیم کے بت کی پرستش دیکھ کر حضرت ابراہیم کو بُرا نہ کہنا، قبر کی پرستش ہوتے دیکھ کر مقبور کو بُرا نہ کہنا۔ اگر تم ایسا کرو گے کہ ان ہستیوں کو بُرا کہو گے تو وہ لوگ نادانی سے جہالت سے شانِ خدا میں گستاخیوں پر اتر آئیں گے۔

گویا اس آیت میں مسلمانوں کو دعوتِ توحید کے سلسلے میں بتایا جا رہا ہے کہ شرک کی تردید نہایت ضروری ہے لیکن ضروری ہونے کے ساتھ اس میں ذرا نزاکت بھی ہے۔ ضرورت تو اس کی واضح ہے نزاکت کو یہاں بتایا جا رہا ہے۔ نزاکت یہ ہے کہ اگر مشرکین اپنے مشرکانہ اعمال خدا کے نیک بندوں کو معبود بنا کر کر رہے ہوں تو اس میں احتیاط کا دامن تھام کر رکھنا چاہیے، شرک کی تردید کرنی چاہیے لیکن جن بزرگوں کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے ان کے دامانِ احترام کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ شرک کی تردید کے جوش میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم کا دامانِ احترام ہاتھ سے نکل جاتے۔ یہی حکم ان سب

بزرگوں کا ہے دنیا جن کی تماثیل بنا کر یا جن کی قبریں بنا کر ان سے عابدانہ تعلقات قائم کیے ہوئے ہے۔ شرک کی برملا تردید کی جائے گی لیکن بزرگوں کے احترام میں ہرگز فرق نہ کیا جائے گا۔ اس تشریح کے بعد کوئی اشکال نہیں رہتا ہے۔ نہ بتوں کو سخت وسست کہنے میں کوئی قباحت ہے نہ الذین میں کسی تاویل کی ضرورت ہے

آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! بحث ومباحثہ کے موقعہ پر تم مشرکین کے معبودوں کو برا نہ کہو جن کو وہ اپنی دعاؤں میں اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ ان کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ سمجھ کر اور بارگاہ الہی میں دفع بلایا جلب منفعت کے لیے سفارشی سمجھ کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی جھگڑے اور بحث ومباحثہ میں حدود سے تجاوز کر جائیں گے اور بغیر علم خدا کی شان میں گستاخیوں پر اتر آئیں گے اگرچہ وہ خدا کو مانتے ہیں مگر انسان حالت غضب میں بے قابو ہو جاتا ہے اور سوچ سمجھ سے بالا ہو کر جوابی کاروائی کرتا ہے۔ ایک عیسائی مسلمانوں کے پیغمبر کے دامان احترام کو ہاتھ لگاتا ہے مسلمان حالت غضب میں عیسائی کے پیغمبر پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ایک شیعہ سنی سے الجھتا ہے اور حضرت ابوبکر کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے سنی اس کے مقابلہ میں حضرت علی پر فقرہ کس دیتا ہے حالانکہ مسلمان جانتا ہے کہ حضرت عیسٰی کو برا کہنا کفر ہے اور سنی کو پتہ ہے کہ حضرت علی کے دامان احترام کو ہاتھ لگانا فسق ہے بلکہ دو بھائی آپس میں لڑتے ہیں اور غضب کی حالت میں دونوں ماں کی گالیاں دیتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ دونوں کی ماں ایک ہے۔ اسی نکتہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے۔ کہا گیا یا رسول اللہ اپنے والدین کو گالی کون دیتا ہے فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔ (صحیح بخاری)

اس لیے آیت میں بغیر علم سے اس علم حضوری کی نفی کی جا رہی ہے جو آدمی میں عمل کی نیکبخت پیدا کرتا ہے۔

عام شارحین قرآن نے آیت کی تشریح میں مشرکین کے معبودوں سے ان کے بت ہی مراد لیے ہیں اور عبداللہ بن عباس، قتادہ اور سدی کی تشریحات بھی اسی کی مؤید ہیں۔

مفسر قرآن مشہور محدث ابن جریر نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے،

مشرکین نے کہا کہ اے محمد تم ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے باز آجاؤ، ورنہ ہم آپ کے رب کی ہجو کریں گے۔

اور ابن جریر نے ہی حضرت قتادہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

مسلمان کافروں کے بتوں کو برا کہتے تھے اور کفار اللہ کی شان میں نازیبا کلمات کہتے تھے۔

اور ابن جریر ہی نے سدی کے حوالہ سے اسی سلسلے میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو قریش نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ابوطالب کے پاس چل کر ان سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دے ورنہ یہ بات ہمارے لیے بڑی عار کی ہوگی ابوطالب کے بعد ہمارے ہاتھوں حضور انور کی موت ہو جائے اور اہل عرب کہیں کہ چچا نہیں رہا تو بھتیجے کو مار دیا۔ چنانچہ ابوسفیان، ابوجہل، النضر بن الحارث، امیہ ابن خلف، ابی ابن خلف، عقبہ بن معیط، عمرو بن العاص اور الاسود بن البختری اکٹھے ہو کر ابوطالب کے پاس گئے اور بولے کہ آپ ہمارے بڑے ہیں اور سردار ہیں، محمد مصطفیٰ نے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو بہت تکلیف پہنچائی ہے ہم آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کو بلا کر سمجھا دیجئے کہ ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہے۔ ابوطالب نے حضور انور کو بلایا اور کہا کہ یہ قوم کے بزرگ آئے ہیں، حضور نے فرمایا کہ کیا کہتے ہیں؟ سب بول پڑے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہیں ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو کچھ نہ کہیں گے۔ حضور انور نے فرمایا بالکل ٹھیک کہتے ہو میں اس کی پابندی کروں گا بشرطیکہ تم میری ایک بات مان لو۔ بات بھی معمولی نہیں بلکہ اتنی اونچی ہے کہ اگر مان لوگے تو پورے عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمہارا باج گزار ہو جائیگا ابوجہل بولا ایسی بات ایک منواتے ہو ہم تو دس ماننے کو تیار ہیں بتاؤ کیا بات ہے؟ فرمایا کہو لا الہ الا اللہ سارے بگڑ گئے۔ ابوطالب نے کہا بھتیجے اس بات کے علاوہ کوئی اور بات منواؤ ان کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضور نے فرمایا چچا جان میں تو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ آسمان سے آفتاب اتار لائیں اور میرے ہاتھ پر رکھ دیں پھر بھی میں صرف یہی کہوں گا۔ اس پر وہ غضب میں آ گئے اور یک زبان ہو کر بول پڑے کہ یا تو آپ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں ورنہ آپ کو بھی برا کہیں گے اور اس کو بھی جو آپ کو حکم دیتا ہے۔

ان روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی رائے میں الذین یدعون من دون اللہ سے بت تماثیل اور اوثان مراد ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو بتوں کو برا کہنا کوئی برائی نہیں ہے بلکہ ایک طاعت ہے اور طاعت نہیں تو کم از کم ایک مباح عمل ہے۔

ایک دستوری دفعہ کا چہرہ

اسی بنا پر علماء نے اس آیت سے یہ دستوری دفعہ معلوم کی ہے کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے

جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے فساد لازم آتا ہو۔ یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہیں وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے کیونکہ معبودات باطلہ یعنی بتوں کو بُرا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے اور ایمانی غیرت کے لحاظ سے کہا جاتے تو شاید اپنی ذات میں محمود بھی ہو لیکن چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہے کہ لوگ اللہ کو بُرا کہیں گے تو بتوں کو بُرا کہنے والے اس کا سبب بن جائیں گے اس لیے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

مطلب یہ ہے کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہو گا بر خلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کیے جا سکتے۔

فقہا نے اس دستوری دفعہ کی روشنی میں بہت سے اخلاقی، معاشرتی، مالیاتی قوانین ترتیب دیے ہیں ابن العربی اور الجصاص نے ان مسائل کی طرف جستہ جستہ اشارات بھی کیے ہیں یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے

ہر قوم کو اپنا ہی عمل اچھا لگتا ہے

۱۳۵ - ایسے ہی ہم نے ہر اُمت کے لیے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان کو اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے وہ ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے تھے۔ یعنی دنیا چونکہ دار الامتحان ہے اس کا نظام ہم نے ایسا رکھا ہے اور ایسے اسباب جمع کر دیے ہیں کہ یہاں ہر قوم اپنے اعمال اور طور و طریق پر نازاں رہتی ہے انسانی دماغ کی ایسی ساخت نہیں بنائی کہ وہ صرف سچائی کے قبول اور پسند کرنے پر مجبور رہے غلطی کی طرف جانے کی گنجائش ہی نہ رکھے ہاں خدا کے یہاں جا کر جب تمام حقائق سامنے ہوں گے پتہ چل جائے گا کہ جو کام دُنیا میں کرتے تھے وہ کیسے تھے [1] مطلب یہ ہے کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اسے اچھی لگتی ہے۔ اللہ کی یہی سنت ہے جو انسانی اخلاق و اطوار میں ہمیشہ سے چل رہی ہے کہ اپنے مالوف اور اپنی پسندیدہ عادتوں کو جو ان کو وراثت میں ملی ہوں اچھا سمجھتے ہیں خواہ وہ تقلید و جہالت کی وجہ سے کرتے ہوں اور چاہے وہ علم و بصیرت کی بنا پر کرتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختیاری اعمال میں تزئین کا خاص اثر ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے کچھ دلوں میں کُفر کی تزئین اور کچھ دلوں میں ایمان کی تزئین تخلیق فرمائی ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو ایمان و کفر اور خیر و شر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان خلقی اطوار میں سے ہو کر رہ جائیں جن کی دعوت و ترغیب یا ممانعت و ترہیب بیکار ہو کر رہ جائے، نہ رسول کی ضرورت رہے اور نہ کتابوں کی حاجت اور اس کے نتیجہ میں نیکوں اور بدوں کا معاملہ ملائکہ اور شیطان جیسا ہو کر رہ جاتے، بلکہ اس کے برعکس ہر انسان میں ایمان و کفر اور خیر و شر قبول کرنے کی یکساں صلاحیت اور استعداد رکھی ہے۔ معتزلہ اور جبریہ نے خواہ مخواہ یہاں اپنے غلط مسلکوں پر آیت کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ جس طرح ہم نے ان لوگوں کی نظر میں ان کا یہ عمل خوشنما بنا دیا ہے اسی طرح ہر طبقہ کی نظر میں اس کا اپنا ہی عمل پسندیدہ کر دکھایا ہے۔ تزئین بمعنی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہاں تزئین اعمال کے معنے اعمال اقوام میں اللہ کے قانون کے ہیں۔ یعنی جو امور قوانین فطرت کے تحت رو نما ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا فعل قرار دیا ہے کیونکہ ان قوانین کا بنانے والا وہی ہے اور جو کچھ ان قوانین کے تحت ہوتا ہے وہ اسی کے حکم سے ہوتا ہے، منشا یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے۔

اعجاز صرف ارادہ الٰہی کا نام ہے

۱۰۹ - اور یہ لوگ خدا کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی سامنے آجاتے تو وہ اسے ضرور مان لیں گے آپ فرما دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں، اور مسلمانو! تمہیں ان لوگوں کا حال کیا معلوم ہے ؟ اگر نشانیاں آ بھی جائیں پھر بھی یہ لوگ یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ یعنی فرمائشی معجزے مثلاً کوہ صفا خالص سونے کا بن جاتے۔ بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ اچھا ہو اگر ان کی یہ حجت بھی پوری ہو جاتے۔ اس پر فرمایا کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ یہ سرکش ضدی لوگ فرمائشی نشان دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر سنت اللہ کے موافق اس کے مستحق ہوں گے کہ فوراً تباہ کر دیے جائیں جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں [1]

اس میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ انہوں نے قسمیں کھا کر یہ یقین دلایا ہے کہ اگر معجزہ ظاہر ہو جاتے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ کہہ دو انما الآیات عند اللہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں تمام شارحین قرآن اس پر متفق ہیں کہ آیت میں

[1] افادات شیخ الاسلام

تقریہے اور معنے یہ ہیں کہ آیات کا معاملہ استقلالاً اللہ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یہ میری دسترس اور قدرت میں نہیں ہے۔ اس اندازِ تعبیر نے ان لوگوں کی فکری غلطی کی اصلاح کر دی جو سمجھتے ہیں کہ معجزہ پیغمبر کا کام ہوتا ہے یہ اس لیئے خاص طور پر بتایا گیا ہے کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہ ہوجائیں۔ اسی قسم کی آیات سے ہمارے متکلمین نے یہ بات عقائد میں داخل کردی ہے کہ معجزہ نبی کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے فتح الصفا شرح الشفا میں ہے کہ

متکلمین کہتے ہیں کہ معجزہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور انسان کی قدرت و طاقت سے بالا ہوتا ہے۔

احناف میں سے شیخ ابن الہمام نے بھی اپنی عقائد پر لکھی ہوئی مشہور کتاب المسامرہ میں لکھا ہے کہ معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور اس کے شارح کمال الدین محمد ابن ابی شریف نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور عقائد کی مشہور کتاب المواقف میں علامہ عضد الدین عبدالرحمٰن نے معجزہ کی شرائط بیان کرتے ہوئے پہلی شرط یہ بتائی ہے کہ معجزہ اللہ کا فعل ہو اور پھر آگے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

معجزہ ہمارے نزدیک فاعل مختار کا فعل ہے جس کو وہ اس شخص کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے جس کی نبوت کی اپنی مشیت سے تصدیق کرنا چاہتا ہے۔

ان عبارات سے آفتاب نیم روز کی طرح یہ بات واضح ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے نبی کا فعل نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے اس فعل کے ذریعے نبی کی نبوت اور رسالت کی عملی اور گویا ایک گونہ قولی تصدیق کرتا ہے۔

آیئے ذرا کچھ ان کی زبانی بھی کچھ سن لیجئے جن کو کلام اور تصوف دونوں میں امام مانا گیا ہے۔ امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

معجزہ انبیاء کرام کی صداقت پر بایں طور دلالت کرتا ہے کہ جب اس کے ظاہر کرنے سے تمام انسان عاجز ہیں تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہوگا اور بس، اور جب یہ نبی کے دعویٰ نبوت کی آغوش میں ہوکر رونما ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تصدیق کردی کہ تو دعویٰ نبوت میں سچا ہے۔

یہ عبارت بھی اس بات کی واشگاف دلیل ہے کہ معجزہ بس اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ معجزات و خوارق کا وقوع پیغمبر یا کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ معجزے کی حقیقت سے نظامِ کائنات کے کسی مستمر اور بندھے ہوئے معمول میں کچھ ترمیم کرنا اور ان کا تمام تر خالق کائنات ہی کے اختیار میں ہونا بالکل ظاہر ہے وہی قدرت بھی اس پر رکھتا ہے اور وہی علم بھی اس کا رکھتا ہے کہ کس معجزے کا وقوع موافق حکمت ہوگا اور کس کا مخالف حکمت، لہٰذا کسی مخصوص و متعین معجزہ کی فرمائش ہی سرے سے بے جا ہے۔ البتہ نفس معجزہ یا کوئی غیر معمولی نشان پیغمبر کے دعوے کی تصدیق و تقویت کے لیے عین موافق حکمت ہے اور ایسے نشانات ایک نہیں بے شمار ظاہر ہو چکے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں وہ چاہے تو ظاہر فرمائے اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امر واقعی کا بیان ہے پیغمبر کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وما یشعرکم انھا اذا جاءت لا یؤمنون۔ اور تمہیں کیا معلوم ہے کہ اگر نشانیاں آبھی جائیں پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ مسلمانوں کو رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر ان منکروں کی فرمائشیں پوری کر دی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو شاید یہ لوگ اس طرح مسلمان ہو جائیں۔ اس میں اسی بات کا مسلمانوں کو جواب دیا جا رہا ہے کہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب کیا ہے تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت وہ نہ مانیں گے بلکہ بدستور اڑے رہیں گے۔

قرآن نے یہ بات دوسری آیات میں کھول کر بتائی ہے کہ معجزات و دلائل، آیات اور آثار سے ہدایت ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے دلوں میں قبولِ حق کی طرف میلان ہو۔ بڑے سے بڑے معجزات اور عجیب سے عجیب خوارق ان لوگوں کے نزدیک سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جن کے دل انابت اور رجوع الی الحق کی استعداد سے خالی ہوں۔ اگر قبولیتِ حق اور اصلاح کی یہ استعداد نہ ہو تو بڑے سے بڑے معجزات بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گمراہی اور شقاوت کی مہر لگی ہوتی ہے۔

کفر و سرکشی کا نتیجہ

۱۳۷ — اور ہم ان کے دلوں اور نگاہوں کو اس طرح پلٹ رہے ہیں جیسے یہ پہلی بار اس پر ایمان نہیں لاتے تھے اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ رہے ہیں۔ یعنی جب کفر و سرکشی میں تمہاری

اور زیادتی ہوگی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے دل اور آنکھیں اُلٹ دیں گے پھر حق کے سمجھنے اور دیکھنے کی توفیق سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ موضح القرآن میں ہے کہ اللہ جن کو ہدایت دیتا ہے اوّل ہی حق سن کر انصاف سے قبول کرتے ہیں اور جس نے پہلے ہی ضد کی اگر نشان بھی دیکھے تو کچھ حیلہ بنا لے[1]

یہ اس قانون کا بیان ہو رہا ہے جس کے تحت کسی کو ایمان نصیب نہیں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں کیا پتہ ہے کہ معجزات کی رونمائی کے وقت ہم ان کے دلوں کو خواطر اور تاویلات میں اور ان کی قوت فکری کو احتمالات کی تخلیق اور ان کی نگاہوں میں تخیلات کی طرف پلٹ دیں گے اور یہ ٹھیک ایسا ہی ہوگا جیسے بار اوّل یہ ایمان نہ لا کر چکے ہیں۔ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں اب بھی جھٹلا دیں و نذرھم فی طغیانھم اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصلی سبب ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ معاندین چونکہ عموماً دولت مند، رؤسا اور مدعیانِ عقل و خرد ہوتے ہیں اس لیے ان کا جذبہ انانیت اور ترفع ان کو داعیان کے سامنے سرنگوں ہونے سے باز رکھتا ہے

یہ ہیں آخری سطریں جو اس بے مایہ اور خطاکار کے قلم سے ساتویں پارے کی تشریحات میں سپردِ قرطاس ہوتی ہیں ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

۲۴ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ
۲۴ دسمبر ۱۹۷۸ء
اتوار ۶ بجے بعد مغرب

---

[1] افادات شیخ الاسلام